حفاظت و حجیتِ حدیث



مولانا محمد محترم فہیم عثمانی



دارالکتب
لاہور

حفاظت وحجیت حدیث

از قلم

مولانا محمد محترم فہیم عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا محمد محترم فہیم عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند کے معروف علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، ان کے والد مولانا محمد مسلم عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فاضل دارالعلوم دیوبند، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں استاذ حدیث رہے، پاکستان بننے کے بعد جامعہ اسلامیہ لاہور کی بنیاد رکھی۔ مولانا محمد محترم فہیم عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کتب علوم اسلامیہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں ماہر اساتذہ سے پڑھیں۔

مولانا کی علمی خدمات کا تعارف کرواتے ہوئے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ:

" اللہ تعالیٰ نے تحریر و انشاء کا بھی خاص سلیقہ بخشا تھا۔ چنانچہ قلم کے ذریعے بھی انہوں نے دین کی بڑی خدمت انجام دی۔ ابتداء میں انہوں نے دینی رسائل میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ پھر رفتہ رفتہ متعدد ضخیم کتابیں بھی لکھیں "حجیت حدیث" کے موضوع پر ان کی مفصل کتاب " حفاظت و حجیت حدیث " (جو تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہے) شاید اپنی جامعیت کے لحاظ سے اس موضوع پر اردو میں مفصل ترین کتاب ہے جس میں انہوں نے منکرین حدیث کے تمام دلائل و اعتراضات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ نماز کے احکام و مسائل پر انہوں نے جو کتاب تالیف فرمائی ہے وہ

بھی اپنے موضوع پر اردو کی شاید جامع ترین کتاب ہے اور پھر خود ہی اس کا انگریزی ترجمہ کر کے اس کی افادیت کو عالمگیر بنادیا ہے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی کتاب ''احکام حج'' کا انگریزی ترجمہ بھی برادر موصوف ہی نے کیا ہے جو ''How to perform hajj'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے ایک درجن سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں تالیف فرمائی ہیں جن میں سے ہر ایک مواد کی صحت و جامعیت اور شگفتہ اسلوب تحریر کے لحاظ سے اردو کے ذخیرہ کتب میں بیش بہا اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ پچھلے دنوں ملک میں عورت کی دیت کا مسئلہ اٹھا تو برادر موصوف نے اس مسئلے پر بھی ایک مفصل مقالہ تحریر فرمایا جو چند ہی ماہ پہلے ابلاغ میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ احقر نے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی قدس سرہ کی کتاب ''اظہار الحق'' کا اردو ترجمہ اپنی شرح و تحقیق کے ساتھ شائع کیا تھا، حضرت مولانا کی ایک دوسری کتاب ''اعجاز عیسوی'' کی تحقیق و ترتیب پر بھی احقر نے کام شروع کیا، لیکن مصروفیات کی بنا پر اسکی تکمیل نہ کر سکا۔ اس کی تکمیل کیلئے احقر نے برادر موصوف سے درخواست کی۔ چنانچہ وہ چند ماہ سے اس کام میں مشغول تھے اور اس کا معتد بہ حصہ مکمل کر چکے تھے۔ اسکے علاوہ انکے والد ماجد قدس سرہ نے طحاوی شریف کی ایک شرح تالیف فرمائی تھی جس کا مسودہ انکے پاس محفوظ تھا، وہ اس مسودے کی تبیض و ترتیب میں مشغول تھے اور شاید اس کا قابل لحاظ حصہ کتابت بھی کرا چکے تھے '' [نقوش رفتگاں ۲۱۳]

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے نقوش رفتگاں از مفتی محمد تقی عثمانی صفحہ ۲۱۱

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی

حفاظت و حجیّتِ حدیث

جس میں

حدیث کی حفاظت اور اس کی حُجیّت سے متعلّق تمام شکوک و شُبہات کا نہایت اطمینان بخش جواب دیا گیا ہے۔

از

مولانا محمّد محترم فہیم عثمانی

دارالکتب

مسجد مقدّس دھوبی منڈی پُرانی انارکلی لاہور

بار اوّل ———— دسمبر ۱۹۷۹ء

باہتمام ———— چوہدری محمد عاشق

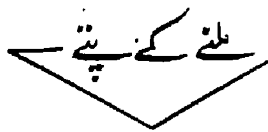
کتابت ———— کفایت اللہ خوشنویس

طباعت ———— شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

ناشر ———— دارالکتب مسجد مقدّس دھوبی منڈی
پرانی انارکلی لاہور

تعداد ———— ایک ہزار

قیمت ———— آفسٹ مجلد -/۴۰ روپے



۱:- دارالکتب مسجد مقدّس دھوبی منڈی پرانی انارکلی لاہور۔

۲:- ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور۔

۳:- المکتبۃ العلمیہ لیک روڈ لاہور۔

۴:- مکتبۂ عزیزیہ ۱۳ اردو بازار لاہور

۵:- دارالاشاعت اردو بازار کراچی نمبر ۱

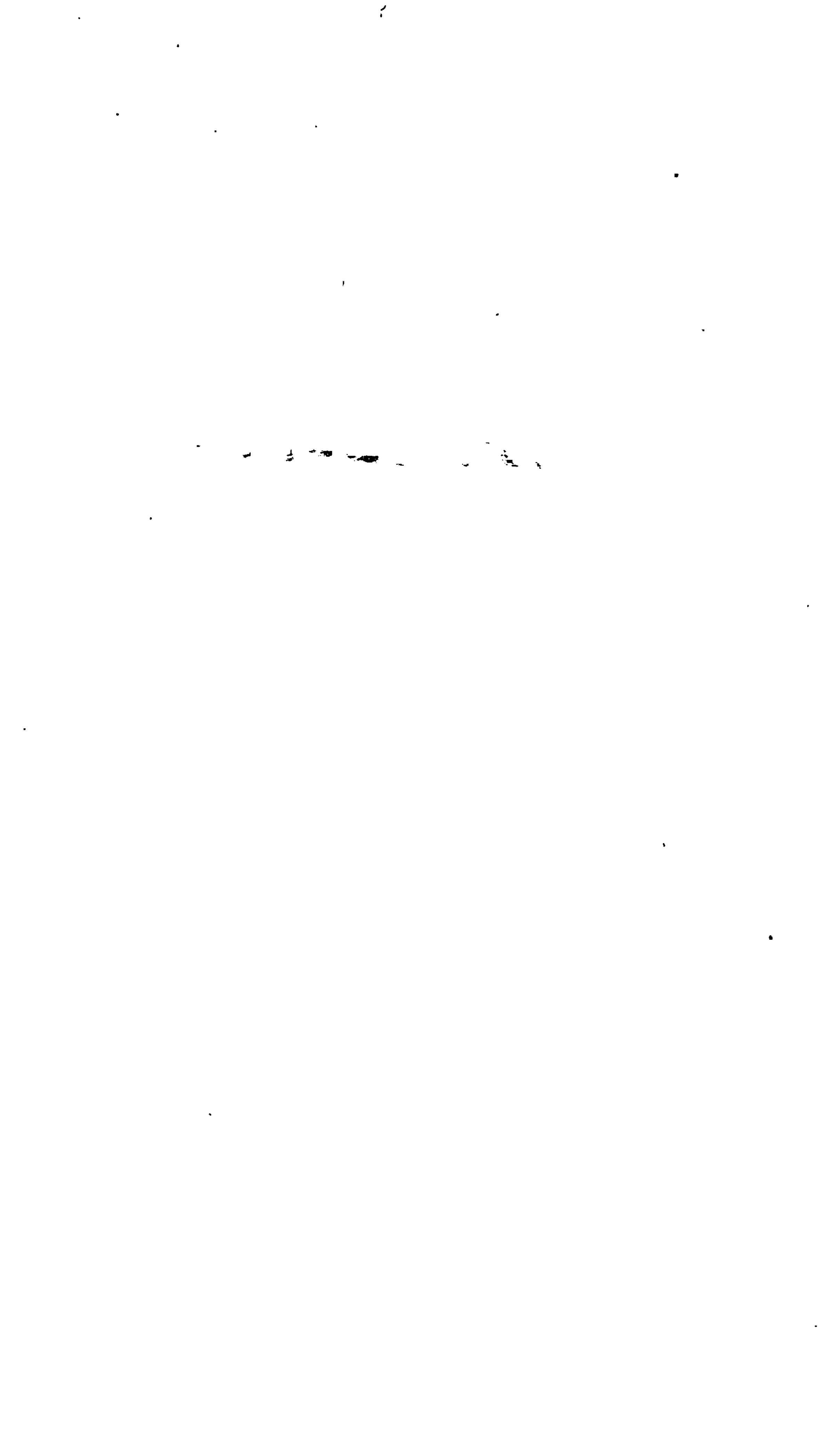
فہرست مضامین

جزوِ دوم ۔ حجیتِ حدیث

اِنتساب

اپنے والدِ ماجد حضرت مولانا محمد مسلم عثمانی قدس اللہ سرّہٗ
کے نام

کہ وُہ میرے والد ہی نہیں میرے استاد و معلّم، شیخ و مربّی اور
ہادی و رہنما سبھی کچُھ تھے۔ مَیں جو کچھ ہوں سب انہی کی بدولت ہوں۔



عرضِ ناشر

اس کتاب کے مؤلف و مصنف مولانا محمد محترم فہیم عثمانی کا نام علمی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ اس سے پہلے مولانا کی متعدد کتابیں دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا کا اسلوبِ نگارش محققانہ اور عالمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ جذب و تاثیر میں اپنی مثال آپ ہوتا ہے مگر شاید کم ہی لوگوں کو یہ بات معلوم ہو کہ مولانا ایک بلند پایہ مصنف ہی نہیں ایک قادر الکلام خطیب بھی ہیں۔ دراصل حفاظت و حجیتِ حدیث کا یہ موضوع مولانا نے ابتداءً اپنے جمعہ کے خطبات میں ہی شروع کیا تھا۔ مگر دو چار تقریروں کے بعد ہی اس کی افادیت کے پیشِ نظر مولانا کے مداحین کی طرف سے یہ اصرار شروع ہو گیا کہ اسے کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

اس کی طباعت و اشاعت کو بروئے کار لانے کی ذمہ داری خوش قسمتی سے میرے حصے میں آئی۔ اس سے پہلے مولانا کی چند تقریروں کا مجموعہ میں شائع بھی کر چکا تھا۔ مولانا نے اس موضوع پر اپنی تقریروں کو صرف "حفاظتِ حدیث" تک ہی محدود رکھا تھا مگر جب ٹیپ ریکارڈ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے مولانا کو یہ تقریریں نظرِ ثانی کے لیے دی گئیں تو ساتھ ہی یہ درخواست بھی کر دی گئی کہ حجیتِ حدیث کے موضوع کا اس میں اضافہ کر دیا جائے۔ مولانا نے کمال مہربانی سے یہ درخواست بھی منظور کر لی اور اس طرح یہ کتاب دو حصوں میں "حفاظت و حجیتِ حدیث" کے نام سے مرتب ہو گئی اور اب کتابت و طباعت کے مراحل سے گزر کر قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ مولانا کی اس کتاب کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کی جو ذمہ داری میں نے اپنی خوشی سے قبول کی تھی اس کو باحسن وجوہ پورا کرنے کی توفیق اس نے مجھے عطا فرمائی۔ مجھے یقین ہے اس کی بارگاہ میں میری یہ حقیر خدمتِ دین شرفِ قبولیت سے ہم کنار ہوگی۔

محمد عاشق 463 شادمان کالونی لاہور

حرفِ اوّل

یہ بات ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اسلام کی صحیح تصویر قرآن اور حدیث دونوں سے مل کر ہی تیار ہوتی ہے اسلام کی صحیح تعلیمات کا علم قرآن اور حدیث کی باہمی توفیق و تطبیق ہی کی بنیاد پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کردیں ایک کو مانیں اور ایک کا انکار کریں وہ صراطِ مستقیم سے دُور ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلام میں جتنے گمراہ فرقے پیدا ہوئے وہ وہی ہیں جنھوں نے قرآن کو حدیث سے یا حدیث کو قرآن سے علیحدہ کرنا چاہا۔ خوارج کی گمراہی کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہ تھی کہ انھوں نے قرآن کو مانا اور حدیث سے انحراف کیا جبکہ ان کے مقابل فرقے نے قرآن کو محرّف بنا کر چھوڑا اور صرف اپنے اماموں کی سنّت کی پیروی کا دعویٰ کیا، اسی طرح معتزلہ نے قرآن کی آیات میں دور از کار تاویلات کا سہارا لے کر احادیث سے اعراض کیا نتیجتاً مدّتوں گمراہیوں کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے۔

تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی ہے جو کچھ پہلے ہوا تھا آج بھی ہو رہا ہے۔ دینِ حق عقل کے اندھوں کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے جو چیز ان کی عقل کے خود ساختہ معیار پر پوری نہیں اترتی اُسے بے تکی تاویلات کے بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے حدیث سے انکار کر کے اپنے زعم میں اسلام کے چہرے سے خلاف عقل ہونے کا داغ مٹانا چاہتے ہیں لیکن ہو یہ رہا ہے کہ داغ سمجھ کر اسلام کی صحیح تصویر کے اصل نقوش مٹاتے چلے جارہے ہیں۔

حدیث کے بغیر قرآن فہمی کے یہ دعویدار جو قرآنِ پاک کو ہر ضرورت، ہر حکم اور ہر مسئلے کا حامل سمجھتے ہیں اور اپنی عقل و فہم کو قرآن کی تفسیر و تشریح کیلئے کافی خیال کرتے ہیں دراصل چاہتے یہ ہیں کہ احادیث اور فقہ کا سارا دفتر مٹ جائے اور ان کی جگہ ان کے خود ساختہ اجتہادات اور بے بنیاد استنباطات قرآن پاک کا حقیقی ایڈیشن اور اسلام کی تعلیمات کا مستند مخزن قرار پا جائیں۔ افسوس تو زیادہ اس بات کا ہے کہ یہ سب کچھ دشمنانِ اسلام کی پیروی میں ہو رہا ہے مستشرقینِ یورپ کے سفیہانہ اعتراضات کی اندھا دھند تقلید سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ ڈھائی سو برس بعد احادیث کے قلم بند ہونے کی باتیں اور اس طرح حدیث کے ذخیرے کو ساقط الاعتبار ثابت کرنے کی سکیمیں، یہ رجالِ حدیث کی ثقاہت پر اعتراضات اور یہ عقلی حیثیت سے احادیث پر شکوک و شبہات کا اظہار یہ سب کچھ مستشرقینِ یورپ کے آثار ہیں جن کو منکرینِ حدیث ہو بہو کر اتراتے ہیں۔ ان کے گروہ میں سے ہر کوئی اس قدر بے باک ہو گیا ہے کہ جس کا جہاں تک بس چلتا ہے دین کا حلیہ بگاڑنے میں مصروف ہے، کوئی نماز کے اوقات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے تو کوئی نماز کے ارکان میں کتر بیونت کرنے پر تلا ہوا ہے، کوئی روزوں کی تعداد کم کرنے کے درپے ہے تو کوئی حج کے مناسک پر قینچی چلا رہا ہے، کوئی قربانی کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اسے سرے سے ہی حذف کر دینا چاہتا ہے، کچھ لوگ ہیں جو سمت قبلہ ہی کو تبدیل کرنے پر مصر ہیں کچھ ہیں جو وضو کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں، مسلمانوں کے اصولِ وراثت میں رد و بدل ہو رہا ہے غرض یہ منکرینِ حدیث کا گروہ لوگوں کو ایک نئے اسلام کی دعوت دینا چاہتا ہے اور اس کے لئے حدیث کا انکار ان کی مجبوری بن گیا ہے۔

تاہم انکارِ حدیث کا یہ فتنہ جس قدر پرانا ہے اسی قدر قدیم ان مساعی کی داستان ہے جو علمی سطح پر اس فتنے کا سدِّ باب کرنے کے لئے علمائے حق نے اپنے اپنے زمانے

میں انجام دیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے امام شافعیؒ نے اپنی تالیف "الرسالۃ" میں اور اس کے بعد "کتاب الام" کی ساتویں جلد میں ان لوگوں کے خیالات کا بڑے ہی پُر زور انداز میں رد کیا جو اپنے فسادِ مزاج کی بنا پر اخبارِ متواترہ کے سوا بقیہ تمام احادیث کا سرے ہی سے انکار کرتے تھے اور بہت سی قرآنی آیات میں اپنے مذاق کے مطابق تاویلیں کرتے تھے یہ لوگ معتزلہ تھے جن کے دماغوں پر عقل کا غلبہ تھا۔ انکارِ حدیث کی ابتدا در اصل انہی لوگوں سے ہوئی ان لوگوں نے حشر و نشر رویت باری تعالیٰ، صراط و میزان، جنت و جہنم اور اسی قسم کی دیگر احادیث کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ امام شافعیؒ نے سب سے پہلے ان لوگوں کے خیالات کی اپنی تالیفات میں تردید کی۔ ان کے بعد امام احمدؒ نے بھی اطاعتِ رسول کے اثبات میں ایک مستقل جزو تصنیف کیا جس کا ایک حصہ حافظ ابن قیم نے اپنی کتاب اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے کچھ عرصہ بعد امام غزالیؒ، ابنِ حزم اور حافظ محمدؒ بن ابراھیم میدان میں آتے اور انکارِ حدیث کے خلاف انتہائی پر مغز اور مدلّل مقالات لکھے۔ متاخرین میں علامہ سیوطی نے بھی اس موضوع پر ایک مستقل جزء تصنیف کیا۔ قریب کے دور میں ڈاکٹر مصطفی سباعی نے "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" لکھ کر اور ڈاکٹر صبحی صالح نے "علوم الحدیث و مصطلحہٗ" ترتیب دے کر اس موضوع پر کام کرنے کا حق ادا کر دیا۔ اردو زبان میں بھی موجودہ دور کے علماء نے انکارِ حدیث کے رد میں بڑا قابلِ قدر کام کیا ہے اس سلسلے میں مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی تصنیف "حجیتِ حدیث"، مولانا مناظر احسن گیلانی کی تالیف "تدوینِ حدیث" نیز مولانا بدر عالم کی کتاب "ترجمان السنّۃ" اور مولانا عبد الصمد صارم کی "تاریخ الحدیث" کے نام سرِ فہرست ہیں۔ رسائل میں "ترجمان القرآن" کا منصبِ رسالت نمبر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے قلم سے اور "الاعتصام" کا حجیتِ حدیث نمبر مولانا سید محمد داود غزنوی کے قلم سے قابلِ ذکر ہیں۔

غرض ہر دور کے علماء نے اپنے اپنے انداز میں انکار حدیث کے فتنے کا خوب خوب مقابلہ کیا اور علمی سطح پر منکرین حدیث کو لاجواب کر کے رکھ دیا دلائل سے بھرپور ایسے مسکت جوابات دیئے کہ ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں اور ان کے قلم ناکارہ نظر آنے لگے۔ اس لحاظ سے ضرورت تو نہ تھی کہ اس موضوع پر گفتگو کی جائے لیکن حال ہی میں منکرین حدیث کی سرگرمیاں از سرِ نو کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ علمی بساط پر مات کھانے کے بعد اب نئی چالیں چلنے لگے ہیں اور اپنی چابکدستی کا مظاہرہ کرنے کے لئے سادہ لوح ناواقف مسلمانوں کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں وہ مسلمان جو بے چارے دین سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی بنا پر ان کے سطحی اعتراضات کو سمجھ نہیں پاتے اور ان کے فریب کا باآسانی شکار ہو جاتے ہیں۔

لاہور میں بھی بعض دوستوں سے ان کی فتنہ سامانیوں کا حال معلوم ہوا سوچ ہی رہا تھا کہ کسی مبسوط تحریر کی مدد سے ان لوگوں کا سدِ باب کروں اسی اثنا میں میرے ایک دوست حج کی غرض سے کراچی کچھ روز ٹھہرے واپسی پر ان کی زبانی ان لوگوں کی سرگرمیوں کا مزید انکشاف ہوا انھوں نے اپنے بعض سرکردہ رہنماؤں کی تقاریر ٹیپ ریکارڈ کر کے ملک کے مختلف علاقوں میں تقسیم کر دی ہیں فارغ وقت میں یہ لوگ پارکوں، تفریح گاہوں اور ہوٹلوں جیسی عام آمد و رفت کی جگہوں پر حلقے بنا بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان تقریروں کی ٹیپ چلا دیتے ہیں۔ عام سادہ لوح مسلمان وقت گزاری کے لئے ہی ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ علمِ دین سے چونکہ پوری طرح واقفیت نہیں ہوتی، اس لئے ان کی پُرفریب باتیں سن سن کر بے چارے عجیب قسم کی ذہنی الجھن میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ عام لوگوں کے سامنے علمی بحثیں تو چل نہیں سکتیں ان کی سمجھ سے ہی بالاتر ہوتی ہیں یوں بھی علمی بحثوں کے لئے اب ان کے پاس رہا بھی کچھ

نہیں جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ علماء نے ان کو خاموش کر کے رکھ دیا ہے اس لئے ان ٹیپ ریکارڈ کی ہوئی تقریروں میں یہ لوگ زیادہ زور اسی بات پر دیتے ہیں کہ احادیث چونکہ محفوظ نہیں رہ سکیں اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور قرآن چونکہ محفوظ ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے مضامین میں جامع بھی ہے اس لئے قرآن اکیلا ہی کافی ہے۔ عام لوگ ان کے اس دھوکے میں آجاتے ہیں اور قسم قسم کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس صورتِ حال کے پیش نظر میں نے اس کام میں مزید تاخیر مناسب نہ سمجھی اور اللہ کا نام لے کر اس موضوع پر کام کا آغاز کر دیا۔ ابتداءً ارادہ یہ تھا کہ چونکہ منکرینِ حدیث حفاظت حدیث ہی کو مشکوک بنا کر حقیقت حال سے بے خبر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے صرف حدیث کی حفاظت کے موضوع تک کام کو محدود رکھا جائے مگر آغاز کار میں ہی محسوس ہونے لگا کہ جب تک حفاظت کے ساتھ ساتھ حجیّتِ حدیث پر بھی تفصیلی بحث نہ کی جائے کام ادھورا ہی رہیگا جوں جوں اس موضوع پر کام کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا یہ ضرورت قوی سے قوی تر ہوتی گئی بالآخر مجھے اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑا چنانچہ میں نے اپنے کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا پہلا حصہ حفاظتِ حدیث ہی کے ساتھ مختص رہا جبکہ دوسرے حصے کو میں نے حجیّت حدیث کی بحث کے لئے خاص کر دیا۔

میری گفتگو کا محور زیادہ تر وہ اعتراضات رہے ہیں جو منکرین حدیث کی جانب سے حفاظت حدیث کو مشکوک بنانے اور حجیّت حدیث کو مضمحل کرنے کی خاطر بڑے شد ومد سے پیش کئے جاتے ہیں میرے پیشِ نظر زیادہ تر یہ رہا ہے کہ علمی بساط پر علمائے حق کے ہاتھوں مات کھانے کے بعد منکرینِ حدیث عام سادہ لوح ناواقف مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے جو نئی چالیں چلنے لگے ہیں ان کی اصل حقیقت

حال واضح کر دوں تاکہ وہ لوگ جو بے چارے دین سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی بنا پر ان کی چالوں کو سمجھ نہیں پاتے ان کے فریب کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔

میں نے اس کام میں جہاں تک ہو سکا اصل ماخذ کو دیکھنے کی کوشش کی ہے مگر کہیں کہیں باہر مجبوری ثانوی مآخذ پر بھی انحصار کرنا پڑا اس دوران جو کتابیں میرے زیر مطالعہ رہیں ان کی ایک مختصر فہرست اس کتاب کے آخر میں میں نے دے دی ہے تاہم جن کتابوں سے مجھے اس کام میں بہت زیادہ مدد ملی وہ حافظ ابن حجرؒ عسقلانی کی تہذیب التہذیب حافظ ابن قیم کی اعلام الموقعین اور حافظ ابن عبد البرؒ کی جامع بیان العلم، نیز محمد عجاج الخطیب کی "السنۃ قبل التدوین" اور شیخ طاہر الجزائریؒ کی توجیہ النظر ہیں۔ علامہ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ، حافظ ابن حجرؒ کی لسان المیزان اور حافظ سیوطی کی تدریب الراوی سے بھی میں نے بھرپور استفادہ کیا۔ قریب کے فضلاء میں سے میں نے ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی کی تصنیف "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" اور ڈاکٹر صبحی صالح کی تالیف "علوم الحدیث و مصطلحہ" سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اردو زبان میں بھی مولانا مناظر احسن گیلانی کی "تدوین حدیث" اور مولانا بدر عالم کی "ترجمان السنۃ" نے میری بڑی رہنمائی کی۔

میں مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب کا شکر گزار ہوں جن کے توسط سے مجھے جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن لاہور کے کتب خانے تک رسائی حاصل ہوئی اور مہتمم جامعہ حضرت مولانا عبید اللہ زید مجدہٗ نے کمال مہربانی سے مجھے اس سے استفادہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ نیز ملک غلام علی صاحب منصورہ لاہور کا بھی ممنون ہوں کہ وہ حوالوں کی تلاش میں وقتاً فوقتاً میری مدد فرماتے رہے اور ضروری مصادر و مآخذ کی بہم رسانی میں مجھے ان کا مکمل تعاون حاصل رہا۔

مجھے حاجی محمد عاشق صاحب شادمان کالونی کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں

نے اس کام میں میرے ساتھ ہمہ جہتی تعاون کیا حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا وجود انہی کے ذوق و شوق اور انہی کی کوششوں کا رہینِ منت ہے اللہ تعالیٰ نے خدمتِ دین کے جس جذبے سے انھیں نوازا ہے وہ قابلِ صد تعریف ہے میری دعا ہے کہ انھیں خدمتِ دین کی بیش از بیش توفیق نصیب ہو اور اس سلسلے میں ان کی تمام مساعی مقبول بارگاہِ الٰہی ہوں۔

آخر میں رب کریم سے دست بدعا ہوں کہ وہ میری اس حقیر کاوش کو شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین! وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ

محتاجِ دعا

محمد محترم فہیم عثمانی

۳ ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ

۳ مارچ ۱۹۷۹ء

جُزو اوّل

حفاظتِ حدیث

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ
وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝

(الحجر: ٩)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیث کا انکار اور منکرینِ حدیث

انکار حدیث کا فتنہ اگرچہ بہت پُرانا ہے لیکن پُرانے منکرین حدیث اور موجودہ منکرین حدیث کے طرزِ عمل میں بڑا ہی بیّن اور نمایاں فرق ہے وہ یہ کہ وہ لوگ احادیث نبوی کے منکر ضرور تھے مگر ان کا تمسخر نہ اڑاتے تھے، فلسفے کی بھول بھلیوں سے مرعوب ہو کر حدیث کا انکار تو کرنے لگے تھے لیکن احادیث نبوی کا مذاق اڑانے کی جرأت انہیں نہ ہوئی تھی۔ ان کے برعکس موجودہ منکرین حدیث احادیث نبوی کا مضحکہ اڑاتے ہیں، تمسخر کرتے ہیں، نہ صرف احادیث کا بلکہ حدیث کا بیش بہا ذخیرہ ہم تک پہونچانے والے تمام صحابۂ کرام کا، محدثین کا مفسرین کا سب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حیرت ہے ان لوگوں کی شرم و حیا کو کیا ہوا، یہ لوگ ایسے علماء ایسے فقہا اور ایسے فضلاء کو اپنے استہزاء کا نشانہ بناتے ہیں جو علم کی تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اپنی نظیر نہیں رکھتے، یہ لوگ امام بخاری امام مسلم اور امام مالک جیسے بلند پایہ محدثین کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ضرور اڑائیں مگر اللہ کی گرفت سے بے خبر نہ ہوں۔

؎ چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد   میلش اندر طعنۂ پاکاں نہند

جب اللہ کسی کی پردہ دری کرنا چاہتا ہے کسی کو ذلیل و رسوا کرنا چاہتا ہے تو اس کے دِل میں یہ رغبت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ پاک لوگوں پر یعنی اللہ کے نیک بندوں پر طعنہ زنی کرنے لگتا ہے ہوتا یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کا دامن اس کے بے جا طعنوں کے باوجود پاک وصاف ہی رہتا ہے نتیجتاً وہ خود ہی رسوا ہو کر رہ جاتا ہے ؎

حلم حق با او مواسا ہا کند   چوں بہ حدش بگزرد رسوا کند

اللہ کی بردباری اسے ڈھیل دیتی رہتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس دریدہ دہنی پر کوئی گرفت ہی نہیں ہے لیکن جب وہ حد سے گذر جاتا ہے تو پھر اللہ اسے رسوا کر ڈالتا ہے۔

رسوائی

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے منکرین حدیث کو رسوا کر کے رکھ دیا ہے یہ محدثین کرام پر زبان طعن دراز کرنے والے، یہ احادیث نبوی کا مذاق اڑانے والے فی الحقیقت رسوا ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ اپنی رسوائی کو سمجھ نہ پائیں تو علیحدہ بات ہے۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے ان کی عقلوں پر پردے پڑ گئے ہیں ورنہ ذرا سوچیں تو سہی یہ لوگ کن لوگوں کی صف میں کھڑے ہیں۔

یہ منکرین حدیث، یہ ارشادات نبوی سے منہ موڑنے والے، یہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلّم کی باتوں کا مذاق اڑانے والے، یہ لوگ جو کہتے ہیں ہمیں حدیث کی ضرورت نہیں، جو لوگوں کو ترغیب دلاتے پھرتے ہیں کہ حدیثوں پر اعتماد نہ کرو، حدیثوں کو نہ سنو، حدیثوں کو نہ پڑھو، حدیثوں پر عمل نہ کرو، احادیث نبوی کے خلاف یہ باقاعدہ تحریکیں چلانے والے خدا را غور تو کریں اپنے آپ کو کن لوگوں کی صف میں کھڑا پاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کے خلاف یوں محاذ بنانے والے کون لوگ تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی باتوں کو نہ سننے کی ترغیب دینے والا سب سے پہلا ابولہب تھا جو مکّہ کی گلیوں میں کہتا پھرتا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی کوئی بات نہ سنو۔

اللہ کی لعنت ہو اس پر وہی تھا جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہر بات کا مذاق اڑاتا تھا اسی مذاق اور اسی تمسخر ہی نے تو ابو لہب کی گردن میں ابدی لعنت کا طوق ڈلوا دیا

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ (لہب: ۱)	ترجمہ: ابو لہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ تباہ و برباد ہو جائے۔

آج منکرین حدیث کا بھی یہی کام ہے وہ بھی گلی گلی کہتے پھر رہے ہیں کہ احادیث نبوی قابلِ اعتماد نہیں انہیں نہ سنو کہ دین پر عمل کرنے کے لیے ان کی کوئی ضرورت نہیں - یہ بھی ارشادات نبوی کا مذاق اڑاتے ہیں تو سُنیں غور سے سُنیں، ارشادات نبوی کا مذاق اڑانے والوں کے لیے اللہ نے ابدی لعنت لکھ دی ہے -

ان منکرین حدیث کی اس سے بڑھ کر رسوائی اور کیا ہو گی کہ یہ لوگ اور ابولہب جیسا قابلِ نفرین دشمن دین ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں -

آج سے چودہ سو سال پہلے ابو جہل کہتا تھا کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) میں آپ کو جھوٹا نہیں کہتا مگر آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں" - آج کا منکرِ حدیث بھی بالکل یہی بات کہہ رہا ہے مگر خوبصورت لفظوں کے پردوں میں لپیٹ کر - وہ کہتا ہے کہ عقل کی کسوٹی پر ہم پرکھتے ہیں تو احادیث پوری نہیں اُترتیں اس لیے ہم احادیث کو نہیں مانتے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ابو جہل کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھیں اب ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں - سمجھ میں آئیں بھی کیسے، قبول حق کی صلاحیت سے محروم افراد کی سمجھ میں حق آیا ہی نہیں کرتا، اور قبول حق کی صلاحیت اس وقت تک نصیب نہیں ہوتی جب تک آئینۂ دل سے تعصب کے پردے نہ ہٹائے جائیں، جب تک چشم بینا سے اغراض نفسانی کی عینک نہ اتاری جائے، جب تک نورِ حق کی کرنوں کے داخلے کے لیے دماغ کی ساری کھڑکیاں کھلی نہ رکھی جائیں - بے چارے منکرین حدیث کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ ان کو علمِ حدیث پر مکمل عبور حاصل نہیں - احادیث کی مختلف اقسام و انواع اور راویان حدیث سے متعلق فن تنقید و تحقیق سے یہ لوگ قطعاً نابلد ہیں -

تطبیق آیات و احادیث ایک مستقل فن ہے جس کی ابجد تک سے یہ بے چارے بے خبر ہیں۔ علوم حدیث کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں' برسوں علماء و مشائخ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا پڑتا ہے اس کے بعد بھی مدتوں مسلسل اور عمیق مطالعہ کی ضرورت ہے تب کہیں جا کر احادیث نبوی کی صحیح عظمت و افادیت اور سنت نبویہ کے صحیح مقام کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

منافقت منکرین حدیث کی سمجھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کے اسرار و رموز نہیں آتے تو صاف کہیں کہ ہم عقل و فراست کی روشنی سے محروم ہیں۔ مشرکین عرب سب کچھ تھے' ان میں ہر قسم کی برائیاں موجود تھیں مگر وہ (دوغلے' منافق) نہ تھے HYP-OCRISY سے انہیں نفرت تھی HYPOCRATES دوغلے پن کو وہ گالی سمجھتے تھے جو ان کے دل میں ہوتا تھا وہی زبان پر ہوتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں تو وہ سیدھے سادے لفظوں میں اس کا اظہار کر دیتے تھے کہ آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں مگر منکرین حدیث سیدھی طرح اپنی عقل کے عجز کا اظہار کرتے ہوئے شرماتے ہیں کیسے کہہ دیں کہ ارشاداتِ نبوی کے اسرار و رموز ہماری عقل کی رسائی سے باہر ہیں ' پردہ دری جو ہوتی ہے۔ دُنیا کو پتہ جو لگ جاتا ہے کہ ان کے علم کی گہرائی کہاں تک ہے۔ منکرین حدیث کی اس کمزوری کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دُور بین نگاہوں نے آج سے تیرہ چودہ سو سال پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ حافظ ابن قیمؒ اپنی کتاب اعلام الموقعین میں نقل کرتے ہیں کہ اِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ کَانَ یَقُوْلُ اَصْحَابُ الرَّاْیِ اَعْدَاءُ السُّنَنِ اَعْیَتْھُمُ الْاَحَادِیْثُ اَنْ یَّحْفَظُوْھَا وَتَفَلَّتَتْ مِنْھُمْ اَنْ یَّعُوْھَا وَاسْتَحْیَوْا حِیْنَ سُئِلُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا لَا نَعْلَمُ فَعَارَضُوا السُّنَنَ بِرَاْیِھِمْ فَاِیَّاکُمْ وَاِیَّاھُمْ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ عقل کی اتباع کرنے والے حدیث کے دشمن ہُوا کرتے ہیں حدیثیں یاد کرنے کی انہیں توفیق نہیں ہوتی اور جب ان سے سوال کیا جاتا ہے تو یہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں کہ ہمیں علم نہیں لہٰذا اپنی رائے سے جواب دیتے ہیں اور احادیث کا عقل سے مقابلہ کرنے لگتے ہیں۔

تم ایسے لوگوں سے بچتے رہنا۔

اتمام حجت غرض منکرین حدیث کے لیے لمحۂ فکریہ ہے وہ سوچیں کہ ان کی رسوائی کیا شکل اختیار کر چکی ہے وہ کن لوگوں کی صف میں کھڑے ہیں ان کا طرزِ عمل کن لوگوں کے طرزِ عمل کا غماز ہے۔ ابو لہب اور ابو جہل کون تھے، احادیث نبوی کے بارے میں ان کی سوچ کا کیا انداز تھا اور پھر اپنی سوچ کے رُخ کو بھی پہچانیں کہیں ان کی سوچ کا رخ بھی اسی جانب تو نہیں جس جانب ابو لہب اور ابو جہل کی سوچ کا تھا۔ تعصب سے بالاتر ہو کر سوچیں اگر سوچ کا رُخ غلط ہے تو اسے درست کر لیں، ابھی وقت ہے ان لوگوں کی صفوں میں آ شامل ہوں جو قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کو بھی حجت مانتے ہیں۔ جو جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ مبارک سے نکلا ہُوا ایک ایک لفظ وحی الٰہی ہے اور اسی لیے واجب الاتباع ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم: ۳ - ۴)

ترجمہ: اور وہ اپنی خواہش سے باتیں نہیں بناتے (ان کا کلام تو) تمام تر وحی ہی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

یہ قرآن کی آیت ہے، اسی قرآن کی جسے منکرین حدیث حجت مانتے ہیں وہی قرآن کہہ رہا ہے کہ آپؐ اپنی طرف سے تو کچھ بھی نہیں کہتے وہی کہتے ہیں جو وحی کی جاتی ہے۔ آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہُوا ایک ایک لفظ وحی ہے پھر حدیث کے حجت نہ ہونے کا کیا مطلب!
خدارا ذرا غور تو کیجئے، پلٹ آیئے اسی قرآن ہی کی طرف پلٹ آیئے جس کے بارے میں آپ کہتے ہیں کہ بس ہمیں قرآن ہی کافی ہے۔ وہی قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے
وما ینطق عن الھوی ۝ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔

؎ گفتۂ او گفتۂ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

آیئے باطل کی ظلمتوں سے نکل آیئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات بابرکات آفتابِ نبوت و رسالت ہے۔ آنکھیں کھولیے دیکھئے قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء - ۶۴)

ترجمہ: اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اسی طرح اللہ کا حکم ہے۔

رسول بھیجا ہی اسی لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اس کے ہر فرمان پر لبیک کہا جائے اس کے ہر فعل کی تقلید کی جائے اس کی ہر ہر ادا کی پیروی کو موجب نجات سمجھا جائے اس لیے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وحی الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اس کی اطاعت کو اپنی اطاعت سے تعبیر کرتا ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء : ۷۹)	ترجمہ: جو رسول کی اطاعت کرے اس نے درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت کی۔

ان قرآنی آیات کو بار بار پڑھیئے ان کے معانی پر خوب غور کیجئے اور پھر ذرا اپنے اس دعوے پر نظر ڈالئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول اور کوئی فعل ہمارے لیے حجت اور واجب العمل نہیں، ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے آپ اللہ کی کتاب ہم تک پہونچانے کے لیے آتے تھے وہ فریضہ ادا ہو چکا اب ہم جانیں اور ہمارا خدا جانے۔ ذرا غور تو کیجئے محولہ بالا آیات قرآنی کی روشنی میں آپ کا یہ دعویٰ کس قدر غیر معقول ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض ایک قاصد اور ڈاکئے کی سی ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ اللہ کا پیغام پہونچا دینے کے بعد نبی کو لوگوں سے کچھ کہنے سننے کا حق باقی نہیں رہتا، پیغام پہونچا دینے کے بعد نبی کی حیثیت عام انسان کی سی ہو جاتی ہے؟ خدا کے لیے ذرا سوچئے یہ کن لوگوں کے الفاظ ہیں جو آپ کی زبان سے نکل رہے ہیں کفار ہمیشہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں یہی کہتے آئے

قَالُوْا مَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (ابراہیم : ۱۰)	ترجمہ: (کفار نے) کہا کہ تم تو بس ہماری ہی طرح کے انسان ہو۔

یعنی ہم تمہاری کیوں سنیں اور کیوں اطاعت کریں۔ کتنے تعجب کی بات ہے دعویٰ ایمانی کے باوجود آپ کی سوچ کا انداز کفار سے ملتا جلتا ہے۔ باہر نکل آیئے ان کی صفوں سے اور مل جایئے ان لوگوں کے ساتھ جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو تمام عالم کے لیے رحمت سمجھتے ہیں اور آپ کی حدیث وسنت کو امت کے لیے حجت اور مشعل ہدایت مانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا

اتباع کیمیائے سعادت اور کلید جنت ہے نیز آپ کا عشق اولاً آپ کی محبت آخرت میں موجب شفاعت اور جنّت میں باعث رفع درجات ہے۔ آیئے ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو جایئے جنہوں نے اتباع سنت نبوی کے سہارے اللہ کے ان محبوب بندوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوالیا جن پر اللہ نے خاص انعام فرمایا ہے

وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۤءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (النساء-۶۹)

ترجمہ: اور جو اللہ کی اور رسول کی اطاعت کرے تو ایسے لوگ ان حضرات کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صلحا اور یہ حضرات بہت ہی اچھے ساتھی ہیں۔

واقعی انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کی رفاقت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں مگر یہ نعمت رسول کی اطاعت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ آیئے رسول کی اطاعت کا عہد کریں تاکہ اس نعمت سے محرومی نہ رہے:

انکار حدیث کی اصل وجہ

منکرین حدیث کو یہ دعوت اتمام حجت کے لیے ہے ورنہ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری یہ پکار ان کے لیے صدا بصحرا سے زیادہ نہیں۔ ان لوگوں کے انکار حدیث کی وجہ کوئی علمی مغالطہ نہیں ہے کہ اس کے دور ہونے کے بعد ان کو شرح صدر ہو جائے گا اور وہ اپنی غلطی سے رجوع کر لیں گے اگر یہ بات ہوتی تو علماء حق ان کے شرح صدر کا کافی سامان مہیا کر چکے ہیں اب تک انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہوتا۔ لیکن یہ ابھی تک انکار حدیث کے موقف کو بدستور حرز جاں بنائے ہوئے ہیں تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے بغیر ان کی گاڑی نہیں چلتی۔ دراصل دین کی پابندی ان کے نفس کی برداشت سے باہر ہے۔ احادیث نبویہ اور سنت محمدیہ قدم قدم پر شہوات نفس میں مزاحم ہیں۔ احادیث کو مانتے ہیں تو آزادی جاتی ہے۔ نفس یورپ کی بے حیا تہذیب اور بے لگام تمدن پر فریفتہ ہے۔ یہی فریفتگی انہیں انبیاء و مرسلین کے تہذیب و تمدن سے متنفر اور بیزار کیے ہوئے ہے۔ اتنی اخلاقی جرأت

نہیں کہ صاف برائت کا اعلان کر دیں اس لیے ان منکرین حدیث نے درمیان کی راہ نکال لی ہے کہ حدیث کا انکار کر دیا جو ان کی آزادی میں اصل سدِّ راہ تھی اور مسلمان کہلانے کے لیے قرآن کریم کا اقرار کر لیا کیونکہ قرآن کریم کی حیثیت ایک اصولی اور قانونی کتاب کی ہے وہ ایک دستورِ اساسی ہے جو زیادہ تر اصول اور کلیات پر مشتمل ہے جن میں ایجاز و اختصار کی بنا پر تاویل کی گنجائش نکل آتی ہے جبکہ احادیث نبویہ ان اصول اور کلیات کی شرح اور تفصیل ہیں ان میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں۔

اب یہ بے چارے احادیث کا انکار نہ کریں تو کیا کریں، آخر انہیں قرآن کریم کے مجملات اور موجز کلمات میں ایسی من مانی تاویلات کرنی ہیں جس سے ان کے اسلام اور ان کے نفس کی بے قید عیش پرستی میں کوئی منافات نہ رہے۔

اسی لیے تو یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انکار حدیث کے بغیر ان بے چاروں کی گاڑی نہیں چلتی، انکار حدیث ان کی مجبوری ہے۔ جس عیش پرستی کے یہ لوگ عادی ہو چکے ہیں حدیث کو حجت ماننے کی صورت میں اس عیش و آرام کو انہیں خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ صادق و مصدوق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے جب اس فتنے کی خبر دی تو ان کی اس کمزوری کی طرف بھی اسی وقت اشارہ فرما دیا تھا کہ انکار حدیث کے فتنے کی اصل وجہ عیش پسندی ہو گی۔ دیگر فتن کی طرح فتنۂ انکار حدیث کی خبر دیتے ہوئے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَکُمْ مُتَّکِئًا عَلٰی اَرِيکَتِهٖ يَاْتِيهِ الْاَمْرُ مِنْ اَمْرِيْ مِمَّا اَمَرْتُ بِهٖ اَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُوْلُ لَا اَدْرِيْ مَا وَجَدْنَا فِيْ کِتَابِ اللّٰهِ اتَّبَعْنَاهُ
(ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: میں تم میں سے کسی کو اپنی مسندوں پر سہارا لگائے ہوئے (اس حالت میں) نہ پاؤں کہ جب میرا حکم اس کے پاس پہونچے جس میں کسی کام کے کرنے کو میں نے کہا ہو یا کسی کام سے روکا ہو تو (تکبر اور نخوت سے) یہ کہے کہ میں نہیں جانتا یہ کیا حکم ہے ہم تو جو قرآن میں پائیں گے فقط اس کی پیروی کریں گے۔

دیکھ لیجئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی یہ پیشگوئی کیسی حرف بہ حرف منکرین حدیث پر صادق آتی ہے ۔ آج اپنی آنکھوں مشاہدہ کر لیجئے ۔ حدیث کا انکار کرنے والے یہی لوگ ہیں ۔ سپرنگ دار صوفوں پر متکبرانہ شان سے بیٹھنے والے، قوم کے بنے ہوئے نرم نرم بستروں پر آرام کرنے والے ۔ یہ سپرنگ دار صوفے اور یہ نرم نرم بستر ہی ان کی اصل کمزوری ہیں ۔ اس راحت و آرام کی عادت نے ان کی طبیعتوں کو آزاد بنا دیا ہے ۔

حدیث کا انکار اس لیے نہیں ہے کہ وہ علمی بنیادوں پر اسے حق سمجھتے ہیں بلکہ اس لیے ہے کہ جس قسم کی آزاد زندگی وہ گزارنا چاہتے ہیں احادیث کا ذخیرہ ان کو اس طرح کی زندگی گزارنے نہیں دیتا ۔ احادیث قرآن کریم کی ایک ایک آیت کے معانی و مفہوم کو متعین کر دیتی ہیں اور اس طرح ان کو پابند بنا دیتی ہیں کہ شریعت کی منشا کے مطابق زندگی گزاریں اور یہی ان کے لیے محال ہے ۔ ان کی آزاد طبیعت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآنی آیات کی من مانی تاویلیں کریں ۔ احادیث ان کے اس مقصد میں مزاحم ہیں اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ احادیث سے پیچھا چھڑا لیا جائے ۔

خواہشاتِ نفس کی پیروی

احادیث ان کی آزادی میں کس طرح مزاحم ہیں ۔ آئیے ذرا اس کا جائزہ لیں طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک دو مثالیں ہی کافی رہیں گی ۔

پانچ وقت کی نماز ان کے نفس پر بڑی شاق ہے ۔ کتنی عجیب پابندی ہے یہ کہ صبح صبح نرم و گرم بستروں کو چھوڑ کر مسجد کا رُخ کیا جائے یا شبینہ محفلوں سے اٹھ کر جائے نماز پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہُوا جائے، دن میں بھی ہر دو ڈھائی گھنٹے بعد دُنیا کے اہم ترین امور سے مُنہ موڑ کر بار بار نماز کے لیے دوڑا جائے ۔ نفس اس پابندی سے گلو خلاصی چاہتا ہے ۔ اس کے پیہم تقاضوں سے مجبور ہو کر اُنہوں نے کہا کہ قرآن نے جہاں جہاں صلوٰۃ کا حکم دیا ہے اس سے یہ معروف نماز مُراد لینا درست نہیں صلوٰۃ کے معنی لغت میں دُعا کے ہیں اس لیے جہاں کہیں بھی اور جس طرح بھی دُعا کر لی جائے اقیموا الصلوٰۃ کے حکم کی تعمیل ہو جائے گی ۔ قرآن نے تو صلوٰۃ کے قائم کرنے کا مجمل

حکم دے کر اس کی تمام تر تفاصیل احادیث پر چھوڑ دی تھیں۔ احادیث ہی نے بتلایا کہ صلوٰۃ کسے کہتے ہیں، صلوٰۃ کے لغوی معنی کیا ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں صلوٰۃ سے کیا مراد ہے وہ کس طرح ادا کی جاتی ہے اسکے اوقات کیا ہیں ہر ہر نماز کتنی رکعات پر مشتمل ہے۔ اس کے ارکان اس کی شرائط اور اس کے فرائض و واجبات سب حدیث نے متعین کیے ہیں۔ اب منکرین حدیث کی مشکل یہ ہے کہ احادیث کو مانتے ہیں تو نماز اپنی پوری کیفیت کے ساتھ ادا کرنی پڑتی ہے اور یہ ان کی آزادی پسند طبیعت کسی طرح قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتی۔ اس مشکل کا آسان حل ان بے چاروں کو یہی نظر آیا کہ احادیث کی حجیت سے ہی انکار کر دیا جائے۔

اسی طرح قرآن نے ایتاء زکوٰۃ کا حکم دیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شرح وتفسیر بیان فرمائی کہ زکوٰۃ کس مال پر ہے، وہ کتنی مالیت کا ہو، اس پر کتنی مدت گزر گئی ہو پھر اس کی ادائیگی کس شرح سے ہو غرض آپ نے اس کی ساری متعلقہ تفاصیل بیان فرمائیں۔ اب احادیث کے ماننے کی صورت میں زکوٰۃ کو اس کی تمام تر تفصیلات کے ساتھ قبول کرنا پڑے گا جو نفسانی اغراض کے پورا کرنے میں زبردست رکاوٹ ہے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے اور زکوٰۃ کے قرآنی حکم کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کا سب سے آسان راستہ یہی تھا کہ احادیث کا انکار کر دیا جائے۔

انہی دو مثالوں پر شریعت کے دیگر احکام کو بھی قیاس کر لیجئے۔ قرآن کریم تو ہے ہی ایک اصولی کتاب جو زیادہ تر کلیات پر مشتمل ہے احادیث نبویہ ان کلیات کی شرح اور تفصیل ہیں۔ قرآن کے اصولی احکام کو ان کی شرح وتفسیر سے الگ کر لیجئے پھر قرآن کے الفاظ کو جو معانی جی چاہیں آپ پہنا دیجئے نفس کی خواہشات بھی پوری ہوتی رہیں گی اور آپ اپنے آپ کو عامل بالقرآن بھی کہہ سکیں گے۔

شیطان کی بالواسطہ مدد

منکرین حدیث نے یہی کچھ کیا۔ دراصل ان لوگوں نے شیطان کا کام بڑا آسان کر دیا، شیطان کو بڑی دردسری کرنی پڑتی تھی ہر ہر نیک کام کے لیے فرداً فرداً ہر ایک کو روکنا پڑتا تھا، کبھی نماز سے روک رہا ہے کبھی زکوٰۃ سے جان بچانے کے حربے سکھا رہا ہے کبھی صدقہ وخیرات

سے جی چرانے کے لیے فقر وعسرت کے ڈراوے دیتا پھر رہا ہے غرض بھلے نیک کام ہیں سب سے روکنے کے لیے اسے علیحدہ علیحدہ محنت کرنی پڑتی تھی اسی طرح ہر برائی کی طرف رغبت دلانے کے لیے اسے ہر بار جدوجہد کرنا پڑتی تھی انہی ذریت کی پوری فوج اس نے لگائی ہوئی تھی ۔ اس کے باوجود بھی شیطان بے چارے کی مشکل یہ تھی کہ ایک انسان نے اس کے بہکانے پر ایک بار نماز نہ پڑھی دو بار نہ پڑھی لیکن کبھی نہ کبھی اسے خیال آ ہی جاتا تھا کہ آخر مسلمان ہوں آخرت پر یقین رکھتا ہوں اللہ کے سامنے جوابدہی کا وقت آئے گا تو کیا کروں گا وہ پھر نماز شروع کر دیتا تھا شیطان کو پھر از سرِ نو اسے بہکانا پڑتا تھا۔ بڑی مشکل میں پھنسا ہوا تھا بے چارہ منکرین حدیث نے اس کی مشکل حل کر دی۔ انہوں نے اس درخت کو ہی جڑ سے اکھیڑ پھینکا جس سے نماز روزے زکواۃ اور دیگر شرعی احکام کی شاخیں پھوٹتی تھیں۔

ع وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

انہوں نے احادیث کا انکار کر دیا جو قرآنی کلیات کی تفصیلات کو بیان کرتی تھیں جو قرآن کے مجمل احکام کی تفسیر تھیں، جو قرآن کے ایجاز و اجمال کی شرح تھیں، جو قرآنی آیات کے صحیح صحیح معانی کی تعیین کرتی تھیں، جو احکامِ الٰہی کی تعمیل کا طریقہ بتلاتی تھیں جو دین کے اصولی اوامر و نواہی کا مکمل ڈھانچہ تشکیل دیتی تھیں انکار حدیث کے بعد اب دین موم کی گڑیا بن گیا جس طرح چاہا اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا شریعت کی ساری پابندیوں سے چشم زدن میں جان چھوٹ گئی شیطان کا کام آسان ہو گیا اب ہر ہر کام کے لیے علیحدہ علیحدہ محنت کی ضرورت نہ رہی جس کو دین سے ہٹانا مقصود ہوا اسے ورغلا بہکا کر منکرین حدیث کے پیچھے لگا دو بس پھر کام ختم ۔

دشمنانِ اسلام کو تقویت

انکار حدیث کا سب سے زیادہ فائدہ دشمنانِ اسلام کو پہونچا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ امت مسلمہ کے لیے ایک نقطۂ اتحاد کی حیثیت رکھتا ہے، یہ ایسا محور و مرکز ہے کہ ہر قسم کے اختلافات یہاں پہونچ کر دم توڑ دیتے ہیں اور اس حقیقت میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ

ملّتِ اسلامیہ کی قوت کا راز اسی نقطۂ اتحاد اور اسی محور و مرکز میں منحصر ہے۔ انکارِ حدیث سے اس نقطۂ اتحاد پر زبردست ضرب لگی انتشار کی راہیں کھل گئیں، دین کا عملی نمونہ ہی سامنے نہ رہے تو دین کی جو تعبیر چاہے کرے۔ مرکز و محور سے ہٹنے کے بعد انتشار ہی انتشار اور افتراق ہی افتراق باقی رہ جاتا ہے اور دشمنانِ اسلام اسی کے خواہاں ہیں منکرین حدیث نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی۔ یہ اتحاد ہی تھا جس کی قوت کے سہارے اُمتِ مسلمہ نے دشمنانِ اسلام کو کبھی سر اُٹھانے کا موقع نہ دیا۔ دشمن اگر کسی چیز سے خائف رہتے تھے تو صرف اس امت کے جذبۂ اتحاد سے وہ تو خدا سے چاہتے تھے کہ کسی طریقے سے یہ امت انتشار کا شکار ہو جائے جو کام دشمنانِ اسلام سے صدیوں میں نہ ہو سکا وہ ان منکرین حدیث نے ان کے لیے انجام دے دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ایک قاصد اور ڈاکیئے کی حیثیت دے دی گئی تو پھر رہ کیا گیا۔

بہرحال گفتگو اس پر تھی کہ انکارِ حدیث سے ان منکرین حدیث کا مقصود قرآن کریم کا اتباع نہیں ہے جیسا کہ یہ دعویٰ کرتے ہیں بلکہ ان کا مقصد محض مذہب کی گرفت ڈھیلی کرنا ہے تاکہ یہ من مانی کر سکیں اور کوئی اعتراض کی انگلی تک ان کی طرف نہ اٹھا سکے۔

علمی سطح پر تو اللہ تعالےٰ نے علمائے حق کے ہاتھوں ان لوگوں کو ایسا رسوا کیا کہ یہ کہیں بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہے لیکن ان لوگوں نے اب دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔ اب ان کا نشانہ دین سے ناواقف سادہ لوح مسلمان ہیں۔ اپنے ذہنوں کی گندگی یہ لوگ خوبصورت الفاظ کے ریشمی رومالوں میں لپیٹ لپیٹ کر پیش کرتے ہیں سادہ لوح مسلمان بے چارے چونکہ پوری طرح دین سے واقفیت نہیں رکھتے آسانی سے ان کے دھوکے میں آجاتے ہیں۔

اصل روپ کہتے ہیں کہ ہم سے زیادہ تو قرآن پر عمل کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں، ہم سب کچھ بس قرآن کو سمجھتے ہیں جو قرآن کہہ دے بس وہی درست ہے، قرآن کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی دوسری چیز کی ضرورت ہی نہیں، قرآن ایک جامع کتاب ہے۔ ظاہر نظر میں یہ باتیں بڑی حسین نظر آتی ہیں، عام آدمی کے سامنے جب یہ باتیں

خطیبانہ انداز میں کہی جاتی ہیں تو فوراً ان کے دل و دماغ کو متاثر کرتی ہیں کون مسلمان ایسا ہے جو یہ کہے گا کہ قرآن ایک جامع کتاب نہیں یا قرآن جو کہتا ہے وہ غلط بھی ہو سکتا ہے لیکن ایک سادہ لوح عام مسلمان بے چارے کو کیا پتہ کہ ان خوبصورت الفاظ کی تہہ میں ان منکرین حدیث نے خود تراشیدہ معانی و مفاہیم کا کیسا زہر گھولا ہوا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ ان الفاظ کے پردے میں دراصل یہ لوگ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کو لے کر جیسے چاہو اپنے معانی پہنا دو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا، احکام قرآنی پر جس طرح عمل کر کے دکھایا، قرآنی نظام پر مبنی جس طرح ایک مکمل معاشرہ قائم کر کے دکھایا ان سب کو ایک طرف رکھ دو، قرآن کو سمجھنے کے لیے ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی کوئی ضرورت نہیں، ہم مہبطِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کے بغیر ہی قرآن کو سمجھ سکتے ہیں جس طرح رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اپنی زندگی پر منطبق کر کے دکھایا اسی طرح ہم بھی اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق موجودہ زندگی پر قرآن کو منطبق کر سکتے ہیں، ان احمقوں کے ذہن میں اتنی بات بھی نہ آسکی کہ رسول برحق کا انطباق وحی الٰہی کی روشنی میں تھا جس میں خطا کا کوئی امکان ہی نہیں اور تمہارا انطباق تمہاری اپاہج عقل کے مطابق ہوگا جو ازل سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی چلی آرہی ہے۔ کہتے ہیں اور ایسا کہتے ہوئے ان عامل بالقرآن کا دعویٰ کرنے والوں کو شرم بھی نہیں آتی کہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض ایک قاصد اور ڈاکیئے کی ہے، جس طرح ڈاکیے اور قاصد کا کام مکتوب الیہ تک خط کا پہونچا دینا ہے اور بس، اسی طرح اللہ کا پیغام پہونچا دینے کے بعد نبی کا کام ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد اسے لوگوں سے کچھ کہنے سننے کا حق باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہونچا دینے کے بعد نبی کی حیثیت ایک عام انسان کی ہوتی ہے گویا نبی اور امتی سب برابر ہو جاتے ہیں۔

العیاذ باللہ یہ منصب نبوت کے ساتھ کیسا دیدہ دلیرانہ استہزا اور کس قدر احمقانہ تمسخر ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی تو تسلیم کریں مگر آپ کے اقوال اور آپ کے افعال کو حجت نہ تسلیم کریں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ کہہ رہے ہوں کہ ہم آپ کو اپنا مقتدا اور پیشوا تو

مانتے ہیں مگر آپ کی کوئی بات ماننے کو ہم تیار نہیں آپ اللہ کی کتاب ہم تک پہونچانے آئے تھے وہ فریضہ ادا ہو چکا اب آپ کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے بھی ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہمیں بھی اللہ نے عقل دی ہے ہم خود سمجھ لیں گے۔ کیسا رکیک دعویٰ ہے، کتنا بدیہی البطلان مشرب ہے۔

منصب نبوت کے ساتھ یہ یقیناً کھلا ہوا استہزاء اور تمسخر ہے مگر عام سادہ لوح مسلمانوں کے سامنے اپنے اس دعوے کو اگر صاف صاف لفظوں میں کہیں تو قبول کرنا تو بہت دور کی بات ہے ان کے لعن طعن کا نشانہ بننا پڑتا ہے اس لیے ان کے سامنے وہی کچھ کہتے ہیں جو تفصیل کے ساتھ ابھی بتلایا جا چکا ہے کہ قرآن کے بعد ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں وغیرہ وغیرہ۔

حدیث کی حفاظت میں شک کا اظہار

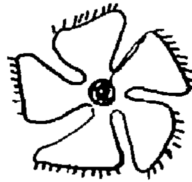
اسی طرح یہ منکرین حدیث عام سادہ لوح مسلمانوں کو کبھی یہ کہہ کر دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ احادیث محفوظ نہیں ہیں اس لیے قابل اعتماد نہیں رہیں مقصود اس کہنے سے بھی ان کا وہی ہے کہنا تو دراصل یہ چاہتے ہیں کہ دین کا وہ مکمّل نقشہ جو قرآن اور حدیث کی روشنی میں تیار ہوتا ہے اس پر عمل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں، ہم آزادی کے دلدادہ ہیں اور قرآن حدیث کے ساتھ مل کر ہمیں پابند بناتا ہے، ہم موجودہ دَور کے چمکیلے تقاضوں سے مرعوب ہیں اور ہم میں اتنی صلاحیت نہیں کہ ان تقاضوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں اس لیے ہم اسلام کو ان تقاضوں کے مطابق بدل دینا چاہتے ہیں۔ کہنا تو فی الحقیقت یہی سب کچھ چاہتے ہیں، یہ اور اسی قسم کے دیگر مزخرفات، مگر کھلم کھلا کیسے کہیں، اتنی جرأت کہاں سے لائیں کہ اس قسم کی باتیں کر کے لوگوں سے گالیاں کھائیں اور چند روز میں اپنی موت آپ مر جائیں لہٰذا ہیر پھیر کر کے کہتے یہ ہیں کہ احادیث کتابی صورت میں ایک عرصۂ دراز کے بعد مدوّن ہوئیں اس سے پہلے عہد نبوی میں اور صحابہ کے دَور میں محض زبانی طور پر نقل در نقل کا سلسلہ رہا اور ظاہر ہے زبانی نقل در نقل کے ذریعے الفاظ حدیث کا بعینہٖ محفوظ رہنا فطرۃً اور عادۃً ”محال ہے اور جب الفاظ محفوظ نہیں تو معانی کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں اس لیے احادیث کے ذخیرہ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور ناقابلِ اعتماد مواد پر دین کی بنیاد نہیں

رکھی جا سکتی نتیجتہً حدیث کا سارا ذخیرہ مسترد۔
دیکھا آپ نے کیسا خوبصورت طرز استدلال ہے سیدھے سادے مسلمان بے چارے کیا جانیں کہ یہ سب لفاظی ہے خلاف واقعہ ہے اور محض خود فریبی اور دھوکہ دہی ہے۔
حیرت کی بات ہے کہ تاریخ کے ذخائر اور مختلف فنون سے متعلق تجربات وتحقیقات تو ان کے لیے قابل اعتماد ہیں جو ناقص ترین ذرائع اور کمزور ترین وسائط کے ذریعے ان تک پہونچے ہیں لیکن فخر دوجہاں سرورکون ومکاں کے وہ فرمودات اور وہ اعمال وافعال ان کے نزدیک قابل اعتماد نہیں جن کو قرآن اپنی زبان میں اسوۂ حسنہ کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے جن پر بے قیل وقال عمل کرنا صحابہ باعث فخر سمجھتے رہے ہیں جن کو چودہ سو سال سے پوری امت مسلمہ حرز جاں بنائے ہوئے ہے جن کا عملی نمونہ بڑے بڑے اولیاء امت، محدثین، مفسرین اور بزرگانِ دین کی زندگیوں کی شکل میں ہر دور میں موجود رہا ہے کتنی عجیب بات ہے کہ رطب ویابس کا وہ مجموعہ تو ان کے نزدیک معتمد ٹھہرے جو کسی مورخ نے سنی سنائی باتوں اور قیاسات پر مبنی شہادتوں کی بنیاد پر صدیوں بعد صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہو اور احادیث کا وہ ذخیرہ غیر معتمد قرار پائے جو ایسے طریقوں اور ایسے راستوں سے ہم تک پہونچا ہو جو انتہائی ثقہ اور قابل اعتماد ہیں جو نقد وجرح کی ایسی چھلنیوں سے چھن کر ہمارے ہاتھوں تک آیا ہو کہ اس سے بہتر نقد وجرح کا کوئی معیار مقرر کرنے سے انسانی فکر عاجز ہے جس کو ہر زمانے میں ایسی جماعت روایت کرتی چلی آئی ہو جن کا عقلاً بھی جھوٹ پر متفق ہونا محال ہے۔

ع بریں عقل و دانش بباید گریست

انتہائی لغو ہے منکرین حدیث کا یہ دعویٰ کہ احادیث کا ذخیرہ محفوظ نہیں رہا۔ عام سیدھے سادے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ احادیث بھی الحمدللہ حجیت دین کے اعتبار سے اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح قرآن محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن کریم کی حفاظت فوق العقل طریقے سے کی اسی طرح احادیث کی حفاظت کا بھی اللہ تعالے نے ہی ایسا اہتمام فرمایا جو فی الواقع عقل کے لیے انتہائی حیران کن

ہے۔ اس کے بعد بھی جو شخص حفاظتِ حدیث میں شک کرتا ہے اس کی عقل میں کلام ہے حفاظت حدیث کا انکار فی الحقیقت حفاظت قرآن کا انکار ہے اور حفاظت قرآن کا منکر وعدۂ الٰہیہ کا منکر ہے کیوں کہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم ہی نے ذکر اتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اور ذکر کے مفہوم میں قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث بھی شامل ہے جہاں یہ آیت قرآن کریم کے سلسلے میں اللہ تعالےٰ کی ذمہ داری کو بیان کرتی ہے وہاں یہ آیت یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ احادیث نبوی کی حفاظت کو بھی اللہ نے اپنی ذمہ داری میں لیا ہوا ہے جیسا کہ انشاء اللہ ابھی ثابت ہوا جاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں گفتگو کی ابتدا حفاظت حدیث ہی کے موضوع پر ہونے لگی ہے مناسب یہی ہے کہ سب سے پہلے حفاظت حدیث کا یقینی ہونا واضح کر دیا جائے حدیث کے بارے میں دیگر تمام شکوک وشبہات کا تفصیلی جائزہ انشاء اللہ بعد میں لیا جائے گا۔



حدیث
اور
حفاظتِ خداوندی

قرآن کی یہ آیت جس کا ابھی حوالہ دیا گیا یا اسی قسم کی دیگر آیات جن میں حفاظت قرآن کا ذکر ہے وہ صرف قرآن ہی پر صادق نہیں آتیں قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث پر بھی صادق آتی ہیں اللہ نے جس طرح قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اسی طرح حدیث کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا ہے جو شخص یہ کہتا ہے کہ احادیث محفوظ نہیں وہ گویا یہ کہتا ہے کہ قرآن محفوظ نہیں اور جو قرآن کی حفاظت کا انکار کرتا ہے وہ فی الحقیقت ان آیات قرآنی کا منکر ہے جن میں اللہ تعالےٰ نے تاکیدی انداز میں یہ فرمایا کہ میں نے ہی یہ کلام اتارا ہے اور میں ہی اس کا محافظ ہوں اور منکر قرآن کے بارے میں ہر شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کیا حکم لگایا جا سکتا ہے ایسے لوگ ہمارے مخاطب نہیں، وہ جانیں اور اللہ جانے، ہمارا خطاب دراصل ان ناواقف مسلمان بھائیوں سے ہے جو منکرین حدیث کے دھوکے میں آ کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ احادیث واقعی محفوظ نہیں اس لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ان پر یہ ثابت کر دیا جائے کہ جس طرح قرآن کو اللہ نے محفوظ رکھا ہے اسی طرح حدیث کو بھی اللہ ہی نے محفوظ رکھا ہے تو امید ہے وہ حق کو پہچان کر اس کو قبول کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔

قرآن اور حدیث دونوں اللہ کی حفاظت میں

اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون میں الذکر کے معنی قرآن کے ہیں یعنی اللہ تعالےٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ الذکر کو قرآن کے معنی میں لینے پر ان لوگوں کا بھی اتفاق ہے جو حدیث کے منکر ہیں، اختلاف یہاں آ کر

ہوتا ہے کہ ہم کہتے ہیں الذکر کے مفہوم میں حدیث بھی شامل ہے کیونکہ قرآن کی حفاظت اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک حدیث کی حفاظت نہ ہو اس لیے جب قرآن یہ کہتا ہے کہ قرآن کی حفاظت اللہ کے ذمہ ہے تو فی الحقیقت یہ کہتا ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں کی حفاظت اللہ کے ذمے ہے۔ منکرین حدیث اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ الذکر سے مراد صرف قرآن ہے اور صرف اسی کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے چنانچہ وہ ہم تک محفوظ پہونچ گیا حدیث کی حفاظت کا ذمہ ہی اللہ نے نہیں لیا اس لیے وہ محفوظ نہ رہ سکی۔

اب ہمیں ثابت یہ کرنا ہے کہ الذکر کے مفہوم میں قرآن اور حدیث دونوں کی ایک ساتھ حفاظت شامل ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے منکرین حدیث ذرا چند سوالوں کا جواب دیں:

چند سوال سب سے پہلے منکرین حدیث یہ بتائیں کہ احادیث تو غیر محفوظ ہونے کی بنا پر قابلِ اعتماد نہیں رہیں تو پھر آپ کو یہ یقین کس ذریعے سے حاصل ہوا کہ قرآن محفوظ ہے بلکہ اس سے بھی پہلے یہ بتائیے کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ ذرا سوچئے آپ کے پاس ان دونوں سوالوں کا اس کے سوا کیا جواب ہے کہ حدیث کے ذریعے سے معلوم ہوا[1] مگر حدیث تو آپ کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن بھی قابلِ اعتماد نہیں؟ خدارا کچھ تو سوچیے آپ حدیث کو نہیں مانیں گے تو قرآن کو کیسے مانیں گے۔

---

[1] اس موقعہ پر بعض منکرین حدیث متواتر اور غیر متواتر کی بحث میں پناہ لینے کی کوشش کیا کرتے ہیں مگر انشاء اللہ اس پناہ گاہ سے بھی انہیں راہِ فرار اختیار کرنا پڑے گی ہم حجیت حدیث کے موضوع کے تحت اس پر بھی انشاء اللہ تفصیلی روشنی ڈالیں گے اور ان کے اس فریب کا پردہ بھی چاک کریں گے۔

ذرا یہ بھی تبلائیے کہ قرآن کریم جس صورت اور جس شکل میں اس وقت میرے اور آپ کے ہاتھ میں نظر آرہا ہے کیا آسمان سے یہ اسی کتابی صورت میں نازل ہوا تھا؟ ظاہر ہے آپ کہیں گے "نہیں"، ہم بھی کہتے ہیں نہیں، تو یہ "نہیں" کس علم کی بنیاد پر ہے۔ یہ بات آپ کس علم کے ذریعے سے بتاتے ہیں کہ قرآن اس کتابی صورت میں آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے تیئیس^{۲۳} سال کی مدت میں نازل ہوا۔ یہ تیئیس سال میں نزولِ قرآن کی تکمیل کی مدت کس آیت قرآنی سے معلوم ہوئی، اس مدت کا ذکر اور نزول کی اس کیفیت کا بیان قرآن میں کس جگہ ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ سب کچھ ہمیں، آپ کو اور پوری دنیا کو احادیث سے اور صرف احادیث سے پتہ لگا پھر احادیث کو محفوظ و معتمد مانے بغیر ان باتوں کی صحت کا یقین آپ کہاں سے حاصل کریں گے۔ اسی طرح ذرا سوچئے کیا قرآنی آیات اسی ترتیب سے آسمان سے نازل ہوئی تھیں جس ترتیب سے اب تلاوت کی جاتی ہیں اور کتاب اللہ میں ہمیں ملتی ہیں، یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ قرآنی آیات کی نزولی ترتیب یہ نہ تھی قرآن کی سورتوں اور قرآن کی آیتوں کی موجودہ ترتیب بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قائم کی گئی آپ کے اس عمل کا پتہ کس ذریعے سے لگا آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی بھی نازل ہوتی آپ اسے کاتبین وحی کے ذریعے لکھوالیا کرتے، آپ نے کیسے جانا کہ وہ کاتبین وحی کون کون لوگ تھے، آپ کے علم میں یہ بات کس طرح آئی کہ قرآن کریم ابتدا میں متفرق اجزا پر لکھا ہوا تھا، پتھر کے ٹکڑوں پر درختوں کے پتوں پر جانوروں کی ہڈیوں پر اور سوکھی ہوئی کھالوں کے قطعات پر۔ یہ سب باتیں آپ کو کس واسطے سے پہونچیں، اگر یہ واسطہ حدیث کا نہیں تھا جس کو آپ غیر محفوظ سمجھتے ہیں تو ذرا بتلایا جائے پھر وہ کونسا واسطہ تھا جو آپ کے نزدیک حدیث کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہے۔

---

^لہ ممکن ہے بعض منکرین حدیث کہیں کہ یہ تاریخی امور ہیں اور تاریخی امور میں حدیث

یہ تمام سوال ہمارے اس دعوے کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ احادیث کی حفاظت کے بغیر قرآن کی حفاظت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تاہم اصل مبحث کی طرف لوٹتے ہوئے ہم یہ ثابت کرنے لگے ہیں کہ قرآن کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اللہ نے حدیث کی حفاظت کا ذمہ بھی خود ہی لیا ہے ؎

قرآن صرف الفاظ کا نام نہیں

محولہ بالا آیت میں الذکر سے مراد قرآن ہے تو آیئے ذرا اس کا جائزہ لیں کہ قرآن کسے کہتے ہیں کیا قرآن صرف الفاظ کا نام ہے یا الفاظ اور معانی کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ تمام اہل علم اس پر متفق ہیں کہ قرآن نہ صرف الفاظ قرآنی کا نام ہے اور نہ صرف معانی قرآنی کا بلکہ دونوں کے مجموعے کو قرآن کہا جاتا ہے۔ آپ خود ہی سوچئے اگر کوئی شخص قرآن کریم کے متفرق الفاظ اور جملے لے کر ایک مقالہ یا رسالہ یا کوئی کتاب اپنے کسی پسندیدہ موضوع پر لکھ دے مثلاً سیاست پر، تاریخ پر، فلسفہ پر یا کسی بھی مذہبی یا غیر مذہبی موضوع پر کوئی تحریر مرتب کرے اور اس میں یہ اہتمام کرے کہ اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے الفاظ تمام کے تمام

(گذشتہ سے پیوستہ) ہمارے نزدیک بھی حجت ہو سکتی ہے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ باتیں تاریخی امور ہونے کے باوجود انتہائی بنیادی ہیں کہ ان کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ کیے بغیر خود قرآن کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ ممکن نہیں جو صرف تاریخی امور ہی کا نہیں تمام احکام دین کا منبع ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا اصل سوال تو یہ ہے کہ یہ احادیث بھی انہی اسانید کے ذریعے سے ہم تک پہونچی ہیں جن کے ذریعے سے ہم تک وہ احادیث پہونچی ہیں جو حلال و حرام والی آیات قرآنی کی تفسیر و تشریح کرتی ہیں اگر یہ اسانید قابل اعتماد نہیں تو دونوں جگہ انہیں قابل اعتماد نہ ہونا چاہیئے اور اگر یہ اسانید قابل اعتماد ہیں تو ان کے ذریعے سے پہونچی ہوئی بعض احادیث کو غیر محفوظ کہنے کا کیا مطلب ؟

وہ استعمال کرے جو قرآن نے استعمال کیے ہیں کوئی ایک لفظ بھی قرآن سے باہر کا نہ آنے دے تو ایسے کسی مقالے یا رسالے کو یا کسی کتاب کو کیا آپ قرآن کہنے پر تیار ہوں گے؟ یا اسی طرح کسی ایسی کتاب کو کیا آپ قرآن کہہ سکیں گے جو تمام تر مضامین قرآنیہ پر مشتمل ہو لیکن اس کے الفاظ اور ان کی ترتیب بناوٹ اس کتاب کی اپنی ہو جیسا کہ اسلامی تصانیف کہ ان میں عموماً معانی اور مضامین قرآن ہی کے بیان کیے جاتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ نہ پہلی قسم کی کتاب قرآن کہلائی جا سکتی ہے نہ دوسری قسم کی تصانیف کو ہم قرآن کہہ سکتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ قرآن نہ صرف الفاظ کا نام ہے نہ صرف معانی کا، قرآن نام ہے اس مصحف ربانی کا جو الفاظ اور معانی دونوں کا مجموعہ ہے۔

فقہا جب فقہ کے مآخذ بیان کرتے ہوئے قرآن پر بطور ماخذ فقہ بحث کرتے ہیں تو قرآن کی تعریف بتلاتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ قرآن نظم اور معنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ مسائل فقہ کا استنباط کرنے کے لیے قرآن کے نظم اور معنی یعنی قرآن کے الفاظ اور ان کے معانی دونوں کا لحاظ رکھنا لازمی ہے اس کے بغیر مسائل کا استنباط ممکن ہی نہیں۔

اس کے علاوہ ذرا اس پر بھی غور کیجیے کہ الذکر کا لفظ جس سے ہم قرآن مُراد لے رہے ہیں لغت میں کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لغت پر منکرین حدیث کو بہت زیادہ اعتماد ہے۔ اسی لغت کی طرف ذرا رجوع کیجیے، الذکر کے لغوی معنی نصیحت کے بھی ہیں۔ قرآن میں بھی جا بجا یہ لفظ نصیحت کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ اَنْزَلْنٰهُ (۲۱-۵۰) اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل کیا یا سورہ صٓ کی پہلی آیت ہے صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ یہ قرآن تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے نصیحت ہے۔

اب یہ بتلایئے کہ کیا الفاظ کے کسی ایسے مجموعے سے نصیحت حاصل کی جا سکتی ہے جس کے کوئی معنی نہ ہوں۔ معمولی سے معمولی عقل رکھنے والا بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ نصیحت کا حصول انہی الفاظ سے ممکن ہے جو معانی رکھتے ہوں، مہمل الفاظ حصول نصیحت کے لیے مفید نہیں۔ اگر یہ بات درست ہے اور یقیناً درست ہے تو اللہ تعالے کا قرآن کو ذکر کے لفظ سے تعبیر کرنا

خود بتلا رہا ہے کہ قرآن الفاظ اور معانی دونوں کے مجموعے کا نام ہے یہ تو ایک حقیقت ہے جس پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں ۔ ایک عام آدمی بھی اتنی بات سمجھتا ہے کہ محض الفاظ کوئی حقیقت نہیں رکھتے "الفاظ اور معانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے" الفاظ اور معانی جسم اور جان کی طرح ہیں ۔ جس طرح رُوح کے بغیر جسم بیکار ہے اور جسم کے بغیر رُوح کا وجود متصور نہیں ہو سکتا اسی طرح معانی کے بغیر الفاظ بے کار ہیں اور الفاظ کے بغیر معانی کا کوئی وجود نہیں ۔ لہٰذا ثابت ہُوا کہ الفاظ اور معانی قرآن کے دو رکن ہیں اور ایسے لازم و ملزوم دو رکن کہ ایک کے بغیر دُوسرے کا وجود ہی باقی نہیں رہتا ۔

یہ حقیقت سمجھ لینے کے بعد کہ قرآن الفاظ اور معانی دونوں کے مجموعے کا نام ہے اتنی بات اور ذہن نشین رکھیے کہ قرآن کے معانی الفاظِ قرآنی سے جدا ایک علیحدہ حیثیت کے بھی حامل ہیں وہ اس طرح کہ قرآن کے معانی سمجھانے کے لیے ظاہر ہے متکلم کو ایسے نئے الفاظ استعمال کرنا پڑیں گے جو الفاظِ قرآنی کے علاوہ ہوں یہ ناممکن ہے کہ قرآنی الفاظ کے معانی سمجھانے کے لیے آپ پھر انہی الفاظ کو دھرا دیں اور آپ کا مخاطب معانی پر مطلع ہو جائے مثال کے طور پر کوئی شخص کہتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی آیت اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کے معانی بتلایئے تو آپ اس شخص کے جواب میں اسی آیت کو دوھرا کر' دو بارہ تلاوت کر کے مخاطب کو مطمئن نہیں کر سکتے آپ یہ دعوی نہیں کر سکتے کہ آپ نے آیت کے معانی بتلا دئیے جب تک کہ آپ اس مقصد کے لیے قرآنی آیت کے علاوہ کوئی اور کلام نہ کریں اور اپنے الفاظ میں آیت کے معانی اپنے مخاطب کو نہ سمجھائیں ۔

حدیثِ نبوی قرآن کا بیان ہے

ان دو مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد کہ قرآن الفاظ و معانی کے مجموعے کا نام ہے اور قرآنی الفاظ کے معانی بیان کرنے کے لیے متکلم کو اپنے الفاظ کی ضرورت ہے اس مسلّمہ حقیقت کو ذہن میں اُجاگر کیجیے کہ حدیثِ نبوی قرآنی الفاظ کے معانی ہی کا نام ہے' حدیثِ نبوی قرآن کا بیان ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال وہ افعال اور وہ تقریرات[1] جن کو محدثین کی

---

[1] محدثین نے احادیثِ نبوی کو بنیادی طور پر تین قسموں پر منقسم کیا ہے' قولی' فعلی' اور تقریری (باقی اگلے صفحہ پر)

اصطلاح میں حدیث یا سنّت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے دراصل مجملاتِ قرآنی کی تفصیل ہیں۔ حدیثِ نبوی یا سنتِ نبوی فی الحقیقت مبہماتِ قرآنی کی وضاحت ہے، مشکلاتِ قرآنی کی تفسیر ہے، مخفیاتِ قرآنی کے لیے اظہار کے مقام پر ہے اور کفایاتِ قرآنی کے لیے تصریح کا کام دیتی ہے۔

ان وضاحتوں کے بعد ہمارے اس دعوے کی حقانیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ نے قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کی حفاظت کا ذمّہ بھی لیا ہے۔ معانی قرآنی کی حفاظت کے بغیر الفاظ قرآنی کی حفاظت بے معنی ہے یعنی حدیث کی حفاظت کے بغیر قرآن کی حفاظت ممکن ہی نہیں۔ اس لیے جب ہمیں یہ خبر دی جاتی ہے کہ قرآن کی حفاظت اللہ کے ذمّے ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآنی الفاظ اپنے معانی سمیت اللہ کی حفاظت میں ہیں یعنی قرآن احادیثِ نبوی سمیت اللہ کی زیرِ حفاظت ہے۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن تو محفوظ ہے مگر حدیث محفوظ نہیں تو گویا وہ یہ کہتا ہے کہ قرآن کے الفاظ تو محفوظ ہیں اس کے معانی محفوظ نہیں اور الفاظ کی حفاظت معانی کے بغیر بے کار ہے تو قرآن محفوظ کہاں رہا اسی لیے ابتدا میں جو کہا گیا تھا وہ بالکل درست تھا کہ حدیث کی حفاظت کا انکار کرنے والا دراصل قرآن کی حفاظت کا انکار کرتا ہے اور جو شخص حفاظت قرآن کا انکار کرتا ہے وہ فی الحقیقت ان آیاتِ قرآنی کا منکر ہے جن میں یہ خبر دی گئی ہے کہ قرآن کی حفاظت اللہ کے ذمّے ہے۔

کیا منکرین حدیث کو اب بھی اس حقیقت میں کوئی شبہ ہے کہ قرآن کی طرح حدیث بھی اللہ ہی کے زیرِ حفاظت ہے۔ ممکن ہے منکرین حدیث اب بھی اس پر اصرار کریں کہ آپ

(گذشتہ سے پیوستہ)
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو کچھ اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا اس کی روایت حدیث قولی کہلائی، جو کچھ امت کے سامنے آپؐ نے کرکے دکھایا اس کی روایت کو حدیث فعلی سے تعبیر کیا گیا اور آپ کے سامنے صحابہ نے کوئی عمل کیا اور اس پر آپؐ نے منع نہیں فرمایا تو اس واقعہ کی روایت کو محدثین نے حدیث تقریری کا نام دیا۔

کی یہ ساری بحث تو اس بنیاد پر ہے کہ الذکر سے قرآن اور حدیث دونوں مراد ہیں جب کہ ہم اس بنیادی بات ہی کو نہیں مانتے ہمارے نزدیک تو الذکر سے مراد قرآن ہے اور اللہ نے صرف اسی کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے ۔ اس اصرار کے جواب میں منکرین حدیث کو ہم قرآن کی وہ آیات یاد دلانا چاہتے ہیں جن میں اللہ تعالےٰ نے قرآن اور شرح و بیان قرآن یعنی حدیث دونوں کو جدا جدا ذکر کر کے یہ بتلایا کہ ان دونوں کی حفاظت ہمارے ذمے ہے ۔ ذرا سورۃ القیامۃ کی سولہویں سے لے کر انیسویں تک کی آیات کو ذہن میں تازہ کیجئے ۔ ارشاد ربانی ہے :

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝

(القیمۃ : ۱۶ - ۱۹)

ترجمہ : (اے پیغمبر) اس (قرآن) کو لینے کے لیے اپنی زبان نہ ہلاؤ جلدی نہ کرو ہمارے ذمے ہے اس قرآن کا (آپ کے سینے میں) جمع کر دینا اور آپ کی زبان سے اسے پڑھوانا ۔ جب ہم اس قرآن کو پڑھیں تو آپ صرف سنتے رہیئے پھر ہمارے ہی ذمے اس قرآن کا بیان بھی ہے ۔

ابتدائے زمانۂ نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ نزولِ وحی کے وقت وحی الٰہی کے الفاظ کو یاد رکھنے کے لیے بار بار زبان مبارک سے رٹتے جاتے اور تکرار فرماتے جاتے تاکہ ذہن میں الفاظ وحی جم جائیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مشقت سے بچانے کے لیے پہلے تو فرمایا کہ اس تکرار لسانی سے کام نہ لیجئے پھر تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اس کلام کا آپ کے ذہن میں محفوظ کر دینا اور پھر آپ کی زبان پر اس کو جاری کر دینا یہ ہمارے ذمّے ہے آپ اس فکر میں نہ پڑیئے کہ کہیں کوئی لفظ یاد سے محو نہ ہو جائے آپ تو بس اطمینان سے سُنا کیجیے ۔

یہاں تک تو الفاظ وحی کے بارے میں اطمینان دلایا گیا کہ ان کو بلا کم و کاست سینۂ نبوت میں اتارہ دینا اور محفوظ کر دینا اللہ کی ذمہ داری میں ہے ظاہر ہے پیغمبر کو حرکت زبان سے منع کرنا حق تعالےٰ کا قرأت قرآن کو اپنی طرف منسوب کرنا اور پیغمبر کا اسے سنتے رہنا ان تمام باتوں کا تعلق الفاظ ہی سے ہو سکتا ہے معنیٰ اسے نہیں ، معنیٰ نہ رٹنے کی چیز ہے نہ قرأت کی اور نہ سننے کی ۔

اس کے بعد الفاظ وحی کے معانی و بیان اور ان کی اصل مُراد کو واضح کر دینے کے بارے میں تسلّی دی کہ ان کا ذمہ بھی خود اللہ تعالےٰ ہی نے لیا ہے۔ فرمایا ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ یعنی پھر اس قرآن کا بیان بھی ہمارے ہی ذمّے ہے۔ اب آپ خود غور کیجئے یہ بیان قرآن کیا چیز ہے؟ ظاہر ہے یہ اس قرآت کے علاوہ ہی کوئی چیز ہو سکتی ہے جس کا ذمہ اس آیت سے متصل سابقہ آیات میں لیا گیا تھا ورنہ اس آیت کے اضافے کی ضرورت ہی نہ تھی یہاں[لے] یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ ثم ان علینا بیانہ میں بیان سے مُراد انہی الفاظ قرآنی کو سُنا دینا ہے اس لیے کہ

لے ایک مقام پر اللہ تعالےٰ نے بیانِ قرآن کی حیثیت کو الفاظ قرآنی سے علیحدہ کر کے اس طرح واضح کیا وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْہِمْ وَلَعَلَّہُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ۔ النحل : ۴۴ (ہم نے تمہاری طرف یہ ذکر (یعنی قرآن) آتارا تاکہ تم لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کر دو جو کچھ ان کی طرف آتارا گیا تاکہ وہ غور کر سکیں) اس آیت میں ذکر یعنی قرآن اور اس کا بیان دونوں جدا جدا حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک اور مقام پر اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بیانِ قرآن کی علیحدہ حیثیت واضح کی گئی۔ ارشاد ہے وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَہُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْہِ۔ النحل : ۶۴

(ہم نے آپ پر کتاب بس اسی لیے نازل کی ہے کہ جس امر میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں آپ اس کو ان پر واضح کر دیں) ظاہر ہے یہ جھگڑا یا تو خود قرآن کے بارے میں ہوگا کہ کسی آیت کے معنیٰ میں اختلاف پڑ جائے یا معاملات میں ہوگا جس میں ہر فریق خود کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے قرآن ہی سے سند لاتا ہو دونوں کا علاج بیانِ رسول بتلایا گیا جو دو مختلف جہتوں میں صحیح جہت کو متعین کر دے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب یہ بیان رسول اس قرآن سے الگ ہو اگر وہ بعینہٖ وہی قرآن ہو تو جب لوگوں نے خود اسی میں جھگڑا ڈالا ہوا ہے تو اسی کو دوبارہ سُنا دینے سے جھگڑا کیسے طے ہو سکے گا لہٰذا نبی کے بیان کو قرآن کے علاوہ ہی ایک حقیقت ماننا پڑے گا۔

الفاظ کے سنا دینے کو بیان نہیں کہتے قرأت کہتے ہیں جس کی حفاظت کی ذمہ داری پہلے ہی علیحدہ بیان کردی گئی ہے۔ بیان تو کسی پوشیدہ بات کے کھول دینے یا کسی مبہم بات کی وضاحت کر دینے یا کسی غیر معلوم بات کو علم میں لے آنے کا نام ہے اور الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں پہلے ہی آچکے جیسا کہ سابقہ آیات میں تبلا دیا گیا اس کے بعد الفاظ کے معانی اور ان کی مرادات ہی ہیں جو الفاظ سن لینے کے بعد مخفی رہ سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ بیان کا لفظ معانی و مطالب کے لیے لایا گیا ہے جیسا کہ لغتاً اور محاورتاً بھی یہ معانی ہی کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ حاصل یہی نکلا کہ الفاظ قرآنی کے ساتھ ساتھ ان کے معانی و بیان کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالٰے نے ہی لیا ہے اور الفاظ قرآنی کے معانی و بیان ہی کا نام حدیث یا سنت ہے۔

قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں من جانب اللہ

ان صریح آیات کے بعد بھی اگر منکرین حدیث اپنے اس اصرار پر جمے رہیں کہ اللہ نے صرف قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے حدیث کا نہیں تو پھر ذی عقل اسے ضدِ بے جا سے زیادہ کوئی اہمیت نہ دے گا۔

بیان قرآنی کو اپنی ذمہ داری میں لینے کی خبر دے کر اللہ تعالٰے نے ایک اور اہم حقیقت پر اپنے بندوں کو مطلع فرمایا، وہ یہ کہ قرآن کے الفاظ اور اس کے معانی دونوں من جانب اللہ ہیں، جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ قرآنی کے صرف نقل کرنے والے ہیں اسی طرح معانی قرآنی کے بھی آپ صرف ناقل ہی ہیں نہ قرآن کے الفاظ آپ کے اپنے ہیں نہ ان الفاظ کے معانی آپ نے اپنی طرف سے متعین کر لیے، الفاظ کا نزول بھی اللہ تعالٰے ہی کی جانب سے ہوا اور معانی و مطالب کی تعیین بھی اللہ تعالٰے ہی نے فرمائی۔ چنانچہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ آیات قرآنی کو سامنے رکھ کر غور فرماتے ہوں کہ اس آیت کے کتنے مطالب محتمل ہیں اور ان میں سے کونسا مطلب الفاظ پر زیادہ چسپاں ہے اس لیے یہی مراد خداوندی ہوگا بلکہ قرآن کے مجملات کی تفصیل، مبہمات کی تفسیر اور مشکلات کی تیسیر سب کچھ وحی الٰہی کی مدد سے از خود زبان نبوی پر جاری ہو جاتا اسی موہبت رحمانی کو

قرآن وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (وہ اپنی خواہش سے باتیں نہیں کرتے ان کا کلام تو تمام تر وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے) سے تعبیر کرتا ہے:-

قرآن فہمی کے لیے صرف زبان دانی کافی نہیں

اس سلسلہ میں یہ گمان کرنا کہ قرآن کے اولین مخاطب عرب تھے جو خود اہل زبان تھے اور اس لیے قرآن فہمی کے لیے انہیں علیحدہ سے کسی بیانِ رسول کی ضرورت نہ تھی بنیادی طور پر ہی غلط ہے اس لیے کہ اوّل تو کسی کتاب کی مُراد سمجھنے کے لیے صرف زبان دانی کافی نہیں ہوتی، لیسا اوقات مصنف کی مُراد محاورات کی وسعتوں، اشتراک و ترادف کے حجابوں اور مجاز و کنایات کے پردوں میں پوشیدہ رہ جاتی ہے بلکہ جتنی بلند پایہ کتاب ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ شرح و تفسیر کی متقاضی ہوتی ہے اس کے علاوہ سب انسان یکساں فہم و فراست اور مساوی علم و قابلیت کے مالک نہیں ہوتے، سب کی ضرورتیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں اس لیے یہ ناممکن ہے کہ کلامِ الٰہی کی ہر ہر آیت کو سنتے ہی ہر ایک صحابی اُس آیت کے کلی جزئی تمام احکام سے باخبر ہو جاتا ہو اور اسے قطعاً کسی شرح و بیان اور کسی وضاحت و تفسیر کی ضرورت نہ ہوتی ہو۔

کتبِ حدیث میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کو بھی قرآن فہمی میں شبہات پیش آجاتے تھے مثال کے طور پر ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کر دینا مناسب رہے گا، اگرچہ منکرین حدیث کے سامنے احادیث سے کوئی بات ثابت کرنا بے سود ہے مگر ان مثالوں سے غرض ان احکام کا اثبات نہیں جو ان میں مذکور ہیں بلکہ صرف تاریخی حیثیت سے یہ بتلانا منظور ہے کہ صحابۂ کرام اہلِ زبان ہونے کے باوجود قرآن کریم کی صحیح مُراد سمجھنے میں شبہات پیش آتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے الفاظ میں ان شبہات کو حل فرماتے تھے۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے درمیان جو سوال و جواب ہوئے ان کی کثیر تعداد کا اندازہ اس بات سے لگا لیجیے کہ حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب اعلام الموقعین میں ان کا جو ذکر کیا ہے وہ پورے ایک سو دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ کہیں

صحابۂ کرام کو کسی قرآنی آیت کی نفس مُراد ہی سمجھنے میں دِقّت پیش آ گئی ہے کہیں صحابہ کو یہ مشکل در پیش رہے کہ قرآن نے ایک بات مجمل طور پر کہی ہے جب تک اس کی تفصیل نہ معلوم ہو اس مجمل آیت کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوتا کبھی صحابہ فروعی مسائل میں بعض اُلجھنوں سے دوچار رہیں غرض صحابہ کو قرآن فہمی میں مختلف قسم کے شبہات پیش آتے ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی کی رہنمائی میں ان سب شبہات کا تشفی بخش جواب ارشاد فرماتے ہیں۔ تمام سوال وجواب کا احاطہ کرنے کی تو نہ بر نظر تحریر ہیں نہ ضرورت ہے نہ مقصود۔ صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ صحابہ کو بھی اہل زبان ہونے کے باوجود قرآن فہمی میں شبہات پیش آتے تھے چند ایک مثالیں پیش خدمت ہیں :

(۱) سورۂ نساء کی ایک آیت مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ (جو شخص کوئی بُرائی کرے گا وہ اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا۔ النساء: ۱۲۳) کی نفس مُراد سمجھنے میں بعض صحابہ کو یہ شبہ پیش آ گیا کہ ایسا تو کوئی انسان بھی نہیں جس سے کبھی بھی کوئی قصور نہ ہوا ہو لہٰذا اس آیت کی رو سے تو ہر شخص کا عذاب میں گرفتار ہونا ضروری ہے بڑی فکر لاحق ہوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو فرمایا کہ یہاں بدلے کو جہنم کے عذاب میں منحصر سمجھنا صحیح نہیں بلکہ ہر وہ تکلیف جو انسان کو اس دُنیا میں پہونچتی ہے وہ بھی اس کی برائی کا بدلہ بن جاتی ہے (ترمذی)

(۲) جب یہ آیت نازل ہوئی وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔ (براۃ : ۳۴)

تو بعض صحابہ نے سمجھا کہ اس آیت نے مطلقاً مال جمع کرنے کو حرام قرار دے دیا ہے۔ صحابہ کی اکثریت اگرچہ غریب تھی مگر کچھ لوگ مالدار بھی تھے ان کے پاس سونا چاندی جمع بھی رہتا تھا وہ یہ آیت سُن کر بڑے فکر مند ہوئے۔ آپ سے استفسار کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا آیت کا وہ مطلب نہیں ہے جو تم سمجھے ہو سونا

چاندی جمع کرنا اس وقت صادق آتا ہے جب زکوٰۃ ادا نہ کی جائے۔ جس مال کی زکوٰۃ دے دی جائے وہ کنز اور خزانے کی تعریف میں نہیں آتا صحابہ چونکہ پریشان تھے اس لیے ان کی پریشانی دور کرنے کے لیے تسلی آمیز انداز میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُفْرِضِ الزَّكٰوةَ اِلَّا لِيُطِيْبَ بِهَا مَا بَقِيَ مِنْ اَمْوَالِكُمْ	اللہ تعالیٰ نے تم پر زکوٰۃ اسی لیے تو لازم کی ہے تاکہ تمہارا باقی مال پاک صاف ہو جائے۔

یہ سن کر صحابۂ کرام کا شبہ حل ہو گیا اور مال جمع کرنے کی حدود کا انہیں علم ہو گیا۔

(۳) عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا واقعہ تو بڑا مشہور ہے جب روزے کے احکام کے بارے میں سورۂ بقرۃ کی یہ آیت نازل ہوئی حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ (کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ سیاہ و سفید دھاگے میں تمہیں فرق معلوم ہونے لگے۔ بقرۃ: ۱۸۷) تو عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے دو دھاگے ایک سیاہ اور ایک سفید لے کر اپنے تکیہ میں رکھ لیے اور سحری ختم ہونے کے وقت ان دھاگوں کو قریب قریب رکھ کر دیکھتے رہے جب دونوں دھاگوں کا رنگ الگ الگ واضح نظر آنے لگا تو کھانا پینا بند کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عدیؓ کے اس عمل کا حال معلوم ہوا تو آپؐ نے از راہ مزاح فرمایا اے عدی تمہارا تکیہ بڑا لمبا چوڑا معلوم ہوتا ہے جس میں رات اور دن دونوں سما جاتے ہیں اور پھر اس آیت کی اصل مراد سمجھاتے ہوئے فرمایا یہاں سیاہ اور سفید دھاگے مراد نہیں بلکہ رات کی تاریکی کی سیاہی اور دن کی روشنی کی سفیدی مراد ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی جانب سے مزید وضاحت کے لیے آیت کے آخر میں مِنَ الْفَجْرِ کے الفاظ اور نازل ہو گئے (بخاری)

(۴) سورۂ انشقاق کی آیت فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا (جس شخص کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب نہایت نرمی سے ہوگا۔ انشقاق: ۷-۸) کا صحیح مفہوم سمجھنے میں ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ جیسی فقیہہ کو مغالطہ لگ گیا۔ ہوا یوں کہ ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی ہولناکیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ قیامت کے دن جس کا بھی حساب لیا گیا سمجھ لو کہ بس وہ ہلاک

ہو گیا حضرت عائشہ نے محولہ بالا آیت کے حوالے سے عرض کیا کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا گیا وہ ہلاک نہ ہوگا اس کا حساب نہایت نرمی سے ہوگا آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ یہ حساب یسیر۔ یہاں عرض یعنی پیش کرنے کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ اعمال نامہ ان کے سامنے رکھ کر صرف ان کو جتلا دیا جائے گا کہ تم نے فلاں فلاں عمل کیا ہے مگر اس پر ان سے باز پرس نہ ہوگی اس کے علاوہ اگر کسی سے یہ سوال کر لیا گیا کہ یہ کام کیوں کیا تھا تو بے شک اس کی خیر نہیں وہ یقیناً ہلاک ہو گیا (بخاری)

(۵) بعض صحابہ کرام سورہ انعام کی آیت اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (جو لوگ ایمان لائے پھر انہوں نے اپنے اپنے ایمانوں میں کوئی ظلم شامل نہیں کیا یہی لوگ ہیں جن کو امن ملے گا اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

الانعام: ۸۲) سن کر پریشان ہو گئے اور دربار رسالت میں عرض کیا کہ ہم میں سے کون شخص ایسا ہے جس نے ایمان لانے کے بعد کوئی ظلم اور معصیت نہ کی ہو اس آیت کے تحت تو ہم میں سے کوئی بھی مستحق امن و سلامتی اور ہدایت یافتہ نہیں رہتا آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے معصیت مراد نہیں ہے بلکہ خاص شرک مراد ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ظلم کو شرک ہی سے تعبیر کیا گیا ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (شرک بہت بڑا ظلم ہے)۔

یہ چند مثالیں جو آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں ان پر دوبارہ نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ صحابہ کرام کو اہل زبان ہونے کے باوجود الفاظ قرآنی کے صحیح معانی اور ان کا اصل مفہوم متعین کرنے میں کیسی کیسی مشکلات پیش آتی رہی ہیں ان میں ایسے سوال بھی ہیں جن کا تعلق عقائد سے ہے ایسے بھی ہیں جن کا تعلق آخرت سے ہے اور ایسے سوال بھی ہیں جو عبادات سے متعلق ہیں اور یہاں یہ جتلانے کی تو شاید ضرورت نہیں کہ یہ تمام امور اتنے اہم ہیں کہ نجات اور عدم نجات کا ان پر مدار ہے۔

بہرحال یہ خیال کرنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ صحابہ چونکہ اہل زبان تھے اس لیے انہیں قرآن فہمی کے لیے کسی بیان رسول کی ضرورت ہی نہ تھی۔ طوالت کے خوف کی وجہ

سے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے اس قسم کی مثالیں کثیر تعداد میں ہیں۔

ان مثالوں میں صحابہ کی جانب سے کیے گئے سوالات پر ذرا اس حیثیت سے بھی نظر ڈالیے کہ کیا ان سوالات کے جواب میں انہی متعلقہ آیات کا دوبارہ تلاوت کر دینا کافی ہوتا اور کیا انہی آیات کو بار بار سنا دینے سے صحابہ کی تشفی ممکن تھی؟

ان مثالوں پر اس نقطۂ نظر سے بھی غور کیجئے کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ بھی کوئی اور شخص ان سوالات کے وہی جواب دے سکتا تھا جو آپ نے دئے۔ کیا کوئی شخص صرف زبان عربی کی مدد سے یہ متعین کر سکتا ہے کہ سوال اوّل میں جزا سے دنیوی تکالیف مُراد ہیں یا چوتھے سوال میں حساب لیسیر کے معنی اعمالنامہ سامنے رکھ دینے کے ہیں یا اسی طرح صرف زبان دانی کی بنیاد پر کوئی یہ سمجھ سکتا ہے کہ پانچویں سوال میں ظلم سے شرک مُراد ہے۔

حدیث کے بغیر قرآن کی حفاظت کا تصوّر

اگر یہ امر واقعہ ہے کہ صحابۂ کرام کو بھی اہلِ زبان ہونے کے باوجود قرآن فہمی میں مشکلات پیش آتی رہی ہیں اور اگر یہ درست ہے کہ قرآن فہمی میں پیش آمدہ مشکلات کے حل کے لیے متعلقہ آیات کا دوبارہ تلاوت کر دینا کافی نہیں ہے نیز اگر یہ بات بھی مسلّمہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی بھی شخص قرآنی آیات کا صحیح مفہوم ربانی متعین کرنے کا اہل نہیں تو پھر اس حقیقت سے بھی مجال انکار نہیں ہو سکتا کہ احادیث نبوی کی حفاظت کے بغیر قرآن کی حفاظت کا تصوّر بے معنی ہے اور اسی بنا پر اللہ تعالے نے قرآن کی حفاظت کے ساتھ ساتھ قرآن کی شرح و تفسیر یعنی حدیث کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا ہے۔ یہ آیات دوبارہ پڑھیے:

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝

(القیمۃ : ۱۷ - ۱۹)

ہمارے ذمہ ہے اس قرآن کا (اے پیغمبر آپ کے سینے میں) جمع کر دینا اور (آپکی زبان سے) اسکا پڑھوا دینا جب ہم اس قرآن کو پڑھیں تو (اے پیغمبر) آپ صرف سنتے رہیے پھر ہمارے ہی ذمہ اس قرآن کا بیان بھی ہے۔

اور غور کیجیے یہ قرآن ہی تو ہے جو حدیث کے محفوظ من اللہ ہونے کا دعوے کر رہا ہے۔ جو شخص عامل بالقرآن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ اگر اپنے دعوے میں سچا ہے تو ان صریح آیات قرآنی کے بعد اس کے لیے انکار حدیث کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ان آیات کے مفہوم پر بار بار غور کریں یہ آیات کیسے واشگاف انداز میں اس حقیقت کا اظہار کر رہی ہیں کہ قرآن کو بیان کی ضرورت ہے اس لیے کہ بیان کے بغیر مرادات خداوندی کا علم ممکن نہیں۔ یہ آیات کتنی صراحت کے ساتھ اس بات کی اطلاع دے رہی ہیں کہ قرآن کی حفاظت کا حق صرف اس کے الفاظ کی حفاظت سے ادا نہیں ہو سکتا بلکہ قرآن مع بیان ہی کی حفاظت سے ادا ہو سکتا ہے۔ قرأت اور بیان کو علیحدہ علیحدہ ذکر کر کے یہ آیات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ قرآن کریم میں ایک درجہ الفاظ و تعبیرات کا ہے جس کا تعلق قرأت خداوندی کی اتباع میں قرأۃ نبوی سے ہے اور ایک درجہ معانی و مطالب اور مرادات ربانی کا ہے جس کا تعلق بیان خداوندی کی پیروی میں بیان نبوی سے ہے پس قرآن کے محفوظ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے الفاظ و تعبیرات بھی محفوظ ہیں اور معانی و مرادات بھی محفوظ ہیں اگر الفاظ کی حفاظت ہو جاتی ہے اور معانی و مطالب کی حفاظت نہیں ہوتی تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ نصف قرآن کی حفاظت ہوئی اور نصف غیر محفوظ رہ گیا۔ اسی طرح اگر معانی و مطالب محفوظ ہوں اور الفاظ محفوظ نہ ہوں تب بھی نصف قرآن کی حفاظت ہوئی نصف کی نہیں ہوئی۔ اگر قرآن کے صرف الفاظ ہی محفوظ ہوں تو ہر ملحد و زندیق اپنی اغراض نفسانی کے تحت جو معنی چاہے انہیں پہنا دے اور اگر صرف معانی محفوظ ہوں تو منتشر معانی کو سمیٹنے کا کوئی قطعی ذریعہ باقی نہ رہے۔ پورا قرآن اسی وقت محفوظ سمجھا جائے گا جب الفاظ و معانی دونوں محفوظ ہوں، الفاظ کی گرفت سے معنی باہر نہ جا سکیں اور معنی کے لحاظ سے الفاظ میں رد و بدل نہ ہو سکے۔ محض الفاظ کی حفاظت سے قرآن کی حفاظت کا وعدہ خداوندی پورا نہیں ہوتا اتنی حفاظت تو شاید تورات و انجیل کو بھی کسی حد تک حاصل رہی لیکن کیا محض الفاظ کی حفاظت سے یہودیت و نصرانیت محفوظ رہ گئیں؟ کیا احبار و رہبان نے تحریف معنوی کر کر کے دین کو

کچھ سے کچھ نہیں بنا دیا ؟ اگر راجح قول کے مطابق یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تورات و انجیل میں لفظی تحریف بھی ہوئی ہے تو پھر بھی حقیقت ناقابل انکار ہے کہ تحریف معنوی تحریف لفظی سے زیادہ خطرناک اثرات کی حامل ہوتی ہے پس قرآن کے الفاظ کو محفوظ کہہ کر پورے دین کی حفاظت کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ غرض قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں لازم و ملزوم ہیں اس لیے قرآن کی حفاظت کو مکمل صرف اسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے جب الفاظ اور معانی یعنی قرآن و بیان دونوں محفوظ مانے جائیں۔ الفاظ محفوظ ہوں بیان محفوظ نہ ہو تب بھی قرآن کی حفاظت ناقص اور بیان محفوظ ہو الفاظ محفوظ نہ ہوں تب بھی ناقص۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے دونوں ہی کی حفاظت کا ذمہ لیا کہ ایک کے بغیر دوسرے کا محفوظ رہنا ممکن ہی نہ تھا ؏

حفاظت کے تین مرحلے

اب رہی یہ بات کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن کے الفاظ و تعبیرات اور اس کے معانی و مطالب دونوں کی حفاظت کس طور پر پوری فرمائی تو اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے اتنی بات ذہن میں رکھیے کہ اللہ تعالےٰ کی جانب سے قرآن اور بیان دونوں کی حفاظت کے تین مرحلے ہیں :

پہلے مرحلے میں حق تعالےٰ شانہٗ نے اپنے کلام کے الفاظ اور اس کی مرادات کو اپنی حفاظت کے ساتھ سینۂ نبوت میں اتار کر جمع اور محفوظ کیا۔

دوسرے مرحلے میں اس کے رسول نے اسی حفاظت خداوندی کی مدد سے قرآن کے الفاظ کو تلاوت کے ذریعے اور اس کے بیان کو اپنے اقوال اپنے افعال اور اپنی تقریرات کی مدد سے صحابہ کی طرف منتقل فرمایا۔ اور پھر

تیسرے مرحلے میں اسی حفاظت خداوندی کے تحت قرآن اور اس کا بیان دونوں صحابہ سے تابعین کی طرف، تابعین سے تبع تابعین تک، اور پھر تبع تابعین سے آئندہ افراد امت کی جانب سینہ بہ سینہ اور سفینہ بہ سفینہ منتقل ہوتے ہوئے ہم تک پہونچے

اتنی بات سمجھ لینے کے بعد اب آئیے ہم ان تینوں مرحلوں کا سلسلہ وار جائزہ لیں کہ قرآن اور اس کے بیان کی یہ ربانی حفاظت کس طرح وقوع پذیر ہوئی ؏

حفاظت سینۂ نبوی تک جہاں تک پہلے مرحلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا تعلق ہے تو اس کے لیے آپ کی توجہ سورۂ قیامۃ کی انہی آیات کی طرف دوبارہ مبذول کرانا ضروری ہے جن کا ابھی کچھ دیر پہلے حوالہ دیا گیا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن اور بیان دونوں چیزوں کی حفاظت کی ذمہ داری عَلَیْنَا کے کلمہ سے فرمائی ہے' جو لوگ عربی زبان سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عَلَیْنَا کا کلمہ اپنے اُوپر لازم کر لینے کے معنی میں آتا ہے۔ اَب آپ دیکھیں کہ جب قرآن کے الفاظ کی حفاظت کا ذکر کیا جا رہا ہے تب بھی عَلَیْنَا کا لفظ استعمال ہوا ہے اور جب قرآن کے بیان کی حفاظت کا ذکر ہوا تب بھی عَلَیْنَا ہی لایا گیا گویا اللہ تعالیٰ نے دونوں کی حفاظت اپنے اُوپر لازم کر لی ہے۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَ قُرْآنَہٗ' سے قرآن کے الفاظ کی حفاظت کا وعدہ ہوا' قرآن کے معنی ہیں پڑھے جانے کی چیز اور پڑھے جانے کی چیز ظاہر ہے الفاظ ہی ہیں معنی نہیں ہو سکتے پھر ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ' فرما کر قرآنی الفاظ کے معانی و مطالب کھول دینے کا وعدہ فرمایا کیونکہ بیان کے معنی کھول دینے اور واضح کر دینے کے ہیں اور وضاحت معانی ہی کی ہوا کرتی ہے جو الفاظ کے پردوں میں چھپے ہوتے اور لپٹے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں عربی داں حضرات ایک اور اہم نکتہ کی طرف توجہ فرمائیں دونوں آیتوں کے درمیان ثُمَّ کا لفظ کیا بتلا رہا ہے؟ ثُمَّ کا لفظ اس امر کی دلیل ہے کہ الفاظ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اور بیان قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری دونوں علیحدہ علیحدہ حیثیتوں کی حامل ہیں۔ ایک ذمہ داری کا دوسری سے کوئی تعلق نہیں' اگر یہ بات نہ ہو تو پھر ثُمَّ کا لانا بھی بے کار ٹھہرے گا عَلَیْنَا کی تکرار بھی عبث ہوگی اور ان دو آیتوں کے درمیان فصل بھی بلا ضرورت قرار پائے گا اور یہ کلام الٰہی میں محال ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ دو علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں ہیں ایک الفاظ قرآن کی حفاظت کی اور ایک بیان قرآن کی حفاظت کی۔

قرآن کے الفاظ تو فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ کی صورت میں سینۂ نبوی میں

ڈالے گئے رہا وہ بیان جو قرآن کی مرادات کے بارے میں سینۂ نبوی میں ڈالا گیا اس کے ڈالے جانے کی کیفیت سے ہمیں بحث نہیں وہ خواہ کسی طرح بھی ڈالا گیا ہو اتنی بات یقینی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک میں اس نے بالآخر کسی ملفوظ ہی کی شکل اختیار کی ہو گی، بیان کی یہ آخری شکل ہی حدیث نبوی ہے جس کا مضمون تو اللہ کی جانب سے ہے اور الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ کہہ کر اسی بیان کو جس کی آخری شکل حدیث نبوی ہے سینۂ نبوی میں محفوظ کر دینے کی ذمہ داری حق تعالےٰ نے فرمائی ہے پس اگر قرآن اپنے الفاظ کی صورت میں اللہ کی حفاظت میں ہے ضائع نہیں ہو سکتا تو قرآن اپنے بیان یعنی حدیث کی صورت میں بھی اللہ کی حفاظت میں ہے ضائع نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا قرآن کے الفاظ تو اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول تک بذریعہ قرأۃ پہونچائے چنانچہ کہیں فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فرما کر اپنے کو پڑھنے والا بتلایا اور کہیں نَتْلُوْا عَلَيْكَ ارشاد فرما کر خود کو تلاوت کرنے والا ظاہر فرمایا۔ دوسری چیز یعنی معانی و مرادات قرآنی کا بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک بذریعۂ تعلیم پہنچایا گیا اتنی بات تو ظاہر ہی ہے کہ علم الفاظ کے پہچاننے کو نہیں کہتے بلکہ الفاظ کے معانی و مطالب سمجھنے کو کہتے ہیں اور معانی و مطالب کا سمجھانا ہی تعلیم ہے چنانچہ اللہ تعالےٰ نے اسی تعلیم کی بابت ارشاد فرمایا

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (النساء : ۱۱۳)	اور ہم نے تم کو وہ باتیں تعلیم کیں جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا بڑا فضل تھا۔

گویا اللہ تعالیٰ الفاظ قرآن کے لیے قاری ہے تو بیان قرآن کے لیے معلّم رسول بھی ہے اسی تعلیم کو ایک مقام پر ہدایت کے لفظ سے تعبیر فرمایا اور ہدایت کا تعلق بھی ظاہر ہے الفاظ سے نہیں معانی ہی سے ہے۔ ارشاد ہے۔

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ	آپ کو یہ خبر نہ تھی کہ کتاب کیا چیز ہے نہ یہ خبر تھی کہ ایمان کیا چیز ہے لیکن ہم نے اس

من نشاء من عبادنا ط (شوریٰ : ۵۲)	قرآن کو ایک نور بنایا جس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔

اسی طرح ایک مقام پر الفاظ قرآن کو کتاب کے لفظ سے تعبیر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بیانِ قرآن کو حکمت کے لفظ سے تعبیر فرمایا اور دونوں کا منزل من اللہ ہونا بتلایا۔ فرمایا

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتَابَ وَ الْحِکْمَۃَ (نساء : ۱۱۳)	اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل کی۔

اسی حکمت کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کی راہوں میں صحیح اور غلط کا فرق واضح کیا، اسی کی مدد سے آپؐ نے انسانی زندگی کے تمام مسائل حل کیے اور اسی کی روشنی میں کام کر کے آپؐ نے اخلاق و روحانیت تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور قانون و سیاست کی دنیا میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ یہی ہے وہ بیان قرآن جس کو ہم حدیث نبوی اور سنتِ نبوی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس بیان قرآن کو بھی اللہ تعالیٰ نے سینۂ نبوی میں اسی طرح محفوظ فرمایا جس طرح الفاظ قرآن کو جمع اور محفوظ فرمایا۔

غرض نبی کریم صلی اللہ کی ذات کی حد تک الفاظ قرآنی تلاوتِ خداوندی کے ذریعے اور معانی و مرادات قرآن تعلیم خداوندی اور ہدایت ربانی کے ذریعے بحفاظت تمام پہونچ گئے اور اس طرح قرآن اور اسکے بیان کی حفاظت کا پہلا مرحلہ پورا ہو گیا۔

حفاظتِ صحابہ تک

ان دونوں کی حفاظت کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اور اس کے بیان کو بحکم خداوندی پوری حفاظت کے ساتھ صحابہ کی طرف منتقل فرمایا۔

اتنی بات تو مسلّمہ ہے کہ قرآن اتارنے کا مقصد قیامت تک کے انسانوں کی ہدایت ہے اس لیے محض سینۂ نبوت میں قرآن کے الفاظ اور اس کا بیان محفوظ کر دینے سے یہ عظیم مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا جب تک یہ دونوں چیزیں ساری امت تک اسی حفاظت سے نہ پہنچ جائیں جس حفاظت سے رسول تک پہنچیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ان دونوں کو امت تک بہ حفاظت پہونچانے کا ذمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر عائد فرمایا کہ وہ

امت کے لیے تلاوت آیات بھی کریں تاکہ الفاظ قرآنی امت تک پہنچ جائیں اور تعلیم و ہدایت کا سلسلہ بھی قائم فرمائیں تاکہ معانی و مرادات قرآنی بھی امت تک بہ حفاظت پہنچ جائیں اور اس طرح قرآن اور اس کے بیان کا آگے تک بہ حفاظت پہونچتے رہنے کا سلسلہ قائم ہوجائے چنانچہ ارشاد ہوا

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (اٰل عمران: ۱۶۴)	اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا جب ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے ان کو پاکیزہ بناتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت کے الفاظ میں غور فرمائیں اس میں تلاوت آیات اور تعلیم آیات دونوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جارہا ہے اور تبلایا جارہا ہے کہ جس طرح اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے تلاوت آیات اور تعلیم آیات فرمائی اسی طرح اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے امتیوں کے لیے تلاوت اور تعلیم فرمائیں گے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر دونوں چیزوں کو جُدا جُدا بیان کرکے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو قرآنی الفاظ کے معانی و مطالب کھول کھول کر بیان کردینے کی ذمہ داری تفویض فرمائی۔ ارشاد ہے

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل: ۴۴)	اور آپ پر ہم نے یہ قرآن اتارا تاکہ جو مضامین آپ پر اتارے گئے آپ انہیں کھول کھول کر بیان کردیں۔

چنانچہ آپؐ نے اپنے اقوال اپنے افعال اور اپنی تقریرات سے منزل من اللہ مضامین کو واقعی کھول کھول بیان فرمادیا۔ آپ نے ہر ہر آیت کی وہ مُراد متعین فرمادی جو مقصود خداوندی تھی۔ آپ نے اگر قرآن کے الفاظ بلا کم و کاست تلاوت کے ذریعے صحابہ کی طرف منتقل کیے تو ان الفاظ کے معانی و مطالب بھی بلا کم و کاست صحابہ کی امانت میں دے دیئے کبھی اپنے ارشادات کے ذریعے کبھی اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو قرآنی سانچے میں ڈھال کر اور کبھی اپنی نگرانی میں صحابہ کے ایک ایک عمل کی جانچ پڑتال کرکے۔ آپؐ ایک

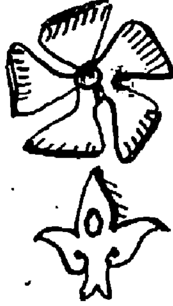
طرف قرآنی آیات کی تلاوت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان آیات کا عملی نمونہ خود پیش کرتے اور صحابہ کی شکل میں ہزاروں عملی نمونے ڈھالنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کسی آیت کے مختلف محتملات میں سے کسی ایک صحیح محتمل کو متعین فرما رہے ہیں، کبھی کسی آیت کے مبہم حکم کو مشخص فرما رہے ہیں اور کبھی کسی آیت کے اجمال کی تفصیل بیان فرمائی جا رہی ہے۔ کبھی اس پر کلام ہو رہا ہے کہ فلاں آیت کے حکم کی کیا توجیہ ہے اور کبھی اس کا بیان ہے کہ فلاں آیت کی کلّی میں کون کونسا جزئیہ شامل ہے، کبھی کسی آیت کے حکم کی علت سے بحث ہے تو کبھی کسی قرآنی حکم کے نواحی و آثار کا ذکر ہے کبھی صحابۂ کرام کو کسی قرآنی آیت کی نفس مراد سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آگئی ہے، اس کو دور کیا جا رہا ہے تو کبھی صحابہ کے ان سوالات کا جواب دیا جا رہا ہے جو قرآن کی بعض تفصیلات کے متعلق آپ سے کیے گئے ہیں کبھی بعض فروعی مسائل سے متعلق سوالات کے جواب میں صحابہ کی تشفی کا سامان ہے اور کبھی قرآنی اشارات کی وضاحت کا اہتمام۔

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اور اس کے بیان کو تمام صحابہ تک پہونچایا اس طرح ان دونوں کی حفاظت کا دوسرا مرحلہ بھی پورا ہو گیا۔

حفاظت تا قیامت

قرآن اور اس کے بیان کی حفاظت کا تیسرا مرحلہ وہ ہے جس میں یہ دونوں چیزیں صحابہ سے ہم تک منتقل ہوتی ہوئی پہونچیں۔ یہ تیسرا مرحلہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ منکرین حدیث کو حفاظت حدیث کے سلسلہ میں زیادہ تر کلام اسی مرحلے میں ہے۔ قرآن کا اپنے الفاظ کی نسبت سے محفوظ رہنے کا جہاں تک تعلق ہے چونکہ اس میں منکرین حدیث کا بھی کوئی اختلاف نہیں ہے اس لیے اس تیسرے مرحلے میں ہماری تمام تر گفتگو صرف قرآنی بیان یعنی حدیث کی حفاظت تک منحصر رہے گی مگر اس گفتگو کی ابتدا کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ذرا اس بات کا جائزہ لیتے چلیں کہ اس تیسرے مرحلے میں حفاظت حدیث کی ضرورت تھی بھی یا نہیں۔ کیونکہ منکرین حدیث کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ قرآن کے معانی و مطالب جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے اور حالات کے مطابق سمجھے اور صحابہ کو سمجھائے اسی طرح یہ

اَب ہمارا فرض ہے کہ ہم قرآن کے معانی و مطالب اپنے زمانے اور اپنے حالات کی روشنی میں سمجھیں اور سمجھائیں۔ اسی لیے ان کا دعویٰ ہے کہ حدیث کی حفاظت کی ضرورت ہی نہ تھی اور اسی لیے اللہ نے اسے محفوظ رکھا بھی نہیں ؎



حدیث کے بغیر قرآن فہمی

آئیے اب ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ کیا حدیث کی مدد کے بغیر قرآن فہمی ممکن ہے نیز یہ کہ کیا منکرین حدیث کے اس دعویٰ میں کوئی وزن ہے کہ قرآن کے معانی و مطالب جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے زمانے اور اپنے حالات کے مطابق سمجھے اور سمجھائے اسی طرح آنے والے زمانوں میں آنے والے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانوں اور اپنے اپنے حالات کی روشنی میں قرآن کے معانی و مطالب کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی اپنی زندگیوں کے لیے مخصوص لائحہ عمل مرتب کریں۔

منکرین حدیث کے اس دعوے کا چونکہ لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن کی صحیح مرادات متعین کرنے میں ایک عام آدمی اور نبی برابر ہوتا ہے اس لیے لازماً ہمیں پہلے اس امر کا جائزہ لینا ہوگا کہ کیا وحی آسمانی کی مدد کے بغیر جو صرف ایک نبی ہی پر نازل ہوتی ہے قرآن کی صحیح مرادات تک پہونچنا ممکن ہے؟

قرآن فہمی اور عجز انسانی

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ قرآن اسلام کا صرف بنیادی قانون، دستور اساسی اور مجموعۂ ہدایت ہی نہیں اپنی ذات میں ایک معجزہ بھی ہے جو اپنے الفاظ اور معانی دونوں ہی کے لحاظ سے اعجازی شان رکھتا ہے جس طرح مخلوق اس بات سے عاجز ہے کہ الفاظ کی تراکیب اجزائے کلام کی ترتیب اور انداز بیان کی فصاحت کے لحاظ سے قرآن کی مثل لاسکے اسی طرح مخلوق کے لیے یہ بھی ناممکن ہے کہ ہدایت کے کمال، احکام کی جامعیت علوم و معارف کی گہرائی اور مضامین کی ہمہ گیری کی نسبت سے قرآن کی نظیر بنا سکے۔ چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ

آج چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود قرآن کی ایک چھوٹی سے چھوٹی آیت کا بھی مثل وجود میں نہ آسکا قرآن کی معنوی وسعتوں اور ہمہ گیر گہرائیوں نے دُنیا کو تھکا دیا کہ وہ اس جیسی جامع علوم و معارف اور حاوی احکام و اصول کتاب یا اس کے کسی جزو جیسا کوئی جزو پیش کر سکے۔

اس مسلّمہ حقیقت کو سامنے رکھ کر ذرا سوچئے کہ آخر قرآن جیسا کلام جنّ و انس مل کر بھی کیوں نہ لا سکے۔ آپ جتنا سوچتے جائیں گے آپ کو ایک ہی جواب ملے گا کہ ان کے فہم و عقل اور ان کے علم و ادراک میں وہ لامحدودیت اور ہمہ گیری نہیں ہے جو ایسے اعجازی کلام کے لیے درکار ہے۔ بس فہم و عقل میں اسی لامحدودیت اور ہمہ گیری کے فقدان کی بنا پر ان میں یہ سکت بھی نہیں ہے کہ وہ قرآن کے معجزانہ اصولی اور کلی جملوں سے نکلتے ہوئے دقائق و حقائق کا ادراک بلا کسی رہنمائی کے از خود کر سکیں قرآنی کلمات کی ایک ایک تہ اور ایک ایک شکن میں صدہا علوم لپٹے ہوتے ہیں جو چودہ سو سال سے مسلسل نکلتے چلے آرہے ہیں اور ہنوز ان کی انتہا کا کوئی پتہ نہیں ظاہر ہے اتنے بے شمار علوم اور لفظ لفظ میں سموئے ہوئے معارف کا قرآنی کلمات میں سے نکال لانا نبوت کی رہنمائی کے بغیر ناممکن تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن اکیلا نازل نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ایک نبی بھی بھیجا جو وحی الٰہی کی روشنی میں قرآنی علوم و معارف لوگوں کو سمجھا سکے۔

اسی حقیقت کو ہم دُوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں لامحدود ہے جبکہ انسان ہر لحاظ سے محدود و متناہی ہے۔ انسان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ محدود رہتے ہوئے لامحدود ذات و صفات والے کو پہچان سکے اور اس سے صادر ہونے والے کلام کے رموز و اسرار کو جان سکے اس لیے اللہ تعالےٰ نے اپنے اور بندوں کے درمیان ایک ایسا طبقہ پیدا فرمایا جو ایک لحاظ سے ذات حق سے قریب تر تھا اور ایک لحاظ سے بندوں میں شامل تھا یہ طبقہ انبیاء علیہم السلام کا تھا جنھوں نے لامحدود ذات و صفات کی حامل ہستی کو پہچان کر سکے

کلام کے علوم و معارف پر اطلاع پائی اور پھر وحی الٰہی کی روشنی میں عامۃ خلائق کو اس سے بہرہ ور کیا۔

نبی کا واسطہ درمیان میں نہ ہو تو ایک عام آدمی کے بس کی یہ بات ہی نہیں کہ وہ قرآنی علوم پر اطلاع پا سکے اور یہ ایک بالکل فطری بات ہے اگر یہ درست ہے کہ عالم کی عالمانہ بحثیں ایک علم آشنا ہی سمجھ سکتا ہے اگر یہ صحیح ہے کہ عاشق کی رمزیں صرف عشق آشنا ہی جان سکتا ہے تو پھر یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ کلام ربّ کی صحیح مراد صرف رب آشنا ہی پا سکتا ہے۔ ایسا کلام جو انتہائی ہمہ گیر اعلیٰ درجہ کا جامع اور بے مثال وسیع العلم ہو جو ماضی کی خبریں، مستقبل کی اطلاعوں اور حال کے احکام کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو اس کی صحیح مرادات تک پہنچنا خدائی رہنمائی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

قرآن کی ہمہ گیری، جامعیت اور وسعت علم کا اندازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس کو حضرت علی نے ایک بار ایک سائل کے جواب میں نقل فرمایا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر تمسک بالقرآن کی تاکید کے ضمن میں کتاب اللہ کی صفات گناتے ہوئے فرمایا:

فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ وَهُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ تَرَكَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللهُ وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدَى فِي غَيْرِهِ أَضَلَّهُ اللهُ وَهُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَتِينُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ وَهُوَ الَّذِي لَا تَزِيغُ بِهِ الْأَهْوَاءُ وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْأَلْسِنَةُ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ	اس میں تم سے پہلوں کی باتیں ہیں اور پچھلوں کی خبریں ہیں اور درمیانی حال کے احکام ہیں وہ یقینی چیز ہے مذاق نہیں جس متکبر نے اسے چھوڑا خدا نے اس کی گردن توڑ دی اور جس نے اس کے علاوہ ہدایت ڈھونڈی اس کو خدا نے گمراہ کر دیا وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے وہ حکیمانہ یادداشت ہے وہ سیدھا راستہ ہے وہ وہ چیز ہے کہ اس سے دلوں کے میلانات ٹیڑھے نہیں ہوتے اور زبانیں مشتبہ نہیں ہوتیں اور

مِنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ هُوَ الَّذِي لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ إِذْ سَمِعَتْهُ حَتّٰى قَالُوْا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِيْ إِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ وَمَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ وَمَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ وَمَنْ دَعَا إِلَيْهِ هُدِيَ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

(ترمذی: فضل القرآن)۔

اس سے علما کبھی سیر نہیں ہوتے وہ کثرت تلاوت سے پرانا نہیں پڑتا اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے وہی ہے کہ جب جنات نے اسے سُنا تو انہیں یہی کہتے بن پڑا کہ ہم نے عجیب کلام سنا ہے جو ہدایت کی طرف لے جاتا ہے ہم تو اس پر ایمان لے آئے (حقیقت یہ ہے کہ) جو اسے زبان پر لایا اس نے سچ کہا جس نے اس پر عمل کیا اسے اجر ملا جس نے اس کے ساتھ حکم کیا اس نے انصاف کیا اور جس نے اس کی طرف بلایا اسے سیدھے سچے راستے کی ہدایت ہوئی۔

اس حدیث پاک کو بار بار پڑھیئے اور سوچیے کہ جس کلام کا یہ عالم ہو کہ وہ ماضی کی خبروں، مستقبل کی اطلاعوں اور حال کے احکام کا احاطہ کیے ہوئے ہو، جس کے علوم سے علماء کبھی سیر نہ ہوتے ہوں، جس کے عجائبات لامتناہی ہوں، جس کے الفاظ کو زبان سے ادا کرنا مجسم سچائی کی تعبیر لیے ہوئے ہو، جس پر عمل کرنا باعث اجر ہو جس کی روشنی میں کیا ہوا فیصلہ عین عدل کہلائے اور جس کی طرف دعوت دینا ہدایت ہی ہدایت بن جائے ایسے ہمہ گیر اور اتنے جامع کلام کی صحیح صحیح مرادات کو پالینا کیا خدائی رہنمائی کے بغیر ممکن ہے ؟ جو ذرا سی بھی عقل سلیم کا مالک ہو گا وہ بے اختیار کہہ اُٹھے گا کہ نبی کے واسطے کے بغیر جو مؤید من اللہ ہے کلام الٰہی کی اصل مرادات کو پالینا ناممکن ہے ؛

قرآن فہمی اور پیغمبر

کیا یہ ایک مسلّمہ حقیقت نہیں کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی تعبیرات اُصولیت اور کلیت کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں، جس کے لفظ لفظ سے حقائق و معارف کے دریا بہہ رہے ہیں، جس کے ایک

ایک اشارے میں معارف الٰہیہ پوشیدہ ہیں، جس کا ایک ایک لفظ اعجازی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے، جس کی آیات کا حال یہ ہے کہ ان میں کوئی خفی ہے کوئی مجمل ہے کوئی مشکل ہے اور کوئی کنایے کا پہلو لیے ہوئے ہے اس کتاب کے مضامین میں تنوع کا یہ عالم ہے کہ دینیات کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ سیاست، معیشت، معاشرت، معاملات، اخلاق اور نفسیات کے علوم کو بھی حاوی ہے اور ان سب کے پہلو بہ پہلو اس میں باطنی کیفیات کے تمام سامان بھی موجود ہیں۔ ایسی محیر العقول کتاب اور ایسے اعجازی کلام کے معانی معلوم کرنا، مطالب اخذ کرنا اور اس کی مرادات کو معلوم کرنا حق یہ ہے کہ صرف نبی ہی کا کام ہے۔ کوئی دوسرا شخص وہ خواہ کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو کلام الٰہی کی مرادات تک صرف اپنے فہم اور اپنی عقل و دانش کے سہارے نہیں پہنچ سکتا۔

یہ بات تو اس قدر واضح ہے کہ کسی دلیل کی بھی محتاج نہیں۔ قرآن تو پھر کلام الٰہی ہے، فانی اور محدود العقل انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کی مرادات سمجھنے میں بسا اوقات محاورات، مجازات اور کنایات سد راہ بن جاتے ہیں۔ جتنی بلند پایہ کتاب ہوتی ہے اسی قدر شرح و تفصیل کی زیادہ محتاج سمجھی جاتی ہے۔ کسی کتاب کی مرادات سمجھنے کے لیے صرف زبان دانی ہی کافی نہیں ہوتی۔

دیوانِ غالب ایک فانی انسان کے کہے ہوئے اشعار کا مجموعہ ہے، غالب جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کوئی بہت بڑا عالم یا کوئی عظیم فلسفی بھی نہ تھا البتہ شعراء کی سب سے پہلی صف میں اس کا شمار ضرور ہے۔ دیوان بھی کسی اجنبی زبان میں نہیں اردو زبان میں ہے جس کی معنوی باریکیوں سے ہم سب اسی طرح باخبر ہیں جس طرح کوئی عرب عربی زبان کی باریکیوں سے ہو سکتا ہے۔ غالب کی صحیح مراد اپنے اشعار سے کیا تھی وہ تو غالب ہی کو معلوم ہوگا لیکن دنیا سے اس کے رخصت ہو جانے کے بعد اس کے دیوان کی شرح لکھنے والوں نے کیسی کیسی طبع آزمائی کی ہے، ہر ایک نے اپنے مزاج کے مطابق اس کے دیوان کی شرح لکھی۔ جو صوفی منش تھا اس نے چن چن کر غالب کے اشعار میں تصوف بھر دیا جو رند طبع تھا

اسے شراب کی مستی و کیف کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ عاشق مزاج نے اس کے دیوان کو عشق و محبت کی داستان بنا دیا اور فلسفی نے اس کے اشعار سے فلسفیانہ مسائل کا استنباط کیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ غالب نے اپنے دیوان کی خود کوئی شرح نہیں لکھی اور نہ ہی اپنے کسی قابل شاگرد کو اپنے اشعار کی اصل مراد کا پتہ دیا۔

اس مثال کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ جب ایک فانی اور محدود العقل انسان کے کلام کا یہ حال ہے تو اس ہستی کے کلام کا کیا حال ہوگا جو اپنی ذات میں بھی لامحدود اور اپنی صفات کمال میں بھی لامحدود ہے، ایسی ہستی کا کلام بھی یقیناً لامحدود حقائق لامحدود معارف اور لامحدود مطالب کا حامل ہوگا، ان لامحدود حقائق و معارف اور ان لامحدود معانی و مطالب پر خود صاحب کلام کے بتائے بغیر اطلاع پانا کیسے ممکن ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی اگر قرآن کو بھی انسانی تالیفات کی طرح لوگوں کی طبع آزمائی کا میدان بنا دیا جائے تو اس کا کیا حشر ہو۔ قرآن کا اعجاز صرف اس کے الفاظ تک محدود نہیں اس کے معانی میں بھی موجود ہے وہ ہمارے پاس ایسے علوم لے کر آیا ہے جو نسل انسانی کو آخری معراج تک پہنچانے کے ضامن ہیں، ہمارے ہر قسم کے نزاعات میں اس کی حیثیت حَکَم کی ہے گویا ہماری سیاست، معیشت، معاشرت معاملات اخلاق "دین" مذہب" غرض ہماری زندگی کا ہر گوشہ براہِ راست اسی کی روشنی کا محتاج ہے۔ ایسی صورت میں ہر صاحب عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کیا قرآن کو صرف زبان دانی اور عام انسانی فہم پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ رسول کی ذات درمیان سے علیحدہ کر لی جائے تو کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی صحیح مُراد کو پہونچنے کا اہل ہے، حدیث کی مدد کے بغیر جو اللہ تعالےٰ کی صحیح مُراد تک پہونچنے کا واحد راستہ ہے کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ راہِ ہدایت صحیح طور پر اس کے ہاتھ آ گئی۔ دیوان غالب والی مثال میں غالب کے اشعار کی شرحیں اگر مختلف ہوئیں تو غالب کو مزید داد ملی مگر قرآن کا اگر یہی حال بنا دیا جائے تو انصاف سے بتائیے قرآن محض ابہامات کا ایک مجموعہ بن کر نہ رہ جائے؟ کلام الٰہی شاعری نہیں جو نازک خیالیوں اور مبالغہ آمیزیوں کا مجموعہ ہوتا ہے، کتاب اللہ تو حقیقت اور ٹھیک ٹھیک حقیقت کا پتہ دینے آئی ہے، جو معاشرت و معاشیات کی مقنن بن کر نازل ہوئی ہے، مبدأ و

معاد کی مخبر ہے اسرارِ غیب اور روحانی حقائق کی معلّم ہے۔ اگر ایسی کتاب بھی محض رائے زنی اور دماغی مشاقی کا میدان بنادی جائے تو حقیقت کا سراغ لگنا کتنا ناممکن بن جائے۔ اللہ کا دین جیسا پہلے مجہول تھا کتاب اللہ کے نزول کے بعد اس سے زیادہ مجہول بن جائے اور کوئی شخص بھی یہ نہ بتلا سکے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے متعلق کیا عقائد لے کر تشریف لائے تھے، عبادات کا کونسا نظام آپ نے ترتیب دیا تھا تمدن ومعاشرت کن اصولوں پر قائم فرمائی تھی اور معیشت وسیاست کے کیا اصول مقرر فرمائے تھے، غرض یہ دین جس کو قرآن نے کامل کہا ہے ناقص ترین دین ہو کر رہ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے کہ اپنے کلام کی مرادات کی تلاش ہمارے ذمے نہیں ڈالی بلکہ ہم میں اپنا ایک رسول بھیج دیا جس نے اس کلام کو پہلے صاحب کلام سے خود پڑھا اس کے معانی ومطالب کو صاحب کلام سے خود سمجھا اور پھر صاحب کلام ہی کی خاص ہدایت اور خاص حفاظت میں وہ کلام اپنے امتیوں کو پڑھایا، سمجھایا اس کی مرادات کو متعین کیا اور اس کے احکام پر عمل کر کے دکھلایا۔ اگر اللہ تعالےٰ اس طرح اپنے رسول کے ذریعے ہماری تعلیم وہدایت کا سامان نہ کرتا تو ہم یقیناً مدت العمر قرآن کی صحیح مراد حاصل نہ کر پاتے اگر قرآن کی مراد کی تعیین عام انسانی عقل پر چھوڑ دی جاتی تو یہ کتاب جو خالصتاً عمل کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی صرف دماغی کدوکاوش کا مشغلہ بن کر رہ جاتی اور اللہ کی مخلوق جہل کی ظلمتوں سے کبھی باہر نہ نکل سکتی۔

قرآن اور اسوۂ نبوی

اس کے علاوہ یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ قرآنِ حکیم صرف ایک علمی کتاب ہی تو نہیں جس کا مقصد صرف علمی طور پر اس کو حل کر لینا ہو، قرآن بنی نوع انسان کے لیے ایک دستور العمل بھی ہے جو زندگی کے ہر ہر شعبے کے لیے مکمل ضابطۂ حیات لے کر آیا ہے اس لیے قرآن کے معانی ومطالب سمجھ لینے کے بعد بھی ایک اہم ضرورت اور باقی رہتی ہے اور وہ ہے ان معانی ومطالب کی روشنی میں عملی زندگی کے راستے متعین کرنا اور زندگی کے ہر ہر شعبے میں ان معانی ومطالب کو روبہ عمل لانا اور یہ کام کسی معلّم کی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ بد

تو بالکل ہمارے مشاہدے کی بات ہے، دنیوی علوم میں بھی بہت سے علم ایسے ہیں جو عملی تجربوں کے بغیر سمجھ ہی میں نہیں آتے مثلاً طب اور ڈاکٹری کا علم انجینیرنگ کا فن یا دیگر سائنسی علوم و فنون کہ ان کے حقائق علمی طور پر بھی پوری طرح اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتے جب تک کہ عملی طور پر ان کو استعمال ہوتا ہوا نہ دیکھا جائے بلکہ خود ان کو عمل میں لا کر تجربہ نہ کر لیا جائے صرف ان کا پڑھ لینا ان کی پوری حقیقت سمجھنے کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔ عملی تجربے کے بغیر اوّل تو یہ علوم و فنون سمجھ ہی میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جائیں تو اس وقت تک ان کو صحیح طور پر عمل میں نہیں لایا جا سکتا جب تک ان کا عملی نقشہ سامنے نہ ہو۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ جب انسانی علوم کا یہ حال ہے تو ربانی علوم تو پھر ربانی علوم ہیں ان کی ذہنیں اور نزاکتیں اپنی تمام تر انواع اقسام کے ساتھ کسی ربانی معلّم کی تعلیم کے بغیر کیسے سمجھ میں آ سکتی ہیں۔

اس لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر اللہ تعالےٰ نے ہماری انتہائی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اگر ہماری یہ ضرورت پوری نہ کی جاتی تو کفر کی ظلمتوں سے باہر نکلنا محال تھا اور اسلام کے پاکیزہ عقائد اور خالص اعمال سے ہمارا مزین ہونا ناممکن تھا۔ قرآن بھیجا تو اس کو سمجھانے اور اس پر عمل کرانے کے لیے ایک معلّم بھی بھیجا اور اس کو قرآن کی مجسم تفسیر بنا دیا اور ہمیں بتا دیا کہ اس عملی تفسیر کی روشنی میں قرآن کو سمجھتے اور اس کے احکام پر عمل کرتے چلے جاؤ۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب: ۲۱)۔	تمہارے لیے اللہ کا رسول بہترین نمونہ ہے۔

کہ اس نمونے کو سامنے رکھ کر کارگاہ حیات میں اپنے اعمال کو ڈھالتے چلے جاؤ جہاں کہیں کوئی عملی الجھن پیش آئے اس مکمل نقشۂ عمل کو دیکھ دیکھ کر دور کر لو۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو صرف کسی خاص شعبۂ حیات کا ہی نمونہ نہیں بنایا گیا بلکہ جو کچھ قرآن میں کہا گیا وہ سب آپ کی زندگی میں دکھلا دیا گیا۔ کسی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا آپ کے اخلاق کیا تھے حضرت عائشہ رضی نے

جواب میں فرمایا کان خلقہ القرآن یہ قرآن ہی آپ کا خلق تھا، خلق میں سب کچھ آگیا اقوال، افعال، تقریرات۔ مطلب یہ کہ آپ کا کوئی قول کوئی فعل ایسا نہ تھا جو قرآن سے باہر ہو۔ آپ کے اسی خلق کو پورے عالم کے لیے اسوۂ حسنہ کہا گیا، اسی خلق کا نام حدیث ہے، اسی خلق نبوی کو ہم سنت نبوی کے نام سے جانتے ہیں اس خلق نبوی کی مدد کے بغیر ہم قرآن کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اسکی مرادات پر صحیح صحیح عمل کر سکتے ہیں۔

حدیث کے بغیر قرآن فہمی

کتنے کوتاہ فہم ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ حدیث کی مدد کے بغیر بھی قرآن کی مرادات معلوم کی جاسکتی ہیں حدیث کے بغیر قرآن فہمی کا دعویٰ کرنے والوں کے سامنے ہم چند آیات قرآنی پیش کرتے ہیں وہ ہمیں حدیث کے ذخیرے سے مدد لیے بغیر ان آیات کا صحیح صحیح مطلب سمجھا کر دکھائیں۔

قرآن کریم کی ایک آیت ہے

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (الحجر: ۸۷)	ہم نے آپ کو سبع مثانی مرحمت فرمائیں اور قرآن عظیم دیا۔

حدیث کے بغیر قرآن فہمی کا دعویٰ کرنے والے ذرا بتلائیں کہ اس آیت میں سبع مثانی سے کیا مراد ہے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ بھی کوئی ذریعہ ہے جس کی مدد سے آپ یہ بتلا سکیں کہ بار بار دوہرائی جانے والی یہ سات چیزیں کیا ہیں کیا صرف اپنی عقل کی مدد سے کوئی شخص اس آیت کی صحیح مراد متعین کر سکتا ہے؟ یہ حدیث ہی تو ہے جس نے ہمیں بتایا کہ سبع مثانی سے قرآن کی سات آیات مراد ہیں، پھر ان سات آیات کی تعیین بھی ہمیں حدیث ہی سے معلوم ہوئی کہ یہ وہ سات آیات ہیں جن پر سورۂ فاتحہ مشتمل ہے۔

اب ذرا تھوڑی دیر کے لیے تصور میں لائیے کہ حدیث کو علیحدہ کرکے اگر اس آیت کی مراد متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو کیا حال ہو۔ ہر شخص کی سوچ مختلف ہوتی ہے

جیسی سوچ ہوتی سبع مثانی کی مراد بھی اسی طرح کی متعین کی جاتی کیا یہ حقیقت نہیں کہ جتنے منہ ہوتے اتنی ہی اس سلسلے میں باتیں کی جاتیں؟ کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان ہدایت پر نظر کرتے ہوئے سات حکمتیں بیان کرتا تو کوئی آپ کی جنگی فتوحات کو دیکھتے ہوئے سات بڑے بڑے غزوات گنواتا، ممکن تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامہ کو سامنے رکھتے ہوئے سبع مثانی کی تشریح کرتے ہوئے سات عالم تلاش کیے جاتے یا بعد کے زمانے میں سبع مثانی کی تفسیر میں صحابہ کے دور کے سات مفتوحہ ممالک شمار کرائے جاتے۔ یہ سب اور اسی قسم کی لاتعداد خیال آرائیاں عین ممکن تھیں پھر ان سب کو درست قرار دینے کے لیے نہ معلوم کتنی مزید حاشیہ آرائیاں ہوتیں، مثانی کے لفظ کی جو مکرّر کے معنی میں ہے نہ جانے ان تمام خیال آرائیوں کے ضمن میں کیا کیا توجیہات پیش کی جاتیں۔ پھر ہر کوئی اپنی بیان کی ہوئی مراد، اپنی پیش کی ہوئی تشریح وتفسیر اور اپنی اختیار کی ہوئی توجیہ کو درست قرار دینے پر اصرار کرتا اور کوئی ذریعہ ہمارے پاس ایسا نہ ہوتا جس سے ہم کسی ایک کو صحیح یا غلط قرار دے سکتے۔ خوش قسمتی سے اگر سبع مثانی سے سات قرآنی آیتیں مراد لے بھی لی جاتیں تو پھر یہ جھگڑا چلتا کہ یہ سات آیتیں کونسی ہیں اور پھر اس بارے میں خیال آرائیاں ہوتیں، حاشیے لگائے جاتے غرض تشریحات و توجیہات کا انبار ہوتا اور ہم پھر اس گومگو کی حالت میں ہوتے کہ کس کو صحیح جانیں اور کس کس کو غلط سمجھیں۔

ذرا غور تو کیجیے کہ حدیث کی مدد کے بغیر صرف ایک لفظ کی تفسیر میں کیسی ہزار داستان تیار ہوتی اور قرآن کی اصل مراد ان داستانوں میں ایسی دفن ہوتی کہ قیامت تک سراغ نہ ملتا۔

اسی طرح قرآن کریم کی ایک اور آیت کے ضمن میں اس حقیقت کو بولتا ہوا دیکھئے کہ حدیث کے بغیر قرآنی آیات کی صحیح مراد کا متعین ہونا ممکن ہی نہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرۃ: ۱۴۲)	ایسا ہی ہم نے تم کو امت وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور تمہارا رسول تمہارے لیے گواہی دے۔

اس آیت کے الفاظ سے اوّل تو یہی پتہ نہیں لگتا کہ یہ گواہی کا واقعہ کب اور کہاں واقع ہوگا، حدیث کی مدد کے بغیر اس کی تعیین میں جو کچھ خیال آرائیاں و تنوع میں آ سکتی ہیں ان کا اندازہ کچھ مشکل نہیں دوسرے بالفرض والمحال بغیر کسی اختلاف کے یہ متعین کر بھی لیا جائے کہ یہ گواہی قیامت میں واقع ہوگی اگرچہ اس کا کوئی امکان نہیں کہ اختلاف کے بغیر ایسی کوئی تعیین وجود میں آجائے تاہم کچھ دیر کے لیے فرض کیے لیتے ہیں کہ اس پر سب متفق ہو گئے کہ یہ گواہی حشر کے روز ہوگی تو حدیث کی مدد کے بغیر یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اس گواہی کی نوعیت کیا ہوگی، امتی کس بات کی گواہی دیں گے اور ہم پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کس سلسلے میں گواہ ہوں گے۔ اس کے علاوہ الناس کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ یہ گواہی پوری مخلوق انسانی کے لیے ہوگی۔ ایک نبی کا پوری مخلوق انسانی کے لیے گواہ ہونا تو کچھ سمجھ میں آ بھی سکتا ہے مگر ایک عام مسلمان ایسے لوگوں پر کیسے گواہ بن سکتا ہے جن کو اس نے نہیں پایا۔ یہ گتھی ذرا حدیث کی مدد کے بغیر کوئی سلجھا کر تو دکھائے۔ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن فہمی کا دعویٰ کرنے والے اپنی عقل کے جتنے گھوڑے دوڑائیں گے دھول ہی دھول اڑائیں گے منزلِ مقصود تک قیامت تک نہ پہونچ سکیں گے۔

اس گتھی کو اگر کسی نے سلجھایا ہے تو صرف حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم نے حدیث نے ہمیں بتایا کہ میدان حشر میں جب تمام انبیاء علیہم السلام کی امتیں اپنے اپنے انبیاء کی ہدایت و تبلیغ سے مکر جائیں گی اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی اور نہ کوئی نبی ہی ہمارے پاس کوئی ہدایت لے کر آیا تو رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہارا کوئی گواہ ہے وہ کہیں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت۔ اس وقت پہلے امت محمدیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے گواہی میں پیش ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ بلاشبہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانے میں اللہ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہونچائی تھی۔

یہاں تک تو حدیث سے یہ معلوم ہوا ہے کہ متذکرہ گواہی کا واقعہ میدانِ حشر میں ہوگا مگر ابھی اس گتھی کا سلجھنا باقی ہے کہ ایک عام مسلمان ان لوگوں کے بارے میں کیسے گواہی

دے سکتا ہے جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں، یہ گتھی بھی حدیث ہی سلجھاتی ہے، سنئے!

حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ امت محمدیہ کی جانب سے گواہی دئے جانے پر دوسری امتیں جرح کریں گی کہ ان لوگوں کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا ان کی گواہی ہمارے مقابلے میں کیسے قبول کی جا سکتی ہے، اس جرح کے جواب میں امتِ محمدیہ کہے گی کہ ہمیں ایک صادق مصدّق رسول نے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے خبر دی تھی، ان کی خبر کو ہم معائنے اور مشاہدے سے زیادہ سچا جانتے ہیں اس لیے ہم حق بجانب اور سچے ہیں اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے اس قول کی توثیق کریں گے اور گواہی دیں گے کہ بے شک انہوں نے درست کہا ہے۔

دیکھ لیجیے وہ گتھی جس کو عقل سلجھانے سے عاجز تھی، حدیث کی مدد سے کیسی آسانی سے سلجھ گئی۔ محشر کے اس واقعے کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی، نسائی اور مسند احمد کی متعدد احادیث میں مجملاً اور مفصلاً مذکور ہے۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں متلاشی حق کو تو یہ دو بھی بہت کافی ہیں تاہم معاندین کی تسلی کے لیے ایک دو مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں۔ قرآن کریم نے قیامت کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ۔ (ابراہیم : ۴۸)	اس روز جس روز زمین اپنی حالت سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی۔

یا اسی طرح سورۂ زمر میں ہے

وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِينِهِ (الزمر: ۶۷)	اور قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہونگے۔

ان آیات کے مفہوم پر نظر کرتے ہوئے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ قیامت کے روز جب آسمان اور زمین دونوں اپنی حالت پر نہ ہوں گے؛ ایک طرف زمین اپنی موجودہ حالت سے بدل دی جائے گی اور اللہ کی مٹھی میں ہوگی دوسری طرف آسمان بھی لپیٹ

دئے جائیں گے تو یہ ساری مخلوق آخر اس وقت کہاں ہوگی۔

حدیث کے بغیر قرآن فہمی کے مدعی ذہن میں ابھرنے والے اس فطری سوال کا جواب دیں یہ بہانہ قابلِ تسلیم نہ ہوگا کہ اس قسم کے سوالوں کے جوابات معلوم کرنے کی ہمیں ضرورت ہی کیا ہے اس لیے کہ اوّل تو یہ سوال معاد سے متعلق ہے اور معاد سے متعلق سوال بھی اگر غیر ضروری ہے تو پھر ضروری کسے کہیں گے علاوہ ازیں قرآن فہمی کے سلسلے میں پیدا ہونے والے سوالات خواہ وہ کسی قبیل سے ہوں ہر حالت میں جواب کے متقاضی ہیں ورنہ قرآن فہمی ناقص ٹھہرتی ہے۔

حدیث کے بغیر اس سوال کا جو جواب بھی دیا جائے گا اس کی حیثیت اندھیرے میں پھینکے جانے والے تیر سے زیادہ نہ ہوگی۔ یقینی جواب لینا ہے تو حدیث کا رُخ کیے بغیر چارہ نہیں۔ حدیث ہی ہمیں بتلاتی ہے کہ اسی قسم کی آیات کے سلسلے میں صحابہ نے ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایسی صورت میں جب زمین و آسمان لپیٹ دئے جائیں گے تو مخلوقِ خدا کہاں ہوگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پُل صراط پر۔

انصاف سے کہیئے یہ جواب محض عقل کی بنیاد پر دیا جانا ممکن ہے یہ یقین و اذعان سے بھرا ہُوا جواب یقیناً منزل من اللہ ہے، ایسا جواب صرف ایسی ہستی ہی کی زبان سے نکل سکتا ہے جو مؤید من اللہ ہو۔

حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنے والوں سے آخرت ہی سے متعلق ایک اور سوال ہے اپنی عقل و دانش پر ناز کرنے والے ذرا حدیث کے بغیر اس سوال کا جواب دے کر دکھائیں۔ قرآن کہتا ہے کہ قیامت میں حق تعالےٰ کا دیدار ہوگا۔

وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (القیمۃ: ۲۳-۲۲)	اس دن بہت (لوگوں کے) منہ تر و تازہ ٹکٹکی لگائے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا دیدار ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں مگر یہ دیدار کس طور پر ہوگا اس کی تفصیل سمجھنے میں دِقّت پیش آتی ہے کیونکہ دنیا میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ اجتماع کے وقت کسی ایک شخص کو اطمینان سے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا تو قیامت کے میدان میں جہاں

اوّلین و آخرین کا اتنا بڑا اجتماع ہوگا کہ جمع ہونے والوں کی تعداد حدِ شمار سے باہر ہوگی جہاں اکیلے خدا کا دیدار باطمینان کیلئے ممکن ہوگا کیا یہ لاتعداد انسانوں کا اجتماع ایک دوسرے کی گردنیں پھلانگتا پھرے گا کیا دیدارِ الٰہی کی کوشش میں وہاں اربوں انسانوں کے کاندھے ایک دوسرے سے چھل رہے ہوں گے اور اس پر بھی کہا یقین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب اہلِ محشر دیدارِ الٰہی سے فیض یاب ہو سکیں گے ؟ یہ تخیلات یہ سوالات ہر اس مومن کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں جو عشق کے جذبے سے دیدارِ الٰہی کا مشتاق ہے ۔

عقل کے سہارے جو جواب بھی ان تفصیلات کا دیا جائے گا قیاس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی لیکن زبانِ نبوی سے اس کا جواب سنتے ہی آپ کی تشفی ہو جائے گی صحابہ کے ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ دیکھو آفتاب اور چاند تمہارے سامنے ہیں جس طرح بغیر کسی رکاوٹ کے بیک وقت کروڑوں انسان ان دونوں کو دیکھا کرتے ہیں اس سے زیادہ صفائی اور اطمینان کے ساتھ تم اپنے رب کو محشر میں دیکھو گے ۔

دیکھ لیجئے اس جواب سے تخیلات کے بادل کیسے ہوا میں اُڑ گئے محض عقل پر چھوڑ دیا جاتا تو یہ بادل گہرے سے گہرے ہوتے جاتے اور گھٹا ٹوپ اندھیروں کے سِوا کچھ ہاتھ نہ آتا ۔

کہاں تک مثالیں دی جائیں جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اس ضمن میں قرآن سے بڑی مثالیں دی جا سکتی ہیں مگر یہ مثالیں اسی پر اثر کریں گی جو حق کا متلاشی ہو ۔ جس نے حق کو جان کر بھی نہ ماننے کی قسم کھائی ہوئی ہو اس کا اطمینان تو کسی طرح ممکن ہی نہیں ۔ ہاں خدا ہی ہدایت عطا فرما دے تو الگ بات ہے ۔ بہر حال ہمارا کام پہونچا دینا ہے اسی لیے

ع ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

قصہ طلب آیات اور احادیث

حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کو سمجھنے کا دعویٰ کرنے والوں سے ایک اور بات دریافت طلب ہے ۔ قرآن کریم میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں کسی نہ کسی خاص قصے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اکثر و بیشتر ان واقعات کا متعلقہ آیاتِ قرآنی سے اس قدر گہرا تعلق ہے کہ جب تک وہ پورا واقعہ معلوم نہ ہو ان آیات کا پورا مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا ۔ احادیث میں

ان قصوں کی پوری تفصیل موجود ہے - اگر احادیث سے مدد لیتے ہیں منکرین حدیث کو عار آتی ہے تو وہ اپنی عقل سے ان آیات کا پورا پورا صحیح مفہوم واضح کر کے دکھائیں - ہم ان آیات میں سے چند ایک صرف نمونے کے طور پر پیش کیے دیتے ہیں شاید منکرین حدیث اپنی غلطی کی حقیقت سمجھ کر سیدھے راستے پر لوٹ آئیں سورۂ توبہ میں ہے -

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا الخ (توبہ : ۱۱۸)	اور ان تینوں پر بھی (توجہ فرمائی) جن کا معاملہ ملتوی رکھا گیا تھا

حدیث سے مدد لیے بغیر ذرا اس آیت کا پورا پورا مفہوم سمجھا کر دکھلائیے - یہ بتلائیے کہ یہ تین شخص کون ہیں جن کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے ان کا کیا قصہ تھا ان کے معاملے کو ملتوی کیوں رکھا گیا - اسی آیت میں آگے آتا ہے کہ ان پر زمین باوجود کشادگی کے تنگ ہو گئی تھی " حدیث کے بغیر یہ معمہ حل کیجئے کہ ان پر ایسی کیا مصیبت آ پڑی تھی جس کی وجہ سے اللہ کی اتنی وسیع زمین انہیں تنگ نظر آنے لگی؟

اس آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے ان تمام سوالوں کا جواب ضروری ہے اور وہ حدیث سے مدد لیے بغیر ممکن نہیں - یا آیت کو اسی طرح تشنہ چھوڑ دیجئے یا ہر کہ ومہ کی رائے پر چھوڑ دیجئے وہ جو چاہے ان سوالوں کے جواب میں اپنے طور پر قرار دے لے یا پھر مانئے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن فہمی ممکن نہیں - تبلائیے ان میں سے کونسی بات قرین عقل اور تقاضائے انصاف ہے؟ یقیناً آخری بات مانے بغیر چارہ نہیں کہ حدیث کے بغیر قرآن کا سمجھنا ناممکن ہے -

ممکن ہے منکرین حدیث کہیں کہ اس قسم کی آیات کی تفسیر کی حد تک تو ہم حدیث کی اہمیت کو مانتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ ان آیات سے متعلقہ احادیث بھی انہی سندوں اور انہی طریقوں سے روایت ہو کر ہم تک پہونچی ہیں جن سے وہ دیگر احادیث روایت ہوئی ہیں جن کو ماننے میں ان کو اعتراض ہے اگر یہ سندیں صحیح ہیں تو ان کو دونوں جگہ درست مانئے اور اگر غلط ہیں تو دونوں جگہ غلط قرار دیجئے - یہ دورنگی کیسی! جہاں اپنا مطلب پورا ہوتا نظر آئے اقرار کر لیا اور جہاں مطلب برآری نہ ہو انکار کر دیا کچھ تو انصاف سے کام لیجئے -

اسی طرح قرآن پاک کی ایک اور آیت کا حوالہ پیشِ خدمت ہے۔ منکرین حدیث احادیث کے ذخیرے سے مدد لیے بغیر اس آیت کا پورا مفہوم واضح کر کے دکھائیں۔

سورۂ احزاب میں ہے۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۝ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا (الاحزاب: ۲۷-۲۶)

اور جن اہلِ کتاب نے ان کی مدد کی تھی (اللہ نے) انہیں ان کے قلعوں سے اتار دیا اور ان کے دلوں میں (تمہارا) رعب بٹھا دیا (پھر) بعض کو تم قتل کرنے لگے اور بعض کو قید کر لیا اور تمہیں مالک بنا دیا ان کی زمین کا اور ان کے گھروں کا اور ان کے اموال کا اور اس زمین کا بھی جس پر تم نے (ابھی تک) قدم نہیں رکھا ہے۔

حدیث کے بغیر اگر قرآن کو سمجھا جا سکتا ہے تو پھر ذرا بتلائیے یہ مدد کرنے والے کون لوگ تھے انہوں نے دشمنانِ اسلام کی مدد کس طور پر کی تھی، وہ قلعے کہاں تھے جہاں سے ان مدد کرنے والوں کو اللہ نے نکال باہر کیا، ان کے قتل اور قید کیے جانے کی تفصیلات کیا ہیں وہ زمین اور وہ جائداد کہاں تھی جس کو مسلمانوں کے قبضے میں دے دیا گیا نیز ان دوسری زمینوں کا اتہ پتہ بھی بتائیے جہاں اس وقت تک مسلمانوں کے قدم نہیں پہونچے تھے مگر ان کے وارث بنا دیے گئے۔

انصاف سے بتلائیے احادیث سے قطع نظر کر کے کیا ان تمام باتوں کا جواب دیا جا سکتا ہے؟ کیا احادیث سے انکار کر کے اس آیت قرآنی اور اس قسم کی لاتعداد آیاتِ قرآنی کا واضح اور متعین مفہوم سمجھنا ممکن ہے؟ کیا صرف قرآن سے ان سوالات کا جواب مل سکتا ہے؟ کیا احادیث کی طرف رجوع کے علاوہ کوئی دوسری صورت بھی ان تمام باتوں کے معلوم کرنے کی ہے؟ جو شخص بھی جویائے حق اور طالبِ ہدایت ہوگا وہ برملا کہہ اٹھے گا کہ صرف اور صرف احادیث ہی وہ ذریعہ ہیں جو اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں۔

منکرین حدیث کو اگر ذرا بھی حق کی طلب ہے تو ان چند مثالوں سے ہی انہیں اپنے اس دعوے کی غیر معقولیت کا اندازہ ہو جانا چاہیئے کہ حدیث کے بغیر قرآن فہمی ممکن ہے ۔ اس قسم کی مثالیں قرآن مجید سے اور بھی بہت سی پیش کی جا سکتی ہیں مگر ہمارا مقصود ان مثالوں کا احاطہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کا اظہار کرنا مقصود ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنا ناممکن ہے اور یہ مقصود ان چند مثالوں سے بھی پورا ہو جاتا ہے ۔

حدیث کے بغیر دین نامکمل ہے

حدیث درحقیقت چونکہ قرآن ہی کی دوسری ایک مفصل شکل ہے، جیسا کہ ہم نے ابتدا میں عرض کیا وہ قرآن کے مجملات کی تفصیل، اس کی مشکلات کا بیان اور اس کے مختصر اشارات کی شرح ہے اس لیے صرف اتنا ہی نہیں کہ حدیث کے بغیر قرآن کی چند آیات کا مفہوم سمجھ میں نہ آتا ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے بغیر دین کا پورا خاکہ ہی تیار نہیں ہو سکتا اور اس لحاظ سے حدیث کے بغیر دین ہی نامکمل رہتا ہے ۔

حدیث کا انکار کرنے والے اگر سمجھتے ہیں کہ حدیث سے مدد لیے بغیر دین کی تکمیل ممکن ہے تو ہم ان کو دعوت دیتے ہیں آگے بڑھیں اور فقط قرآن کریم سے دین اسلام کے عقائد و عبادات، حلال و حرام کے احکام، معاشیات و معاشرت کی تفصیلات نکاح و طلاق کے مسائل، تجارت و سیاست کے ضابطے اور احکام جہاد و خراج وغیرہ کا مکمل نقشہ تیار کر کے دکھائیں ۔ دین کا مکمل نقشہ تو بہت دور کی بات ہے وہ نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ ان چار ارکان دین ہی کے تفصیلی احکام صرف قرآن سے متعین کر کے دکھا دیں ۔

ارکانِ دین اور حدیث

مثال کے طور پر قرآن نے جا بجا نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے ۔ حدیث کے ذخیرے سے مدد لیے بغیر ذرا بتلایئے تو سہی کہ نماز ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اللہ کے اس تاکیدی حکم کی تعمیل آخر کس طریقے پر کی جائے ایسا تاکیدی حکم کہ قرآن میں ستر سے زیادہ مقامات پر اس کا کسی نہ کسی پیرائے میں

ذکر کیا گیا ہو۔ ذرا بتلائیے، صرف قرآن کی مدد سے بتلائیے کہ نماز پڑھنے والا نماز کے لیے ابتدا میں ہاتھ اٹھائے تو کس طرح، ہتھیلیوں کا رُخ کس جانب ہو، ہاتھ کہاں تک اٹھائے، اٹھاتے وقت کیا کہے، پھر ہاتھ چھوڑ دے یا باندھ لے، باندھے تو کیسے اور کہاں، کھڑے ہونے کی حالت میں کیا پڑھے، رکوع میں کیا کہے، رکوع ایک کرے کہ دو، سجدے میں کیا پڑھے، سجدوں کی تعداد کتنی ہو، نماز میں رکوع پہلے ہے کہ سجدہ، قیام پہلے ہے کہ قعدہ، قعدہ میں کیا دُعائیں پڑھے، نماز سے باہر کس طرح آئے، سلام پھیرے تو پہلے دائیں طرف پھیرے کہ بائیں طرف؟ یہ اور اسی قسم کی تمام تفصیلات قرآن نے تو کہیں بیان نہیں کیں، قرآن نے یہ بھی نہیں بتایا کہ نمازوں کے اوقات کی صحیح تعیین کیا ہے، کونسی نماز کا وقت کس وقت شروع ہوتا ہے اور کس وقت ختم ہو جاتا ہے، قرآن نے رکعات نماز بھی متعین کر کے کہیں نہیں بتلائیں۔ قرآن سے آپ کو یہ بھی نہیں معلوم ہو سکے گا کہ نماز میں بھول ہو جائے تو کیا کیا جائے، کن کن صورتوں میں نماز فاسد ہو جاتی ہے، نماز کا وقت قضا ہو جائے تو کیا کرے، کن کن اوقات میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور کن اوقات میں حرام ۔ یہ تمام تفصیلات آپ کو حدیث ہی کے ذخیرے سے ملیں گی ۔

اسی طرح روزے کے تفصیلی احکام محض قرآن سے معلوم نہیں کیے جا سکتے کیا صرف قرآن سے کوئی بتا سکتا ہے کہ کن کن حالات میں روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور کن صورتوں میں کفارہ لازم آتا ہے ۔ کیا حدیث کی مدد کے بغیر یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کن لوگوں کے لیے روزہ رکھنے کے بجائے فدیہ دے دینے کی اجازت ہے، وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بنا پر روزہ نہ رکھنا جائز ہے وہ کونسی صورتیں ہیں جن میں رکھا ہوا روزہ توڑ دینے کی اجازت ہے؟ اسی قسم کی جتنی تفصیلات روزے سے متعلق ہیں وہ قرآن نے تو کہیں بیان نہیں کیں ۔

نماز اور روزے ہی پر آپ دو دُوسرے ارکان حج اور زکوٰۃ کو بھی قیاس کر لیجئے۔ حج اور زکوٰۃ کا حکم تو آپ کو قرآن میں مل جائے گا مگر مناسکِ حج اور مسائل زکوٰۃ معلوم کرنے کے لیے آپ کو حدیث ہی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ قرآن آپ کو یہ نہیں بتائے گا کہ

حج ادا کرنے کے کتنے طریقے ہیں' احرام میں کتنے کپڑے ہوتے ہیں حدود میقات کیا کیا ہیں' مناسکِ حج کس ترتیب سے ادا کیے جاتے ہیں' طواف میں کتنے چکر ہیں اور سعی کتنے شوط کی ہے رمل کسے کہتے ہیں اور کس طرح کیا جاتا ہے' رمی کرنے کا طریقہ کیا ہے' قربانی کب اور کس طرح دینی ہے' حج کی جنایات کیا کیا ہیں۔ غرض حج سے متعلقہ تفصیلی احکام قرآن میں آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔ اسی طرح قرآن میں زکوٰۃ کا حکم تو ملے گا مگر زکوٰۃ کا نصاب' اس کی شرح اور اس کی مدت وغیرہ معلوم کرنے کے لیے حدیث سے رجوع کیے بغیر چارہ نہیں۔ صرف قرآن کی مدد سے کوئی نہیں بتا سکتا کہ مختلف قسم کے اموال پر زکوٰۃ کے مختلف نصاب کیا کیا ہیں اور ہر ایک مال پر زکوٰۃ کس کس شرح سے ادا کی جاتی ہے' حیوانات کی کیا زکوٰۃ ہے اور زمین کے پیداوار کی کیا ہے عشر اور خراج کے مسائل کیا ہیں۔ ان تمام تفصیلات کے لیے حدیث کا ذخیرہ ہی ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

ان ارکانِ دین نماز روزہ حج اور زکوٰۃ ہی پر موقوف نہیں حدیث کی مدد کے بغیر دین کا کوئی شعبہ بھی مکمل نہیں ہوتا' معاشرت ہو یا معیشت' سیاست کے امور ہوں یا تجارت کے معاملات' اخلاق کی بات ہو یا حقوق و فرائض کی' دین کے ہر ہر شعبے کا پورا نقشہ عمل تیار کرنے کے لیے ہم حدیث کے محتاج ہیں۔

حدیث کا انکار کرنے والوں سے کوئی پوچھے کہ حدیث کو چھوڑ کر آپ دین کو آخر کیا شکل دینا چاہتے ہیں کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ نماز نماز نہ رہے اور روزہ روزہ نہ کہلا سکے حج اور زکوٰۃ اپنا وجود کھو بیٹھیں' دین کا پورا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ ملّتِ اسلامیہ منتشر ہو کر رہ جائے۔ ہر شخص قرآن کی ایک الگ تفسیر اور دین کا ایک علیحدہ ڈھانچہ لیے پھرے اور کوئی کسی کو غلط یا درست کہنے والا نہ رہے۔

انکارِ حدیث ابطالِ دین کے مترادف ہے

حدیث سے قطع نظر کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ حدیث کا انکار کر کے قرآن کی تفسیر قرآن کی تحریف بن جائے گی۔ ہر شخص اپنی سوچ کے مطابق قرآن

کی مرادات متعین کرے گا اور پھر اس پر اصرار کرے گا کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے وہی درست ہے، دین ایک کھیل بن جائے گا۔

ان منکرین حدیث نے دین کو واقعی ایک کھلونا سمجھا ہوا ہے۔ حدیث کے بغیر ان کی قرآن فہمی کا ایک شاہکار ملاحظہ کیجیے۔ دیکھئے اور عبرت پکڑیئے۔

شیخ عبداللہ چکڑالوی صاحب نے جن کو منکرین حدیث کے یہاں امام کا درجہ حاصل ہے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "برہان القرآن علی صلوٰۃ القرآن" یہ کتاب تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب میں شیخ صاحب نے حدیث کی مدد کے بغیر نماز کے تفصیلی احکام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ شیخ صاحب کی اس کوشش کا سب سے مزیدار پہلو یہ ہے کہ اپنی متعین کردہ نماز کی جس کو وہ صلاۃ القرآن کہتے ہیں جو ترکیب انہوں نے لکھی ہے وہ اس کو قرآن سے ثابت نہیں کر سکے، پہلے ہی قدم پر حدیث کی احتیاج کاش وہ دیدۂ عبرت نگاہ سے بہرہ ور ہوتے۔ اس کے علاوہ اپنی نماز میں انہوں نے بجائے تسبیحات کے آیات قرآنیہ رکھی ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ تکبیر اولیٰ کی جگہ وان اللہ ھو العلی الکبیر پڑھا جائے، ثنا یعنی سبحٰنک کی بجائے انی وجھت وجھی للذی الخ پڑھیں، اسی طرح ہر موقع پر انہوں نے مختلف آیات قرآنی تجویز کی ہیں مگر مزے کی بات یہ ہے کہ یہ نہ بتلا سکے کہ ان آیات کا تعین انہوں نے قرآن کی کس آیت کے حکم کے تحت کیا ہے۔ پھر صرف ایک نماز ہی کے معاملے میں ان کے آپس کے اختلافات کا عالم دیکھئے۔ شیخ چکڑالوی صاحب کو قرآن سے پانچ وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے جبکہ ان کے شاگردوں کو قرآن میں صرف دو وقت کی نماز نظر آتی ہے، شیخ صاحب کے نزدیک رکعات نماز کی تعداد دو بھی ہے تین بھی اور چار بھی مگر شیخ صاحب کے مریدین مصر ہیں کہ قرآن سے تعداد رکعات صرف دو ثابت ہوتی ہیں۔ اذان کے سلسلے میں بھی ان کے اختلافات کی بوالعجبی کچھ اس سے زیادہ ہی ہے۔ شیخ عبداللہ چکڑالوی صاحب اذان کے منکر تھے اس کو کفر و شرک خیال کرتے تھے لیکن ان کے خلیفہ شیخ حشمت علی نے اپنے شیخ کے علی الرغم ایک اذان اپنی طرف سے ترتیب دے لی اس کے لیے انہوں نے چند آیات قرآنی ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی وغیرہ جمع کیں اور ان کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کر کے اس مجموعہ کا نام اذان رکھ دیا مگر وہ بے چارے بھی یہ نہ بتا سکے کہ مختلف آیات کا

یہ تعین اور یہ ترتیب قرآن کی کس آیت سے ثابت ہوتی ہے۔ جب آیات کے تعین اور ترتیب کے لیے کوئی دلیل ہی نہیں تو عین ممکن ہے کل کلاں کو شیخ حشمت علی صاحب کے خلیفہ اٹھیں اور اذان کے لیے کسی دوسری آیات کا انتخاب کریں اور اپنی مرضی کی ترتیب انہیں عطا فرمائیں۔

غور فرمایا آپ نے حدیث سے قطع نظر کرتے کے بعد قرآن کی تفسیر کا یہ حال ہوتا ہے قرآن کے صرف دو لفظوں کی تفسیر میں اس قدر اختلافات رونما ہو گئے اور وہ بھی اُستاد اور شاگرد کے درمیان ع آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ذرا اس دعوے پر بھی غور کیجیے کہتے ہیں کہ قرآن میں سب کچھ ہے قرآن کو مزید کسی تشریح کی ضرورت ہی نہیں۔ اقیموا الصلوٰۃ کا ترجمہ کرتے کرتے تو شیخ چکڑالوی صاحب اس کی تشریح میں چارسو صفحات لکھ گئے اور دعویٰ یہ کہ قرآن کو کسی تشریح کی ضرورت نہیں؟ قرآن کے صرف ایک فقرے کو سمجھانے کے لیے چارسو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب تیار کرنی پڑی کیا اسی طرح قرآن میں سب کچھ موجود ہے؟ اگر ان احادیث کو جمع کیا جائے جو نماز سے متعلق ہیں تو اس سے نصف ضخامت کی کتاب بھی مرتب نہ ہو۔ کاش منکرین حدیث کچھ تو عقل سے کام لیتے مگر نہیں! یہ لوگ عقل ہی سے تو کام لے کر اپنی اغراضِ نفسانی پورا کرنے کی راہیں نکال رہے ہیں۔ کاش ان کو عقلِ سلیم نصیب ہوتی جو وحی کی روشنی میں چکا چوند ہونے کے بجائے اور چمک اُٹھتی اور ان کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکتی۔

انکار حدیث اور حلال و حرام کی تمیز

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ منکرین حدیث اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں، ان کو اتنا بھی احساس نہیں کہ حدیث کو درمیان سے نکال دیا جائے تو دین کا وجود ہی اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہتا، حدیث کو ماخذ دین نہ مانا جائے تو نہ معتقدات اپنی جگہ پر برقرار رہتے ہیں نہ عبادات نہ معاملات، دین کا سارا نظام تلپٹ ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر اغراض کے بندوں کے ہاتھوں دین کا ایسا حلیہ بگڑتا ہے کہ اکثر حالات میں حلال و حرام تک کی تمیز باقی نہیں رہ سکتی۔ ہم نہیں سمجھتے کہ منکرین حدیث اس قدر جاہل ہوں گے کہ اتنی بات بھی نہ سمجھیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ماخذِ دین ہونے کی حیثیت سے حدیث کا اگر انکار کر دیا جائے تو بیشتر حالات میں حلال اور حرام خلط ملط ہو کر رہ جائیں۔ اس سلسلے میں بھی چند مثالیں ملاحظہ کرتے چلیے:

(۱) ذرا بتلائیے! دینِ اسلام میں پھوپی بھتیجی یا خالہ بھانجی کو ایک نکاح میں جمع کرنا حلال ہے یا حرام؟ ہر کوئی یہی کہے گا کہ حرام ہے۔ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے اگر کوئی شخص دوسرا نکاح کرنا چاہے تو وہ اپنی موجودہ بیوی کی بھتیجی یا اس کی بھانجی سے نکاح نہیں کر سکتا، شریعت نے ان دونوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے مگر حدیث کو دین کا ماخذ نہ ماننے والوں سے آپ پوچھیں گے تو انہیں یہی کہنے بن پڑے گی کہ حلال ہے۔ آپ تعجب کا اظہار نہ کریں یہ بالکل درست ہے، منکرِ حدیث کو یہ اقرار کیے بغیر چارہ نہیں کہ پھوپی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو ایک ساتھ اپنے نکاح میں رکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس میں ان دونوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام کہا گیا ہو قرآن نے تو صرف دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے۔

لیجئے بیٹھے بٹھائے ایک حرام چیز حلال ہو گئی۔ قصّہ دراصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے تو واقعی دو بہنوں کو ہی ایک نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے مگر اس کی علّت یہ ہے کہ اس وجہ سے ان میں رقابت کا جذبہ بیدار ہوگا اور فطری طور پر ان دونوں کے درمیان قطع رحمی پیدا ہو جائے گی جبکہ شرعاً دونوں بہنوں کے درمیان صلہ رحمی واجب تھی۔ حدیث نے اس علّت کے پیشِ نظر ان رشتوں کا بھی اسی حکم میں داخل ہونا بتلا دیا جن میں اس صلہ رحمی کے قطع ہونے کا خطرہ تھا یعنی جہاں کہیں بھی وہ علّت موجود تھی جو دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی حرمت کی اصل وجہ تھی حدیث نے وہاں وہاں ہی ان رشتوں کو یکجا جمع کرنا حرام قرار دے دیا۔ گویا جمع بین الاختین کی حرمت کا حکم دے کر قرآن نے ایک اصول تبلایا اور حدیث نے اس اصول کا اطلاق ہمیں سکھایا اور واضح کیا کہ خدا کی مُراد صرف یہ دو ہی رشتے نہیں بلکہ اس قسم کے اور رشتے بھی جہاں قطع رحمی کا خطرہ ہو یہی حکم رکھتے ہیں۔

(۲) اسی طرح شیر بھیڑیا ریچھ وغیرہ تمام درندے حرام ہیں شکاری پرندے باز شکرہ وغیرہ کو بھی شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ کسی جاہل سے جاہل مسلمان سے بھی آپ پوچھیں گے تو وہ ان جانوروں کا گوشت کھانے کو حرام ہی کہے گا مگر حدیث کا انکار کرنے والوں سے پوچھئے انہیں ان حرام جانوروں کو بھی حلال ماننا پڑتا ہے۔ حدیث سے قطع نظر کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ دراصل قرآن

نے حلال اور حرام سے متعلق ایک قاعدۂ کلیہ بتلا دیا ہے کہ جو چیزیں طیبات ہیں وہ حلال ہیں اور جو خبائث ہیں وہ حرام ہیں :

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (اعراف : ۱۵۷) (اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں جائز بتاتا ہے اور ان پر گندی چیزیں حرام رکھتا ہے) لیکن اب درندوں اور شکاری پرندوں کے بارے یہ قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو طیبات میں داخل سمجھا جائے یا خبائث میں شامل گنا جائے ۔ حدیث نے اس تذبذب کو رفع کیا اور قرآن کے اس حکم کی تشریح کی ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذِيْ نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ (کچلیاں رکھنے والے درندے) اور ذِيْ مِخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ (پنجوں والے شکاری پرندے) کے الفاظ سے درندوں اور شکاری پرندوں کا خبائث کے حکم میں درج ہونا بتلایا لیکن منکرین حدیث کو تو حدیث سے مدد لینا باعثِ عار ہے اس لیے ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ درندوں اور شکاری پرندوں کو حلال جانیں یا پھر حدیث کا اقرار کریں۔

اس مثال میں آپ اس حیثیت سے بھی غور کریں کہ اگر طیبات اور خبائث کی تشریح کو منکرین حدیث کی خواہش کے مطابق صرف عقل کے سپرد کر دیا جائے تو بات صرف درندوں اور شکاری پرندوں کے حلال ہو جانے تک ہی محدود نہیں رہتی ۔ حرام کھانے کے عادی لوگ تمام خبائث کو طیبات کہہ کہہ کر حلال بنا ڈالیں اور کوئی بھی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہو۔

(۳) ایک اور مثال پیشِ خدمت ہے شاید منکرین حدیث پر اپنی غلطی واضح ہو جائے ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ شراب اور اسی قسم کی دوسری نشہ آور چیزیں حرام ہیں ان میں تھوڑی اور زیادہ کا بھی کوئی فرق نہیں شراب کا جس طرح ایک پیگ یا ایک بوتل پینا حرام ہے اسی طرح ایک گھونٹ پینا بھی حرام ہے خواہ اس گھونٹ سے نشہ بھی نہ ہوتا ہو شراب نجس جو ہوئی قرآن کے الفاظ ہیں اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ (شراب جوا اور انصاب اور ازلام سب نجس ہیں) تو نجس چیز تھوڑی ہو یا زیادہ نجس ہی ہوتی ہے ۔ پیشاب کا ایک قطرہ بھی ناپاک ہی ہوتا ہے غرض نشہ آور چیزوں میں تھوڑی اور زیادہ کا کوئی فرق نہیں لیکن قرآن نے اس امر کی وضاحت کہیں نہیں کی ۔ اللہ تعالٰی نے جو چیزیں نشہ آور نہیں وہ حلال فرمائی ہیں اور جو نشہ آور ہیں وہ حرام کی ہیں یہ وضاحت

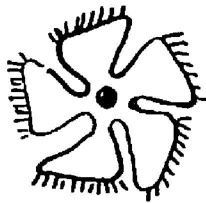
کہ جو چیزیں زیادہ مقدار میں استعمال کرنے سے نشہ پیدا کرتی ہیں ان کو تھوڑی مقدار میں استعمال کرنا بھی حرام ہے صرف حدیث نے کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا اَسْکَرَ کَثِیْرُہٗ فَقَلِیْلُہٗ حَرَامٌ (جن کی زیادہ مقدار نشہ لائے وہ تھوڑی بھی حرام ہیں) حدیث سے قطع نظر کی جائے تو یہ وضاحت نہیں ملے گی اور شراب کے رسیا گھونٹ گھونٹ کر کے شراب کو حلال قرار دیتے رہیں گے۔ آپ خود بھی دیکھ رہے ہیں موجودہ دور میں شراب کو حلال ہی نہیں مفید صحت قرار دیا جا رہا ہے اور منکرین حدیث ان کی تقویت کا باعث بن رہے ہیں۔

غرض حدیث کے بغیر قرآن فہمی انتہائی نامعقول بات ہے اور اس سے زیادہ غیر معقول یہ دعوی ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے زمانے میں اپنے اپنے حالات کی روشنی میں قرآن کے معانی و مطالب سمجھ سکتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بڑا احسان کیا ہے کہ اپنے کلام کی مرادات کی تلاش عقل انسانی کے ذمے نہیں ڈالی بلکہ ہم میں اپنا ایک رسول بھیج دیا جس نے وحی الٰہی کی روشنی میں کلام الٰہی کی مرادات متعین کر کے ہمیں بتلا دیں نہ صرف بتلا دیں بلکہ ان پر عمل کر کے ان کا عملی نمونہ ہم پہونچا دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے رسول کے ذریعے ہماری تعلیم و ہدایت کا سامان نہ کرتا اور مرادات قرآنی کی تعیین کو ہماری عقل پر چھوڑ دیتا تو ہم یقیناً مدت العمر قرآن کی صحیح مراد حاصل نہ کر پاتے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بالکل صحیح فرمایا کہ لَوْلَا السُّنَّۃُ مَا فَہِمَ اَحَدٌ مِّنَّا الْقُرْآنَ (اگر حدیث نہ ہوتی تو ہم میں سے کوئی بھی قرآن کو نہ سمجھتا) حدیث کے بغیر نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی کے احکام و مسائل مستور و مجہول نہ رہتے بلکہ نکاح، خلع، طلاق، جہاد و قتال اور صلح و جنگ وغیرہ کی حقیقت بھی ہم پر کبھی منکشف نہ ہو سکتی اور دین ایک کھلونا بن کر رہ جاتا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ قرآن جو ہدایت انسانی کے لیے نازل ہوا تھا نوع انسان کی گمراہی کا سبب بن جاتا۔

مگر اللہ کو تو اپنے بندوں کی ہدایت منظور ہے وہ ان کو گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتا کیسے چھوڑ دیتا اس نے قرآن کی اس طرح حفاظت کی کہ اس کے الفاظ کو بھی محفوظ رکھا اور اس کے معانی و مطالب اور اس کی مرادات کی بھی حفاظت کی اور یہی ہے وہ حفاظت جس کا

قرآن میں وعدہ کیا گیا تھا۔ صرف الفاظ محفوظ ہوتے تو یہ وعدہ پورا نہ ہوتا اسی طرح صرف معانی کی حفاظت سے اس وعدے کا ایفا صادق نہ آتا۔

غرض منکرین حدیث کے اس دعوے میں کوئی وزن نہیں کہ حدیث کے بغیر قرآن فہمی ممکن ہے۔ قارئین پر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ حدیث کے بغیر صرف یہی نہیں کہ قرآن فہمی ناممکن ہے بلکہ حدیث کے بغیر قرآن ہدایت کے بجائے گمراہی کا سبب بن جاتا ہے اسلام کی صحیح تصویر قرآن اور حدیث سے مل کر نمایاں ہوتی ہے' اسلام کی صحیح تعلیم قرآن اور حدیث کی باہمی توفیق و تطبیق سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن پاک اور حدیث دونوں مل کر ہی سرچشمۂ ہدایت ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں ایک کو مانیں اور ایک کا انکار کریں وہ صراطِ مستقیم سے دور ہیں ؛



حفظِ حدیث اور صحابہ

گذشتہ گفتگو کے نتیجے میں یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن فہمی ناممکن ہے صرف قرآن فہمی ہی ناممکن نہیں بلکہ حدیث کے بغیر دین نامکمل ہے اسلام کی پوری تصویر قرآن اور حدیث دونوں سے مل کر ہی تیار ہوتی ہے جو شخص قرآن کی اس آیت پر یقین رکھتا ہے کہ

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدة : ۳) ۔	آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین کے پسند کر لیا ۔

اور یہ مانتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دین کامل کر دیا اس کو یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ انکارِ حدیث ابطال دین کے مترادف ہے اور اسی طرح جو شخص قرآنِ حکیم کی اس آیت پر ایمان رکھتا ہے کہ

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب : ۴۰)	محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں البتہ اللہ کے رسول ہیں اور (سب) نبیوں کے ختم پر ہیں ۔

اور یہ یقین رکھتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سب سے آخری نبی ہیں اب دوسرا کوئی نبی آنے والا نہیں آپؐ پر نبوت ختم ہوگئی قیامت تک یہی نبوت قائم رہے گی تو اسے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حدیث کی حفاظت اتنی ہی ضروری ہے جتنی قرآن کی ۔ اگر حدیث کی حفاظت نہ ہو تو دین غیر محفوظ قرار پاتا ہے اور دین کا قیامت تک کے لیے محفوظ رہنا ضروری ہے کیونکہ اب نبوت کا دروازہ تو بند ہوگیا کہ ایک نبوت کے ختم ہونے اور ایک شریعت کے گم ہو جانے پر نئی نبوت اور نئی شریعت اس کے قائم مقام ہو جائے ۔

حدیث کی ضرورت ثابت ہو جانے کے بعد اب ہم پھر اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں اور اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ حدیث کی حفاظت کا تیسرا مرحلہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح انجام دیا۔ آپ کو یاد ہوگا ابتدا میں عرض کیا گیا تھا کہ حفاظت کا یہ تیسرا مرحلہ جس میں احادیث نبوی صحابہ سے چل کر تابعین تبع تابعین اور پھر بعد کے آنے والے محدثین کے واسطوں سے ہوتی ہوئی ہم تک پہونچی ہیں اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ منکرین حدیث کو حفاظت حدیث کے سلسلے میں زیادہ تر کلام اسی مرحلے میں ہے۔

حفاظتِ حدیث کے سلسلے میں منکرین حدیث کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تو قلم بند ہوئیں نہیں بلکہ صحابہ کے عہد میں بھی ان کو قید تحریر میں نہیں لایا گیا محض زبانی طور پر نقل در نقل کا سلسلہ جاری رہا۔ کتابی شکل میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث عہد نبوی سے تقریباً دو سو سال بعد مدوّن ہوئیں اب جو چیز اس قدر عرصہ دراز کے بعد تحریر میں آئی ہو اس کا محفوظ رہنا فطرۃً اور عادتاً محال ہے لہٰذا احادیث کے ذخیرے کو محفوظ تصور نہیں کیا جا سکتا اور اس لیے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

منکرین حدیث کے اس اعتراض کا ہمیں دو حیثیتوں سے جائزہ لینا ہے اوّل یہ کہ کیا یہ امر واقعہ ہے کہ احادیث عہد نبوی کے دو سو سال بعد قید تحریر میں آئیں یا یہ محض افترا پردازی ہے دوم یہ کہ کیا احادیث کو غیر معتمد قرار دینے کے لیے بس اتنی ہی دلیل کافی ہے کہ وہ ایک عرصۂ دراز کے بعد قلم بند ہوئیں کیا کتابت وتحریر کے علاوہ دوسرا کوئی ذریعہ نہیں جو حفاظتِ حدیث کا ضامن ہو سکے۔ کیا حفظ کے راستے سے احادیث کی سینہ بہ سینہ منتقلی ان کی حفاظت کی ضمانت نہیں بن سکتی ؟

جہاں تک احادیث کے قید تحریر میں آنے کا تعلق ہے منکرین حدیث کے اس دعوے میں قطعاً کوئی وزن نہیں کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں احادیث کو تحریر کی شکل میں محفوظ نہیں کیا گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ احادیث کے موجودہ ذخیرے کا غالب ترین حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے عہد میں ہی قید تحریر میں آچکا تھا جیسا کہ انشاء اللہ دلائل کی روشنی میں یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آجائے گی مگر یہ موضوع چونکہ ذرا تفصیل طلب ہے اس لیے

اس کو زیرِ بحث لانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان قرائن کا جائزہ لیں جو حفاظت حدیث کے سلسلے میں کتابت و تحریر سے زیادہ اہم ہیں اور جن کو اگر نظر میں رکھا جائے تو اس بات کی کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہتی کہ احادیث کتابی شکل میں کب مدوّن ہوئیں ۔

اعتماد کی بنیاد

ہمیں اس سلسلے میں منکرینِ حدیث سے سب سے پہلے یہ پوچھنا ہے کہ کیا ان کے نزدیک یہ اصول مسلّمہ ہے کہ ہر لکھی ہوئی چیز محفوظ اور قابل اعتماد ہوتی ہے اور ہر وہ چیز جو تحریر میں نہ آئی ہو غیر محفوظ اور ناقابل اعتماد ہوتی ہے۔ فرض کیجئے راہ چلتے کوئی تحریر آپ کو زمین پر پڑی ہوئی مل جاتی ہے جو کسی خبر یا کسی اطلاع پر مشتمل ہے تو کیا آپ اس خبر اور اس اطلاع پر صرف اس لیے یقین کر لیں گے کہ وہ لکھی ہوئی ہے یا اس ذریعے کا پتہ لگانے کی کوشش کریں گے جس نے اس خبر اور اس اطلاع کو ہم پہونچایا ہے تاکہ اس کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کا فیصلہ آپ کر سکیں ظاہر ہے اگر آپ عقل کی دولت سے بہرہ ور ہیں تو آپ دوسرا راستہ اختیار کریں گے صرف اس بنا پر اس خبر کی سچائی کو آپ کبھی بھی قبول کرنے کو تیار نہ ہوں گے کہ وہ آپ کو تحریر کی صورت میں ملی ہے کسی اطلاع کو آپ اس وقت تک سچ نہ مانیں گے جب تک آپ کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس اطلاع کا ہم پہونچانے والا سچا ہے۔ اخبارِ دنیا ہی کی مثال لے لیجئے کوئی خبر اس وقت تک قابلِ اعتماد نہیں سمجھی جاتی جب تک کسی معتمد علیہ نیوز ایجنسی نے اسے جاری نہ کیا ہو معلوم ہوا محض تحریر شدہ ہونے کی بنا پر کسی خبر کے بارے میں اعتماد یا عدم اعتماد کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اعتماد کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ خبر کے ذرائع قابلِ اعتماد ہوں۔ یہ ایک ایسا مسلّمہ اصول ہے کہ جو شخص اس میں شک کرے گا اس کی عقل کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جائے گا تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ حدیث کے بارے میں منکرینِ حدیث کو محض تحریر کی شرط پر اصرار کیوں ہے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ احادیث جن ذریعوں سے ہم تک پہونچی ہیں وہ انتہائی قابلِ اعتماد ہیں تو پھر اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی کہ احادیث قلم بند کب ہوئیں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ حدیث کی حفاظت کے لیے جن جن ذریعوں سے کام لیا جا سکتا تھا سب سے پورا پورا لیا گیا اور قرائن یہ بتائیں کہ وہ تمام ذرائع قابلِ اعتماد تھے تو احادیث کی حفاظت میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی ۔

کیا قرآن کریم جس پر منکرین حدیث کو بھی پورا اعتماد ہے آسمان سے تحریری صورت میں نازل ہوا تھا اگر اعتماد کے لیے لکھا ہوا ہونا ہی ضروری ہے تو قرآن بھی معاذ اللہ قابل اعتماد نہ رہا کیونکہ اللہ نے اسے کتابی صورت میں نازل نہیں فرمایا حضرت جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اللہ کی جانب سے کوئی لکھی ہوئی تحریر لے کر نہ آتے تھے بلکہ قرآن کریم کے الفاظ جبریل علیہ السلام کی زبان سے نکلتے اور زبان نبوی پر جاری ہو جاتے جبریل علیہ السلام کی لائی ہوئی وحی کیا اس لیے ناقابل اعتماد قرار دی جا سکتی ہے کہ وہ لکھی ہوئی شکل میں نہیں بھیجی گئی ظاہر ہے کوئی بھی اس کا قائل نہیں کلام الٰہی کو قابل اعتماد سمجھنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کا لانے والا قابل اعتماد ہے اس کی امانتداری کی خود صاحب کلام نے ضمانت دی ہے نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (اسے امانت دار فرشتے نے اتارا۔ الشعراء: ۱۹۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے صحابہ کی طرف قرآن کی منتقلی بھی تحریری صورت میں نہیں ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی آیات صحابہ کو زبانی ہی سنائیں جنہیں صحابہ نے سن کر اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا یا کاتبین وحی نے متفرق اجزا پر لکھ لیا کیا صحابہ نے کبھی یہ مطالبہ کیا کہ قرآن اللہ کی طرف سے تحریری صورت میں نازل ہوا اور وہ تحریر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں دکھائیں تو ہم قرآن کو سچا مانیں زبان نبوی سے سنی ہوئی آیات کو محض اس لیے سچا مانا گیا کہ ان کا سنانے والا صادق و مصدوق اور امین تھا۔

تحریر اور اعتماد

لہٰذا یہ اصول ہی غلط ہے کہ صرف لکھی ہوئی چیز ہی قابل اعتماد ہو سکتی ہے۔ اعتماد و عدم اعتماد کا تحریر و عدم تحریر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک چیز لکھی ہوئی ہو مگر غلط ہو کسی چیز کے قید تحریر میں آجانے سے اشتباہات و شکوک کے سارے دروازے بند نہیں ہو جاتے غلطی کا امکان بہر حال باقی رہتا ہے۔ کاتبوں کے ہاتھوں رحمت کو زحمت بنتے کس نے نہیں دیکھا عصر حاضر میں بھی طباعت اور طباعت کی بے احتیاطیوں سے کون واقف نہیں ذرا سی بے احتیاطی سے عبارتوں کا کچھ سے کچھ ہو جانا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ کتابت اور طباعت کے مرحلوں سے نکل آنے کے بعد بھی پڑھنے والوں کی نگاہیں کیا لغزشوں سے بالکل محفوظ ہیں؟ خصوصاً عربی زبان کی عبارات اور پھر بالخصوص اس زمانے کی عبارات

جب عربی زبان نقاط سے محروم تھی اس زبان کی عبارات میں تو اور بھی زیادہ مذکورہ بالا قسم کی غلطیوں کے امکانات ہیں آج بھی جب کہ عربی زبان نقطوں سے مزیّن ہے خَبیث کو عَنیس پڑھنے والے اور رُزّاق کو بُراق سمجھنے والے آپ کو بہت مل جائیں گے غرض کسی چیز کا تحریر میں آجانا اس کے محفوظ ہو جانے کی ضمانت نہیں بن سکتا اس لیے کتابت، تحریر اور تدوین جیسے الفاظ کی رٹ لگائے جانا بالکل بے سود ہے۔ منکرین حدیث احادیث کے زبانی حفظ کے بارے میں جس قدر شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ شکوک و شبہات کا اظہار کتابت اور تحریر کے بارے میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے جانچنے پرکھنے والی بات یہ نہیں کہ احادیث قید تحریر میں کب آئیں بلکہ دیکھنے اور غور کرنے والی بات یہ ہے کہ احادیث ہم تک کن ذرائع سے پہونچیں اور وہ ذرائع محفوظ تھے یا غیر محفوظ۔

احادیث زبانی حفظ و یادداشت کے ذریعے سے محفوظ کی گئی ہوں یا کتابت و تحریر کے واسطے سے دیکھنا یہ ہے کہ حصول اعتبار کے لیے جس حزم و احتیاط کی ضرورت تھی اس کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے یا نہیں اگر جواب اثبات میں ہے تو حفاظت حدیث پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ حفاظت حدیث کے سلسلے میں ابتدا ہی سے اگرچہ حفظ اور کتابت دونوں سے کام لیا گیا ہے لیکن اگر صرف حفظ سے ہی کام لیا گیا ہوتا جیسا کہ منکرین حدیث کہتے ہیں اور یہ ثابت ہو جائے کہ حفظ سے متعلق جس قدر ذمہ داریاں ضروری ہیں وہ باحسن وجوہ پوری کی گئی ہیں اور کسی بھی قسم کی امکانی غفلت اور لاپرواہی سے کام نہیں لیا گیا تو ہر صاحب عقل حدیث کو محفوظ ماننے پر مجبور ہوگا۔

منکرین حدیث جب احادیث کی تدوین کا دو سو سال بعد وقوع میں آنے کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی گفتگو کا انداز کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے کہنا چاہتے ہوں کہ دو سو سال تک احادیث کا ذخیرہ قعر گمنامی میں پڑا رہا اس سے پہلے حفاظت حدیث کی کوئی صورت نہ تھی احادیث کا کوئی چرچا نہ تھا۔ دو سو سال بعد یک بیک کچھ لوگوں کے ذہن میں آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے دو سو سال پہلے جو کچھ کہا تھا یا جو کچھ کیا تھا وہ لکھ لیا جائے چنانچہ لکھ لیا گیا اور پھر اسی بنیاد پر بڑے معصومانہ انداز میں سادہ لوح مسلمانوں سے سوال کرتے ہیں آپ

خود ہی بتائیے دو سو سال بعد کس کو یاد رہتا ہے کہ رسولِ خدا نے کیا کہا تھا اور کیا نہیں کہا تھا، کونسا کام کس طرح انجام دیا تھا اور کس طرح نہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ صورتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی کتابت کے علاوہ احادیث کو حفظ کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا تو وہ حفظ کے ذریعے کو کمزور ترین ذریعہ ثابت کرنے اور زبانی یادداشت کے واسطے کو سب سے زیادہ ناقابلِ اعتبار واسطہ قرار دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیتے ہیں۔

قوتِ حافظہ

کیا حفظ کا ذریعہ واقعی کمزور ترین ذریعہ ہے کیا انسان کا قوتِ حافظہ واقعی اعتبار کے قابل نہیں ہے؟ انسان کی قوت بینائی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے قوتِ شنوائی بھروسے کے قابل ہے تو کیا وجہ ہے قوتِ حافظہ ہی کیوں اعتماد کی حامل نہیں۔ دیکھنے میں آنکھوں پر یقین ہے سننے میں کانوں پر بھروسہ ہے سونگھنے میں ناکوں پر اعتماد ہے چکھنے میں زبانیں سچی ہیں تو ساری بدگمانیاں ایک یادداشت اور قوتِ حافظہ ہی کے حصے میں کیوں آئی ہیں۔ ان بدگمانیوں کی آخر دلیل کیا ہے؟ انسان کی قوتِ حافظہ کے بارے میں کم از کم امتِ مسلّمہ کا تو تجربہ و مشاہدہ یہ ہے کہ دیگر انسانی قوتوں کے مقابلے میں اس کو برتری حاصل ہے ایک سات آٹھ سال کا بچہ تقریباً سات آٹھ سو صفحات پر مشتمل کتاب قرآن کریم کو اس طرح حفظ کر لیتا ہے کہ زبر زیر پیش تک کی غلطی بھی باقی نہیں چھوڑتا اس کا ذہن قرآن کے اوراق اور صفحات کی حدود تک محفوظ کر لیتا ہے وہ آپ کو یہ تک بتلا سکتا ہے کہ کونسی آیت قرآن کریم میں صفحے کے وسط میں ہے، ابتدا میں ہے آخر میں ہے یا آگے پیچھے ہے کس لفظ پر قرآن کریم کا صفحہ ختم ہو جاتا ہے اور کس لفظ پر ورق کھلتا ہے۔ اس کو یہ بھی پتہ ہے کہ قرآن کریم میں کونسا لفظ کس طرح لکھا ہے اس میں کونسا حرف صرف تحریر میں آیا ہے مگر پڑھا نہیں جاتا۔ یہ تمام تفصیلات ایک سات آٹھ سال کے بچے نے اپنی قوتِ حافظہ ہی سے کام لے کر اپنے ذہن میں محفوظ کی ہیں اس کے باوجود قوتِ حافظہ بدگمانیوں کا شکار ہے! آخر کیوں؟ شاید کہا جائے کہ قرآن کے حفظ میں تائیدِ الٰہی شامل ہے تو ہمارا تو دعویٰ ہے کہ حفظِ حدیث میں بھی تائیدِ الٰہی شامل ہے اور ہم اس کو سابقہ گفتگو میں دلائل کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں۔

بہرحال ہماری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ انسان کی قوتِ حافظہ کے بارے میں اس قدر

بدگمانی سے کام کیوں لیا جائے کہ جو چیز چند روز کے لیے اس کے سپرد ہو جائے وہ ہر قسم کے اعتماد سے محروم ہو جائے۔ منکرین حدیث شاید یہ خیال کرتے ہیں کہ ابتدا میں حدیث کو باقاعدہ حفظ کرنے کا کوئی اہتمام نہ تھا متفرق طور پر متفرق صحابیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا یا کچھ کرتے ہوئے دیکھا تھا بس کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر وہ اس کو بیان کر دیا کرتے تھے یا کبھی فرصت کے وقت میں بیٹھ کر دل بہلانے کے لیے ایک دوسرے سے اس کا تذکرہ کر لیا کرتے تھے جیسے عام دستور ہے کہ گھر کے پرانے بڑے بوڑھے اپنے عہد جوانی کے قصے گرمیٔ بزم کے لیے بیان کیا کرتے ہیں۔ منکرین حدیث سمجھتے ہیں کہ حدیث کی ابتدا العیاذ باللہ کچھ اسی طرح پر ہوئی مستقل علم کی حیثیت اسے بعد کو حاصل ہوئی ؛

حفظِ حدیث کا اہتمام

حدیث کے بارے میں منکرین حدیث کا یہ خیال ایک شیطانی وسوسہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن کے ساتھ حدیث کا لازمی تعلق جو گذشتہ اوراق میں ثابت کیا جا چکا ہے اس کے بعد کوئی احمق ہی یہ سوچ سکتا ہے کہ احادیث نبوی صحابہ کے لیے اس قدر غیر اہم ہو سکتی ہیں کہ گزرے ہوئے عہد کے قصوں سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدا ہی سے قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کو بھی حفظ کرنے کا پورا پورا اہتمام تھا اصحاب صفہ کے نام سے کون واقف نہیں ان بے چاروں کا اس کے سوا کوئی کام نہ تھا کہ دن رات مسجد نبوی میں پڑے قرآن اور حدیث حفظ کرتے تھے۔ صفہ محض ایک چبوترہ ہی نہ تھا ایک باضابطہ مدرسہ اور ایک باقاعدہ تعلیم گاہ تھی جس میں طلبہ کی تعداد ایک ایک وقت میں اسّی اسّی تک جا پہنچی تھی اس مدرسہ میں کن کن باتوں کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی احادیث میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے وہاں قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرائض اسلام اور قوانین شریعت بھی پڑھائے اور سکھائے جاتے تھے گویا قرآن اور سنت دونوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فروہ بن ملیک جو یمن سے مدینہ منورہ آئے تھے وہ بھی اسی مدرسہ کے طالب علم تھے ان کے ذکر میں ابن سعد کے یہ الفاظ ہیں :

جَاءَ مِنَ الْيَمَنِ وَتَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَفَرَائِضَ الْإِسْلَامِ وَشَرَائِعَهُ ۔	یمن سے آئے اور قرآن (کے ساتھ ساتھ) اسلام کے فرائض اور قوانین شریعت کی تعلیم حاصل کی۔

یہ وہی فروہ بن ملیک ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یمن کے قبائل مراد زبید اور مذحج کا گورنر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس صفّہ نبوی کے مدرسے میں فروہ جیسے نہ جانے کتنے شاگرد تھے جن کو تعلیم دینے کا کام ابوہریرۃ، ابن مسعود، زید بن ثابت اور ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ انجام دیتے تھے اور یہ تعلیم حفظ قرآن اور حفظ حدیث کے علاوہ اور کیا تھی؟

یہ حفظ حدیث ہی کا تو اہتمام تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی کے درمیان اس معاہدے کا متقاضی ہوا جس کی رو سے بارگاہ نبوی میں حاضری کے لیے ان دونوں کے درمیان باری مقرر تھی کہ ایک روز حضرت عمر حاضر رہتے اور انصاری بھائی اپنی مشغولیتوں کی دیکھ بھال کرتے اور ایک روز انصاری صحابی حاضری دیتے تاکہ حضرت عمر اپنے کاروبار کی ذمہ داریاں نبھا سکیں۔ اور ہر روز حاضر رہنے والا اپنے غائب رفیق کو وہ سب کچھ من وعن سناتا جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنتا یا آپ کو کرتے دیکھتا بخاری میں خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

كُنْتُ أَنَا وَجَارٌ لِي مِنَ الْأَنْصَارِ فِي بَنِي أُمَيَّةَ بْنِ زَيْدٍ وَهِيَ مِنْ عَوَالِي الْمَدِينَةِ وَكُنَّا نَتَنَاوَبُ النُّزُولَ عَلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْزِلُ يَوْمًا وَأَنْزِلُ يَوْمًا فَإِذَا نَزَلْتُ جِئْتُهُ بِخَبَرِ ذٰلِكَ الْيَوْمِ مِنَ الْوَحْيِ وَغَيْرِهِ وَإِذَا نَزَلَ فَعَلَ مِثْلَ ذٰلِكَ۔

میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی، ہم دونوں امیہ بن زید والوں کی بستی میں رہتے تھے جو مدینہ کے عوالی کی بستیوں میں سے ہے ہم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باری باری سے حاضری دیتے تھے ایک دن وہ حاضر رہتے ایک دن میں حاضر ہوتا میں جس دن حاضری دیتا اس دن کے حالات اور خبریں وحی وغیرہ کی ان کو سناتا اور جب وہ حاضر ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ

مَا كُلُّ مَا نُحَدِّثُكُمْ بِهِ سَمِعْنَاهُ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِنْ كَانَ يُحَدِّثُ بَعْضُنَا بَعْضًا (مستدرک للحاکم)

ہم تم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بیان کرتے ہیں سب کچھ آپؐ ہی سے ہم نے نہیں سنا ہے بلکہ ہم میں بعضوں نے بعض سے بھی سنا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ حفظ حدیث کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

جب مجلس سے اُٹھ جاتے تو ہم صحابہ آپس میں مل کر بیٹھ جاتے اور جو کچھ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہوتا اسے بار بار دوہراتے بعض مرتبہ صحابہ کا یہ اجتماع ساٹھ ساٹھ صحابہ پر مشتمل ہوتا۔ مجمع الزوائد میں حضرت انس ہی سے یہ روایت موجود ہے۔ فرماتے ہیں :

کنا تعود ًا مع النبی فعسی ان یکون ستین رجلاً فیحدِّ ثنا الحدیثَ ثم یدخل لحاجتہٖ فنراجعہٗ بیننا ھذا ثم ھذا فنقوم کانّما زرع فی قلوبنا (مجمع الزوائد جلد ۱)	ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے تو اکثر (درس میں) ساٹھ ساٹھ آدمی ہوتے اور جب آپؐ تشریف لے جاتے تو ہم احادیث کو بار بار دوہراتے اور جب ہم اُٹھتے تو ہم کو حدیثیں ایسی یاد ہوتیں جیسے انہیں ہمارے دلوں میں بو دیا گیا ہو۔

یہ سب کچھ حفظ حدیث ہی کا تو اہتمام تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عام گفتگو کے بارے میں یہ عام عادت جو بیان کی جاتی ہے کہ اَنَّہٗ کَانَ اِذَا تَکَلَّمَ بِکَلِمَۃٍ اَعَادَھَا ثَلٰثاً (جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات دوہراتے تو اس کو تین دفعہ دوہراتے ۔ بخاری) تو غالباً اس میں بھی زیادہ تر دخل اسی مقصد کو تھا کہ سننے والے کو ذہن نشین ہو جائے۔ آثار صحابہ میں متعدد اقوال اس بات کے شاہد ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین قرآن ہی کی طرح حدیث کو بھی حفظ کرنا ضروری سمجھتے تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے

اَکْثِرُوا ذِکْرَ الحدیثِ فَاِنَّکُم اِن لَّم تفعلوا یدرُسُ علمُکم (جامع بیان العلم)	حدیث کو بار بار دہراتے رہو اگر ایسا نہ کروگے تو تمہارا علم فرسودہ ہو کر مٹ جائے گا۔

اسی طرح معرفۃ علوم الحدیث میں حاکم نے حضرت عبداللہ ابن مسعود کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ فرمایا کرتے :

تَذَاکَرُوا الحدیثَ فَاِنَّ حیاتَہٗ مذاکرتُہٗ	بار بار حدیث کو دوہراتے رہو کیونکہ اس کے زندہ رکھنے کی یہی شکل ہے۔

حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ہی نہیں اکثر صحابہ سے یہ منقول ہے کہ وہ ان لوگوں سے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں ان سے سننے آیا کرتے تھے یہ کہا کرتے تھے ۔

اِنَّ نبیّکم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یحدّثنا فنحفظ فاحفظوا کما کنّا نحفظ (جامع بیان العلم)

تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں سے حدیثیں بیان کرتے تھے اور ہم ان کو زبانی یاد کر لیتے تھے پس تم لوگ بھی اسی طرح حفظ کیا کرو جس طرح ہم کرتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ فرمایا کرتے تھے کہ میں جتنا عرصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہا مجھے احادیث حفظ کرنے سے زیادہ کوئی کام پسند نہ تھا۔[1] آپ نے حفظ حدیث کی خاطر رات کے اوقات کو تقسیم کیا ہوا تھا خود بتلایا کرتے کہ میں رات کے تین حصے کر لیتا ایک میں سو جاتا ایک میں نماز پڑھتا اور ایک میں احادیث کو یاد کرتا۔[2]

حقیقت یہی ہے کہ صحابہ کرام قرآن ہی کی طرح حدیث کو بھی حفظ کرتے تھے۔ اس زمانے میں جس طرح قرآن کریم کو حفظ کرنے کا رواج تھا اسی طرح حدیث کو بھی حفظ کرنے کا رواج تھا۔ اگر حفظ کرنے کی بنیاد پر قرآن کریم قابلِ اعتماد ہے تو یقیناً حدیث بھی اسی بنیاد پر قابلِ اعتماد ہے۔ قرآن کریم بھی انہی صحابہ نے حفظ کیا اور ہم تک پہونچایا اور ہم سب کے لیے قابلِ اعتماد ٹھہرا احادیث کے حفظ کرنے والے بھی یہی صحابہ تھے انہوں نے ہی احادیث کو باقاعدہ حفظ کیا اور ہم تک پہونچایا سمجھ میں نہیں آتا پھر یہ احادیث ناقابلِ اعتماد کیسے بن گئیں۔ قرآن کریم کو جو تقریباً سات آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے محفوظ ماننے کے لیے اگر قوتِ حافظہ پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے تو ذخیرہ حدیث کو محفوظ ماننے کے لیے اس قوت پر بھروسہ کیوں نہیں کیا جا سکتا جبکہ احادیث کا مجموعہ اگر مکررات نکال دی جائیں قرآن کریم کی ضخامت سے کم ہی ضخیم ہوگا۔ احادیث کے بارے میں لاکھوں کی تعداد کا ذکر متابعات وشواہد اور اسناد وطرق کے اختلاف کی بنا پر ہوتا ہے ورنہ اس سے قطع نظر اگر تمام قسم کی احادیث جمع کی جائیں تو پچاس ہزار سے ان کی تعداد آگے نہیں بڑھتی۔ یہ بھی اس وقت ہے جبکہ صحیح حسن غریب ہر قسم کی احادیث کو شامل کیا جائے اور اگر صرف صحیح احادیث پر اکتفا کیا جائے تو تمام احادیث دس ہزار سے زیادہ نہیں بنتیں۔ بہرحال پچاس ہزار بھی ہوں تب بھی ان کا مجموعہ قرآن کریم سے کم ہی ضخامت پر مشتمل ہوگا اگر قرآن کریم حفظ ہو سکتا

---

[1] ابن سعد [2] مسند دارمی

ہے اور اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک سات آٹھ سال کا بچہ الحمد سے لے کر والناس تک فر فر سناتا چلا جاتا ہے تو احادیث کیوں حفظ نہیں ہو سکتیں ؟

تقاضائے محبت

غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتدا ہی سے قرآن کی طرح حدیث کے حفظ کرنے کا بھی اہتمام تھا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ زبانی رٹ لیتے آپؐ کا ہر قول، ہر فعل اور ہر عمل صحابۂ کرام کے دلوں پر نقش ہو جاتا تھا اور یہ کیسے نہ ہوتا صحابۂ کرام شمع نبوی کے پروانے تھے۔ انسان جس ہستی سے محبت کرتا ہے اس کی ایک ایک ادا اس کی آنکھوں میں رچ جاتی ہے اس کی ایک ایک بات اس کے دل کی دھڑکن بن جاتی ہے۔ محبوب کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو وہ ہر وقت کا وظیفہ بنا لیتا ہے ہر ایک کے سامنے فخر سے کہتا پھرتا ہے میرے محبوب نے یہ کہا اور میرے پیارے نے یہ کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس صحابۂ کرام کے لیے محبوب سے کہیں بڑھ کر تھی، وہ اہتمام نہ بھی کرتے تب بھی ارشاداتِ نبوی کا خود بخود ان کو ازبر ہو جانا فطری بات تھی یہ تشبیہ و استعارے کی بات نہیں حقیقت کا اظہار ہے کہ صحابۂ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پروانے تھے وہ اپنے ماں باپ بھائی بہن بیوی بچوں بلکہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی زندگی کو عزیز رکھتے تھے وہ اپنی جان تو کیا اپنا سب کچھ آپؐ پر ہمہ وقت قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے ایسے محبت کرنے والوں کے بارے میں یہ خیال کرنا حماقت ہی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو محفوظ نہ رکھ سکے ہوں گے۔

صحابۂ کرام تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کے دیوانے تھے وہ تو یہاں تک بھی یاد رکھتے تھے کہ کونسی بات آپؐ نے کس طرح کس ہیئت اور کس کیفیت کے ساتھ ارشاد فرمائی تھی۔ اگر کہیں کوئی بات ارشاد فرماتے ہوئے آپؐ مسکرا پڑے ہیں تو صحابہ نے اس مسکراہٹ کو اس مخصوص ارشاد کا ایک لازمی حصہ بنا لیا جب کبھی وہ حدیث کسی کو سنائی اسی طرح مسکرا کر سنائی جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے تھے اور آئندہ آنے والے محدثین نے ایسی حدیث کو مسلسل بالضحک کا ایک مخصوص نام دے دیا۔ جو لوگ اصول حدیث کے علم سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسی تمام احادیث کہ جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

خاص خاص کیفیات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے اور ہمیشہ انہی کیفیات کے ساتھ ان کو نقل کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے مسلسلیات کہلاتی ہیں۔ انہی مسلسلیات میں سے ایک حدیث مسلسل بضرب الفخذ (ران پر ہاتھ مارنے کی کیفیت والی) ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حدیث ارشاد فرماتے وقت اپنی ران مبارک پر ہاتھ مارا تھا اداؤں کو محفوظ رکھنے والوں نے یہ ادا بھی محفوظ کر لی۔

تبایئے عشق و سرمستی میں سرشار ایسے لوگوں کے بارے میں یہ خیال کرنا کس قدر نادانی کی بات ہے کہ انہوں نے اپنے محبوب کے اقوال و افعال محفوظ نہ رکھے ہوں گے وہاں تو عالم یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ارشادات کے بارے میں سننے والے کو یہ بھی یاد ہے کہ اس نے سب سے پہلی بات کونسی سنی ہے اور پھر اس نے اپنی یہ عادت بنالی ہے کہ جب کسی کو احادیث نبوی سنانے کا موقع ملا ہے تو سب سے پہلے اسی حدیث کو بیان کیا ہے۔

اغراض نفسانی کے متوالے عشق نبوی کے سوختہ سامانوں کا حال کیا جانیں اگر کہیں بطور عتاب بھی کوئی کلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکل گیا تو صحابہ نے اسے بھی حرز جاں بنا لیا ہے۔ ایک بار حضرت ابوذر رضؓ کے متعجبانہ دوبارہ وسہ بارہ کسی سوال کے جواب میں کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہ تنبیہ یہ فرمادیا کہ وَاِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِیْ ذَرٍّ یعنی جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ اسی طرح ہے خواہ ابوذر کی ناک خاک میں رگڑی جائے تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ جب کبھی اس حدیث کو روایت کرتے تو تنبیہ کا یہ فقرہ بھی خوب مزے لے لے کر نقل کرتے انصاف کی بات تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ایسے لوگوں کو لفظاً بلفظ یاد رہ جانا محال اور خلاف فطرت نہیں جیسا کہ منکرین حدیث کہتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو احادیث کا یاد نہ رہنا محال اور خلاف فطرت ہے۔

بھلا جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ اپنے گھوڑوں تک کے شجرۂ نسب یاد رکھتے ہوں، جانوروں میں گھوڑا ان کو سب سے زیادہ محبوب تھا اور اپنی ہر محبوب چیز کی معمولی معمولی تفصیلات تک یاد رکھنے کے وہ عادی تھے ان کے بارے میں یہ بدگمانی رکھنا کہ انہوں نے اپنے

دونوں جہان سے زیادہ محبوب آقا کے ارشادات یاد رکھنے میں تساہل یا کسی غفلت سے کام لیا ہوگا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن لوگوں میں مبعوث ہوئے ان کا عالم یہ تھا کہ جو شاعر انہیں پسند آجاتا اس کے قصائد وہ ازبر کر لیتے ہزار ہزار اشعار پر مشتمل قصائد وہ بلاتکان سنائے چلے جاتے بعثت نبوی کے بعد ان لوگوں کی تمام تر پسند کا محور اور ہمہ جہت محبت کا مرکز صرف اور صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ یہ لوگ عشق نبوی میں خود کو فنا کر چکے تھے انہوں نے اپنی ذات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اس حد تک گم کر دیا تھا کہ اپنا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا کھانا پینا ہنسنا بولنا سب کچھ انہی کے رنگ میں رنگ لیا تھا وہ ہمہ تن محبوب کے مشاہدے میں محو تھے وہ سوتے کس طرح ہیں وہ جاگنے پر کیا عمل کرتے ہیں وہ کھانا کھاتے وقت کس ہیئت پر بیٹھتے ہیں وہ پانی کس طرح پیتے ہیں وہ اپنے اللہ کو کس طرح پکارتے ہیں وہ اللہ کے بندوں سے کس طرح مخاطب ہوتے ہیں راتوں کو ان کا کیا عالم ہوتا ہے دن ان کے کیسے گزرتے ہیں۔ صحابہ کو تلاش تھی تو انہی باتوں کی انہیں فکر تھی تو انہی عادات واطوار پر اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو ڈھال لینے کی۔ صحابہ کرام اس شعر کی مجسم تصویر بنے ہوئے تھے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی   تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ایسے لوگ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی حفاظت کو حرز جاں بنائے ہوئے تھے ان کے بارے میں کیسے یہ یقین کر لیا جائے کہ انہوں نے احادیث نبوی کی حفاظت میں کوئی اہتمام نہ کیا ہوگا۔ حب نبوی کا جو ثبوت صحابہ اپنی ایک ایک حرکت سے لوح جہاں پر نقش کر رہے تھے اس کی موجودگی میں کیونکر مان لیا جائے کہ انہوں نے اپنے محبوب کی باتوں کو بھلا دیا ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے بعد صحابہ کے اس والہانہ تعلق میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی تھی عالم یہ تھا کہ وہ اپنے محبوب کا کوئی فعل کوئی قول بیان کرنے لگتے تو رو رو پڑتے، کانپنے جاتے اور حدیث نبوی نقل کرتے جاتے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے بارے میں دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ حدیث بیان کرنے کا موقع آتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک زبان پر آتے ہی بدن پر کپکپی طاری

ہو جاتی ۔

اِذْ تَعَدَّوَارْتَعَدَتْ ثِیَابُہٗ تَنْتَفِخُ اَوْدَاجُہٗ اِغْرَوْرَتَ عَیْنَاہُ (مستدرک للحاکم)	کانپنے لگتے انکے کپڑوں میں تھرتھری پیدا ہو جاتی گردن کی رگیں پھول جاتیں آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں ۔

اندازہ کیجئے جس کا عشق نبوی میں یہ حال ہو وہ اپنے محبوب کی باتیں کرتے میں کس قدر احتیاط سے کام لیتا ہوگا ہم یہ یقین کرتے میں حق بجانب ہیں کہ ایسا شخص ایک ایک حرف کی حفاظت کرتا ہوگا اس میدان میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کیلئے نہیں ہیں اکثر صحابہ کا یہی حال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے وقت ان پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی ۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کے بارے میں ہے کہ کبھی کوئی حدیث بیان کرنا چاہتے تو اکثر اوقات مُنہ سے اَوْصَانِی حُبّی اَبُوالقَاسِمِ اَوْصَانِی خَلِیلی صلی اللہ علیہ وسلم (مجھے میرے محبوب نے وصیت کی مجھے میرے دوست صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی) کے الفاظ ہی نکل پاتے اور چیخ مار کر بیہوش ہو جاتے اسی قسم کے واقعات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذکر میں بھی ملتے ہیں ۔

مقصود صحابۂ کرام کی محبت کے مظاہر بیان کرنا نہیں ہے بلکہ بتلانا یہ مقصود ہے کہ محبین اور عشاق کو اپنے محبوب کے ملفوظات اس کے حالات اور اس کی کیفیات کا یاد نہ رہنا محال اور خلاف فطرت ہے ۔ محبت اور پسند کا تعلق ہو تو بغیر کوشش کے دفتر کے دفتر یاد ہو جاتے ہیں ۔ دُور کیوں جائیے بالکل قریب کی مثال لے لیجئے آج کل کے آزاد طبیعت اور عاشق مزاج نوجوانوں کا ذرا جائزہ لیجئے بے شمار عشقیہ اشعار ان کو یاد ہوتے ہیں ناولوں اور کہانیوں کے صفحے کے صفحے آپ ان سے فرفر سن لیجئے ہزلیات ایک بار ہی سننے پر ان کی زبانوں پر جاری ہو جاتی ہیں مگر یہی نوجوان فلسفہ وحساب وغیرہ کا ایک صفحہ بھی باوجود کوشش کے سارے دن میں یاد نہیں کر پاتے ۔ کبھی آپ نے غور کیا آخر یہ فرق کیوں ؟ صرف اس لیے کہ پہلی قسم کی چیزوں میں ان کے شوق اور ان کی رغبت کو دخل ہے جبکہ دُوسری قسم کی چیزیں اس سے محروم ہیں بالکل اسی طرح حفظ حدیث میں چونکہ صحابہ کے شوق ورغبت کو دخل تھا اور حبّ نبوی کا جذبہ کارفرما تھا اس لیے فطری طور پر ان کے سینے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کے ایک ایک لمحے کے امین بن گئے تھے ۔

تقاضائے عظمت

جس طرح محبت اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ محبوب کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ وردِ زبان ہو جائے اور محبوب کی ہر ہر ادا دِل میں اُتر کر رہ جائے اسی طرح ایک اور جذبہ ہے جو بعینہٖ اسی قسم کے طرزِ عمل کا طالب ہے اور وہ ہے عظمت کا جذبہ جو ہستی عظمت کی حامل ہوتی ہے وہ اپنے ماننے والوں کیلئے فطری طور پر قابلِ اتباع و تقلید بن جاتی ہے۔ اس کے ماننے والوں کے دِل میں قدرتی طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو وہ ہمہ تن گوش ہو کر سنیں اور دِل کی تہوں میں محفوظ کر لیں۔ ملک کا صدر یا وزیرِاعظم اگر کسی سے کوئی بات کر لیتا ہے تو اس کی کہی ہوئی بات کا ایک ایک لفظ دِل میں اُتر جاتا ہے۔ ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر یا کسی عام پبلک جلسے میں کی ہوئی کسی بڑے آدمی کی تقریروں کے اقتباسات لوگ انہی کے انداز میں دوہراتے پھرتے ہیں آج فلاں صاحب نے یہ فرمایا اور یُوں فرمایا صدر یا وزیرِاعظم تو پھر ملک کی بہت بڑی ہستی ہیں۔ کسی علاقے کا نمائندہ یا کوئی اور معمولی حاکم ہی کسی سے دو چار باتیں توجہ سے کر لیتا ہے تو وہ ان باتوں کو مزے مزے لیکر پُورے علاقے میں گاتا پھرتا ہے غرض عظمت کی حامل ہستی بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور اس کی تقلید کو باعثِ فخر سمجھا جانے لگتا ہے۔ اب آپ غور کیجئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ باعظمت کون ہو سکتا ہے خصوصاً صحابہ کے لیے۔ صحابہ کے دلوں میں آپ کی عظمت کا عالم یہ تھا کہ جب آپ کی مجلس میں ہوتے تو اس طرح سر جھکائے اور ساکت و صامت بیٹھتے کہ یوں لگتا جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں بعض صحابہ خود اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کَاَنَّ عَلٰی رُءُ سِنَا الطَّیْرُ یوں معلوم ہوتا جیسے ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں کہ ذرا ہلے تو اُڑ جائیں گے یا یُوں سمجھئے کہ اس قدر بے حس و حرکت کہ پرندے بھی جو اوّل تو آدمی کے سایہ سے ہی بھاگتے ہیں اور اگر کوئی حس و حرکت محسوس کر لیں تو پھر ٹھہر ہی نہیں سکتے وہ بھی اس وقت صحابہ سے متوحش نہیں ہوتے تھے کیونکہ مشاہدۂ نبوی کی محویت ان کو بالکل جامد بنا دیتی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے صحابہ کو نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی ایسی روایات موجود ہیں کہ کسی صحابی سے بعد کے لوگوں میں سے کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیۂ مبارک کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا یہ ہمت ہی کسے تھی کہ چہرۂ مبارک کو نظر بھر کر

دیکھ سکے حلیہ بیان ہو تو کیونکر۔

عظمت کی یہ کیفیت تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے دہن مبارک سے لعاب نکلتا ہے تو صحابہ ہاتھوں میں لے کر چہروں پر مل لیتے ہیں، کلی کرتے ہیں تو لوگ دوڑ پڑتے ہیں کہ کوئی چھینٹ ہو جو ہمارے چہروں پر پڑ جائے اور برکتوں سے مالامال کر جائے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عُروہ بن مسعود ثقفی جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے اور کفار قریش کی جانب سے قاصد بن کر آئے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے صحابہ کی تعظیم کا یہ عالم دیکھتے ہیں تو جا کر کفار قریش سے کہتے ہیں خدا کی قسم میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں مگر عظمت کا وہ عالم کہیں نہیں دیکھا جس کا مظاہرہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دربار میں اصحاب محمد کی جانب سے دیکھنے میں آیا تم ایسے لوگوں کے مقابلے میں کبھی کامیاب نہ ہو گے۔ بخاری کے الفاظ میں عروہ بن مسعود ثقفی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں :

أَیْ قَوْمِ وَاللّٰہِ لَقَدْ وَفَدْتُ عَلَی الْمُلُوْکِ وَفَدْتُ عَلٰی قَیْصَرَ وَکِسْرٰی وَالنَّجَاشِیِّ وَاللّٰہِ مَا رَأَیْتُ مَلِکًا قَطُّ یُعَظِّمُہٗ أَصْحَابُہٗ مَا یُعَظِّمُ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ مُحَمَّدًا وَاللّٰہِ إِنْ تَنَخَّمَ نُخَامَۃً إِلَّا وَقَعَتْ فِیْ کَفِّ رَجُلٍ مِنْہُمْ فَدَلَکَ بِہَا وَجْہَہٗ وَجِلْدَہٗ وَإِذَا أَمَرَہُمْ ابْتَدَرُوْا أَمْرَہٗ وَإِذَا تَوَضَّأَ کَادُوْا یَقْتَتِلُوْنَ عَلٰی وَضُوْئِہٖ وَإِذَا تَکَلَّمَ خَفَضُوْا أَصْوَاتَہُمْ عِنْدَہٗ وَمَا یُحِدُّوْنَ إِلَیْہِ النَّظَرَ تَعْظِیْمًا لَہٗ (بخاری)

لوگو خدا کی قسم بادشاہوں کے درباروں میں بھی مجھے باریابی کا موقعہ ملا ہے قیصر کسریٰ اور نجاشی (حبشہ) کے سامنے بھی حاضر ہوا ہوں خدا کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ لوگ اس کی اتنی عزت کرتے ہوں جتنی محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی کرتے ہیں خدا کی قسم جب وہ بلغم تھوکتے ہیں تو وہ ان کے ساتھیوں میں سے کسی آدمی کے ہاتھ پر ہی گرتا ہے پھر وہ اپنے چہرے اور اپنے بدن پر اسے مل لیتا ہے اور وہ جب کسی بات کا انہیں حکم دیتے ہیں تو اسکی تعمیل میں وہ سب جھپٹ پڑتے ہیں اور جب (محمدؐ) وضو کرتے ہیں تو اس وقت انکے وضو کے پانی پر وہ آپس میں اُلجھ پڑتے ہیں اور جب وہ (محمدؐ) بات کرتے ہیں تو انکی آوازیں پست ہو جاتی ہیں وہ لوگ (محمدؐ) کو آپکی عظمت کی وجہ سے نگاہ بھر کر دیکھ نہیں سکتے۔

ایک طرف صحابہ کرام کی جانب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے توقیر و عزت اور تعظیم و عظمت کے یہ مظاہر ہیں اور دوسری طرف منکرین حدیث کا یہ مضحکہ خیز دعویٰ کہ احادیث کے بارے میں صحابہ کی یادداشت کا کیا اعتبار! حیرت ہوتی ہے کہ انکی عقلوں کو کیا ہُوا۔ کہیں یہ خَتَمَ اللّٰہُ عَلیٰ قُلُوبِھِمْ وَعَلیٰ سَمْعِھِمْ وَعَلیٰ اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ (اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں اور انکے کانوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں) کے مصداق بن کر تو نہیں رہ گئے۔ جن لوگوں کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو آخر کچھ تو سوچنا چاہیئے ان لوگوں نے حیات نبوی کے ایک ایک لمحے کی نگہداشت میں کس اہتمام، کس انہماک اور کس توجہ سے کام لیا ہوگا۔ جن کے نزدیک ایک موئے مبارک جو بظاہر بے جان چیز ہے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہو ان کی نظر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حیاتِ جاوداں کے حامل اقوال و افعال کی کیا قیمت ہوگی۔ خادمِ رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ کو آپؐ کا ایک موئے مبارک ہاتھ آگیا تھا وہ اس موئے مبارک کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ اُنہوں نے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینۂ مبارک بھی محفوظ کیا ہُوا تھا اور اس کو خوشبو کے طور پر استعمال کرتی تھیں [1] حضرت امیر معاویہ کے پاس بھی چند موئے مبارک محفوظ تھے جن کے بارے میں اُنہوں نے اپنی وفات کے وقت وصیّت کی کہ میرے مُنہ اور ناک میں بھر دیئے جائیں [2]

غور کا مقام ہے جس ہستی کو عظمت کا یہ مقامِ عالی حاصل ہو اس کی ایک ایک بات ایک ایک ادا اپنے ماننے والوں کے دِل و دماغ کو قدرتی طور پر کس قدر متاثر کرتی ہوگی؟ ان کی قوتِ حافظہ میں اس ہستی کی زندگی کا ایک ایک لمحہ نقش فی الحجر ہوکر نہ رہ جاتا ہوگا؟ اس کی ذات سے متعلق ہر ہر تفصیل ان لوگوں کی ارواح کے لیے غذا کا کام نہ دیتی ہوگی؟

غرض محبت اور عظمت یہ دونوں جذبے اس کے متقاضی ہیں کہ جس ہستی کی طرف بھی ان کی نسبت ہو وہ ہستی خود بخود فطری طور پر ہمہ تن توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور اس کا ہر قول،

---

[1] بخاری۔ کتاب الاستیذان [2] نزہۃ الابرار۔ تذکرہ حضرت امیر معاویہ

ہر فعل اور ہر عمل اس قدر اہم ہو جاتا ہے کہ دیکھنے اور سننے والوں کے ذہنوں میں جاگزیں ہو کر رہ جاتا ہے اس طرح کہ عمر بھر یادداشت کے اوراق پر اس کے نقوش تازہ ہی محسوس ہوتے ہیں۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صحابۂ کرام کی محبت و عظمت کے ان مظاہر کی موجودگی میں جو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ابھی آپ کی نظروں سے گزرے ہیں اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ اللہ کے رسول کا ہر قول ہر فعل اور ہر عمل صحابۂ کرام کے ذہنوں میں واقعی اس طرح جاگزیں تھا کہ ہمیشہ اس کے نقوش تازہ ہی نظر آتے تھے۔

صحابہ کی غیر معمولی قوّتِ حافظہ

درا صل محبت اور عظمت کا تعلق ہی ایسا ہے کہ اس کے تقاضوں کو یاد رکھنے کے لیے کسی اضافی کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی اس کے متوالے ضعیف الحافظہ بھی ہوں تو قوی الحافظہ ہو جاتے ہیں اور صحابہ کو تو اللہ تعالےٰ نے خصوصیت سے اس نعمت کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا حضرت عبد اللہ ابن عباس کے متعلق مشہور ہے کہ طویل طویل قصائد صرف ایک بار سن لینے سے یاد ہو جاتے تھے ایک مرتبہ عرب کا مشہور شاعر عمر بن ابی ربیعہ ان کے پاس آیا اور اپنا ایک طویل قصیدہ جو ستّر اشعار پر مشتمل تھا سنا گیا اس کے جانے کے بعد حاضرین مجلس کے درمیان اس کے ایک شعر کے بارے میں گفتگو چلی حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ شاعر نے اس مصرعے کو اس طرح پڑھا تھا مخاطب نے تعجب سے پوچھا کہ کیا پہلی دفعہ میں ہی آپ کو پورا مصرعہ صحیح یاد رہ گیا؟ آپؓ نے جواب دیا کیوں نہیں ؟ کہو تو پورا قصیدہ سنا دوں چنانچہ ستّر کے ستّر اشعار من وعن اسی ترتیب سے سنا دیے جس ترتیب سے عمر بن ربیعہ سنا کر گیا تھا۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے بارے میں ہے کہ ایک ایک دفعہ میں کسی شاعر کے قصیدے کے ساٹھ ساٹھ ستّر ستّر بلکہ سو سو اشعار برجستہ سناتی چلی جاتی تھیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جن سے بہت زیادہ احادیث مروی ہیں بے پناہ حافظے کے مالک تھے۔ امام بخاریؒ نے کتاب الکنیٰ میں ان کے حافظے سے متعلق ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے ایک مرتبہ مروان بن حکم حاکم دمشق نے حضرت ابوہریرہ کے حافظے کا امتحان کرنا چاہا چنانچہ اس نے آپ کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ ان کے آنے سے پہلے اپنے کاتب ابوالزعزعہ

کو ایک پردے کے پیچھے چھپا کر بٹھا دیا اور حکم دیا کہ میرے پوچھنے پر جو حدیثیں ابوہریرہ بیان کرتے جائیں ان کو تم لکھتے جانا غرض حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے تشریف لانے پر مروان مختلف باتیں چھیڑ چھیڑ کر آپ سے احادیث پوچھتا جاتا اور آپ بیان کرتے جاتے ادھر پردے کے پیچھے بیٹھا ابوالزعزعہ ان احادیث کو لفظ بہ لفظ نقل کرتا جاتا ۔ اس طرح خاصی تعداد احادیث کی قلم بند کر لی گئی اور حضرت ابوہریرہ کو پتہ بھی نہ لگا۔ سال بھر کے بعد مروان نے حضرت ابوہریرہ کو دوبارہ طلب کیا اور ابوالزعزعہ کو حسب سابق پھر پردے کے پیچھے بٹھا دیا۔ سابقہ لکھی ہوئی احادیث کا مجموعہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے مروان نے ابوالزعزعہ سے کہا میں وہی حدیثیں دوبارہ حضرت ابوہریرہ سے پوچھتا جاؤں گا تم اس مجموعہ سے مقابلہ کرتے جانا ۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق اس امتحان کی پوری کارروائی عمل میں لائی گئی نتیجہ کیا نکلا ؟ سنئے ۔ خود ابوالزعزعہ کا بیان ہے :

فجعل یسالہ وانا انظر فی الکتاب فما زاد ولا نقص (کتاب الکنیٰ بخاری صـ۳۳) ۔	(مروان) حضرت ابوہریرہ سے پوچھتا جاتا اور میں کتاب میں دیکھتا جاتا پس (ابوہریرہ) نے نہ کسی لفظ کا اضافہ کیا اور نہ کمی کی ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حافظے کی قوت کا یہ عالم فی الحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ تھا یہ وہی ابوہریرہ ہیں جن کو باوجود کوشش کے احادیث یاد نہ ہوتی تھیں مگر ایک بار بڑی حسرت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی اس کمزوری کی شکایت کی ۔ آپؐ نے فرمایا اپنی چادر پھیلاؤ حضرت ابوہریرہ نے حکم کی تعمیل کی آپؐ نے اپنے خالی ہاتھوں کو لپ بنا کر ان کی چادر میں ڈال دیا پھر فرمایا کہ چادر سمیٹ لو حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں :

فَضَمَمْتُہٗ فَمَا نَسِیْتُ شَیْئًا ۔ (بخاری ۔ حفظ العلم)	چنانچہ میں نے (چادر کو) سمیٹ لیا پھر اس کے بعد میں کچھ نہیں بھولا ۔

اور آثار اس پر شاہد ہیں کہ اس واقعہ کے بعد واقعی حضرت ابوہریرہؓ کا حافظہ اس قدر قوی ہو گیا تھا کہ کسی بات کو ایک بار سُن لینے کے بعد پھر کبھی نہ بھولتے تھے۔ حفظ حدیث کے سلسلے میں تو دراصل قوتِ حافظہ کے جتنے حیرت انگیز مظاہر تاریخ کے اوراق میں ثبت ہیں وہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ معجزے ہیں وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی تاثیر ہی کا زندہ ثبوت ہیں۔ حدیث کو یاد کرنے والوں کے لیے آپؐ کی دعا کے الفاظ ہیں:

نَضَّرَ اللّٰہُ عبدًا سمِعَ مقالتی فوعاھا ثُمَّ ادّاھا الی من لم یسمعھا (صحاح)	تر و تازہ رکھے اللہ اس بندے کو جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سُنا ہے اس تک اسے پہونچا دیا۔

کبھی آپ فرماتے

رحِمَ اللّٰہُ امرءً سمِعَ منّی حدیثًا فحفِظَہٗ۔ (ابوداود فضل نشر العلم)۔	اللہ اس بندے پر رحم فرمائے جس نے میری حدیث سُنی اور یاد کر لی۔

حفظ حدیث کے سلسلے میں صحابہ کی قوتِ حافظہ کے حیرت انگیز مظاہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انہی دعاؤں کا طفیل سمجھیے یا یوں کہیے کہ یہ تمام مظاہر قرآنی وعدے اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْن کی عملی تفسیر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حفاظت حدیث کے لیے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرنے کے جو ظاہری اسباب پیدا فرمائے تھے ان میں سے ایک یہ حافظے کی غیر معمولی قوت تھی جو صحابہ اور بعد کے آنے والے راویانِ حدیث کو از غیب عطا کر دی گئی تھی۔

قوتِ حافظہ اور عرب

اگرچہ محبت کا جذبہ، عظمت کا تعلق، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی تاثیر اور تائیدِ الٰہیہ ان میں سے ہر ایک بجائے خود حفظ حدیث کے سلسلے میں ایک قوی ضمانت ہے تاہم ان پر اس تاریخی حقیقت کا اور اضافہ کر لیجئے کہ عرب کے باشندے قدرتی طور پر قوی الحافظہ واقع ہوئے تھے، ان کے شعراء، خطباء، اور رواۃ بے پناہ قوتِ حافظہ کے مالک ہوتے

تھے؟ ان کو ہزاروں اشعار، سینکڑوں ضرب الامثال اور بے شمار واقعات ازبر ہوتے تھے۔ مختلف لوگوں اور مختلف قبیلوں کے شجرہ ہائے نسب کو محفوظ رکھنا ان کا معمول تھا جانوروں تک کے نسب نامے وہ یاد رکھتے تھے۔ قصہ گوئی کو ان کے یہاں باقاعدہ فن کا درجہ حاصل تھا ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو اس قدر سریع الحفظ تھے کہ صرف ایک بار سن کر لمبے لمبے قصائد یاد کر لیتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر کے الفاظ ہیں:

كَانَ اَحَدُهُم يَحْفَظُ اَشْعَارَ بَعْضٍ فِى سَمْعَةٍ وَاحِدَةٍ (جامع بيان العلم)۔	ان میں سے بعض لوگ صرف ایک دفعہ سن کر لوگوں کے اشعار یاد کر لیا کرتے تھے۔

عرب باشندوں میں قوت حافظہ اس قدر نمایاں تھی کہ آج تاریخی طور پر یہ بات مسلم سمجھی جاتی ہے کہ اِنَّ العَرَبَ قَد خُصَّت بِالحِفظِ (عرب حافظے کے معاملے میں خصوصیت کے حامل تھے) حافظ ابن عبدالبر بھی عربوں کی اس تاریخی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مَذهَبُ العَرَبِ اَنَّهُم كَانُوا مَطبُوعِينَ عَلَى الحِفظِ مَخصُوصِينَ بِذٰلِكَ (جامع بيان العلم)	عرب کا عام طریقہ تھا کہ حفظ کے وہ عادی ہو گئے تھے اس بات میں انہیں ایک خاص خصوصیت حاصل تھی۔

عربوں کو اپنی اس خصوصیت پر فخر بھی تھا انھیں اپنی قوت حافظہ پر اس قدر اعتماد تھا کہ لکھ کر یاد کرنے تک کو وہ ایک نقص خیال کرتے تھے۔ کتابی علم کو وہ علم ہی نہ سمجھتے تھے ان کے یہاں یہ فقرہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا تھا کہ حَرفٌ فِى تَامُورِكَ خَيرٌ مِن عَشرَةٍ فِى كُتُبِكَ (تیرے ذہن میں ایک حرف کا ہونا کتاب کی دس باتوں سے بہتر ہے) ان کے درمیان ایسے اشعار بہت عام تھے جن میں کتابی علم کا مذاق اڑایا جاتا کتابت اور تحریر کو ایک عیب کے طور پر پیش کیا جاتا اور اس کے مقابلے میں قوت حافظہ کی برتری ثابت کی جاتی۔ مثلاً کسی شاعر کا شعر ہے ؎

لَيسَ بِعِلمٍ مَا حَوَى القِمَطرُ ۔۔۔ مَا العِلمُ اِلَّا مَا حَوَى الصَّدرُ

یعنی علم وہ نہیں ہے جو کتابوں میں درج ہے بلکہ علم تو صرف وہی ہے جو سینے میں محفوظ ہے۔ ایک اور شاعر کاغذوں کو علم کا بدترین مدفن خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ علم کو کاغذ کے سپرد کر دینا ایسا ہے جیسے اسے ضائع کر دیا وہ کہتا ہے:

اِستَودَعَ العلمَ قرطاساً فَضَیَّعَہٗ   وبِئسَ مُستَودَعُ العلمِ قراطیسُ

یعنی جس نے علم کو کاغذ کے سپرد کر دیا اس نے گویا اسے ضائع کر دیا اور کاغذ تو علم کے بدترین مدفن ہیں۔ غرض عرب تحریر و کتابت کو پسند نہیں کرتے تھے اور جو شخص قوت حافظہ پر اعتماد کرنے کے بجائے لکھے ہوئے پر بھروسہ کرتا تھا اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ ذوالرمہ آخری مخضرمی شاعر مدتوں اس بات کو چھپاتا رہا کہ وہ فنِ کتابت سے آشنا ہے اسے ڈر تھا کہ کہیں اسے لوگ ناپسند نہ کرنے لگیں۔

عربوں کا تحریر و کتابت کو ناپسند کرنا اور اس پر بھروسہ کرنا ظاہر ہے صرف اس بنا پر تھا کہ انہیں اپنے قوتِ حافظہ پر ناز تھا وہ زیادہ سے زیادہ اس سے کام لیتے اور جتنا زیادہ وہ اس سے کام لیتے جاتے تھے اتنی ہی زیادہ اس میں بالیدگی اور قوت بڑھتی جاتی تھی کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس قوت کو جتنا زیادہ استعمال کیا جائے گا اتنی ہی زیادہ اس قوت میں جلا پیدا ہوتی جائے گی چنانچہ قوتِ حافظہ سے کام لینے کی عادت نے عربوں کو بے پناہ قوی الحافظہ بنا دیا تھا۔

اسلام آیا تو حفظِ حدیث کے مشغلے نے عربوں کی اس قوتِ حافظہ کو مزید جلا بخشی انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ اس قوت سے کام لینا شروع کر دیا یوں بھی اسلام کے آجانے سے ان کے وہ تمام مشغلے یک دم متروک ہو گئے تھے جو ان کی ذہنی اور دماغی قوتوں کے لیے غذا کا حکم رکھتے تھے ان کا سب سے بڑا مشغلہ شعر و شاعری کا تھا مگر اسلام جھوٹ پر مبنی مبالغہ آمیز شاعری کو قطعاً پسند نہ کرتا تھا خمری اور فحش اشعار کی تو کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ انساب کے علم سے بھی انہیں شغف تھا اسلام بھی اس علم کو اگرچہ ناپسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتا تھا مگر یہ علم زیادہ تر باہمی تفاخر یا ایک دوسرے کی توہین کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو ظاہر

ہے اسلام کی نظر میں غیر پسندیدہ فعل تھا یوں یہ ذہنی مشغلہ بھی متروک ہوگیا تھا۔ ایسے وقت میں جب کہ عربوں کی ذہنی اور دماغی قوتیں اپنی پرانی غذاؤں سے محروم ہو کر کسی نئی غذا کی کھوج میں تھیں انہیں حفظِ حدیث کا مشغلہ ہاتھ آگیا اور پھر وہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر اس کی طرف لپکے اور ایسے گم ہوئے کہ بس اسی کے ہو کر رہ گئے ان کی تشنہ قوتِ حافظہ نے پھر ایسی جولانیاں دکھائیں کہ دنیا حیران رہ گئی ؂

حکمِ نبوی

عربوں کی قوتِ حافظہ سے متعلق اس تاریخی حقیقت کے پسِ منظر میں جب ہم صحابۂ کرام کی محبت و عظمت کے ان مظاہر پر نظر ڈالتے ہیں جن کا اس سے پہلے تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے تو حفظِ حدیث پر یقین و اعتماد کی ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی یہ یقین و اعتماد کی کیفیت اس وقت مزید قوت حاصل کر لیتی ہے جب ہم اس مرکزِ محبت اور محورِ عظمت ہستی کو خود یہ حکم دیتا ہوا پاتے ہیں کہ جو کچھ مجھ سے سنو اور جو کچھ مجھے کرتا ہوا دیکھو اسے یاد رکھو اور دوسروں تک پہونچاؤ یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ صحابۂ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کے عاشق تھے اور اس لیے آپؐ کی حیات کا ایک ایک لمحہ ان کے ذہنوں پر نقش تھا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بات یہ تھی کہ وہ محبوب خود کہہ رہا تھا کہ میری ایک ایک بات یاد رکھو اور عاشقین صادقین اپنے محبوب کی خواہش پورا کرنے میں دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔ اسی طرح بات محض اتنی ہی نہیں کہ صحابۂ کرام عظمتِ نبوی کے تقاضوں کی تکمیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول اور ہر فعل کو حرزِ جاں بناتے ہوئے تھے بلکہ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ صاحبِ عظمت ہستی خود حکم دے رہی تھی کہ میرے ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کو یاد رکھو اور دوسروں تک پہونچاؤ اور حکم بھی سرسری طور سے نہیں بلکہ اس کی اہمیت کا عالم یہ ہے کہ منیٰ کا میدان ہے حجۃ الوداع کا موقع ہے وہ حج جس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا کی حیاتِ مبارک میں دوبارہ حج نصیب نہیں ہوا۔ ایک لاکھ سے اوپر جاں نثار صحابہ کا مجمع ہے حجۃ الوداع کے تاریخی خطبے کے الفاظ آپؐ کی زبان مبارک سے نکل رہے ہیں پورا مجمع ہمہ تن گوش بنا ہوا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایک خاص کیفیت طاری ہے۔ ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ آپؐ اپنی لائی ہوئی ہدایت کے رہنما اُصول اس خطبے میں واضح فرما دینا چاہتے ہیں اور یہ اطمینان کر لینا چاہتے ہیں کہ تبلیغ ہدایت کی جو ذمہ داری اللہ تعالےٰ کی جانب سے سونپی گئی تھی وہ بہ تمام وکمال پوری ہو گئی ہے کیونکہ صحابہ سے خطاب کر کے بڑے ہی دل سوز انداز میں پوچھا جا رہا ہے کہ کیا میں نے اللہ کا پیغام تم تک تمام پہونچا دیا اور مجمع کی طرف سے بیک آواز اثبات میں جواب پا کر بار بار آسمان کی طرف آپ کی اُنگلی اُٹھتی ہے اور زبان سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں:

اللّٰھمّ ھل بلّغتُ اللّٰھمّ ھل بلّغتُ اللّٰھم ھل بلّغتُ ۔	اے اللہ کیا میں نے پہونچا دیا اے اللہ کیا میں نے پہونچا دیا اے اللہ کیا میں نے پہونچا دیا۔

غرض ایسے پراثر ماحول میں اور ایسے اتمام حجت کے موقعہ پر آپؐ کی زبان مُبارک سے جو آخری الفاظ نکلتے ہیں وہ اسی حکم پر مشتمل ہیں۔ یعنی اقوال وافعال نبوی کو یاد رکھنے اور دُوسروں تک پہونچانے کا حکم۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں:

الا فلیبلّغ الشّاھدُ الغائبَ (صحاح)	خبردار جو حاضر ہے اسے چاہیئے (میری باتیں) غائب کو پہونچاتا جائے۔

مختلف اطراف واکناف سے مختلف قبائل کے وفود دربارِ نبوی میں حاضر ہو رہے ہیں اور جب صحبت نبوی سے مستفید ہو کر اور آپ کے اقوال وافعال کا مشاہدہ کر کے واپس ہونے لگے ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے ہیں:

اِحفظوھنّ وَاَخبرُوھنّ مَنْ وَرَاءَکُم (بخاری)۔	ان تمام باتوں کو یاد رکھو اور جو لوگ تمہارے پیچھے والے ہیں انہیں مطلع کرتے رہو۔

کبھی صحابہ کے مجمع سے خطاب کر کے بطور پیش گوئی کے ارشاد ہو رہا ہے:

تَسمَعُونَ ویُسمَعُ مِنکُم ویُسمَعُ مِمَّنْ الَّذِینَ یَسمَعُونَ مِنکُم۔ (ابوداؤد)	تم مجھ سے سُن رہے ہو تم سے بھی سنا جائے گا اور جن لوگوں نے تم سے سنا ان سے بھی لوگ سُنیں گے۔

یعنی جب معاملہ یہ ہے کہ میری باتیں تمہیں دوسروں کو سنانی ہیں تو انہیں یاد رکھو تا کہ اپنی ذمہ داری

سے یا حسن وجوہ عہدہ برآ ہوسکو حامل نبوت کے رمز شناس اس بلیغ گوئی کے بالواسطہ و بلا واسطہ ہر قسم کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہیں وہ اپنی ذمہ داریوں سے بھی پوری طرح واقف ہیں انہیں اپنے محبوب کی منشاء پوری کرنے کے لیے کسی قسم کی تصریحات کی ضرورت نہیں وہ تو خم ابرو کے اشاروں کا بھی انتظار نہیں کرتے تعمیل کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ صحابہ نے واقعی اپنی ذمہ داری کو خوب پہچانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے جو کچھ سنا جو کچھ دیکھا آنے والوں کو من وعن سنا دیا ہو بہو کر کے دکھا دیا۔

صحابۂ کرام کے تعمیل حکم کے اس جذبے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم بھی پوری طرح باخبر تھے آپ کے سامنے صحابہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر سنت نبوی کی حفاظت کرنے اور پوری صحت کے ساتھ اس کو دوسروں تک پہونچانے کا اہتمام کرتے ہیں لگے ہوئے تھے چونکہ یہ سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور منشاء قلبی کے عین مطابق تھا اس لیے بے اختیار زبان نبوی پر صحابۂ کرام کے لیے دعائیہ کلمات جاری ہو جاتے ۔ آپ فرماتے

نضّر اللہ امرءً سمِعَ منّا حدیثًا فبلّغہ کما سمِعہ فربّ مبلّغ اوعٰی من سامِع ۔ (صحیح ابن حبان)	اللہ اس شخص کو تر و تازہ رکھے جس نے ہم سے حدیث کو سنا اور جس طرح سنا تھا اسی طرح دوسروں تک پہونچا دیا لیکن اوقات مجھ سے سننے والوں کی نسبت زیادہ حفاظت کرنے والے وہ ہوتے ہیں جو ان سے سنتے ہیں۔

ان دعائیہ کلمات ہیں بھی کما سمعہ کے الفاظ حفظ حدیث کے حکم کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس طرح سنا تھا اسی طرح ہو بہو دوسروں تک پہونچانا اسی وقت ممکن ہے جب سُنی ہوئی بات کو حفظ کر لیا جائے۔ حفظ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر اہتمام تھا کہ آپؐ صحابہ کو جو کچھ سناتے یا کر کے دکھلاتے تو اس کے متعلق صرف یہ حکم دے دینے پر اکتفا نہ کرتے کہ اس سُنے ہوئے کو یاد رکھو یا جس طرح مجھے کوئی کام کرتے دیکھو اسی طرح تم بھی اسے عمل میں لاؤ بلکہ باقاعدہ اس بات کی نگرانی فرماتے کہ اس حکم پر پوری طرح عملدرآمد بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ ذخیرۂ احادیث سے اس قسم کے بہت سے واقعات تلاش کیے جا سکتے ہیں جو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نگرانی کا ثبوت مہیا کرتے ہیں مگر طوالت کے خوف سے صرف دو واقعات ہی بطور نظیر کے ہدیۂ قارئین ہیں ان میں سے ایک واقعے کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ہے اور دوسرا واقعہ آپؐ کے فعل سے متعلق ہے

ایک مرتبہ آپ نے ایک صحابی کو سوتے وقت پڑھنے کے لیے ایک دُعا تعلیم فرمائی۔ پھر پوچھا بتاؤ میں نے کیا کہا جو کچھ میں نے کہا ہے اسے دوہراؤ۔ صحابی نے وہ دُعا دوہرائی مگر اس دُعا کے آخری فقرے میں غلطی سے نَبِیِّکَ کے بجائے صحابی کے مُنہ سے رسولِکَ کا لفظ نکل گیا۔ اگرچہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنیٰ ہیں یعنی نبی اور رسول۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اپنی زبان مبارک سے نَبِیِّکَ کا لفظ ادا فرمایا تھا اس لیے ارشاد ہوا کہ میں نے یہ نہیں کہا جو کچھ میں نے کہا ہے وہی دوہراؤ۔ غور کیجئے بات اگرچہ صرف دُعا کی تھی جو محض مستحب ہے فرض یا واجب کے حکم سے متعلق کوئی لفظ نہ تھا مگر اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصرار ہے جو میں نے کہا ہے بالکل وہی دوہراؤ۔ جب ایک معمولی دُعا کے الفاظ کے بارے میں اس قدر سخت نگرانی ہے تو خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ مہمات شریعت اور اساسی امور سے متعلق ارشادات کے بارے میں آپؐ کی نگرانی کا کیا حال ہوگا۔

اسی طرح آپ کے فعل سے متعلق بھی ایک واقعہ بہت مشہور ہے ایک صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے اُنہوں نے نماز کے تمام ارکان قیام اور رکوع وسجود وغیرہ ادا تو بالکل درست طریقے اور صحیح ترتیب کے ساتھ کیے مگر ان کی ادائیگی میں ذرا جلد بازی سے کام لیا وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صَلِّ فَاِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ (پھر نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی) اُنہوں نے دوبارہ نماز پڑھی مگر اس بار بھی مطلوبہ سکون ووقار پیدا نہ ہوسکا آپؐ نے پھر وہی فرمایا اُنہوں نے پھر نماز دوہرائی لیکن اس مرتبہ بھی وہ نماز صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ (اسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو) کے سانچے میں پوری نہ اُتر سکی۔ بہرحال تیسری بار جاکر کہیں وہ صحابی درست نماز پڑھ پائے۔ اس واقعے میں غور کرنے والی بات یہ

ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے افعال کے طریقوں کی حفاظت کا بھی کس قدر اہتمام تھا کہ نماز میں سکون واطمینان اگرچہ اکثر فقہا کے نزدیک فرض یا واجب کے درجہ میں نہیں ہے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کیے ہوئے عمل کے نمونے کی حفاظت پر اصرار ہے۔

غرض حفظ حدیث پر یقین و اعتماد کی کیفیت میں یہ امر مزید قوت کا باعث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خود یہ خواہش ہے کہ میرا ہر قول اور ہر فعل محفوظ رکھا جائے نہ صرف خواہش بلکہ آپ حکم دیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور پھر اس بات کی نگرانی فرماتے ہیں کہ اس حکم کی تعمیل کس انداز میں ہو رہی ہے۔ اندازہ کیجئے کہ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے متوالوں اور آپ کی عظمت کے شیدائیوں نے اپنے محبوب کی خواہش کو پورا کرنے اور اپنے آقا کے حکم کو بجالانے میں کیا کچھ نہ کیا ہوگا کیا اس کے بعد بھی اس بدگمانی کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ حفظ حدیث میں تساہل غفلت اور لاپرواہی سے کام لیا ہوگا۔

منشائے الٰہی

اس سلسلے میں یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش بلکہ آپ کا یہ حکم کہ مجھ سے جو کچھ سنو اور جو کچھ مجھے کرتے دیکھو اسے یاد رکھو در اصل منشاء الٰہی کی تکمیل تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دینے کے بعد اللہ تعالےٰ نے قیامت تک اپنے دین کو محفوظ کرنے کا کام چونکہ امت محمدیہ کے سپرد کر دیا تھا اس لیے ضروری تھا کہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت اپنی پوری شکل میں قیامت تک موجود رہے اور اس کی یہی صورت تھی کہ صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کا مجسم نمونہ بن جائیں اور آئندہ آنے والوں کو من وعن جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے سنا اور کرتے دیکھا پورا پورا پہونچادیں گویا صحابہ سے خود قرآن کا یہ مطالبہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو کچھ انہوں نے سنا ہے اور جو کچھ خدا کے نبی کو انہوں نے کرتے دیکھا ہے وہ دوسروں تک مسلسل پہونچاتے چلے جائیں ہر حاضر غائب کو اور ہر موجود شخص آئندہ آنے والوں کو

اقوال و افعال نبوی کی طرف بلاتا چلا جائے۔ قرآن کا پیغام تھا:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران: ۱۱۰)	تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں (کی بہتری) کے لیے ظاہر کی گئی ہے تاکہ لوگوں کو بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔

قرآن کا مطالبہ تھا

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران: ۱۰۴)	اور چاہیے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف بلایا کرے اور بھلائی کا حکم دیتی رہے بدی سے روکتی رہے۔

بھلا کیسے ممکن تھا کہ صحابہ قرآن کی اس پکار پر لبیک نہ کہتے قرآنی تقاضوں کی تکمیل ہی کی خاطر تو انہوں نے قسم قسم کی مشقتیں سہیں تھیں طرح طرح کی اذیتیں برداشت کیں تھیں اپنا گھر بار چھوڑا تھا اور اپنے وطن کو خیر باد کہا تھا قرآنی مطالبوں کو پورا کرنے کی خاطر تو انہوں نے اپنے عزیز و اقارب تک سے قطع تعلق کر لیا تھا، وہ سب سے منہ موڑ کر قرآن اور صاحب قرآن کے ہو رہے تھے اب قرآن اگر ان سے کہہ رہا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو کچھ سنو اسے ورد زبان بنا لو جو کچھ اللہ کے رسول کو کرتا دیکھو اسے حرز جاں کر لو تو کیسے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ نے قرآن کے اس مطالبے کی تکمیل میں کسی تساہل یا غفلت سے کام لیا ہو گا۔ قرآن نے ان سے کہا

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا (الحشر: ۷)۔	رسول نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اسے لے لو اور جس سے روکا ہے اس سے رک جاؤ۔

اور وہ دنیا کی ہر چیز سے دست بردار ہو کر رسول کی ذات میں گم ہو گئے وہ اس کی

آواز کے لیے ہمہ تن کان اور اس کے احکام کی تعمیل میں ہمہ تن اطاعت بن گئے۔ رسول نے جو کچھ دیا وہ اسے مضبوطی سے تھامتے چلے گئے اور جس سے روکا اس سے یک لخت منہ موڑ لیا۔ اور پھر اپنی زبان اور اپنے عمل سے رسول اللہ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کے امین بن گئے۔ غور کا مقام ہے جس دین کی خاطر صحابہ نے سب کچھ برداشت کیا وہی ان سے مطالبہ کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر ادا پر نگاہ رکھو اور آپؐ کی لائی ہوئی ہدایت کے ہر ہر جزو اور ایک ایک خط و خال کی زندہ تصویریں بن جاؤ تو کیسے ممکن تھا کہ وہ اس مطالبے کو کوئی اہمیت نہ دیتے اس مطالبے کو پورا کرنے میں ان سے جو بن پڑا انہوں نے اس کے کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

حفظ حدیث کے عوامل اور اعتماد کی بنیاد

غرض حفظ حدیث کے سلسلے میں اب تک جن عوامل کا بیان ہوا ہے ان کو یکجا کر کے دیکھئے اور پھر سوچئے کہ ان عوامل کی موجودگی کی بنا پر حفاظت حدیث میں کس قدر اہتمام کس درجہ انہماک اور کیسی توجہ سے کام لیا گیا ہوگا۔ جن لوگوں کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا ہو جس کے چند ایک نمونے ابھی آپ کی نظر سے گزرے جو لوگ شمع نبوی پر پروانہ وار نثار ہونے ہوں جن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عظمت کا پیکر ہو اور جو لوگ بے پناہ قوتِ حافظہ کے مالک ہوں انہوں نے احادیث کی حفاظت میں اپنی محبت کی کیسی روشن مثالیں قائم کی ہوں گی عظمت نبوی کے تقاضوں کی کس کس طرح لاج رکھی ہوگی اپنی قوتِ حافظہ کے کیسے کیسے کرشمے دکھاتے ہونگے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اس بدگمانی کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ حفظ حدیث میں کوئی کوتاہی غیر ارادی طور پر بھی ان کی جانب سے ظہور پذیر ہوئی ہو خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ خود وہ ہستی ان سے حفظِ حدیث کا مطالبہ کرتی ہو جو ان کی محبت کا مرکز ہے جس کو وہ عظمت کی بلندیوں پر متمکن دیکھتے ہیں اور پھر ان سب پر مزید یہ کہ رضائے الٰہی کا حصول بھی وہ حفظ حدیث ہی میں منحصر سمجھتے ہوں۔ ان تمام عوامل کے یکجا ہو جانے کے بعد کوئی عقل سے عاری ہی ہو تو یہ کہہ سکتا ہے کہ حفاظت حدیث کے سلسلے میں محض صحابہ کے حفظ پر اعتماد

نہیں کیا جا سکتا۔ حق یہ ہے کہ ان تمام عوامل نے مل کر صحابہ میں ایک ایسی رُوح پھونک دی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و احوال کی حفاظت کے علاوہ ان کو کچھ اور یاد ہی نہ رہا تھا۔

حفظِ حدیث میں صحابہ کا شغف

صحابہ سب کچھ بھول کر حفظِ حدیث کے کام میں ایسے منہمک ہوئے کہ سچ پوچھئے تو انہیں تن من کا ہوش نہ رہا ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو آستانۂ نبوی پر آئے تو بس اسی در کے ہو رہے عمر گزار دی دن رات خدمت نبوی میں رہ کر حفظِ حدیث کے علاوہ کوئی کام نہ کیا۔ ایسے بھی تھے جن کو نہ کھانے پینے کا ہوش تھا نہ راحت و آرام کی فکر۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کا استحضار تھا اور وہ تھے۔ انہی میں وہ لوگ بھی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک حدیث کے لیے در در کی خاک چھانتے پھرتے تھے وہ بھی تھے جو حفظِ حدیث ہی کی دھن میں دُور دراز کے سفر کی صعوبتوں کو تسکینِ قلب کا سامان سمجھتے رہے۔

آیئے صحابۂ کرام کے اس عظیم الشان کام کی چند جھلکیاں دیکھتے چلیں اندازہ لگایئے صحابہ نے قرآن کی اس پکار کا کہ اللہ کا رسول جو کچھ تمہیں دیتا ہے اسے لے لو کس طرح جواب دیا۔

یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں ان کے نام سے کون واقف نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بہت کثرت سے ان سے مروی ہیں۔ یمن کے رہنے والے ہیں قبیلۂ دوس سے ان کا تعلق ہے عین عالم شباب میں یعنی تیس سال کی عمر میں خیبر کے مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور پھر بس آپ ہی کے در کے ہو رہتے ہیں دن ہو یا رات، سردی ہو یا گرمی سفر ہو یا حضر صبح و شام چوبیس گھنٹے آپ کا اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کہ ہر گھڑی ہر لمحے خدمتِ نبوی میں حاضر رہیں اور جو آپؐ اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمائیں اسے سنیں اور جو کچھ آپؐ کو کرتا ہوا دیکھیں اس کا بغور مشاہدہ کریں اور پھر آپؐ کے ان تمام اقوال و افعال کو ذہن میں محفوظ کر لیں۔ آستانۂ نبوی پر حضرت ابوہریرہ کی یہ ہمہ وقت حاضری اور حفاظت حدیث میں یہ ہمہ تن مشغولیت پورے ذوق و شوق اور اہتمام کے ساتھ اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بالآخر اس دُنیا سے تشریف نہ لے گئے۔ اس پُورے دَور میں حضرت ابوہریرہ کا عالم یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر مسجد نبوی میں تشریف فرما ہیں

تو یہ مسجد نبوی کے کسی گوشے میں بیٹھے جمال نبوی کے مشاہدے میں مشغول ہیں اگر آپؐ ازواج مطہرات کے مکانوں میں سے کسی مکان میں داخل ہو گئے ہیں تو یہ دہلیز تک ساتھ ساتھ ہیں اور پھر وہیں بیٹھے آپؐ کے باہر تشریف لانے کے منتظر ہیں۔ آپؐ حج پر جا رہے ہیں یا جہاد کا سفر در پیش ہے تو ابو ہریرہ ضرور ہم رکاب ہیں غرض کوئی وقت ایسا نہ تھا جب یہ یمنی دوسی نوجوان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد منڈلاتا نظر نہ آتا ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو آج ہم ذخیرۂ حدیث کے سب سے بڑے راوی کی حیثیت سے جانتے ہیں کبھی کبھی اپنے واقعات بیان کرتے ہوئے خود فرمایا کرتے:

قدمت علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بخیبر انا یومئذ قد زدت علی الثلاثین فاقمت معہ حتیٰ مات و ادور معہ بیوت نسائہ واخدمہ واغزو معہ (ابن سعد)	میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خیبر کے مقام پر حاضر ہوا اس وقت میری عمر تیس سال سے اوپر ہو چکی تھی پھر میں نے آپؐ کے ساتھ قیام کر لیا یہاں تک کہ آپ کی وفات ہو گئی میں آپؐ کے ساتھ لگا رہتا آپ اپنی بیویوں کے مکانوں پر جاتے تو میں آپؐ کے ساتھ جاتا آپ کی خدمت کرتا حج اور جہاد میں آپ کے ساتھ ہوتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی حفاظت میں حضرت ابو ہریرہ کے شغف کا عالم یہ تھا کہ نہ بھوک کی پرواہ تھی نہ پیاس کا خیال، کئی کئی وقت فاقوں سے گزر جاتے زمین پر ٹیک لگا لگا کر یا پیٹ سے پتھر باندھ باندھ کر اپنے آپ کو تھامے رہتے۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں، حضرت ابو ہریرہ کے خود اپنے الفاظ ہیں:

واللّٰہ الذی لا الٰہ الا ھو ان کنت لاعتمد علی الارض بکبدی من الجوع واشدّ الحجر علی بطنی (بخاری شریف)	اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ بھوک کی وجہ سے میں جگر تھام کر زمین سے سہارا لے لیتا اور اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتا۔

کبھی کبھی بھوک اس قدر تنگ کرتی کہ چکرا کر گر پڑتے اور ایسے بیہوش ہو جاتے کہ لوگ جنون کا اثر سمجھنے

لگتے۔ بعد میں یہ تمام حالات حضرت ابوہریرہ نے بڑے مزے لے لے کر خود بیان کیے ہیں۔ فرماتے ہیں

رأیتنی اصرع بین منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحجرۃ عائشۃ فیقال مجنون وما بی جنون ان ھی الا الجوع (معارج)	میں خود کو پاتا کہ منبر نبوی اور حضرت عائشہؓ کے حجرے کے درمیان چکرا کر گر پڑا ہوں خیال کیا جاتا کہ میں پاگل ہوں حالانکہ جنون سے میرا کیا تعلق وہ تو صرف بھوک کا اثر ہوتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حفاظت حدیث کے کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا ان سے کثرت سے احادیث روایت ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ انہوں نے دُنیا کے ہر کام سے لاتعلق ہو کر حفاظت قرآن وحدیث کے کام ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ خود فرمایا کرتے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اس کے یاد کرنے اور سمجھنے سے زیادہ مجھے کوئی چیز پسند نہ تھی (ابن سعد) اپنی آنکھوں سے دُوسرے لوگوں کو دُنیا کے کاروبار سے نفع اٹھاتے اور آرام و راحت کی زندگی گزارتے دیکھتے مگر اپنے لیے سب سے زیادہ نفع کی تجارت اور راحت و آرام کا کام انہیں اس کے سوا نظر نہ آتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک کے ایک ایک لمحے سے اپنی رُوح کی غذا کا سامان بہم پہونچالیں بہت سے انصار ومہاجرین دُنیا کی مشغولیتوں میں بھی اُلجھے رہتے اور حتی الامکان خدمتِ نبوی میں حاضری کا بھی موقع نکال ہی لیتے مگر حضرت ابوہریرہ کو دُنیا کے کاروبار سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بعض مرتبہ لوگوں کو ان کی کثرت روایت پر تعجب ہوتا تو فرمایا کرتے :

انکم تزعمون ان ابا ھریرۃ یکثر الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ الموعد انی کنت امرأ مسکینا اصحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ملاء بطنی	تم لوگ خیال کرتے ہو کہ ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ حدیثیں بیان کیا کرتا ہے مگر خدا کی قسم میں ایک غریب مسکین آدمی تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیٹ کے بل پڑا رہتا حالانکہ مہاجرین بازاروں کے کاروبار

وکان المھاجرون یشغلھم الصفق بالاسواق وکانت الانصار یشغلھم القیام علیٰ اموالھم (بخاری)	ہیں مشغول رہتے اور انصار اپنے اموال (باغ اور کھیت وغیرہ) میں اُلجھے رہتے۔

یہ تو تھا حضرت ابوہریرہ کا حال۔ اب دیکھئے یہ حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار۔ ان کا بھی یہی عالم تھا کہ ہمہ وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے حتیٰ کہ آپؐ حجرۂ مبارک میں تشریف فرما ہوتے تو وہاں بھی موجود ہوتے کیونکہ ان کو پردہ اٹھا کر حجرۂ نبوی میں بھی داخل ہونے اور آپ کی تنہائی کی گفتگو سننے کی اجازت تھی اور اسی لیے ان کو صاحب السواد (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار) کہا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کو لوگ بس اسی حال میں دیکھتے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی نہ کسی خدمت میں مصروف ہیں کبھی بستر بچھا رہے ہیں کبھی اٹھا کر رکھ رہے ہیں کبھی آپ کی نعلین مبارک اتار رہے ہیں کبھی پہنا رہے ہیں اور کبھی آپ کے نعلین مبارک ان کی بغل میں دبے ہوئے ہیں۔ کبھی ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسواک اس کی مناسب جگہ پر رکھنے کی فکر ہے تو کبھی وضو کا پانی مقررہ وقت پر مہیا کرنے کا خیال ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غسل فرما رہے ہیں اور حضرت عبداللہ ابن مسعود چادر تانے کھڑے ہیں، آپ سوئے ہوتے ہیں اور یہ انتظار میں ہیں کہ مقررہ وقت پر بیدار کرنے کی ذمہ داری پوری کریں۔ اللہ کا رسول سفر میں ہے اور یہ اللہ کا سپاہی مسلح ہو کر بطور گارڈ ساتھ ساتھ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف لائے اور عبداللہ ابن مسعود نے لپک کر آپؐ کا عصا آپؐ کے دستِ مبارک میں دے دیا ہے آپؐ اٹھ کر چلنے لگے ہیں اور عبداللہ ابن مسعود ہیں کہ عصائے نبوی ہاتھ میں تھامے آگے آگے بطور پیش خدمت کے چلے جا رہے ہیں تا آنکہ آپؐ سے پہلے حجرے میں داخل ہو کر آپ کے راحت و آرام

کی جگہ کو درست کرنے میں مشغول ہو گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کی انہی مشغولیتوں کی بنا پر صحابہ کے درمیان ان کا خطاب ہی صاحب النعلین والسواک والوسادۃ پڑ گیا تھا۔ دربار رسالت میں ان کی ہر وقت کی حاضری سے بعض نو واردوں کو یہ مغالطہ لگ جاتا تھا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے گھر کے کوئی آدمی ہیں چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ہم جب یمن سے آئے تو مدتوں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے متعلق یہی گمان کرتے رہے کہ

انّہٗ رجلٌ من اھل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما نری من دُخولہٖ ودُخولِ اُمّہٖ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم (اصابہ)	کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے کوئی آدمی ہیں جس کی وجہ ان کی اور ان کی ماں کی آمد و رفت تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتی رہتی تھی۔

دربار نبوی میں یہ ہر وقت کی حاضری ذرا غور تو کیجئے آخر کس لیے تھی۔ ما آتاکم الرسول فخذوہ (جو کچھ رسول تمہیں دیتا ہے اسے لے لو) کی قرآنی پکار کے عملی جواب کے علاوہ بھی کوئی اور وجہ اس کی سمجھ میں آتی ہے نہیں ہرگز نہیں۔ یہ ہر وقت کی حاضری صرف اسی لیے تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو کچھ سنیں اور جو کچھ آپ کو کرتے ہوئے دیکھیں ایک ایک لمحۂ حیات نبوی کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیں پھر خود بھی اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالیں اور دوسروں تک بھی ہدایت کے یہ خزانے من وعن پہونچا دیں۔

بات صرف حضرت ابو ہریرہ یا حضرت عبداللہ ابن مسعود یا اسی قسم کے چند گنے چنے صحابہ تک محدود نہیں بلکہ تقریباً تمام صحابہ کا یہی حال تھا۔ کوئی موقع دربار رسالت میں موجود رہنے کا ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ ابھی حضرت عمرؓ کا حال آپ سن ہی چکے ہیں کہ ایک انصاری صحابی کے ساتھ دربار نبوی میں حاضری کے لیے باری مقرر کی ہوئی تھی کہ کہیں کسی وقت کے فیض و برکت سے محرومی نہ ہو جائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ مسلسل نو دس

سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی خدمت میں مصروف رہے یہ دس سال کی عمر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے پھر آپؐ کے دُنیا سے رحلت فرمانے تک آپ کی ہمہ وقت حضوری سے فیض یاب ہوتے رہے۔ ان کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موالی مثلاً حضرت رافع اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما بھی شاذونادر ہی دربار رسالت کی حاضری سے محروم رہتے۔ ان سب کے سامنے صرف ایک ہی مقصود تھا اور وہ یہ کہ ما آتاکم الرسول فخذوہ کی زندہ عملی تفسیر بن جائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ ملے اسے لے کر محفوظ کرلیں اور دُوسروں تک پہونچائیں۔ اس مقصد کے حصول کی لگن صرف مردوں تک ہی محدود نہ تھی۔ عورتوں میں یہی حال امہات المومنین کا تھا جن میں سے کوئی نہ کوئی آپؐ کی خلوت کی زندگی میں آپؐ کے ساتھ ہوتی تھیں اور آپؐ کے اقوال و افعال کی حفاظت کا فریضہ اسی طرح انجام دیتی تھیں جس طرح جلوت کی زندگی میں مرد صحابہ انجام دے رہے تھے۔

پھر اسی پر بس نہیں جن امور کا علم صحابہ کو براہ راست حاصل نہ ہو پاتا اس کو ایک دُوسرے سے پوچھتے پھرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد تو حصول حدیث کے شغف میں صحابہ کا عالم ہی عجیب تھا جس کسی کے بارے میں علم ہو جاتا کہ اس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل محفوظ ہے ہزار جتن کر کے صحابہ اس کے پاس پہونچتے اور جب تک وہ حدیث حاصل نہ کر لیتے چین نہ آتا۔ ایک ایک حدیث کی خاطر مصر و شام جیسے دُور دراز علاقوں کا بھی اگر سفر کرنا پڑتا تو اس سے بھی انہیں عذر نہ ہوتا حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کثیر احادیث کے راوی ہیں خود ایک ایسے ہی سفر کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

بلغنی حدیثٌ عن رجلٍ من اصحابِ النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فابتعتُ بعیراً فشددتُ علیہ رحلی ثم	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے ایک صاحب کے واسطے سے مجھے ایک حدیث پہونچی میں نے ایک اونٹ خریدا اس پر کجاوہ

سِرُتُ الیہ شھرًا حتّٰی قدِمتُ الشّامَ فاِذا عبدُ اللّٰہِ بنُ اُنیسَ الانصاریُّ فاَتیتُ منزلَہٗ وارسلتُ الیہ انَّ جابرًا علی البابِ فرجَعَ الیَّ الرسولُ فقال جابرُ بنُ عبدِ اللّٰہِ فقلتُ نعم فخرج الیَّ فاعتنقتہٗ و اعتنقنی قال قلتُ حدیثٌ بلغنی عنکَ انّکَ سمعتہٗ من رسولِ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی المظالِمِ لم اسمعہٗ انا منہ قال سمعتُ رسولَ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول الحدیث (جامع بیان العلم)

کیا اور ایک ماہ تک چلتا رہا یہاں تک کہ میں شام پہونچ گیا پھر میں عبداللہ بن انیس انصاری (جن سے حدیث پہونچی تھی) کے گھر جا پہونچا اندر آدمی بھیجا کہ دروازے پر جابر کھڑا ہے آدمی نے واپس آکر پوچھا کہ کیا جابر بن عبداللہ رضؓ ہیں میں نے کہا ہاں! عبداللہ بن انیس باہر نکل آئے دونوں نے معانقہ کیا پھر میں نے پوچھا کہ مجھے آپ کے واسطے سے ایک حدیث پہونچی ہے جو آپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مظالم کے بارے میں سنی ہے اور میں اس حدیث کو نہیں سن سکا عبداللہ بن انیس نے جواب میں کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا پھر اُنھوں نے پوری حدیث سنائی)۔

مدینے سے شام جیسے دُور دراز علاقے کا سفر۔ ذرا غور تو کیجیے۔ کہہ دینا اور سن لینا آسان ہے۔ اتنا طویل سفر کیا جائے تو نوبت لگتی ہے اور پھر خصوصاً آج سے ہزار بارہ سو سال پہلے کا سفر، ذرائع آمد و رفت کا حال معلوم صرف اُونٹ کی پشت پر صحراؤں اور ریگستانوں کے درمیان قطع مسافت۔ یہ سب کچھ کس لیے صرف ایک حدیث کے حصول کی خاطر! ایک حدیث پوری بھی بڑی بات ہے بعض اوقات کسی حدیث کے محض ایک حرف کی تصحیح کی خاطر صحابہ نے رختِ سفر باندھ لیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا نام روایتِ حدیث میں بڑا معروف ہے

ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے ایک مرتبہ حدیث کے صرف ایک حرف کی درستی کے لیے باقاعدہ سفر اختیار کیا۔ اسی طرح دارمی میں ایک اور صحابی کے متعلق ہے کہ وہ اسی مقصد سے حضرت فضالہ بن عبداللہؓ کے پاس مصر پہونچے، فضالہ اس وقت اپنی اونٹنی کا چارہ تیار کر رہے تھے۔ ان کے خوش آمدید کہنے پر وہ صحابی بولے میں آپ کی ملاقات کو نہیں آیا بلکہ میں نے اور تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سُنی تھی میں یہ اُمید لے کر آیا ہوں کہ وہ تمہیں یاد ہو گی۔ اسی قسم کا بلکہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ایک واقعہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ اُنھوں نے اور حضرت عقبہ بن عامرؓ نے ایک حدیث مسلمانوں کی عیب پوشی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ساتھ سُنی تھی۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو اتفاق سے اس حدیث کے الفاظ میں کچھ شبہ پیدا ہو گیا ضرورت ہوئی کہ حضرت عقبہ بن عامرؓ سے اس سلسلے میں استفسار کریں معلوم ہوا کہ وہ تو مصر جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ آپ کو یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ حضرت ابوایوب انصاری صرف ایک معمولی سا شک دُور کرنے کی خاطر مدینہ منورہ سے مصر روانہ ہو جاتے ہیں اور اس سے زیادہ حیرت آپ کو یہ معلوم کر کے ہو گی کہ مصر پہونچ کر کھڑے کھڑے حضرت عقبہ بن عامرؓ سے وہ حدیث سنتے ہیں اور سنتے ہی پھر واپس سوار ہو کر عازم مدینہ ہو جاتے ہیں۔ کجاوہ تک بھی اپنی سواری کا مصر میں نہیں کھولتے۔ حافظ ابن عبدالبر کے الفاظ ہیں کہ

فاتی ابوایوب راحلتہٗ فرکبھا وانصرف الی المدینۃ وما حل رحلہٗ (جامع بیان العلم)	حضرت ابوایوب اپنی سواری کی طرف پلٹے سوار ہوئے اور مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے آپ نے اپنا کجاوہ بھی نہ کھولا۔

کہاں تک بیان کیا جائے کہ صحابہ نے حصول و حفاظت حدیث کی خاطر کیسے کیسے کارنامے انجام دئے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے سُن سُن کر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابن عم ہونے کے باوجود صحابۂ کبار کے دروازوں پر تلاشِ حدیث میں فرشِ خاک پر پڑے نظر آتے ہیں نہ سورج کی تمازت کا خیال ہے نہ تیز و تند گرم ہواؤں کی فکر ہے۔ گرد و غبار کھاتے ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جا رہے ہیں دھن سوار ہے تو بس یہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی جو حدیث جہاں سے ملتی ہے لے لیں ۔ دارمی اپنی سنن میں حضرت عبداللہ ابن عباس ہی کی زبانی روایت کرتے ہیں کہ

كنتُ لآتى الرّجلَ فى الحديث يبلغنى انّهٗ سمعهٗ من رسول الله صلى الله عليه وسلم فاجدهٗ قائلًا فاتوسّد ردائى على بابه تسفى الريحُ التراب علىّ وجهى حتّى يخرج فاذا خرج قال يا ابن رسول الله صلى الله عليه وسلم مالكَ فاقول بلغنى حديثٌ عنكَ انكَ تحدّثهٗ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فاحببتُ ان اسمعهٗ منكَ فيقولُ هلّا بعثت الىّ حتى آتيكَ فاقول انا احق اليكَ ۔	حدیث کی طلب میں میں کسی ایسے آدمی کے پاس جاتا جن کے متعلق مجھے پتہ لگتا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے اور ان کو پاتا کہ وہ قیلولہ کر رہے ہیں تو اپنی چادر کو تکیہ بنا کر میں ان کے دروازے پر پڑ جاتا ہوائیں گرد و غبار اڑا اڑا کر میرے چہرے پر ڈالتیں تا کہ خود وہ صاحب باہر نکل آتے ۔ باہر نکل کر (مجھے دیکھتے تو) کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے آپ کیسے تشریف لائے ہیں کہتا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کوئی حدیث روایت کرتے ہیں میں نے چاہا کہ وہ حدیث آپ سے سنوں وہ صاحب کہتے آپ کسی کو بھیج دیتے میں خود حاضر ہو جاتا میں کہتا تمہارے پاس حاضر ہونے کا میں زیادہ مستحق ہوں ۔

طلب حدیث میں بھلا اپنے مرتبہ و وقار کا خیال کسے تھا۔ تحصیل حدیث کی لگن میں صحابہ کے درمیان چھوٹے بڑے کا بھی کوئی امتیاز نہ تھا۔ خلفائے راشدین تک اپنی عظمت مرتبت کے باوجود دوسرے صحابہ سے احادیث پوچھنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ

كانوا يعرفون لزومى فيسألونى عن حديثه منهم عمرُ وعثمانُ وعلىٌّ وطلحةُ والزبيرُ (ابن سعد)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میری وابستگی کا حال لوگوں کو چونکہ معلوم تھا اس لیے آپؐ کی حدیثیں لوگ مجھ سے پوچھا کرتے ان میں عمرؓ بھی ہیں عثمانؓ بھی علیؓ بھی طلحہ بھی اور زبیرؓ بھی ۔

غرض صحابہ نے تحصیل حدیث اور حفظ حدیث میں ہر وہ طریقہ اپنایا جو اس کام میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی ایسی حفاظت کی کہ اس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہ اس سے پہلے تھی نہ قیامت تک ممکن ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، ان عوامل کی موجودگی میں جن کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے ایسا ہی کچھ ہونا چاہیئے تھا جیسا ظہور میں آیا۔ ایسا نہ ہوتا تو تعجب کی بات ہوتی۔ حق تو یہ ہے کہ شاید کاغذ کے سفینوں میں بھی حدیث کی ایسی حفاظت ممکن نہ تھی جیسی حفاظت صحابہ نے اپنے سینوں سے کام لے کر کی۔ صحابہ ذخیرۂ حدیث کی مجسم کتابیں بن گئے۔ ہر ہر صحابی اپنی جگہ پر حدیث کا ایک نسخہ تھا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان زندہ نسخوں کی موجودگی میں حدیث کے کاغذی نسخوں کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی اس لیے اگر امر واقعہ ہی فرض بھی کر لیا جائے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں حدیث کا ذخیرہ تحریر میں نہیں آیا تھا تو حفاظت حدیث کے سلسلے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

حدیث کی زندہ کتابیں

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جن واقعات و حالات اور جن اقوال و ملفوظات کا ظہور ہوا تھا صحابۂ کرام اپنے اپنے علم کی حد تک ان اقوال و افعال کا مکمل نمونہ بنے ہوئے تھے اور اس طرح احادیث نبوی کا ذخیرہ صرف کسی ایک نسخے ہی میں نہیں ہزاروں نسخوں کی صورت میں عہد صحابہ سے بھی پہلے عہد نبوی ہی میں وجود میں آچکا تھا۔ قرآن نے صحابہ پر بڑے تاکیدی انداز میں یہ بات واضح کی تھی کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب: ۲۱)۔	تمہارے لیے رسول اللہ (کی زندگی) میں ایک عمدہ نمونہ موجود ہے۔

اور صحابہ نے اس قرآنی وضاحت کی روح کو پہچان کر اپنی زندگی کے ہر گوشے میں ہر پہلو سے اس نمونے کی شمع روشن کر لی تھی صرف فرائض و واجبات ہی کے معاملے میں نہیں بلکہ مستحبات و مباحات میں بھی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر زندگی کے عام معمولات میں بھی صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کی ہو بہو تصویر بن جانے کی کوشش کرتے تھے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق عام طور سے

مشہور ہے کہ ان کا تو عالم یہ تھا کہ سفر پہ راہ میں قصداً اس بات کا اہتمام کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں کہیں اپنی اونٹنی کا رخ پھیرا تھا وہاں ان کی اونٹنی کا رخ بھی ضرور پھرے جن جن مقامات پر آپؐ نے راستے میں نمازیں پڑھی تھیں ان مقامات کو تلاش کر کر کے حضرت عبداللہ ابن عمر نمازیں پڑھتے حافظ ابن حجر عسقلانی حضرت عبداللہ ابن عمر کی اسی عادت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

كان يتبع آثاره في كل مسجد صلّى فيه وكان يعترض براحلته في طريقٍ رأى رسول اللهِ صلى الله عليه وسلم عرضَ ناقته (اصابہ)	جن جن مقامات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیں پڑھی تھیں وہ (ابن عمر) ان کو تلاش کرتے تھے اور نمازیں پڑھتے تھے راہ میں جہاں کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کا رخ پھیرا تھا وہ (ابن عمر) بھی اپنی سواری کا رخ موڑتے۔

ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر کے دوران راہ میں کہیں اونٹ سے اتر کر استنجے کی غرض سے بیٹھے تھے حضرت عبداللہ ابن عمر نے اپنی یہ عادت بنالی تھی کہ جب بھی اس جگہ سے گزر ہونا تو بلا ضرورت بھی اپنی اونٹنی سے اس مقام پر اترتے اور استنجے کی شکل بنا کر بیٹھتے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چال ڈھال اور وضع و قطع تک اس حد تک اپنالی تھی کہ صحابہ ان کو ان کے طریقوں اور ان کی عادات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تشبیہ دیتے تھے ایک مرتبہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ طرز و روش اور چال ڈھال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ قریب کون ہے آپ نے جواب میں فرمایا

اقربُ النّاسِ هَدياً وَ دَلاًّ وسمتاً برسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم ابنُ مسعود (ترمذی)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طرز و روش چال ڈھال اور وضع و قطع میں سب سے زیادہ قریب آدمی ابن مسعودؓ ہیں۔

یوں تو عادات و خصائل نبوی کی ہو بہو نقل کرنا تمام صحابہ ہی کا مطمح نظر تھا لیکن بعض صحابۂ کبار کو جن میں خلفائے راشدین سب میں ممتاز ہیں عادات و خصائل نبوی کے ساتھ ساتھ خصائص نبوی کی ضوفشانیوں سے بھی حظ وافر نصیب ہوا تھا چنانچہ انہیں ہمیں کوئی صدیقیت کے مقام پر فائز نظر آتا ہے تو کوئی حق اور باطل میں امتیاز کے لیے فاروقیت کے اعزاز کا حامل دکھائی دیتا ہے کسی کو "اصدق الناس حیاءً" کا خطاب ملا ہوا ہے تو کسی کو عدل و قضا کی کرسی پر سرفرازی نصیب ہوتی ہے کوئی فقر و زہد نبوی کا مجسم پیکر ہے تو کوئی غناء و کفاف پیغمبری کا زندہ نمونہ ہے غرض ہر صحابی اپنی اپنی جگہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی مکمل تصویر نظر آتا ہے اور یوں ہر صحابی اپنے اپنے مقام پر احادیث نبوی کی ایک زندہ کتاب ہے۔

اور جب تک دھڑکتے ہوئے سینوں پر مشتمل یہ زندہ کتابیں موجود رہیں اس وقت تک پھڑپھڑاتے اوراق سے جڑی ہوئی بے جان کتابوں کی ضرورت ہی لاحق نہ ہوئی اگرچہ معترضین کا منہ بند کرنے کے لیے اللہ نے حفاظت حدیث کے لیے ان کاغذ کے سفینوں کا بھی ساتھ ساتھ انتظام فرمایا جیسا کہ عنقریب انشاء اللہ ثابت ہوا جاتا ہے تاہم اللہ نے اگر یہ انتظام نہ بھی فرمایا ہوتا تب بھی صحابہ کے سینوں میں محفوظ ذخیرۂ حدیث کے مجموعے حفاظت کے تمام تر تقاضے پورا کرنے کے لیے بالکل کافی تھے۔

لاکھوں زندہ کتابیں

ذخیرۂ حدیث کے یہ زندہ مجموعے اس وقت اور بھی زیادہ وقیع اور قابل اعتماد بن جاتے ہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ مجموعے ایک دو نہیں دس بیس نہیں سو دو سو یا ہزار دو ہزار بھی نہیں بلکہ ایک لاکھ سے متجاوز ہیں۔ عقل خود فیصلہ کر سکتی ہے کہ حدیث کے زندہ مجموعوں کی یہ کثرت تعداد حفاظت حدیث پر کیسے غیر متزلزل یقین اور کس قدر ٹھوس اعتماد کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ذرا غور تو کیجئے احادیث کا محور صرف ایک ذات یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اردگرد آپؐ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا مشاہدہ کرنے والی لاکھوں زندہ آنکھیں - ایک فوکس FOCUS (مرکزی نقطہ) اور ہر ہمہ جہتی تصویر کشی کے لیے لاکھوں کیمرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر حرم مبارک میں

تشریف فرما ہیں تو آپ کے ارد گرد ازواج مطہرات کا جھمگٹا ہے وہ ازواج مطہرات جن کے لیے آپؐ کی ذات محض ایک خاوند ہی کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ آپؐ کو ہادی عالم کی حیثیت سے بھی اچھی طرح پہچانتی ہیں انہیں بخوبی معلوم ہے کہ آپؐ کی زندگی کے ہر ہر عمل کو امت کے لیے اسوۂ حسنہ بنایا گیا ہے وہ اسی نقطۂ نظر سے آپؐ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا مشاہدہ کر رہی ہیں وہ آپؐ کی زندگی کے ان لمحات کی بھی امین ہیں جن کو بیوی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ غرض آپؐ حرم مبارک میں ہیں تو ازواج مطہرات آپ کے ارد گرد جمع ہیں اور اگر آپ حرم مبارک کے باہر نجی مشاغل میں مصروف ہیں تو آپؐ کے خدام خاص حضرت انس حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت بلال حضرت رافع رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں مسجد میں تشریف فرما ہیں تو اصحاب صفہ حلقہ بنائے آپؐ کے مختلف ارشادات سُن رہے ہیں اور آپ کو مختلف کام کرتے دیکھ رہے ہیں۔ آپؐ سفر پر تشریف لے گئے ہیں تو ہزاروں صحابہ آپؐ کے ہم رکاب ہیں اور ایک ایک بات نوٹ کر رہے ہیں آپ کے سفر کی کیا کیفیت ہے آپؐ سواری پر کس طرح بیٹھتے ہیں سفر کے دوران آپؐ کی عادات کیا کیا ہیں پڑاؤ پر آپؐ کا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے اسی طرح آپؐ جہاد کے لیے نکلے ہیں تو تقریباً تمام ہی صحابہ آپؐ پر پروانہ وار نثار ہونے کے لیے حاضر ہیں۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ذات مبارک اور مشاہدہ کرنے والے لاکھوں۔ کیا کوئی گوشہ کوئی پہلو اندھیرے میں رہ جانے کا امکان باقی رہتا ہے اگرچہ ان عوامل کی موجودگی میں جن کا ابھی بیان ہُوا ہے صحابہ جیسے جاں نثاروں کی ایک چھوٹی سی جماعت بھی ارشادات نبوی کو یاد رکھنے اور ان حالات و واقعات کو محفوظ کرنے کے لیے بہت کافی ہوتی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اکیلی ذات کے گرد گھومتے تھے مگر یہاں تو معاملہ ہی جُدا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر اور دیکھ کر روایت کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔[1]

احادیث روایت کرنے والے صحابہ کی اس کثرت کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو منکرین حدیث

---

[1] الاصابۃ

کی اس وحشت کا علاج بھی ہو جاتا ہے جو احادیث کی کثرت تعداد کو دیکھ کر انہیں ہوتی رہتی ہے کہ لاکھوں احادیث صحابہ نے اپنے حفظ کے سہارے کیسے محفوظ رکھی ہوں گی اوّل تو یہ لاکھوں کا عدد محض ایک مغالطہ ہے جو متابعات و شواہد اور اسناد و طرق کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی بنا پر لگا ہے انشاء اللہ اس مغالطے کی حقیقت اپنے مقام پر واضح ہو جائے گی تاہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والے صحابہ اگر ایک لاکھ سے متجاوز تھے تو احادیث کے لاکھوں کی تعداد میں ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک ایک صحابی کے حصّے میں بہت قلیل تعداد احادیث کی آتی ہے جو، کا حفظ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ معدودے چند حضرات صحابہ کو چھوڑ کر جنہیں ہم مکثرین کہتے ہیں زیادہ تر صحابہ ایسے ہی ہیں جن کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد سو کے عدد سے بھی آگے نہیں بڑھتی ۔صحابہ کی عمومیت اصحاب العشرات (یعنی سو سے کم احادیث کے راوی) میں شمار ہوتی ہے ۔غرض حدیث روایت کرنے والے صحابہ کی اس کثیر تعداد کے پیش نظر اس بدگمانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اتنی زیادہ احادیث صحابہ نے اپنے حفظ کے سہارے کیسے محفوظ رکھی ہوں گی اور اس وقت تو اس بدگمانی کا اور بھی کوئی جواز نہیں رہتا جب ہمارے سامنے یہ حقیقت آتی ہے کہ وہ ذخیرۂ احادیث جو ہر صحابی نے اپنے اپنے طور پر حفظ کیا تھا محض اقوال و ملفوظات نبوی ہی پر مشتمل نہیں تھا بلکہ اس میں کثیر حصّہ واقعات کا بھی شامل تھا جن کو یاد رکھنے کے لیے قوتِ حافظہ پر کوئی خاص بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی ایک عام آدمی کے ذہن میں بھی ہزار ہا واقعات کی یاد جو اس کے ساتھ گزرے ہوں بغیر کسی کوشش کے محفوظ رہتی ہے۔

ایک شخص کسی کی زبان سے کوئی بات سنتا ہے مختلف الفاظ سے مرکّب کوئی جملہ اس کے کانوں میں پڑتا ہے تو اس کو یاد رکھنے کے لیے اسے باقاعدہ اپنا ذہن استعمال کرنا پڑے گا بہ خلاف کسی واقعہ کے جو اس نے دیکھا اسے یاد رکھنے کے لیے ذہن کو بالارادہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں وہ واقعہ خود بخود ذہن پر نقش ہو جائے گا وہ جب چاہے گا اسی واقعے کو من وعن سنا دے گا۔ حدیث صرف اقوال و ملفوظات ہی کا نام نہیں ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو جو کچھ کرتے دیکھا گیا یا آپؐ کے سامنے دوسروں نے جو کچھ کیا اور اس پر آپ نے

نہیں فرمائی محدثین کی اصطلاح میں جسے تقریر کہا جاتا ہے ان سب واقعات کو بھی حدیث کا لفظ حاوی ہے اور حدیث کا اکثر حصہ انہی واقعات پر مشتمل ہے احادیث کے ذخیرے کا تقریباً تین چوتھائی حصہ واقعات پر مشتمل ہے ذخیرۂ حدیث کے اس اکثر حصے کو یاد رکھنے کے لیے صحابہ کو باقاعدہ اپنا ذہن استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی صحابہ جو کچھ دیکھتے تھے وہ خود بخود ان کے ذہن پر نقش ہوتا جاتا تھا اس لحاظ سے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہونے والے اقوال وملفوظات اور آپ کے اردگرد وجود میں آنے والے واقعات کو یاد رکھنے کے لیے صحابہ کی ایک چھوٹی سی جماعت بھی بہت کافی ہوتی۔ مگر یہاں تو عالم یہ ہے کہ اس کام کو کرنے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ایک لاکھ سے اوپر تھے اور یہ تمام سننے اور دیکھنے والے اس سماعت اور اس نظر سے سننے دیکھنے والے نہ تھے جن سے ہر عام واقعہ سنا اور دیکھا جاتا ہے بلکہ یہ سب کے سب شمع نبوی کے پروانے حب نبوی کے دیوانے اور عظمت نبوی کے بے دام غلام تھے اور جو کچھ وہ سن رہے تھے اور دیکھ رہے تھے اس کا تعلق کسی قوم کے منتشر ادوار سے نہیں، کسی ملک کے وسیع وعریض خطوں سے نہیں، کسی حکومت کے پیچیدہ معاملات سے نہیں اور کسی میدانِ جنگ کے اطراف وجوانب میں بکھرے ہوئے واقعات سے بھی نہیں بلکہ اس کا تعلق صرف اور صرف ایک ذات سے تھا ایک واحد شخص کوئی ایک قوم نہیں، کسی قوم کا کوئی ایک قبیلہ نہیں، کسی قبیلے کا کوئی ایک خاندان نہیں بلکہ صرف اور صرف ایک واحد انسان جس کے گرد تمام ادوار سمٹ آئے تھے جو تمام معاملات وواقعات کا مرکز ومحور تھا جو تمام کثرتوں کا مجموعہ تھا۔ انصاف سے کہیے پراگندہ اور منتشر کثرتوں کو اکٹھا کرنے کے مقابلے میں ایک مقام پر مرتکز کثرتوں کو سمیٹنا کس قدر آسان ہے اور اسی بنا پر ان مرتکز کثرتوں کا صحیح صحیح پورے طور پر سمٹ آنا کس قدر یقینی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اکیلی ذات کے گرد جمع شدہ حقیقتوں کو سمیٹنے اور محفوظ کرنے کے لیے اگر صرف ایک واحد شخص ہی کو مقرر کر دیا جاتا تو یقین واعتماد کے حصول کے لیے کافی ہو جاتا مگر یہاں تو حال یہ ہے کہ کثرتیں مجتمع اور سمیٹنے والے لاکھوں ؛

ذخیرہ حدیث اور تاریخی مواد

حیرت کی بات ہے کہ یقین و اعتماد کی ان بلندیوں میں تو منکرین حدیث کو پستیاں ہی پستیاں نظر آتی ہیں شکوک و شبہات اور بدگمانیوں کے عمیق غار دکھائی دیتے ہیں اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہو یعنی ارد گرد حد نظر تک منتشر پراگندہ اور بکھری ہوئی کڑیاں اور ان کو سمیٹنے والے ایک یا دو تو شکوک و شبہات کے ان اندھیروں میں بھی انہیں یقین و اعتماد کے چراغ جلتے ہوئے نظر آتے ہیں ہمارا اشارہ عام تاریخی ذخیروں کی طرف ہے یہ تاریخی ذخیرے جن پر منکرین حدیث کو اندھا اعتماد ہے ان کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ ابتداءً مبہم اور غیر واضح افواہوں کی صورت میں یہ تاریخی واقعات پہنائے عالم میں بکھرے رہے پھر یکایک کسی کو شوق پیدا ہوا اس نے انہی افواہوں کو قلم بند کرنا شروع کر دیا اور اپنی صوابدید کے مطابق جس حصے کو چاہا باقی رکھا اور جسے چاہا حذف کر دیا بعد کے آنے والوں نے قرائن و قیاسات کا گورکھ دھندا بچھا کر مزید کتر بیونت سے کام لیا پھر جوں جوں اس انداز میں ترتیب دئیے ہوئے واقعات پر زمانہ گزرتا گیا جوں جوں واقعات سے سیاہ شدہ اوراق بوسیدہ ہوتے گئے اور جوں جوں ان کی تحریر کی سیاہی مدھم پڑتی گئی ان واقعات کے تاریخی وثیقہ ہونے پر مہر لگتی چلی گئی اور اگر کہیں کسی تحریر کو کیڑوں نے بھی اپنی خوراک بناتے بناتے کچھ حصے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو کیڑوں کا مسترد کیا ہوا وہ حصہ اور زیادہ تاریخی و ثقافت کی معراج پا گیا تاریخی ذخیرے میں سے کوئی ایسا تاریخی حصہ مشکل ہی سے دستیاب ہو گا جس کو قلم بند کرنے والے اس کے عینی شاہد رہے ہوں اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ تاریخ کا کوئی ایسا حصہ خوش قسمتی سے موجود ہے جسے ہم چشم دید گواہوں کا بیان قرار دے سکتے ہوں تو بھی ان ابتدائی راویوں کی تعداد ایک یا دو سے زیادہ نہیں اور وہ بھی ایسے مجہول الحال کہ کچھ پتہ نہیں کون لوگ تھے کس دماغی قابلیت کے حامل تھے کس قسم کی اخلاقی منزلت سے بہرہ ور تھے ہمارا تمام تر تاریخی ذخیرہ اسی قسم کی مبہم اور غیر یقینی کوششوں کا رہین منت ہے۔ اگر یہ مبہم کوششیں یقین و اعتماد کی ضامن ہو سکتی ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ احادیث کا وہ ذخیرہ قابل اعتماد کیوں نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد افواہوں پر نہیں عینی شہادتوں پر ہے جو قرائن و قیاسات کا گورکھ دھندا

نہیں ثابت شدہ حقیقتوں کا چمکتا دمکتا سورج ہے جس کو سننے اور دیکھنے والے ایک دو نہیں لاکھوں کی تعداد میں ہیں جن میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کے حال سے ہم واقف نہ ہوں ان عینی شاہدوں میں سے ہم ہر ایک کے بارے میں اس کے حسب ونسب اس کے کردار اس کی دماغی قابلیت، اس کی اخلاقی منزلت حتیٰ کہ اس کی ذاتی عادات وخصائل سے متعلق تمام جزئی وکلی تفصیلات سے باخبر ہیں۔ ان عینی شاہدوں کے عادل وثقہ ہونے میں کوئی عقل سے عاری ہی ہو تو شک کرے گا ورنہ ان کی ثقاہت اور ان کے عدل پر فرشتے بھی گواہ ہیں ذخیرہ حدیث کے ان امینوں کی قوت حافظہ بھی معجزے کی حد تک حیران کن ہے۔ تعصب کی تو بات ہی علیحدہ ہے ورنہ انصاف سے کہئے کہ یقین واعتماد کے اعتبار سے تاریخی مواد اور ذخیرۂ احادیث میں کیا کوئی نسبت نظر آتی ہے؟ اوّل الذکر میں کوتاہیوں، غلط فہمیوں اور غلطیوں کے اندیشے کی بنا پر شکوک وشبہات کی جس قدر گنجائش ہے یقیناً اسی نسبت سے آخر الذکر میں اپنی صحت و واقعیت کی بنا پر یقین واعتماد کی اسی قدر عقلاً توقع ہے مگر بُرا ہو اس تعصب کا کہ منکرین حدیث کو روز روشن تاریک رات کی طرح نظر آتا ہے اور شب تار سے گھپ اندھیرے ٹامک ٹوئیوں کے بے نور چراغوں کے سہارے روشن دکھائی دیتے ہیں۔

بہرحال بات یہ ہو رہی تھی کہ ہر ایک صحابی اپنے اپنے علم کی حد تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال پر مشتمل ایک زندہ کتاب تھا اور جب وقت آپؐ نے اس دُنیائے فانی سے کوچ فرمایا اس وقت ذخیرۂ حدیث کی ان زندہ کتابوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی کچھ اوپر ہی تھی اس لحاظ سے اگر منکرین حدیث کا یہ دعویٰ تھوڑی دیر کے لیے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں احادیث کتابی صورت میں جمع نہیں ہوئی تھیں تب بھی ان لاکھوں زندہ کتابوں کی موجودگی میں سیاہ وسپید اوراق پر مشتمل کتابوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔

کاغذی کتابوں کی ضرورت

ان زندہ کتابوں نے حفاظت حدیث کا کام کاغذ کے سفینوں سے کہیں زیادہ بہتر صورت میں اپنے سینوں کے ذریعے سے انجام دیا۔ صرف حفاظت ہی نہیں اپنے سینوں سے دُوسرے سینوں میں اس امانت کی منتقلی کا کام بھی ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ نہ اپنی طرف سے کوئی کمی کی نہ زیادتی

نہ کسی بات کو چھپایا نہ کوئی غلط بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت ہونے دی اور اس طرح اس لحاظ سے بھی ان زندہ کتابوں نے کاغذی کتابوں سے مستغنی کیے رکھا۔

امانتِ حدیث کی منتقلی کے کام میں بھی صحابہ کے احساس ذمہ داری کا عالم یہ تھا کہ موت کے وقت بھی یہی فکر رہتا کہ کہیں کوئی حدیث ایسی نہ رہ جائے جو ہم نے ابھی تک نہ سنائی ہو۔ حضرت معقل بن یسارؓ پر مرض الموت طاری ہے مگر فرما رہے ہیں میں تم سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں اگر مرض الموت میں مبتلا نہ ہوتا تو نہ بیان کرتا[۱] گویا فکر یہ ہے کہ اگر مر گیا اور حدیث کی یہ امانت ادا نہ کر سکا تو خدا کے یہاں مواخذہ نہ ہو جائے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث سنا کر یہ ہدایت فرما دی تھی کہ اس کا عام اعلان نہ کیا جائے حضرت معاذ بن جبل نے عمر بھر اس راز کو چھپایا مگر وقت نزع محض اس خوف سے وہ حدیث سنائی کہ کہیں حدیث کو چھپانے کا مرتکب نہ ٹھہرا دیا جائے[۲]۔ دراصل صحابہ کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد رہتا تھا۔

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ ثُمَّ كَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ۔ (ابوداؤد، ترمذی)۔	جس کسی سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور وہ اسے چھپائے تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

ایسی سخت وعید کے بعد صحابہ سے یہ توقع کی ہی نہیں جا سکتی کہ امانتِ حدیث کے منتقلی کے کام میں وہ معمولی سی کوتاہی بھی روا رکھتے۔ عین سکرات کے عالم میں احادیث کے بیان کی فکر اسی قسم کی مواعید سے بچنے کا اہتمام تھا۔ احادیث نبوی کے علاوہ خود قرآن کی وہ آیت بھی اس ضمن میں صحابہ کو مستحضر رہتی ہو گی جس میں ہدایت کی باتیں چھپانے والوں کو اللہ اور اس کے بندوں کی طرف سے لعنت کا مستحق گردانا گیا تھا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ	جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جو ہم کھلی نشانیوں اور ہدایت کی باتوں میں سے نازل کر چکے ہیں اور اس کے

---

[۱] مسلم۔ کتاب الایمان [۲] مسلم۔ کتاب الایمان

لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ○

(البقرۃ : ۱۵۹)

بعد چھپاتے ہیں جب ہم انسانوں کے لیے اسے کتاب میں کھول کر بیان کر چکے ہیں ہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔

غرض اسی قسم کی آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی تعمیل میں صحابہ میں سے ہر صحابی کی کوشش یہ تھی کہ جتنا علم بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس تک پہونچا ہے وہ پورا کا پورا بعد کے آنے والوں کے سینوں میں منتقل ہو جائے۔ گویا ذخیرۂ احادیث پر مشتمل یہ زندہ کتابیں کاغذی کتابوں کا یہ مقصد بھی باحسن وجوہ پورا کر رہی تھیں کہ ان کے اوراق میں محفوظ ذخیرہ معلومات دوسروں تک بہ تمام وکمال پہونچتا رہتا ہے۔

اسی طرح کاغذی کتابوں کے اوراق پر جو کچھ ایک مرتبہ نقش کر دیا جاتا ہے وہ من وعن ان کتابوں کے پڑھنے والوں تک پہونچ جاتا ہے جس طرح وہ کتابیں ان نقوش میں اپنی طرف سے نہ کمی کرتی ہیں نہ زیادتی بالکل اسی طرح صحابہ کے اوراق قلب پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر اور دیکھ کر جو کچھ ثبت ہو گیا تھا اس میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی یا زیادتی کیے بغیر صحابہ نے من وعن وہ سب دوسروں تک پہونچانے میں پوری احتیاط سے کام لیا۔ یوں بھی صحابہ سے اس کی توقع ہی کیسے کی جا سکتی تھی اس لیے کہ احادیث میں کسی بھی قسم کی کمی زیادتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب کر دینے کے مترادف تھی اور صحابہ بکثرت بار بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس شخص کے لیے جہنم کی وعید سن چکے تھے جو آپ کی طرف غلط بات منسوب کرے۔ آپ فرمایا کرتے

حَدِّثُوْا عَنِّیْ وَلَا حَرَجَ وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ (مسلم)

میری باتیں روایت کرو اس میں کوئی حرج نہیں مگر میری طرف جو جان بوجھ کر جھوٹ بات منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائیگا۔

کبھی آپ اسی بات کو یوں ارشاد فرماتے

من قال علیّ مالم اقُل فلیتبوأ مقعدہ من النّار (بخاری باب من کذب علی النبی) | جو شخص میرا نام لے کر وہ بات کہے جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔

آج کا بے باک ذہن ان جہنم کی وعیدوں کو شاید اتنی اہمیت نہ دے لیکن صحابہ کے سامنے جہنم کی وعید سنانا ایک زبردست بات تھی آخرت کے عذاب کو صحابہ سب سے بڑی مصیبت خیال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کی نسبت کرنا دراصل اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے اور قرآن نے ایک جگہ نہیں بے شمار مقامات پر خدا پر جھوٹ باندھنے والے کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے۔ جس قسم کے ایمان و یقین کی دولت سے صحابہ سرفراز تھے اس کے ہوتے ہوئے ان سے یہ توقع کون کر سکتا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یا اللہ کی طرف کوئی غلط بات بھولے سے بھی منسوب کر سکتے تھے۔ صحابہ کا عالم یہ تھا کہ حدیث سناتے لگتے تو کانپنے لگتے اور اس ڈر سے کہ کہیں کوئی غلط بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے حدیث روایت کرتے جاتے اور کہتے جاتے اس سے کم یا اس سے زیادہ، اس کے قریب یا اس کے مشابہ۔ غرض یقینی طور پر یہ نہ کہتے تھے کہ آپ کی کہی ہوئی حدیث کے الفاظ بعینہٖ یہی ہیں[۱]۔

حضرت انس بن مالکؓ جب حدیث بیان کرتے تو گھبرا اٹھتے اور کہتے آپ نے یہ کچھ فرمایا اور یہ کچھ فرمایا پھر فرماتے اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[۲] (یا جیسا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہوگا)۔ حضرت علی فرماتے مجھے یہ گوارا ہے کہ مجھ پر آسمان پھٹ پڑے بہ نسبت اس کے کہ میں آپؐ کی طرف اس بات کا انتساب کروں جو آپؐ نے نہیں کہی[۳]۔ بعض صحابہ کی یہ عادت ہو گئی تھی کہ جس وقت حدیث بیان کرنے بیٹھتے تو بیان کرنے سے پہلے من کذب علیّ متعمّداً والی حدیث کو ایک بار ضرور دوہراتے تا کہ اس نازک ذمہ داری کا احساس تازہ ہو جائے کہ کوئی غلط بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] ابوداؤد [۲] دارمی [۳] مسلم کتاب الزکوٰۃ باب التحریض علی قتل الخوارج

کی طرف منسوب نہ ہوتے پائے خصوصاً حضرت ابوہریرہ تو ہمیشہ ہی اس حدیث کو کسی بھی حدیث کے بیان کرتے سے قبل شروع ہی پڑھتے[۱]

غرض احادیث نبوی دوسروں تک پہونچانے میں صحابہ نے اس بات کا بھی پورا پورا اہتمام کیا کہ جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر اور آپ کو کرتے ہوئے دیکھ کر انہیں حاصل ہوا تھا وہ بعد کے آنے والوں تک من وعن پہونچا دیا جائے اور اس طرح صحابہ نے جو فی الحقیقت ذخیرۂ احادیث پر مشتمل زندہ کتابوں کے مترادف تھے ہر لحاظ سے کاغذی کتابوں کی ضرورت ہی محسوس نہ ہونے دی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ذخیرۂ احادیث کا اکثر حصہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں قلم بند ہو چکا تھا تاہم احادیث کی باقاعدہ تدوین کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب صحابہ کا دور ختم ہونے لگا جب احادیث کی یہ چلتی پھرتی کتابیں دنیا سے اٹھنے لگیں۔ تب کاغذی کتابوں کی ضرورت پڑی۔ حضرت عمر بن العزیز کا وہ مقولہ آج تک تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے جو باقاعدہ تدوین حدیث کی ابتدا کرتے وقت ان کی زبان پر بے ساختہ آگیا تھا۔ جب انہوں نے اپنی حکومت کی جانب سے باقاعدہ اس کا اہتمام کیا کہ احادیث کو مدون کیا جائے تو یہی فرمایا کہ صحابہ اٹھتے چلے جا رہے ہیں خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں احادیث کا ذخیرہ ضائع نہ ہو جائے۔ گویا جب تک صحابہ موجود تھے۔ حدیث کا ذخیرہ محفوظ تھا اور اوراق پر مشتمل کتابوں سے بے نیاز تھا اب جبکہ حدیث کے یہ زندہ نسخے دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں تو ضروری ہو گیا ہے کہ اس علم کو باقاعدہ کتابوں کی صورت میں یکجا کر لیا جائے۔

بہرحال حفظ حدیث کے سلسلے میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ثابت کرنے کے لیے بہت کافی ہے کہ تحریر وکتابت کے بغیر بھی صرف حفظ اور یادداشت کے راستے سے ہی احادیث کا ذخیرہ پوری طرح محفوظ رہ سکتا تھا اور چنانچہ محفوظ رہا۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ حفظ کے ساتھ ساتھ کتابت حدیث کا بھی اہتمام عہد نبوی اور عہد صحابہ ہی میں پورا پورا کیا گیا جیسا کہ انشاء اللہ ابھی ثابت ہوا جاتا ہے۔

---

[۱] مسند امام احمد بن حنبل

کتابتِ حدیثؐ اور صحابہؓ

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ احادیث کا ذخیرہ تحریر و کتابت کی مدد کے بغیر ہی صرف حفظ اور یادداشت کے ذریعے بہ تمام و کمال محفوظ رہ سکتا تھا اور رہا اگرچہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ احادیث عہد نبوی و عہد صحابہ میں قلم بند ہوئیں یا نہیں تاہم معترضین کا منہ بند کرنے کے لیے اور حقیقت کے اظہار کی خاطر اب ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں اور آپ کے بعد کے متصل زمانے میں ذخیرہ احادیث کا کس قدر حصہ قید تحریر میں آچکا تھا۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے احادیث کی کوئی قلیل تعداد نہیں بلکہ ان کا ایک غالب حصہ عہد نبوی اور عہد صحابہ ہی میں مکتوب صورت میں بھی محفوظ ہو چکا تھا اس وقت احادیث کا جتنا ذخیرہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی کوئی معمولی مقدار نہیں بلکہ اکثر حصہ ان لوگوں کے ہاتھوں قید تحریر میں آچکا تھا جو اس تمام تر ذخیرے کے اوّلین مخاطب تھے صحابہ نے احادیث کو حفظ کے ساتھ ساتھ کتابت کے ذریعے سے بھی پوری طرح محفوظ کر لیا تھا۔ لوگ تو دو سو سال کی بات کرتے ہیں کہ احادیث کتابی صورت میں دو سو سال بعد آئیں اور اس کے لیے امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالے کے سنین وفات کو ثبوت کے طور پر پیش کر دیتے ہیں جبکہ ہمارا دعویٰ ان کے علی الرغم یہ ہے کہ دو سو سال تو بہت دُور کی بات ہے جو جہالت کے سوا کچھ نہیں یہ مدت سو سال کے عرصہ پر بھی محیط نہیں ہے جیسا کہ بعض اصحاب علم کو مغالطہ لگا ہے اور اُنہوں نے ابن شہاب زہری کو وہ پہلا شخص قرار دیا ہے جس نے سب سے پہلے احادیث کو مدوّن کیا اصل میں بات اس سے بھی آگے بڑھ کر جو کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ دو سو سال بعد یا ایک سو سال بعد کی باتیں تو خلاف واقعہ ہیں ہی اس سے نصف مدّت بعد کی

بات بھی اگر کی جائے تو خلاف واقعہ ہی ہوگی کیونکہ امر واقعہ تو یہ ہے کہ احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے سامنے اور خلفائے راشدین ہی کے عہد میں قید تحریر میں آچکی تھیں اور تھوڑی بہت نہیں موجودہ ذخیرۂ احادیث کا اکثر حصہ قلم بند ہو چکا تھا۔

فن کتابت اور عرب باشندے

اس پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ایک بنیادی غلط فہمی کا ازالہ کر دیا جائے دراصل تحریر و کتابت حدیث کے سلسلے میں لوگوں کو دھوکہ یہ لگتا ہے کہ آغاز اسلام کے زمانے میں نہ تو تحریری ساز و سامان ہی پورے طور پر دستیاب تھا نہ عرب میں ہی کچھ زیادہ لکھنے لکھانے کا رواج تھا لکھنا جاننے والے بھی چند گنے چُنے لوگ تھے ایسی صورت میں احادیث کے پورے ذخیرے کا قلم بند ہو جانا ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور نظر آتا ہے اگر احادیث قلم بند ہوئی بھی ہوں گی تو چند متفرق چھوٹے چھوٹے جزو چند مخصوص لوگ تیار کر پائے ہوں گے۔ اس مغالطے کی اصل وجہ زمانۂ جاہلیت کی اصطلاح ہے اسلام سے قبل کا زمانہ جاہلیت کا زمانہ کہلاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس زمانے کے لوگ اس معنی میں جاہل تھے کہ انہیں لکھنے پڑھنے سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا وہ لکھنے پڑھنے کے سامان قلم دوات کاغذ اور کتاب وغیرہ سے کوئی سروکار ہی نہ رکھتے تھے۔ کا لفظ فی الحقیقت علم قرآن و حدیث کے مقابلے میں بولا جاتا ہے گویا جب تک اسلام کا علم نہیں آیا اس وقت تک کا زمانہ جہالت کا زمانہ تھا۔ قرن اوّل میں علم نام ہی صرف علم دین کا تھا علم دین کے علاوہ جو کچھ بھی تھا اسے جہالت تصور کیا جاتا تھا۔ جاہلیت دراصل قرآن کی ایک اصطلاح ہے ایک سے زائد مقامات پر قرآن نے اپنی اس خاص اصطلاح کا تذکرہ کیا ہے۔ اس قسم کی جتنی آیات قرآنی ہیں ان کے مفہوم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص قسم کے ملحدانہ خیالات کافرانہ عقائد اور فاسقانہ عادات و اطوار کی تعبیر جاہلیت کے لفظ سے کی گئی ہے ورنہ جہاں تک نوشت و خواند کا تعلق ہے اس زمانے میں بھی جسے ہم زمانۂ جاہلیت سے تعبیر کرتے ہیں عرب باشندوں کی بھی قریب قریب وہی حالت تھی جو اس زمانے کے عموماً کامل متمدن نہیں تو کم از کم نیم متمدن ممالک کی تھی۔ دراصل اس

زمانے میں تقریباً ہر ملک اور ہر قوم میں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک خاص علیحدہ پیشہ ور طبقہ ہوتا تھا عام لوگوں کو اس کام سے چنداں سروکار نہ ہوتا تھا کسی ملک میں لکھنے پڑھنے کا کام پادریوں کے سپرد تھا تو کسی میں موبد یہ کام سرانجام دیتے تھے ہندوؤں میں مثال کے طور پر یہ کام خاص برہمنوں سے متعلق تھا عرب میں بھی قریب قریب یہی حال تھا۔ عرب باشندوں کی اکثریت یقیناً لکھنے پڑھنے کے فن سے آشنا نہ تھی لیکن ہر شہر میں ایسے لوگ ضرور پائے جاتے تھے جو اس فن سے پوری طرح آشنا تھے اور لکھنے پڑھنے کا کام انجام دیتے تھے اور اس طرح مجموعی طور پر عرب میں ایک اچھی خاصی تعداد لکھنا پڑھنا جاننے والوں کی موجود تھی نہ صرف مرد بلکہ بعض عورتیں بھی ایام جاہلیت میں ایسی پائی جاتی تھیں جو نوشت وخواند سے بخوبی واقف تھیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ غلاموں میں بھی اس فن سے آشنا افراد موجود تھے۔ عیسائیوں کے گرجے عرب میں جہاں کہیں تھے ہر ایک میں مختلف مذہبی کتابوں کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق اس زمانے میں عیسائی گرجوں میں اس قسم کی تقریباً ۷۲ (بہتّر) کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہودی مذہب کی کتابوں کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ مدینہ منورہ اور خیبر وغیرہ میں جہاں کہیں بھی عرب میں یہودی آباد تھے موجود تھا ان کتابوں کا ذکر بھی بہ کثرت تاریخ وسیر کی کتابوں اور تفسیری روایات کے ذخیروں میں اب بھی ملتا ہے۔ عرب کے عیسائیوں اور یہودیوں کے علاوہ بھی عرب کے عام جاہلی خاندانوں میں ایک کتاب کے عام رواج کا پتہ چلتا ہے جس کا نام "مجلۂ لقمان" تھا کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی ایک بار یہ کتاب لائی گئی تھی۔ ایرانیوں کے شاہنامہ کا عربی ترجمہ مکّہ میں بعض لوگوں کے پاس موجود تھا شام سے بھی اسی قسم کے تاریخی لٹریچر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نضر بن حارث وقتاً فوقتاً مکّے لایا کرتا تھا۔ درمنثور میں علامہ سیوطی نے ایسی روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے بازاروں میں یہودی کتابوں کی باقاعدہ تجارت کرتے تھے نیز بائیبل کا عربی ترجمہ کر کر کے عربوں کے درمیان اس کی اشاعت کیا کرتے تھے اور یہ تو بہت مشہور بات ہے عام لوگ بھی اس سے واقف ہیں بخاری میں بھی ہے کہ مکّہ میں ورقہ بن نوفل توراۃ وانجیل کا ترجمہ عربی میں کیا کرتے تھے طائف کے ایک باشندے حارث بن کلدہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ایران کی مشہور طبی درسگاہ

جندسابور میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور عربی میں علمِ طب پر ایک کتاب بھی اس نے لکھی تھی۔ یمن وغیرہ میں مختلف خاندانوں کے پاس کتابوں سے بھرے ہوئے صندوق موجود تھے عرب شاعروں کے قصائد مکتوبہ شکل میں پائے جاتے تھے سبع معلقات کے نام سے کون واقف نہیں آخر وہ قصائد جو بیت اللہ میں مختلف شاعروں کی طرف سے لٹکائے گئے تھے لکھے ہوئے ہی تو تھے۔ مختصر یہ ہے کہ جاہلیت کے لفظ سے مکمل جہالت کا جو ماحول سمجھ لیا جاتا ہے وہ قطعاً درست نہیں ہے نوشت وخواند کے معاملے میں عرب بالکل ہی تہی دست نہ تھے۔

اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر حقیقتِ حال کی وضاحت کے لیے اتنا ہی کافی ہے جاہلیت کے لفظ سے دھوکہ کھا کر یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ عرب باشندے لکھنے پڑھنے کے فن سے اس حد تک کورے تھے کہ تحریر وکتابت کے ساز وسامان تک سے ناآشنا تھے سمجھ میں نہیں آتا جو شخص قرآن پڑھتا ہے وہ کیسے اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ قرآن ایسے لوگوں کے لیے نازل کیا گیا تھا جو پڑھنا لکھنا بالکل جانتے ہی نہ تھے بھلا جس کتاب کا نام ہی قرآن ہو یعنی پڑھی جانے والی چیز اس کے بارے میں کیسے یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ ان لوگوں کی طرف بھیجی گئی تھی جو پڑھنے کے لفظ تک سے واقف نہ تھے۔ جس کتاب میں کھولنے کے ساتھ ہی پہلی ہی لائن میں ذلک الکتاب کے الفاظ نظر آتے ہوں اس کے متعلق کیونکہ یہ باور کر لیا جائے کہ وہ ایسے لوگوں میں اتری تھی جو کتابت کے فن سے بالکل عاری تھے جو کتاب روشنائی، دوات، سفرہ، کاتبین اور سجل جیسے الفاظ سے بھری پڑی ہو جس کی تقریباً ہر بڑی سورت میں کتاب کا کاغذ کا اور لوح کا ذکر آتا ہو اور جس کے نزول کی ابتدا ہی پڑھنے لکھنے اور قلم کے ذکر سے ہوئی ہو کون خیال کر سکتا ہے کہ ایسی کتاب ایسے لوگوں کے درمیان نازل کی گئی تھی جو نوشت و خواند کے سامان وآلات تک سے ناواقف تھے۔ بھلا غور تو کیجئے قرآن کے مخاطبین اگر ناخواندہ تھے اور لکھنا نہ جانتے تھے تو قرآن کی اس آیت میں پھر آخر کن لوگوں کو خطاب کیا گیا تھا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ (البقرۃ: ۲۸۲)	اے ایمان والو جب تم کسی مدت معینہ کے لیے ایک دوسرے کو قرض دو تو اسے لکھ لیا کرو۔

قرآن اگر ایسے لوگوں کے درمیان اُترا تھا جو لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف ہی نہ تھے تو قرآن کے اس کہنے کا کیا مطلب تھا کہ

ولا تسئموا ان تکتبوہ صغیرا او کبیرا	قرض چھوٹا ہو یا بڑا اسے ضبط تحریر میں لانے سے نہ اکتاؤ۔

ذرا سوچئے تو سہی جو لوگ لکھنا جانتے ہی نہیں ان کے اکتانے کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے قرآن جن سے مخاطب ہے وہ بخوبی لکھنا جانتے ہیں بلکہ قرآن کا یہ عام خطاب تو یہ بتلاتا ہے کہ عام آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

آلات کتابت کی دستیابی

دراصل یہ غلط فہمی کتابتِ قرآن کے سلسلے میں بیان کی جانے والی ان روایتوں سے بھی پیدا ہوئی ہے جن میں ذکر کیا گیا ہے کہ شروع شروع میں قرآنی آیات ہڈیوں پر، کھجور کی ٹہنیوں پر، چمڑے کے ٹکڑوں پر یا پتھروں پر لکھی جاتی تھیں۔ بس اسی سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا کہ اس کی وجہ آلات نوشت وخواند کی کمی تھی عظم، عسیب، لخاف اور ادم کے الفاظ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ ان سے مراد گری پڑی ہڈیاں تازہ یا سوکھی ہوئی کھجور کی ٹہنیاں، بن گھڑے بے ڈول پتھر اور کچے پکے چمڑے کے ٹکڑے ہیں۔ حالانکہ غور کرنے کی بات ہے کہ ان چیزوں میں اتنی وسعت ہی کب ہوتی ہے کہ ان پر قرآن جیسی ضخیم کتاب کے اجزا تحریر میں لائے جا سکیں۔ دراصل یہ تمام الفاظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ وہ تمام چیزیں جو اس زمانے میں مصنوعی طریقوں سے لکھنے کے کام کے لیے تیار کی جاتی تھیں ان کو ان اصطلاحی الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے لکھنے کی جس چیز کی تیاری میں ہڈی کام میں لائی جاتی تھی اس کے لیے عظم کا لفظ ہی اصطلاحی انداز میں اختیار کر لیا گیا اسی طرح کھجور کی شاخوں سے لکھنے کے لیے جو تختہ تیار کیا جاتا ہوگا اسے عسیب کے لفظ سے تعبیر کیا جاتے لگا انہی پر چمڑے کے ٹکڑوں اور پتھر کے پتروں کو قیاس کر لیجئے۔ غرض ان الفاظ سے عام چیزیں ہڈی چمڑا پتھر وغیرہ ہرگز مقصود نہ تھیں موجودہ زمانے میں بھی ہم لکڑی اور پتھر کو لکھنے کے کام میں لاتے ہیں مگر ان کے لیے ہم علیحدہ تختی اور سلیٹ کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں ورنہ حقیقت میں تو وہ لکڑی اور پتھر ہی ہیں اسی طرح اس زمانے میں کچھ چیزیں لکھنے کے کام میں لائی جاتی تھیں جن کو عظم، عسیب،

لخاف اور ادم کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

بہر حال بات یہ ہو رہی تھی کہ کتابت قرآن سے متعلق ان روایتوں کا اثر کتابت حدیث پر بھی پڑا اور سطحی علم رکھنے والوں نے سمجھا کہ ابتدا میں سامان کتابت کی کمی کی وجہ سے احادیث قید تحریر میں نہ آسکی ہوں گی حالانکہ یہ امر واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ اتنی بات تو مسلّم ہے کہ عرب میں مصر کا کاغذ یا چین کا بنا ہوا کاغذ دستیاب نہ تھا مگر پھر بھی اس زمانے میں لکھنے کی جو عام چیز تھی اور جسے عربی میں رَق کہتے تھے اس کی عرب میں کوئی کمی نہ تھی۔ عرب میں اس کی کمی کی کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی اس لیے کہ یہ رَق جسے آپ پارچمنٹ یا شبٹ یا تختہ کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں جانوروں کے معدے کے پاس کی باریک جھلیوں سے تیار کیا جاتا تھا اور یہ کسے معلوم نہیں کہ عرب باشندوں کی عام خوراک گوشت تھی۔ عرب جیسے گوشت کھانے والے ملک میں یہ جھلیاں جتنی وافر تعداد میں فراہم ہو سکتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ معدے کی جھلیوں کے علاوہ لکھنے کے یہ شبٹ شتر مرغ یا خرگوش وغیرہ کی باریک کھالوں سے بھی تیار ہوتے تھے اور ان چیزوں کی بھی ظاہر ہے عرب میں کوئی قلت نہ تھی۔ غرض رَق عرب میں وافر مقدار میں دستیاب تھا اور اس زمانے کے لحاظ سے یہ رَق کاغذ ہی کا متبادل تھا۔ ہڈی چمڑے اور پتھر وغیرہ سے بنی ہوئی چیزیں تو دراصل زیادہ تر حفاظت اور پائیداری کے نقطۂ نظر سے استعمال کی جاتی تھیں ورنہ عام حالات میں رَق ہی لکھنے کے کام آتا تھا۔

فن کتابت سے واقف صحابہ

غرض عرب میں نہ لکھنے پڑھنے کے ساز و سامان کا قحط تھا نہ لکھنا پڑھنا جاننے والوں کی کوئی کمی تھی جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا عرب باشندوں کی اکثریت تو واقعی لکھنے پڑھنے کے فن سے آشنا نہ تھی تاہم ایک اچھی خاصی تعداد عرب کے مختلف شہروں میں ایسے لوگوں کی موجود تھی جو نوشت و خواند سے بخوبی واقف تھے مرد تو مرد عورتیں بھی بعض ایسی مل جاتی تھیں جو اس فن سے پوری طرح آشنا تھیں چنانچہ صحابہ میں بھی بہت سے لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ خلفائے اربعہ کے علاوہ حضرت ابی ابن کعب حضرت زید بن ثابت حضرت خالد بن ولید حضرت

عمرو بن العاص حضرت عبد اللہ بن عباس حضرت معاویہ بن ابی سفیان حضرت مغیرہ بن شعبہ حضرت حنظلہ حضرت زبیر بن عوام حضرت ثابت بن قیس حضرت عامر بن فہیرہ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام لکھنا پڑھنا جاننے والوں میں سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اور بہت سے ایسے صحابہ کے نام لیے جا سکتے ہیں جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے آثار و سیر کی کتابوں سے اگر ایسے تمام صحابہ کے نام جمع کیے جائیں تو یقیناً سینکڑوں سے متجاوز ہو جائیں اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ وحی قرآنی کی کتابت جن صحابہ کے سپرد تھی ان کی تعداد تینتالیس[۱] تک جا پہنچتی ہے۔

کتابت سکھانے کا خصوصی اہتمام

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت کچھ لوگ تو پہلے ہی سے لکھنا جانتے تھے تاہم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابہ میں فن کتابت کو عام کرنے کے لیے خصوصی اہتمام فرمایا۔ مسجد نبوی میں قائم ہونے والی سب سے پہلی درسگاہ جو ایک سائبان اور ایک چبوترے پر مشتمل تھی اور جسے درسگاہ صفہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس میں قرآن و حدیث کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا چنانچہ حضرت عبادہ بن الصامت رضؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں صفہ میں لوگوں کو لکھنا سکھانے اور قرآن پڑھانے پر مامور فرمایا[۲] تھا حضرت عبد اللہ ابن سعید بن العاص کو بھی جو فن کتابت کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور بڑے خوشنویس تھے نیز زمانہ جاہلیت میں بھی ماہر کاتب کی حیثیت سے مشہور تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا سکھائیں[۱]۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف ہو جائیں چنانچہ جنگ بدر کے ان قیدیوں کے بارے میں جو فدیہ دے کر رہائی حاصل نہ کر سکے تھے آپ نے اعلان فرمایا کہ جو قیدی دس مسلمان بچوں کو فن کتابت سکھا

---

[۱] الکتانی [۲] اسد الغابۃ

دے گا اس کو رہائی دے دی جائے گی ؎۳ مردوں کے ساتھ ساتھ آپ عورتوں کو بھی لکھنے پڑھنے کے فن سے روشناس کرانا ضروری سمجھتے تھے چنانچہ امام مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شفاء بنت عبداللہ رضؓ ام المومنین حضرت صفیہؓ کو لکھنا سکھایا کرتی تھیں ۔

حدیث کی عام کتابت

غرض کتابت حدیث کے سلسلے میں اس خیال کی ایک مفروضے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں کہ سامانِ کتابت کی قلت کی بنا پر یا فنِ کتابت سے ناواقفیت کی وجہ سے احادیث قیدِ تحریر میں نہ آسکی ہوں گی ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حفظِ حدیث کے ساتھ ساتھ صحابہ کتابت حدیث کا بھی پورا پورا اہتمام کرتے تھے اور جس جس کو لکھنا آتا تھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو لکھ لکھ کر بھی محفوظ کرتا جاتا تھا ۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اس پر شاہد ہے آپ فرماتے ہیں :

کنا قعودًا نکتب ما نسمع من النبی (مجمع الزوائد)	ہم حضور کے گرد بیٹھے ہوئے جو کچھ آپ سے سنتے لکھتے جاتے تھے ۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے گویا احادیث لکھنے کا عمل صرف حضرت ابوسعید تک محدود نہ تھا بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے دیگر صحابہ بھی احادیث لکھتے جاتے تھے گویا صورتِ حال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم درمیان میں تشریف فرما ہیں اور آپ کے اردگرد صحابہ حلقہ بنائے بیٹھے ہیں آپ جو کچھ فرماتے جاتے ہیں صحابہ لکھتے جاتے ہیں ۔ حضرت ابوسعید خدری کی اس روایت کی تائید حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے ۔ فرماتے ہیں

بینا نحن حول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکتب (جامع بیان العلم)	جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے لکھ رہے تھے ۔

اس قسم کی روایات کا انداز ذرا غور تو کیجئے کیا بتلا رہا ہے یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں کہ صحابہ

؎۳ روض الانف

اپنے طور پر احادیث لکھا کرتے تھے بلکہ بات اصل یوں بنتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لکھاتے جاتے تھے اور صحابہ لکھتے جاتے تھے۔ اس پس منظر میں ان روایات کا مفہوم اور زیادہ کھل کر واضح ہو جاتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات ارشاد فرماتے تو اسے تین بار دہراتے حضرت انس کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :

کان اذا تکلم بکلمۃٍ اعادھا ثلٰثًا حتّٰی تفھم عنہ۔ (بخاری باب من اعاد الحدیث ثلثًا)۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات ارشاد فرماتے تو تین مرتبہ دوہراتے یہاں تک کہ وہ خوب سمجھ میں آجاتی۔

گویا آپ اس بات کا خیال رکھتے کہ میری کہی ہوئی بات کا ایک ایک کلمہ مخاطبین تک پورا پورا پہنچ جائے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں صحابہ احادیث کا ایک ایک لفظ پوری صحت کے ساتھ قلم بند کر لیتے ہوں گے بعض روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احادیث قلم بند کرنے کے بعد بعض صحابہ اصلاح و تصحیح کی خاطر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی پیش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت انسؓ اپنی لکھی ہوئی احادیث کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں انکو لکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کر چکا ہوں۔ مستدرک میں سعید بن ہلال کا بیان ہے :

کنا اذا اکثرنا علی انس بن مالکؓ رضی اللہ عنہ فاخرج الینا مجالاً عندہ فقال ھٰذہٖ سمعتُھا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکتبتُھا وعرضتھا علیہ (مستدرک للحاکم)	ہم جب حضرت انس رضی اللہ عنہ سے زیادہ پوچھ گچھ کرتے تو وہ اپنے پاس سے ایک چونگہ نکالتے اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھیں اور لکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کو پیش کر چکا ہوں۔

مسند دارمی میں بھی یہ روایت تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ موجود ہے حضرت انس کو خادم خاص ہونے کی بنا پر جو قرب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حاصل تھا وہ محتاج بیان نہیں اس لحاظ سے احادیث تحریر کرنے کا خوب موقع ملا ہوگا اور حضرت انس وہ ہیں جو بچپن ہی سے لکھنے کے فن سے خوب واقف تھے چنانچہ ان کی والدہ نے ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش

کرتے وقت خاص طور سے ان کی اس مہارت کتابت کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا یا رسول اللہ ھذا ابنی وھو غلام کاتب (اسد الغابہ) یہ میرا بیٹا ہے ابھی بچہ ہے مگر فن کتابت جانتا ہے۔

بہرحال یہ تمام روایات یہ بتلاتی ہیں کہ احادیث کو قید تحریر میں لانا صحابہ کی ایک عام عادت تھی۔ صحابہ میں سے جس کو بھی لکھنا آتا تھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ لکھ بھی لیتا تھا۔ بعض صحابہ اس لیے بھی احادیث کو لکھنے کا خصوصی اہتمام کرتے تھے کہ اس طرح احادیث حفظ کرنے میں انہیں آسانی ہو جاتی تھی جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ

کُنْتُ أَکْتُبُ کُلَّ شَیْئٍ أَسْمَعُہُ مِنْ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم أُرِیْدُ حِفْظَہٗ (ابوداؤد کتاب العلم)	میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا اسے لکھ لیا کرتا تھا اس ارادے سے کہ اسے یاد کر لوں گا۔

حفظ میں آسانی کے علاوہ صحابہ کو سب سے زیادہ فکر اس بات کا رہتا تھا کہ کہیں کوئی غلط بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے اِن کے پیش نظر ہر وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد رہتا تھا جس میں غلط بات منسوب کرنے والے کے لیے جہنم کی وعید سنائی گئی تھی پھر صحابہ کو یہ بات بھی پوری طرح مستحضر تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب کرنا خدا پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے اور خدا پر جھوٹ باندھنے والے کو قرآن نے جابجا سب سے بڑا ظالم ٹھہرایا تھا اس قرآنی الزام اور وعید نبوی سے بچنے کی خاطر بھی صحابہ حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ احادیث کو لکھتے بھی جاتے تھے چنانچہ ایک موقعہ پر حضرت عبداللہ بن عمرو کے ایک سوال کے جواب میں صحابۂ کبار کی ایک جماعت نے اسی حقیقت کا اظہار بڑے واضح الفاظ میں فرمایا:

یہ سوال و جواب حضرت عبداللہ بن عمرو ہی کی زبانی سنئے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ

کان عند رسولِ اللہ ناسٌ من أصحابہ وأنا معھم وأنا أصغرُ القوم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کذب علیَّ متعمِّدًا فلیتبوّأ مقعدہٗ من النّارِ فلمّا خرج القومُ قلتُ	"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صحابہ کی ایک جماعت حاضر تھی اور میں بھی ان میں تھا اور میں سب سے چھوٹا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھتا ہے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے جب مجلس برخاست ہوئی تو میں نے صحابہ سے

کیف تحدثون عن رسول اللہ وقد سمعتم ما قال وانتم تنهکون فی الحدیث عن رسول اللہ فضحکوا فقالوا یا ابن اخینا ان کل ما سمعنا منہ عندنا فی کتاب (مجمع الزوائد)

کہا کہ آپ نے حضور کے ارشاد کو سنا پھر آپ لوگ حدیث بیان کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں صحابہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا اے بھتیجے ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا ہے وہ ہمارے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔

یعنی لکھا ہوا ہونے کی بنا پر ہمیں پورا اطمینان ہے کہ ہم کوئی غلط بات آپؐ کی طرف منسوب کرنے کے جرم کا ارتکاب نہیں کر رہے ہیں۔ اس روایت کے بیان کرنے والوں کے بارے میں ہیثمی نے تصریح کی ہے کہ سب کے سب صحیح بخاری کے راوی ہیں۔

کاتبین حدیث

غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ صحابۂ کرام کی ایک واضح تعداد احادیث نبوی کو حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ لکھ کر بھی محفوظ کرتی تھی صحابہ کا جو طرزِ عمل قرآن کے بارے میں تھا کہ حفظ بھی کرتے تھے اور مختلف اجزا میں لکھ لکھ کر بھی اسے محفوظ کرتے جاتے تھے یہی طرزِ عمل احادیث کے بارے میں بھی تھا احادیث کو بھی حفظ اور کتابت دونوں طریقوں سے محفوظ رکھا جا رہا تھا۔ اگر ان روایات کو پیش نظر رکھا جائے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مخصوص صحابہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کتابت حدیث کی خصوصی اجازت ملی ہوئی تھی تو بلا تکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح قرآن کی کتابت کے لیے کاتبینِ وحی مقرر تھے اسی طرح احادیث کی کتابت کے لیے بھی بعض صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کاتبینِ حدیث کی حیثیت کے حامل تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ان لوگوں میں شامل ہیں جن کو کتابت حدیث کی خصوصی اجازت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملی ہوئی تھی اپنی اس اجازت کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عن عبداللہ بن عمرو اتیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

اللہ انی ارید ان اروی من حدیثک فاردت ان استعین بکتاب یدی مع قلبی ان رایت ذلک فقال رسول اللہ ان کان حدیثی ثم استعن بیدک مع قلبک (سنن دارمی)

حاضر ہوئے اور عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ آپکی حدیثیں روایت کروں میرا ارادہ ہے کہ دل کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ سے دل کی مدد بھی لوں اگر آپ یہ پسند فرمائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میری حدیث ہو تو پھر اپنے دل کے ساتھ اپنے ہاتھ سے بھی مدد لو (یعنی لکھ لیا کرو)

اس اجازت کے بعد معلوم ہوتا ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے کتابت حدیث میں اس قدر انہماک سے کام لیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا اسے قلم بند کر لیا چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں:

کنت اکتب کل شیئ اسمعہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارید حفظہ فمنعتنی قریش فقالوا انک تکتب کل شیئ تسمعہ من رسول اللہ و رسول اللہ بشر یتکلم فی الغضب فامسکت عن الکتابۃ فذکرت ذلک لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال اکتب والذی نفسی بیدہ ماخرج منی الا الحق (سنن دارمی)

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا اسے لکھ لیتا تھا اس ارادے سے کہ اسے یاد کر لوں گا لیکن قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے ہو لکھ لیتے ہو حالانکہ آپ بشر ہیں اور غصہ میں بھی کچھ فرما دیتے ہیں میں نے (یہ سن کر) لکھنا ترک کر دیا پھر میں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپؐ نے فرمایا جو مجھ سے سُنا کرو ضرور لکھ لیا کرو اس کی قسم جس کی قدرت میں میری جان ہے میری زبان سے حق کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا۔

اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ حدیث سے متعلق حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کو دی ہوئی اجازت کو بحال رکھا وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ آپؐ نے اس امر کی بھی توثیق فرما دی کہ میری ہر ہر بات کو لکھ کر محفوظ کر لیا جائے اس توثیق نبوی کی

تائید مسند احمد کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں ذکر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے ایک بار بڑی صراحت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا کہ

أأكتب كل ما أسمع قال نعم قال في الرضى والغضب قال نعم فاني لا أقول في ذلك الا حقاً (مسند احمد)	میں جو کچھ آپ سے سنوں کیا سب لکھ لیا کروں آپ نے فرمایا ہاں! عرض کیا خواہ آپ راضی ہوں یا غصے میں ہوں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں کیونکہ میں ہر حال میں حق بات کہتا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی طرح حضرت رافع بن خدیجؓ کو بھی بارگاہ نبوی سے کتابت حدیث کی اجازت ملی ہوئی تھی چنانچہ انہی سے روایت ہے کہ

قلنا یا رسول اللہ انا نسمع منك أشياء أفنكتبها قال اكتبوا ولا حرج (کنز العمال)	ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ہم لوگ آپ سے بہت سی باتیں سنتے ہیں کیا انہیں لکھ لیا کریں آپؐ نے فرمایا لکھ لیا کرو کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت رافع بن خدیج کے الفاظ ظاہر کر رہے ہیں کہ کتابت حدیث کی اجازت سے متعلق اس سوال میں دیگر صحابہ بھی شامل تھے اور بارگاہ نبوی سے سب سوال کرنے والوں کو کتابت کی اجازت مل گئی تھی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور خادم حضرت ابورافع نے بھی آپؐ سے احادیث لکھنے کی اجازت مانگی تھی اور آپؐ نے انہیں اجازت دے دی تھی۔ بارگاہ نبوی سے کتابت حدیث کی خصوصی اجازت حاصل کرنے والوں میں ان مذکرہ حضرات کے علاوہ حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت سمرۃ بن جندب اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام صحابہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے اپنے مستقل صحیفے تیار کیے تھے اور جن کے صحیفوں کے متعلق احادیث کے موجودہ ذخیرہ میں بھی اچھا خاصا مواد ملتا ہے ان کے صحیفوں کے بارے میں تفصیلی ذکر انشاء اللہ آگے مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

اب تک کتابت حدیث کے سلسلے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ بلاشبہ یہ ثابت کرنے

کے لیے بہت کافی ہے کہ صحابہ میں سے جس جس کو بھی لکھنا آتا تھا وہ احادیث کو حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ قلم بند بھی کرتا تھا اور ان میں سے بعض حضرات نے بارگاہ نبوی سے کتابت حدیث کی باقاعدہ اجازت بھی حاصل کی تھی ۔

کتابت حدیث کی ممانعت پر مبنی روایات

اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات کا بھی جائزہ لے لیا جائے جن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے کی ممانعت فرمادی تھی اگرچہ منکرین حدیث کا طرز عمل اس سے یکسر مختلف ہے وہ ان ممانعتِ حدیث والی روایات کو تو بہت نمایاں کر کر کے پیش کرتے ہیں اور ان سے اپنے مزعومہ نتائج نکال نکال کر سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں مگر ان احادیث کا ذکر تک نہیں کرتے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی ۔ یہ ایک علمی خیانت ہے جو منکرین حدیث ہی کو سجتی ہے جن کا مقصد محض اپنے مخصوص عزائم کو پورا کرنا ہے مگر ہمارا مقصود اثباتِ حق ہے اس لیے ہمارے لیے یہی مناسب ہے کہ ہم ان روایات کی بھی اصل حقیقت معلوم کیے بغیر آگے نہ چلیں جن کو معاندین حدیث کے متعلق بے اعتمادی پھیلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔

اس سلسلے میں منکرین حدیث کے تمام اعتراضات کا اصل مدار حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جس کو امام مسلم نے کتاب الزھد میں باب التثبت فی الحدیث وحکم کتابۃ العلم کے تحت بیان کیا ہے اور جس کے الفاظ اس طرح پر ہیں :

عن ابی سعیدؓ الخدریؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لاتکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ، وحدثوا عنی ولاحرج ومن کذب علیّ متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار ۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور اگر کسی نے سوائے قرآن کے مجھ سے کچھ لکھا ہے تو وہ مٹادے البتہ میری حدیث کو زبانی روایت کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے ۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مزید وضاحت انہی کی روایت کردہ اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو الہیثمی نے مجمع الزوائد میں مسند احمد سے نقل کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :

عن ابی سعیدٌ الخدریؓ قال کنّا قعودًا نکتبُ ما نسمعُ من النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم فخرج علینا فقال ماھذا تکتبون فقلنا ما نسمع منکَ فقال اَکتابٌ مع کتاب اللہِ امحضوا کتابَ اللہ واخلصوہٗ قال فجمعنا ما کتبناہ فی صعیدٍ واحدٍ ثم احرقناہ۔	حضرت ابوسعید خدریؓ نے فرمایا ہم نے جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا سب بیٹھے لکھ رہے تھے کہ آپؐ تشریف لائے اور فرمایا یہ کیا لکھ رہے ہو ہم نے عرض کیا وہ کچھ جو آپؐ سے سنتے ہیں آپؐ نے فرمایا کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ ایک اور کتاب (بھی لکھی جارہی ہے) اللہ کی کتاب کو علیحدہ کر کو اسے خالص رکھو پس ہم نے جو کچھ لکھا اسے اکٹھا کیا اور جلا دیا۔

اسی طرح کی ایک روایت حضرت ابوہریرہ سے بھی بیان کی جاتی ہے خطیب بغدادی نے اس کو تقیید العلم میں نقل کیا ہے۔ روایت ہے

عن ابی ھریرۃ انہ قال خرج علینا رسول اللہ ونحن نکتب الاحادیث فقال ماھذا الذی تکتبون قلنا احادیثُ نسمعھا منکَ قال کتاب غیرَ کتاب اللہ اتدرون ماضلّ الامَمُ قبلکم الا بما اکتبوا من الکتب مع کتاب اللہ۔	حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم احادیث لکھ رہے تھے آپؐ نے فرمایا یہ تم کیا لکھ رہے ہو ہم نے کہا یہ وہ احادیث ہیں جو ہم نے آپؐ سے سنی ہیں آپؐ نے فرمایا اللہ کی کتاب کے علاوہ کوئی کتاب ہے کیا تم جانتے ہو کہ پہلی قومیں صرف اس وجہ سے تباہ ہوئیں کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کے ساتھ ملا کر کتب لکھیں۔

انہی روایات کو بنیاد بنا کر منکرین حدیث یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو قید تحریر میں لانے سے مطلقاً منع فرما دیا تھا اور پھر از خود نتیجہ نکالتے

ہوئے کہتے ہیں کہ اس ممانعت کتابت سے آپ کا منشا یہ تھا کہ احادیث کو محفوظ نہ کیا جائے مبادا بعد کے لوگ احادیث کو بھی قابل حجت سمجھنے لگیں۔

منکرین حدیث کا غیر منطقی طرز عمل

علمائے کرام نے ان روایات کی جو توجیہات پیش کی ہیں ان کا ذکر کرنے سے پہلے منکرین حدیث سے اس سلسلے میں ایک اہم بات کا فیصلہ کر لینا بہت ضروری ہے منکرین حدیث پہلے یہ بتلائیں کہ احادیث کی عدم کتابت کے ثبوت کے لیے اگر ان متذکرہ بالا روایات کا سہارا لیا جا سکتا ہے جیسا کہ انہوں نے لیا ہے تو تحریر و کتابت حدیث کو ثابت کرنے کے لیے ان روایات سے استشہاد کیوں نہیں کیا جا سکتا جو اسناد کے اعتبار سے اوّل الذکر روایتوں سے قوی تر ہیں۔ وہ اگر روایات کی مدد سے کوئی بات ثابت کر رہے ہیں تو تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر نتیجے تک پہونچنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے اگر واقعی حق کی تلاش ہے تو انصاف سے کہیے کیا اس غیر منطقی طرز عمل سے حق کا حصول ممکن ہے کہ پہلے اپنے طور پر ایک بات طے کر لی جائے اور پھر روایات کا جائزہ لیا جائے جو روایت اپنے مفروضے کی تائید کرتی ہوئی ملے اسے لے لیا جائے اور جس روایت سے اس مفروضے پر زد پڑتی ہو اسے ترک کر دیا جائے۔ ممانعت حدیث والی روایات پر بے بنیاد دلائل کی خواہ کیسی ہی فلک بوس عمارت تعمیر کر لیجئے اجازت حدیث والی روایات سے معارضہ ہوتے ہی آپ کی اس عمارت میں ایسے رخنے پڑتے ہیں ایسی دراڑیں آتی ہیں کہ اس کی فلک بوسی زمین بوس ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ آپ یا تو ان رخنوں اور ان دراڑوں کو پُر کر کے دکھائیے یا پھر اپنے مفروضہ نتائج پر مبنی بر خود غلط دعاوی سے دست بردار ہو جائیے۔ پہلی بات تو یقیناً آپ کے بس کی نہیں اس لیے آپ کے لیے دوسری راہ اختیار کیے بغیر چارہ نہیں مگر ہمیں معلوم ہے آپ سے یہ بھی نہ ہو سکے گا جھوٹا وقار اور بے جا ضد ہمیشہ قبول حق کے راستے میں زبردست رکاوٹ بنتے رہے ہیں آپ کی بھی یہی مجبوری ہے۔

منکرین حدیث کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیجئے مگر جس کو حق کی تلاش ہے وہ خود سوچے روایات وہ بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کی

کتابت سے منع فرمایا تھا اور روایات وہ بھی ہیں اور وہ گذشتہ اوراق میں آپ کی نظر سے گزر چکی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ سے بعض صحابہ نے خصوصی طور سے احادیث لکھنے کی اجازت طلب کی اور آپ نے مرحمت فرمادی نہ صرف ایک بار مرحمت فرمادی بلکہ اس اجازت کو اس وقت بھی باقی رکھا جب بعض حضرات کو کتابت حدیث کی اجازت سے متعلق اصل منشائے نبوی کے سمجھنے میں شبہ پیش آیا ہمارا اشارہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی غصہ کی حالت میں کلام نبوی سے متعلق روایت کی طرف ہے جس کا تفصیلی حال ابھی گذر چکا ہے۔ ان دونوں قسم کی روایات کی موجودگی میں انصاف سے کہئے کیا وہی نتیجہ نکلتا ہے جو منکرین حدیث نکالتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے سے کلی طور پر مطلقاً منع فرما دیا تھا۔ اگرچہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی ممانعت حدیث والی روایت کو امام بخاری نے موقوف علیہ قرار دیا ہے اور اس سے استدلال کو درست نہیں جانا اس لحاظ سے اجازت حدیث والی روایات زیادہ قوی ہو جاتی ہیں تاہم دونوں قسم کی روایات کو صحت کے اعتبار سے اگر ایک مقام پر بھی رکھا جائے تب بھی وہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا جو منکرین حدیث اپنے طور پر نکالے بیٹھے ہیں۔ دونوں قسم کی روایات کی موجودگی میں ہم زیادہ سے زیادہ جس نتیجے پر پہونچ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جہاں آپ نے بعض صحابہ کو احادیث لکھنے سے منع فرمایا وہاں بعض صحابہ کو خصوصی طور سے لکھنے کی اجازت بھی دی گویا زیادہ سے زیادہ جزوی ممانعت ثابت ہوتی ہے کلی ممانعت کسی طرح ثابت نہیں ہوتی ؛

احادیث قلمبند کرنے کی ہدایت

ممانعت کیوں کی گئی تھی اور اجازت کیوں دی گئی تھی اس سلسلے میں سیر حاصل تبصرہ اور اصل حقیقتِ حال کی وضاحت تو ہم آگے چل کر کریں گے اس وقت تو ہمیں منکرین حدیث کے اس دعوے کا ابطال مقصود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ حدیث سے بالکل ہی منع فرما دیا تھا یہ دعوی ایک سفید جھوٹ سے زیادہ کچھ نہیں بس اتنی بات درست کہی جا سکتی ہے کہ کتابت حدیث کی اگر ممانعت کی گئی تھی تو اجازت بھی دی گئی تھی بلکہ صرف اجازت ہی نہیں ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے احادیث کو لکھ لینے کا باقاعدہ حکم فرمایا تھا۔

چنانچہ حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

قیدوا العلم بالکتابۃ (جامع بیان العلم)	علم کو لکھ کر مقید کر لو ۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

قیّدِ العلمَ قلتُ وما تقییدُہٗ قال کتابتہ (مستدرک حاکم)	علم کو مقید کر لے میں نے عرض کیا مقید کرنے سے کیا مراد ہے آپ نے فرمایا اس کو لکھ لینا

ایسی روایات بھی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ نے یہ شکایت کی کہ ہم آپ کی احادیث سنتے ہیں مگر بھول جاتے ہیں تو آپ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو یعنی ان کو لکھ لیا کرو۔ ترمذی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ

کانَ رجلٌ من الانصار یجلس الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فیسمع من النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم الحدیث فیعجبہ ولایحفظہٗ فشکا ذلک الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال یارسول اللّٰہ انی لاسمع منک الحدیث فیعجبنی ولا احفظہٗ ۔ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم استعن بیمینک واومابیدہ الخط (ترمذی باب ماجاء فی الرخصۃ فیہ)	انصار میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھتا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں سنتا تو اسے پسند آتیں مگر اسے یاد نہ رہتیں اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس (کمزوری) کی شکایت کی اور عرض کیا اے اللہ کے رسول میں آپ کی حدیثیں سنتا ہوں اور وہ مجھے پسند آتی ہیں مگر یاد نہیں رہتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لے اور اپنے ہاتھ سے لکھنے کی طرف اشارہ فرمایا۔

کچھ الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ اسی قسم کی ایک روایت حضرت ابوہریرہ سے ہی خطیب بغدادی نے تقیید العلم میں بھی نقل کی ہے۔ حکم کتابتِ حدیث کی پہلی دو روایتوں میں لفظ علم کی مختلف تعبیرات کی بحث چھیڑ کر منکرین حدیث ممکن ہے کتمان حق کی کوشش کریں مگر حضرت ابوہریرہ سے مروی یہ متذکرہ بالا روایتیں تو کتابتِ حدیث سے متعلق حکم نبوی کے ثبوت میں بہت ہی واضح ہیں۔ ان

روایات کی موجودگی میں ہر کوئی خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ منکرین حدیث کے اس دعوے میں کیا وزن رہ جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث کی بالکلیہ ممانعت فرما دی تھی۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اجازت کتابت اور حکم کتابت سے متعلق روایات ابتدائی زمانے کی ہیں اور ممانعت کتابت والی احادیث کا زمانہ بعد کا ہے اس لیے کہ مؤخر الذکر روایات کے بارے میں محدثین کا خیال ہے کہ آغاز ہجرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ محدث رامہرمزی نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے[1] جبکہ اوّل الذکر روایات میں سے بعض کے بارے میں حتمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا تعلق حجۃ الوداع سے ہے چنانچہ وہ روایت اس پر شاہد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایک صحابی حضرت ابو شاہ یمنی کی درخواست پر خطبہ حجۃ الوداع لکھنے کا حکم دیا تھا۔ صحیح مسلم کی روایت میں حجۃ الوداع کے موقعہ پر خطبہ دینے کا پورا واقعہ بھی نقل کیا گیا ہے تاہم ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی هریرۃ انّ النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم خطب فذکر قصّۃً فی الحدیث فقال ابو شاہ اکتبو لی یا رسول اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکتبو لابی شاہ (ترمذی ابواب العلم باب فی الرخصۃ فیہ)	ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ پڑھا اور راوی نے حدیث میں ایک قصہ کا ذکر کیا تو ابو شاہ نے کہا اے اللہ کے رسول مجھے لکھوا دیجئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو شاہ کے لیے لکھ دو۔

حکیم ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔

ممانعت کتابت سے غلط استدلال

بہر حال ممانعتِ کتابت والی احادیث سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کلی طور پر احادیث لکھنے سے منع فرما دیا تھا۔ انہی

---

[1] المحدث الفاصل

روایات سے منکرین حدیث یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں کہ اس ممانعت کتابت سے منشائے نبوی یہ تھا کہ احادیث کو قید تحریر میں لا کر محفوظ نہ کیا جائے مبادا بعد کے لوگ احادیث کو بھی دین میں حجت سمجھنے لگیں۔ ممانعت کی اصل حقیقت پر گفتگو کرنے سے پہلے آیئے منکرین حدیث کے اس دعوے کا بھی تجزیہ کرتے چلیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ دریافت طلب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منشا کا علم منکرین حدیث کو ہوا کس طرح؟ کیا وہ کوئی ایسی روایت پیش کر سکتے ہیں جو اشارتاً ہی اس منشائے نبوی کا پتہ دیتی ہو؟ کیا یہ منشا منکرین حدیث کا خود تراشیدہ نہیں؟ کیا یہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک غلط بات منسوب کرنے کے مترادف نہیں؟ وہ بات جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول کسی فعل میں دُور دُور تک پتہ نہیں اس کو آپؐ کی منشا قرار دینا کیا بہتان طرازی کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ ممانعت کتابت سے متعلق روایات سے اخذ کردہ اس بزعم خود غلط نتیجہ کو منشائے نبوی کہہ کر کیا منکرین حدیث از خود اس ارشاد نبوی کی زد میں نہیں آ گئے جس میں آپؐ کی طرف غلط بات منسوب کرنے والے کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے؟

منکرین حدیث اگر ذرا عقل سے کام لیتے تو ان کو انہی روایات سے جن کو وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں حقیقتِ حال کا علم ہو جاتا اگر انہوں نے ان ممانعتِ کتابت پر مشتمل روایات ہی کو ذرا غور کی نظر سے دیکھ لیا ہوتا تو انہیں اتنی بڑی ٹھوکر کبھی نہ لگتی وہ ایک غلط بات کو منشائے نبوی کبھی قرار نہ دیتے۔ منکرین حدیث کو دعوتِ فکر ہے وہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی اس روایت کو جو ان کے تمام دعاوی کا اصل ماخذ ہے آخر تک ذرا غور سے پڑھیں۔

اس روایت میں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھوا ور اگر کسی نے کچھ لکھا ہے تو اسے چاہیئے کہ اسے فوراً مٹا دے اس کے فوراً بعد آپؐ کے الفاظ یہ ہیں کہ

وحدثوا عنی ولا حرج	میری حدیث کو زبانی روایت کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ کی منشا یہ تھی کہ میری احادیث کو دین میں حجت نہ سمجھا جائے تو آپؐ زبانی روایت کو بھی ممنوع قرار دیتے زبانی روایت کی اجازت دینا تو یہ بتلا رہا ہے کہ آپؐ کی منشا اس کے برعکس تھی آپؐ کی خواہش تھی کہ لوگ اپنی دینی زندگی میں میری احادیث سے مستفید ہوتے رہیں اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی احادیث کو دین میں حجت قرار دینا نہیں چاہتے تھے تو کتابت حدیث سے منع فرماتے وقت آپؐ کو بڑی صراحت کے ساتھ یہ فرمانا چاہیئے تھا کہ میری احادیث کو زبانی بھی ہرگز ہرگز روایت نہ کرو مگر یہاں تو ہم دیکھتے ہیں کہ معاملہ اس کے برعکس ہے کتابت حدیث کی ممانعت کے فوراً بعد آپؐ خصوصی طور پر احادیث کو زبانی روایت کرنے کی اجازت دیتے ہیں نہ صرف اجازت بلکہ فرماتے ہیں کہ زبانی روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں گویا اس متوقع غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں کہ ممانعت کتابت سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس سے مقصود حفاظت حدیث اور تبلیغ حدیث سے روکنا ہے احادیث کی سینہ بسینہ منتقلی جاری رہنی چاہیئے۔

حیرت کی بات ہے منکرین حدیث جس روایت کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں اس روایت کے ان الفاظ کو تو خوب نمایاں کر کے پیش کیا جا رہا ہے جن میں کتابت حدیث کی ممانعت کا ذکر ہے اور فوراً بعد آنے والے ان الفاظ سے عمداً آنکھیں بند کی جا رہی ہیں جو ان کے مفروضہ نتائج کا صریحاً رد کرتے ہیں۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ منکرین حدیث تحقیق و تلاش حق میں دیانت و امانت کے تقاضوں کا کس حد تک خیال رکھتے ہیں۔

منکرین حدیث کو اسی روایت کے آخری الفاظ بھی شاید نظر نہیں آتے ذرا سوچ کر بتلایئے اگر منشائے نبوی یہ ہے کہ احادیث کو دین میں حجت نہ ٹھہرایا جائے تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے کوئی بات نقل کرنے میں جھوٹ اور سچ کا امتیاز کیسا۔ پھر تو آپؐ کو یہ فرمانا چاہیئے تھا کہ میری طرف منسوب کر کے کوئی بات بھی نقل نہ کرو۔ آپ کا یہ فرمانا کہ من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہٗ من النار (جو شخص عمداً میری طرف جھوٹی بات منسوب کرتے وہ اپنا ٹھکانہ جہنّم میں بنا لے) صاف بتلا رہا ہے کہ چونکہ احادیث کو دین میں حجت کی حیثیت حاصل ہے اس لیے جھوٹی بات منسوب کرنے سے دین میں خلل واقع ہوگا۔ خلل دین

سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ میری طرف نسبت کرکے جو بات بھی بیان کی جائے اس کے متعلق پورا یقین حاصل کر لیا جائے کہ وہ اپنے مفہوم میں بالکل اسی طرح ہے جس طرح میں نے کہا تھا یا جس طرح کوئی کام میں نے کرکے دکھایا تھا۔

حجیت حدیث پر تفصیلی بحث تو انشاء اللہ اپنے مقام پر ہوگی مگر یہاں بھی اتنی بات تو منکرین حدیث ہمیں سمجھائیں کہ کتابت حدیث کی ممانعت سے اگر مقصود یہی تھا کہ دین میں احادیث کو حجیت کا مقام نہ حاصل ہو پائے تو پھر ان ارشادات نبوی کا آپ کیا مطلب لیں گے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بڑے ہی تاکیدی انداز میں یہ ہدایت فرمائی کہ میری بات جس جس کے پاس پہونچتی رہے وہ آگے ان لوگوں تک پہونچاتا چلا جائے جن تک میری بات نہیں پہونچی[1] احادیث کے جس ذخیرے سے منکرین حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ کی یہ کتابت حدیث کی ممانعت سے متعلق روایت نکال کر لائے ہیں اسی ذخیرے میں انہیں کیا یہ روایت نظر نہیں آئی الا فلیبلغ الشاھد الغائب (خبردار جو حاضر ہے اسے چاہیئے میری باتیں ان تک پہونچاتا جائے جو غائب ہیں) یہ روایت تو صحاح کی تمام کتابوں میں موجود ہے تعصب کی عینک اتر نے تو نظر آئے۔ اگر مقصود یہی تھا کہ احادیث نبوی سے امت مسلمہ مستفید نہ ہو تو اس تاکیدی انداز میں تبلیغ احادیث کا حکم دینا کیا معنی۔ اگر کتابت حدیث کی ممانعت سے منشائے نبوی یہی تھا کہ احادیث کو حجت نہ جانا جائے تو لازم تھا کہ احادیث کی حفاظت کرنے والوں کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حوصلہ شکنی فرماتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بالکل برعکس آپؐ ان لوگوں کی قدم قدم پر حوصلہ افزائی فرماتے ہیں جو احادیث کو محفوظ کرتے اور دوسروں تک پہونچانے کے کام میں مصروف ہیں ایسے لوگوں کے لیے زبان نبوی پر بے اختیار دعائیہ کلمات جاری ہو جاتے ہیں کبھی آپ فرما رہے ہیں اللہ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے مجھ سے حدیث کو جس طرح سنا تھا اسی طرح دوسروں تک پہونچا دیا[2] کبھی روایت حدیث کی ضرورت واہمیت جتلانے کے لیے آپ اس حقیقت کا اظہار فرما رہے ہیں کہ فرب مبلغ اوعی من سامع[3] (لیبا اوقات مجھ سے سننے والوں کی نسبت حدیث کی حفاظت زیادہ

---

[1] صحاح [2] صحیح ابن حبان، [3] مسند احمد

وہ کرتے ہیں جو ان سے سُن کر پہونچانے والے ہوتے ہیں) اور کبھی صحیح فہم حدیث کی فقہی ضرورت کو اذہان میں اُجاگر کرنے کے لیے ارشاد ہو رہا ہے فرُبَّ حامِلِ فِقْہٍ الیٰ مَنْ ھُوَ افْقَہُ مِنْہُ (بہت سے اہل فقہ حدیث کو ان لوگوں تک پہونچاتے ہیں جو ان سے زیادہ فقیہ ہیں)۔ اگر منشائے نبوی حجیت حدیث کے حق میں نہیں تھا تو روایت حدیث کی اہمیت جتلانے کے بجائے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار ہونا چاہیئے تھا احادیث کو فقہی ضرورت قرار دینے کے بجائے واضح الفاظ میں یہ بتلانا چاہیئے تھا کہ احادیث کا فقہ اسلامی میں کوئی مقام نہیں۔ یہ تمام روایات منکرین حدیث کو احادیث کے کسی مجموعے میں نظر نہیں آئیں مگر کیا وہ حضرت ابوہریرہؓ کی اس مشہور روایت سے بھی آنکھیں بند کرلیں گے جو صحاح کی عام کتابوں میں پائی جاتی ہے اور امام بخاری نے بھی باب حفظ العلم کے تحت اس کو بیان کیا ہے۔ اور جس میں حضرت ابوہریرہ نے اپنی قوتِ حافظہ کی شکایت بارگاہ نبوی میں پیش کرنے کا واقعہ بیان کیا ہے[۲] اس واقعہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعجازی طور پر حضرت ابوہریرہ کا حافظہ قوی کر دیا تھا سوال یہ ہے کہ اگر احادیث کی حفاظت و تبلیغ منظور نہ تھی تو حافظہ کو قوی کرنے کے بجائے اعجازی انداز میں اور زیادہ کمزور کیا جانا چاہیئے تھا تاکہ احادیث کا سینہ بہ سینہ منتقلی کا دروازہ ہی بند ہو جاتا امت میں احادیث کا ذکر ہی پہنچنے نہ پاتا اور حجیت و عدم حجیت کی بحث ہی نہ چھڑتی۔

غرض کتابت حدیث کی ممانعت والی روایات سے منکرین حدیث کا نہ یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کے لیے کلی طور پر احادیث لکھنے سے منع فرما دیا تھا اور نہ یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے کہ ممانعت کتابت سے مقصود حفاظت و تبلیغ حدیث سے روکنا اور احادیث کے حجت ٹھہرائے جانے کے خدشے کو دُور کرنا تھا۔

ممانعت کتابت کی اصل وجہ

منکرین حدیث کے ان دونوں دعووں سے پیدا شدہ غلط فہمی دُور ہو جانے کے بعد اب ہمارے لیے ممانعت

---

[۱] ابوداؤد باب فضل نشر العلم

[۲] زیر نظر کتاب میں یہ واقعہ "حفظ حدیث اور صحابہؓ" کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

کتابت پر مشتمل احادیث کے بارے میں اصل حقیقت حال تک پہونچنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ آیئے اِن روایات کو دوبارہ بغور پڑھیں اور ان تمام توجیہات کی روشنی میں جو علمائے کرام نے اس سلسلے میں پیش کی ہیں کتابت حدیث کی ممانعت سے جو اصل مقصود و منشائے نبوی تھا وہ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔

علمائے کرام نے کتابت حدیث کی ممانعت سے متعلق روایات کی متعدد توجیہات پیش کی ہیں۔ ان تمام توجیہات کا باہم ترجیح و تطبیق کے نقطۂ نظر سے اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو درج ذیل دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) اوّل یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو قلم بند کرنے سے مطلقاً منع نہیں فرمایا تھا بلکہ اس طور سے احادیث لکھنے کی ممانعت فرمائی تھی کہ جس سے قرآن اور حدیث دونوں آپس میں خلط ملط ہو جائیں۔

(۲) دوم یہ کہ اس ممانعت سے مقصود قرآن اور حدیث کے درمیان ایک واضح امتیاز باقی رکھنا تھا متن اور عبارت کے لحاظ سے بھی اور احکام و نتائج میں فرق مراتب کے اعتبار سے بھی۔

قرآن اور حدیث میں امتیاز

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کردہ احادیث پر ذرا دوبارہ نظر ڈالیے خصوصاً اس روایت کے الفاظ میں غور کیجیے جس کو الہیثمی نے مجمع الزوائد میں مسند احمد سے نقل کیا ہے اُمحضوا کتابَ اللہِ واُخلصوہُ (یعنی اللہ کی کتاب کو علیحدہ کر دو اور اسے خالص و بے آمیز کرو) کے الفاظ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں کہ اللہ کی کتاب کی ساتھ کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ کرو یعنی مطلوب یہ نہیں ہے کہ احادیث کو بالکل نہ لکھو بلکہ مطلوب یہ ہے کہ قرآن کی ساتھ خلط ملط کر کے نہ لکھو۔ اسی روایت میں ان الفاظ سے پہلے جو سوال جواب صحابہ کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ہُوا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ قرآن اور حدیث کو یکجا کر کے اس طرح لکھ رہے تھے کہ دونوں میں کوئی حدِ فاصل کھینچنا مشکل تھا۔ غور فرمائیے صحابہ کو لکھتا ہُوا دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پوچھتے ہیں کہ کیا لکھ رہے ہو تو صحابہ جواب میں عرض

کرتے ہیں جو کچھ آپؐ سے سنتے ہیں' یعنی قرآن اور حدیث میں سے جو کچھ آپؐ سے سنتے ہیں اسے لکھ لیتے ہیں۔ ظاہر ہے قرآن و حدیث دونوں کو یکجا اس طرح لکھنا کہ دونوں میں کوئی امتیاز نہ ہو سکے دینی مقاصد کے لیے انتہائی ضرر رساں تھا اس لیے آپؐ نے روکا اس بات سے تھا کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب کو اس طرح نہ لکھو کہ دونوں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ "اکتاب' مع کتاب اللہ" کے الفاظ بھی یہی تبلا رہے ہیں کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ کسی دوسری کتاب کے لکھنے سے روکنا مقصود ہے۔

مشہور محدث امام خطابی معالم السنن میں اسی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

إنه إنما نهى أن يكتب الحديث مع القرآن في صحيفة واحدة لئلا يختلط به ويشتبه على القاري فأما أن يكون نفس الكتاب محظورًا وتقييد العلم بالخط منهيًا عنه فلا۔	آپ نے قرآن و حدیث کو ایک ہی صحیفہ میں لکھنے سے منع فرمایا تھا تاکہ کہیں خلط ملط نہ ہو جائے اور پڑھنے والا کسی شبہ میں نہ پڑ جائے تاہم نفس کتابت اور علم کو لکھ کر محفوظ کر لینا ہرگز ممنوع نہ تھا۔

محدث رامہرمزی نے بھی حضرت ابو سعید خدری کی روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی خیال کا اظہار فرمایا ہے کہ آپ نے کتابت حدیث کی ممانعت اس وقت فرمائی تھی جب قرآن و حدیث کے مل جانے کا خطرہ تھا[1]۔ بات یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی کتابت مطلقاً منع نہیں فرمائی تھی بلکہ اصل حقیقت حال یہی تھی کہ بعض صحابہ کلام الٰہی اور کلام رسول دونوں کو ایک ہی ورق پر یا ایک ہی صحیفہ میں ساتھ ساتھ لکھ رہے تھے اس طرح خدشہ یہ تھا کہ قرآن و حدیث کہیں اس طرح خلط ملط نہ ہو جائیں کہ دونوں میں کوئی امتیاز ہی باقی نہ رہے جبکہ دونوں میں امتیاز باقی رہنا عبادت کے اعتبار سے بھی ضروری تھا کہ کلام الٰہی رسول کے کلام سے ملتبس نہ ہو جائے اور احکام و نتائج کے اعتبار سے بھی لازمی تھا کہ دونوں کا فرق مراتب برقرار رہے۔

---

[1] المحدث الفاصل جلد ۲ صہ ۷

قرآن اور حدیث اگرچہ دونوں دین کے سرچشمے ہیں ۔مگر ان دونوں سے پیدا ہونے والے احکام کے مطالبوں میں قوت وضعف کا جو فرق ہے وہ محتاج بیان نہیں کون نہیں جانتا کہ تواتر و توارث کی جس راہ سے منتقل ہوتا ہوا قرآن ہم تک پہونچا ہے اسی راہ سے منتقل ہونے والی وہ ساری چیزیں جو ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی ہیں یقین واعتماد کا جو مقام قرآن کو اور ان چیزوں کو امت مسلمہ میں حاصل ہے وہ مقام ان چیزوں کو کہاں حاصل جن کے علم کا ذریعہ وہ حدیثیں ہیں جنہیں اصطلاحاً خبر آحاد کہا جاتا ہے ۔ لازماً بالیقین واعتماد سے بہرہ ور دین کا اوّل الذکر حصہ یقیناً قرآن کی اپنی اصطلاح کے مطابق بینات کا درجہ رکھتا ہے جبکہ مؤخر الذکر حصے کو بینات کے مقابلے میں غیر بیناتی کہا جا سکتا ہے ۔ دین کے ان دونوں حصوں سے پیدا ہونے والے احکام کے مطالبوں میں قوت وضعف کا جو فرق ہے وہ ظاہر وباہر ہے ۔ اس فرق کو باقی رکھنے کے لیے بھی ضروری تھا کہ قرآن اور حدیث آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں اور دین کا وہ حصہ جس کو امت کی سہولت کے پیش نظر غیر بیناتی رکھنا مقصود ہے بینات کی شکل نہ اختیار کر لے [۱]

---

[۱] دین کا بیناتی حصہ وہ اصول وکلیات ہیں جن کا انکار خود دین کا انکار بن جاتا ہے جبکہ دین کا غیر بیناتی حصہ ان فروع اور ان جزئیات پر مشتمل ہے جن سے اگرچہ دینی زندگی کی تعمیر کا کام لیا جاتا ہے لیکن ان سے نکل جانے پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آدمی دین سے نکل گیا ۔ گویا دین کے بیناتی حصہ کی بنیاد قرآن کے بعد وہ احادیث ہیں جو تعامل صحابہ اور تواتر و توارث عامۃ المسلمین کی راہ سے بغیر کسی انقطاع کے نسلاً بعد نسلٍ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے ذریعے منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہونچی ہیں ۔ ایسی احادیث کی بنیاد پر تشکیل پانے والے دین کے بیناتی حصے کی مقدار متعین کرنے کے لیے عقائد وایمانیات کے سوا طہارت غسل وضو عبادات نماز روزہ حج زکوٰۃ معاملات عقوبات سیاسیات اور مباحات ومحذورات وغیرہ وغیرہ مختلف ابواب سے ان اتفاقی مسائل کا انتخاب کر لیا جائے جن پر امت اسلامیہ کے تمام فرقے متفق ہیں اور جو عہد نبوت سے اس وقت تک ہر ملک اور ہر فرقہ کے مسلمانوں میں تواتر کے ساتھ اسی حیثیت سے مسلّم ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

مقصد پیشِ نظر اسی امتیاز کو برقرار رکھنا تھا البتہ اس کے لیے آپؐ نے ظاہر ہے تدابیر مختلف اختیار فرمائی ہوں گی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع شروع میں چند مخصوص لوگوں کو احادیث لکھنے کی اجازت دی اور عام طور پر ممانعت فرما دی ممکن ہے آپ نے ان لوگوں کو اجازت دے دی ہو جو علم رسم الخط سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے اور ان کی تحریر کردہ باتوں میں غلطی اور شبہ کا امکان نہ تھا اور جو اس فن سے پوری طرح واقف نہ تھے انہیں منع فرما دیا ہو ابن قتیبہ نے ممانعت و اجازت کتابت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہی خیال ظاہر کیا ہے[۱] بعض قرائن بھی اس کی تائید میں ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جن کو احادیث لکھنے کی اجازت دی گئی تھی سریانی و عبرانی رسم الخط میں مکمل مہارت رکھتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کتابت حدیث سے منع کرنے اور اجازت دینے میں آپؐ نے صحابہ کی قوت یادداشت کو ملحوظ رکھا ہو جن صحابہ کا حافظہ قوی تھا۔ ان کے لیے آپؐ نے یہ پسند فرمایا ہو کہ وہ اپنی اسی

گزشتہ سے پیوستہ

کہ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور یہی آپ کا طرزِ عمل تھا اگر پوری تلاش و جستجو سے کام لیا جائے تو اس قسم کے مسائل کی تعداد یقیناً ہزاروں سے متجاوز ہوگی۔ یہی دین کا بنیاتی حصہ ہے اس کے مقابلے میں دین کا غیر بنیاتی حصہ ان احادیث کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قصداً اور ارادتاً انفرادی معلومات تک محدود رکھا ہے تاکہ یہ احادیث اپنے مطالبوں کی قوت میں دین کے اوّل الذکر حصے کے برابر نہ ہو جائیں نہ دینِ اسلام کے بنیاتی اور غیر بنیاتی حصوں کے درمیان اسی امتیاز نے ہی اسلام کو تیسیری اور سہولت پسندانہ خصوصیت عطا کی ہے کہ عزم و ہمت رکھنے والے اگر چاہیں تو دین کے دونوں حصوں پر عمل پیرا ہو کر محبوبیت حق میں ترقی کرتے چلے جائیں اور عزم و ہمت سے محروم افراد اگر دین کے ان دونوں حصوں کے مطالبوں کو پورا کرنے میں کامیاب نہ ہو پاتے ہوں تو کم از کم دین کے بنیاتی حصے کی تعمیل کر کے ان ثمرات و نتائج سے تو محروم نہ رہیں جن کی توقع ایک مسلمان بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنی آخرت کی زندگی میں رکھتا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب تدوین حدیث میں اس موضوع پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔

---

[۱] بحوالہ توجیہ النظر للجزائری ص۱

خدا داد قوت سے کام لیں اور احادیث کو لکھنے کے بجائے حفظ کریں اس کے مقابلے میں ان لوگوں کو جن کی قوتِ حافظہ کمزور تھی کتابت کے فن سے مدد لینے کی ہدایت کی گئی اس خیال کو تقویت ان روایات سے بھی ملتی ہے جن میں بیان کیا گیا ہے کہ بعض صحابہ نے سوءِ حفظ کی شکایت کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہاتھ کی طرف اشارہ کرکے احادیث کو قلم بند کر لینے کی ہدایت کی۔ ابن حبان نے کتابت حدیث سے ممانعت پر مشتمل روایات کی یہی توجیہ کی ہے ان کا کہنا ہے کہ قرآن کے سوا حدیث لکھنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے منع کیا تھا کہ حفظ حدیث پر زور دینا مقصود تھا۔

تدابیر خواہ کچھ بھی اختیار کی گئی ہوں مگر اتنی بات بالکل صاف ہے کہ کتابت حدیث سے ممانعت محض اسی مقصد کے پیشِ نظر تھی کہ کہیں قرآن اور حدیث ایک دوسرے میں خلط ملط نہ ہو جائیں چنانچہ یہ ممانعت اسی وقت تک رہی جب تک یہ قرآن و حدیث کے خلط ملط ہونے کا خطرہ باقی رہا جب قرآن کا اکثر حصہ نازل ہو گیا اور بہت سے صحابہ نے اسے حفظ کر لیا اور اس طرح احادیث سے اس کے التباس کا کوئی خطرہ نہ رہا تو آپ نے حدیث نویسی کی کھلی اجازت دے دی وہ روایات جن سے کتابتِ حدیث کی عام اجازت مفہوم ہوتی ہے اسی بعد کے دور کی ہیں۔ محدث رامہرمزی کتابتِ حدیث کی ممانعت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت آپؐ نے آغازِ ہجرت میں اس وقت فرمائی تھی جب قرآن و حدیث کے آپس میں ملتبس ہو جانے کا خطرہ تھا[1] ڈاکٹر صبحی صالح کا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو قید تحریر میں لانے سے آغاز وحی میں منع فرمایا تھا کہ مبادا آپؐ کے اقوال و تشریحات اور سیرت قرآن سے خلط ملط ہو جائے اور دونوں میں کسی فرق و امتیاز کا امکان باقی نہ رہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی اس بات سے تو اتفاق کرتے ہیں کہ کتابت حدیث سے ممانعت اسی مقصد کے پیشِ نظر تھی کہ قرآن اور حدیث سے پیدا ہونے والے احکام و نتائج کے مطالبوں میں

---

[1] المحدث الفاصل:

قوت وضعف کا جو فرق ہے اسے قائم کیا جائے اس نکتہ کی وضاحت پر اُنہوں نے اپنی کتاب تدوین حدیث میں سیر حاصل بحث بھی کی ہے مگر وہ ممانعت کتابت کی اس توجیہ سے متفق نہیں ہیں کہ اس سے مقصود قرآن اور حدیث کی عبارات کے آپس میں خلط ملط ہو جانے کے اندیشے کو روکنا تھا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی دراصل اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ یہ ممانعت کتابت کا حکم یکایک نہیں دے دیا گیا تھا بلکہ اس حال سے واقف ہونے کے بعد دیا گیا تھا کہ آپؐ سے ہر سُنی ہوئی بات لکھی جا رہی ہے احادیث کی اس طرح کی عمومی اشاعت آپؐ کو پسند نہ تھی کیونکہ عہد نبوت ہی میں اگر مکتوب احادیث کے اس کثرت سے مجموعے تیار ہو جاتے تو ان سے بتدریج پیدا ہونے والے احکام ونتائج میں اور قرآنی آیات سے پیدا ہوتے والے احکام ونتائج میں کوئی فرق باقی نہ رہتا اور اس طرح دین کے احکام میں تنگی پیدا ہو جاتی مولانا کے نزدیک منشائے نبوی دراصل یہ تھا کہ ان احادیث کو چھوڑ کر جو قرآن کے عملی مطالبات کی تشکیلات اور اسی نوعیت کے حامل دین کے دوسرے بنیادی احکام پر مشتمل ہیں عام احادیث کی تدوین اس اہتمام سے نہ ہو جس اہتمام سے قرآن کی تدوین ہو رہی تھی تاکہ عام احادیث کا سرمایہ قطعیت اور یقینی ہونے میں قرآن کے برابر نہ ہو جائے۔ مولانا کے خیال کے مطابق اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو عام طور پر لکھنے سے منع کر دیا اور قصداً و ارادتاً ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ قرآن کے مقابلے میں ان احادیث کا درجہ دُوسرا ہو گیا ایسا دوسرا درجہ جس کی وجہ سے اُن کے متعلق علماء کے اجتہاد کی راہیں کھُل گئیں اور فقہا کو فکر و نظر کے لیے وسیع میدان میسر آ گیا اور اس طرح دین پر عمل کرنا آسان ہو گیا نیز آنے والے زمانوں میں دین جمود کے خطرے سے محفوظ ہو گیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کا یہ نقطۂ نظر اپنی جگہ پر اگرچہ درست ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے لیے اُنہوں نے ممانعت کتابت کی اس توجیہ کو رد کرنا کیوں ضروری سمجھا کہ اس سے مقصود قرآن وحدیث کے باہم خلط ملط ہو جانے کے اندیشے کو دُور کرنا تھا حالانکہ یہ توجیہ ان کے نقطۂ نظر کے ثبوت کے لیے تائید کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا کے یہ الفاظ کہ

"میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہر لکھی ہوئی چیز کو صحابہ یا ان کے بعد کے مسلمان قرآن کیوں سمجھ لیتے"۔[1]

اگرچہ صحابہ کی اکثریت کے معاملے میں بالکل مبنی بر حقیقت ہیں لیکن صحابہ کے درمیان بھی دیہات سے تعلق رکھنے والے ایسے اصحاب کی موجودگی کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا جو گہری دینی بصیرت سے پوری طرح بہرہ ور نہ ہونے کی بنا پر کلام الٰہی اور کلام رسول کے درمیان امتیاز کرنے میں کسی شبہے کا شکار ہو سکتے تھے۔ چنانچہ خطیب بغدادی کتابت حدیث کی ممانعت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ونُهِيَ عن كتب العلم في صدرِ الاسلام لقلة الفقهاءِ في ذالك الوقتِ والمميّزين بين الوحيِ وغيرِه لأنّ اكثرَ الاعرابِ لم يكونوا فقهوا في الدينِ ولا جالسوا العلماءَ العارفين فلم يُؤمن ان يلحقوا ما يجدون من الصحف بالقرآن ويعتقدوا انّ ما اشتملت عليه كلام الرحمٰن

(تقييد العلم)

ابتدائے اسلام میں علم کو مکتوب کرنے سے اس لیے منع کیا کہ اس وقت اس بارے میں گہری بصیرت کی کمی تھی اور وحی و غیر وحی میں امتیاز کرنے میں شبہ ہو سکتا تھا کیونکہ اکثر دیہاتیوں کو دینی بصیرت حاصل نہ تھی اور نہ وہ عارف علماء کے پاس بیٹھے تھے اس کا اندیشہ تھا کہ وہ دیگر صحیفوں کو قرآن سے ملحق کر دیتے اور یہ سمجھنے لگ جاتے کہ جو کچھ ان میں ہے وہ اللہ کا کلام ہے۔

جب قرن اوّل میں یہ خدشہ موجود تھا کہ بعض لوگ قرآن اور غیر قرآن کو باہم ملتبس نہ کر دیں تو ان کے بعد کے مسلمانوں کا معاملہ تو اور بھی زیادہ معرض خطر میں ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی وحی الٰہی کے اوّلین مخاطبین کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے اوراق بعد میں آنے والوں کے لیے یقین د

---

[1] تدوین حدیث صـ ۲۴۲

قطعیت کے کس مقام پر ہوتے اور وہ اوراق جن میں قرآن اور حدیث یکجا لکھے ہوئے ہوتے کیسے کیسے شبہات کو دعوت دیتے اور کتنے عظیم فتنے کا سبب بن جاتے۔ حضرت ابو سعید خدری رض کی روایت ہیں جو یہ آتا ہے کہ لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا تھا وہ سب ایک جگہ لاکر جمع کیا اور نذر آتش کر دیا یہ سب کچھ اسی عظیم فتنے کے سدّ باب کے لیے تھا کہ بعد کے آنے والے کہیں قرآن اور حدیث کو باہم ملا نہ دیں۔

بہرحال کتابتِ حدیث کے موافق و مخالف قرائن پر اس تفصیلی گفتگو کے بعد شکوک و شبہات کے وہ بادل پوری طرح چھٹ گئے ہیں جو عدم کتابت سے ثبوت کی ناکام کوشش میں منکرین حدیث کے اڑائے ہوئے غبار سے وجود میں آسکتے تھے اور ہمارے اس دعوے کے لیے فضا بالکل صاف ہو گئی ہے جو ہم نے اس موضوع پر گفتگو کی ابتدا کرتے وقت کیا تھا کہ احادیث کا اکثر حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ اور آپ کے بعد کے متصل زمانے میں ہی قید تحریر میں آچکا تھا۔ آئیے اب حقیقتِ حال کے آئینے میں اس دعوے کا اصل عکس دیکھنے کی کوشش کریں:-

مکثرین صحابہ کے مکتوب ذخیرے

سب سے پہلے ہم ان صحابہ کے مکتوب ذخیروں کا جائزہ لیتے ہیں جو مکثرین کی صف میں شمار ہوتے ہیں یعنی جن کی مرویات کی تعداد ایک ہزار سے اوپر ہے۔

حضرت ابوہریرہ کا تحریری ذخیرہ

مکثرین صحابہ میں سرفہرست حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں آپ سے پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) احادیث مروی ہیں۔ فقہ اسلامی میں جن تین ہزار احادیث پر مدار احکام ہے ان میں سے پندرہ سو احادیث حضرت ابوہریرہ سے روایت ہیں۔ اب وہ شواہد ملاحظہ کیجیے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جتنی روایات بھی حضرت ابوہریرہ سے مروی ہیں وہ سب کی سب مکتوب صورت میں آپ کے پاس محفوظ تھیں۔

جامع بیان العلم میں حافظ ابن عبدالبر نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جو مشہور صحابی

حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ کے صاحبزادے حضرت حسن کے الفاظ میں اس طرح پر ہے کہ

تحدثت عند ابی ھریرۃ بحدیث فانکرہ فقلت انی قد سمعتہ منک فقال ان کنت سمعتہ منی فھو مکتوب عندی فاخذ بیدی الی بیتہ فارانا کتبا کثیرۃ من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوجد ذلک الحدیث فقال قد اخبرتک ان کنت حدثتک بہ فھو مکتوب عندی

میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک حدیث بیان کی اُنہوں نے اس کا انکار کیا میں نے عرض کیا کہ اس حدیث کو میں نے آپ ہی سے سنا ہے بولے اگر تم نے مجھ سے حدیث سنی ہے تو پھر وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہو گی پھر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے گئے مجھے اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی بہت سی کتابیں دکھائیں - انہی میں وہ حدیث بھی پائی گئی حضرت ابوہریرہ نے فرمایا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں نے اگر تم سے کوئی حدیث بیان کی تھی تو وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہے -

اس واقعے کو سرسری نظر سے پڑھتے ہوئے نہ گزر جائیے غور کیجئے حضرت ابوہریرہ کا یہ فرمانا کہ "اگر تم نے مجھ سے کوئی حدیث سُنی ہے تو پھر وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہو گی" صاف یہ تبلا رہا ہے کہ جو کچھ آپ روایت کرتے تھے وہ سب آپ کے پاس مکتوب صورت میں محفوظ تھا اور یہ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے اس کا مطلب یہ ہُوا کہ پانچ ہزار سے اُوپر احادیث حضرت ابوہریرہ کے پاس لکھی ہوئی موجود تھیں پھر راوی کا یہ کہنا بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے مجھے حدیث کی بہت سی کتابیں دکھائیں معلوم ہُوا یہ تحریری ذخیرہ صرف چند اوراق پر مشتمل نہ تھا بلکہ کتابوں کی ایک کثیر تعداد تھی اس سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت ابوہریرہ کی تمام مرویات کتابی شکل میں محفوظ تھیں۔

اس واقعے میں کسی شک وشبہ کی بھی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ حافظ ابن حجر نے بھی اس واقعہ کو فتح الباری میں نقل کیا ہے اگرچہ اس کی سند مختلف ہے - اس کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کے مکتوب ہونے پر اس سے قوی تر ایک اور شاہد بھی موجود ہے -

سنن دارمی حدیث کی ایک مستند کتاب ہے اور اس کا درجہ صحاح ستہ کی اکثر کتابوں سے بلند ہے ملا علی قاری نے صحاح ستہ میں ابن ماجہ کے بجائے سنن دارمی کو شامل کرنے کی رائے دی ہے، اس کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کا ایک نسخہ ان کے شاگرد بشیر بن نہیک نے تیار کیا تھا نہ صرف تیار کیا تھا بلکہ پڑھ کر حضرت ابوہریرہؓ کو سنایا بھی تھا۔ بشیر بن نہیک ہی سے روایت ہے فرماتے ہیں :

كنتُ اكتبُ ما اسمعُ من ابي هريرةَ فلما اردتُ ان افارقهُ اتيتهُ بكتابه فقراتهُ عليه وقلتُ لهُ هذا ما سمعتهُ منك قال نعم۔

میں حضرت ابوہریرہؓ سے جو حدیثیں سنا کرتا تھا وہ لکھ لیا کرتا تھا میرا جب ارادہ ان سے الگ ہونے کا ہوا تو کتاب ان کے پاس لے کر آیا اور ان کے سامنے پڑھ گیا اور پھر میں نے ان سے کہا کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو آپ سے میں نے سنی ہیں فرمایا ہاں

اس روایت کے الفاظ بھی یہی بتلا رہے ہیں کہ حضرت بشیر بن نہیک نے جو کچھ حضرت ابوہریرہؓ سے سنا تھا سب کچھ قلم بند کر لیا تھا اور پھر لاکر حضرت ابوہریرہؓ سے گویا اس کی تصدیق بھی کرا لی تھی ظاہر ہے حضرت بشیر کا یہ مجموعہ اس مجموعے کے علاوہ تھا جو حضرت ابوہریرہ نے از خود اپنے لیے تیار کیا ہوا تھا اور جس کا ذکر ابھی حافظ ابن عبدالبر کے حوالے سے گزرا ہے۔ اس طرح حضرت ابوہریرہ کی مرویات کے یہ دو نسخے علیحدہ علیحدہ تیار ہو گئے تھے بلکہ ان دو کے علاوہ ایک اور نسخے کا ثبوت بھی حدیث کی کتابوں سے ملتا ہے جس کو حضرت ابوہریرہؓ کے ایک اور شاگرد حضرت ہمام ابن منبہ نے تیار کیا تھا اور انہی کے نام پر صحیفۂ ہمام کے نام سے مشہور ہے امام احمد بن حنبل نے اس کتاب کا ایک بہت بڑا حصہ اپنی مسند میں شامل کیا ہے امام مسلم نے بھی اپنی صحیح میں اس کو نقل کیا ہے۔

ان شواہد کی روشنی میں اتنی بات بہرحال یقینی ہو گئی ہے کہ حضرت ابوہریرہ کی تمام مرویات کتابی شکل میں محفوظ تھیں گویا یہ شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ پانچ ہزار تین سو چوہتّر (۵۳۷۴) احادیث قرن اوّل ہی میں قلم بند ہو چکی تھیں۔

عہدِ نبوت اور قرن صحابہ میں حدیث کے جن مکتوب ذخیروں کی موجودگی کا ہم جائزہ لینے

لگے ہیں ابھی اس کی صرف ابتدا ہی ہوئی ہے۔ ابھی صرف ایک صحابی کی مرویات کا تذکرہ ہوا ہے مگر اسی پہلے قدم ہی پر ہم یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا اکثر وغالب حصہ قرن اول ہی میں قید تحریر میں آچکا تھا اس لیے کہ اول درجے کی صحیح احادیث کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور پانچ ہزار تین سو چوہتر کا عدد دس ہزار کے عدد کا یقیناً اکثر وغالب حصہ ہے۔

احادیث کی صحیح تعداد

صحیح حدیثوں کی تعداد کے بارے میں دس ہزار کا عدد سن کر شاید بعض ناواقف حضرات کو حیرانی ہو رہی ہو مگر یہ امر واقعہ ہے کہ اول درجے کی صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہونچ پاتی اور یہ بات یونہی بے سند نہیں کہی جا رہی بلکہ ہمارے پاس اس کے لیے سند موجود ہے۔ تمام کتابوں سے چھان بین کر کے امام حاکم نے جو تعداد صحیح حدیثوں کی بیان کی ہے وہ یہی ہے ان کے الفاظ ہیں :

الاحادیث اللتی فی الدّرجۃِ الاولیٰ لا تبلغُ عشرۃَ آلاف (بحوالہ توجیہ النظر صد ۹۳)۔	اعلیٰ درجے کی حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک نہیں پہونچ پاتی ۔

اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ صحیح بخاری میں صحیح سند کے ساتھ جو حدیثیں مروی ہیں ان کی تعداد بمشکل دو ہزار چھ سو کے قریب ہے اور صحیح مسلم کی حدیثوں کی کُل تعداد چار ہزار ہے جبکہ اس میں اکثریت ان روایتوں کی ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں مشترک ہیں۔ تبلایئے حدیث کی یہی دو بڑی کتابیں ہیں ان دونوں کی صحیح حدیثوں کی مجموعی تعداد تین چار ہزار سے آگے نہیں بڑھتی۔ مؤطا امام مالک کو بھی شمار کر لیجئے جسے ام الصحیحین کہا جاتا ہے اس میں صحیح سند کے ساتھ مروی احادیث صرف چھ سو ہیں۔ غرض اعلیٰ درجے کی صحیح حدیثوں کی تعداد کسی طرح بھی دس ہزار کے عدد تک پوری نہیں پہونچتی دس ہزار سے کم ہی رہتی ہے اور یہ دس ہزار سے کم کی تعیین بھی امام حاکم کے قول کے مطابق ہے جن کی تنقید کا معیار سب جانتے ہیں کہ اتنا سخت نہیں ہے۔

حقیقت حال سے ناواقف بعض حضرات کی سمجھ میں ممکن ہے یہ بات پوری طرح نہ آ پا رہی ہو اور ان کے ذہنوں میں وہ لاکھوں کے ہندسے گھوم رہے ہوں جو مختلف محدثین کے تذکروں

ہیں وہ سنتے چلے آئے ہیں کہ فلاں فلاں محدث کو اتنے اتنے لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے اصل صورتِ حال کی وضاحت ہو جائے ؛

دو بُنیادی باتیں

احادیث کی صحیح تعداد کا تعین کرنے سے پہلے دو بنیادی باتوں کا سمجھ لینا انتہائی ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ محدثین کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ احادیث کو متون کے اعتبار سے نہیں بلکہ ان کے طریقوں اور ان کی سندوں کے اعتبار سے گنتے تھے یعنی اگر کوئی حدیث دس طریقوں سے روایت ہوتی ہے تو محدثین کے نزدیک وہ ایک حدیث نہیں رہی بلکہ دس حدیثیں بن گئیں۔ دوم یہ کہ حدیث کا اطلاق ابتدا میں اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، آپ کے افعال اور آپ کی تقریرات پر ہی کیا جاتا تھا مگر بعد میں صحابہ کے اقوال و فتاویٰ اور ان کے مختلف فیصلوں کو بھی حدیث ہی کے ضمن میں داخل سمجھا جانے لگا بلکہ اس کے بھی بعد کے زمانے میں تو تابعین اور تبع تابعین تک کے اقوال پر بھی حدیث کے لفظ کا اطلاق کیا جانے لگا ؛

ان دونوں بنیادی باتوں کا اگر لحاظ رکھا جائے تو حفاظ حدیث کی طرف منسوب احادیث کے سلسلے میں بیان کیے جانے والے لاکھوں کے ہندسوں کی اصل حقیقت سمجھنے میں کوئی دشواری نہ رہے گی۔

توابع و شواہد

دراصل صحابہ سے روایت کرنے والے محدثین کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایک ہی روایت کو جن جن صحابیوں سے سننا ممکن ہو سب سے سنا جائے اس طرح ایک روایت اگر کسی نے مثلاً حضرت ابوہریرہؓ سے بھی سُنی ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بھی اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے بھی تو اپنی عبارت اور اپنے متن کے اعتبار سے تو وہ اگرچہ ایک ہی حدیث ہے مگر محدث جب اسے ان تینوں سے روایت کرے گا تو یہی کہا جائیگا کہ اسے تین حدیثیں یاد ہیں۔ گویا ایک حدیث کی تین حدیثیں بن گئیں شروع شروع میں تو یہ سلسلہ مختصر ہی رہا مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا راویوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی ہر راوی کی یہ کوشش رہی کہ جتنے شیوخ و اساتذہ سے کوئی حدیث حاصل کی جا سکے اس میں کمی نہ کی جائے چنانچہ ایک ایک حدیث کے راویوں کی تعداد سینکڑوں تک پہونچ گئی۔ دراصل کسی حدیث کے راویوں کی

تعداد جس قدر بڑھتی جاتی تھی اسی قدر اس حدیث کی قطعیت اور اس کے یقینی ہونے میں قوت بڑھتی چلی جاتی تھی اس لیے ہر محدث اپنی روایتوں میں قوت پیدا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ راویوں کی تلاش کرتا تھا۔ اس طریق عمل کا نام محدثین کی اصطلاح میں متابعت ہے اور جو حدیثیں اس طرح جمع کی جاتی ہیں انہیں توابع و شواہد کہا جاتا ہے۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ توابع و شواہد جمع کرنے کا شوق شدید ہوتا گیا اور راویوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اندازہ کیجئے ایک مشہور حدیث ہے۔ انّما الاعمالُ بالنّیات یہ کہنے کو تو ایک حدیث ہے مگر اس کے راویوں کی تعداد سات سو سے بھی متجاوز ہے اور اس طرح محدثین کی نظر میں یہ ایک حدیث نہیں بلکہ سات سو حدیثیں ہیں اور یہ کسی ایک حدیث کی بات نہیں بلکہ ذخیرۂ حدیث کے بیشتر حصّے کا بھی حال ہے۔ یہ جو ہم امام احمد بن حنبل اور امام ابو زرعہ جیسے حفاظ حدیث کے بارے میں سنتے ہیں کہ انہیں سات لاکھ سے اُوپر احادیث یاد تھیں یا امام بخاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں دو لاکھ کے قریب غیر صحیح اور ایک لاکھ کے قریب صحیح احادیث زبانی حفظ تھیں یا اسی طرح امام مسلم اپنی صحیح کے بارے میں خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے کانوں سے سُنی ہوئی تین لاکھ احادیث سے یہ مجموعہ منتخب کیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے بڑے بڑے اعداد جو مختلف محدثین کی طرف منسوب ہیں ان کا راز یہی ہے کہ یہ سب اعداد حدیثوں کے متن اور عبارت کے اعتبار سے نہیں بلکہ سند اور طریقے کے اعتبار سے ہیں راویوں کے ناموں میں جہاں کہیں لفظ دو لفظ کا اضافہ یا تبدیلی ہوئی حدیث کے عدد میں اضافہ ہو گیا اس طرح سے ایک حدیث چند لفظوں کے فرق سے سات سات سو کے عدد تک شمار ہوتی چلی گئی۔ احادیث کی تعداد کے سلسلے میں جو لاکھوں کے ہندسے نظر آتے ہیں وہ زیادہ تر اسی بنا پر ہیں۔ یا پھر حدیثوں کے عددی اضافہ کی بنیاد وہ توسیع اور کشادگی ہے جو بعد کے دور میں حدیث کے لفظ کے اطلاق کے بارے میں اختیار کر لی گئی اور جس کا ذکر دُوسرے درجے کے عامل کے طور پر ابھی اُوپر ہوا ہے کہ صحابۂ کرام کے اقوال و فتاویٰ نیز "تابعین و تبع تابعین" تک کے ملفوظات کو اصطلاحاً حدیث میں شامل سمجھا جانے لگا۔ انہی دو بنیادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے صاحب توجیہ النظر لکھتے ہیں :

إن كثيراً من المتقدمين كانوا يطلقون اسم الحديث على ما يشمل آثار الصحابة والتابعين و تابعيهم وفتاواهم و يعدون الحديث المروي بإسنادين حديثين۔	اکثر متقدمین حدیث کے لفظ کا اطلاق ایسے عام مفہوم پر کرتے تھے جس میں صحابہؓ تابعین اور تبع تابعین کے آثار و فتاوی سب ہی داخل ہیں نیز ایک ہی حدیث جو دو سندوں سے مروی ہوتی اسے وہ دو حدیث قرار دیتے

احادیث کی تعداد میں لاکھوں کے ہندسوں کی بنیاد انہی دو وجوہ کی بنا پر ہے۔ ورنہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی معیاری حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہونچتی۔ صحیح کے ساتھ حسن ضعیف ہر قسم کی تمام حدیثیں جو اس وقت صحاح ستہ مسند احمد اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں ان سب کو بھی اگر ملا لیا جائے تب بھی تمام حدیثوں کی تعداد پچاس ہزار تک بھی بمشکل پہونچتی ہے یہ بھی اس وقت جبکہ اس میں جعلی اور موضوع احادیث بھی شامل کر لی جائیں۔ علامہ ابن جوزی سے بڑھ کر کس کا بیان قابل اعتماد ہو سکتا ہے انہوں نے اپنی کتاب صید الخواطر میں فصل ۱۷۵ کے تحت احادیث کے اس عددی مغالطے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

انه لو جمع الصحيح والمحال والموضوع وكل منقول عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ما بلغ خمسين الفاً۔	صحیح حدیثوں کے ساتھ ان ساری بے بنیاد جھوٹی اور گھڑی ہوئی جعلی حدیثوں کو بھی جمع کر لیا جائے جو کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو وہ بھی پچاس ہزار تک نہیں پہونچتیں۔

ابن جوزی کے قول کو ممکن ہے ان کی تشدد پسندی اور تنقید کے معیار میں سختی اختیار کرنے کی بنا پر درخور اعتنا نہ سمجھا جائے لیکن علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی سہولت پسندی اور تنقید کے معیار میں نرمی تو سب کو معلوم ہے انہوں نے اپنی کتاب جمع الجوامع میں تمام حدیثوں کو جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کتاب میں احادیث کی تعداد پچاس ہزار سے کہیں کم ہے۔ بلکہ دور کیوں جائیے کنز العمال نامی کتاب سے کون واقف نہیں یہ جمع الجوامع ہی کی فقہی ترتیب

ہے اس کے مؤلف ہندوستان کے مشہور محدث علی متقی ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں نہ صرف جمع الجوامع کی کل حدیثیں موجود ہیں بلکہ وہ بھی ہیں جو جمع الجوامع میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں۔ اب سنئے کنز العمال میں جمع شدہ احادیث کی کل تعداد چالیس ہزار نو سو اسٹھ ہے اور یہ بھی اس وقت ہے جبکہ اس کتاب میں ابھی مکررات موجود ہیں غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ صحیح اعلیٰ معیاری حدیثوں کی تعداد اگر دس ہزار تک بھی نہیں پہونچتی تو ضعیف وحسن وصحاح سب کو ملانے کے بعد تیس بتیس ہزار سے آگے ان کی تعداد کا بڑھنا مشکل ہے البتہ موضوعات کو ملا لینے کے بعد شاید پچاس ہزار تک یہ تعداد پہونچ جائے۔

بہرحال چونکہ اعلیٰ درجے کی صحیح احادیث دس ہزار سے کم ہی ہیں اس لیے حضرت ابوہریرہؓ کی پانچ ہزار تین سو چوہتر مرویات کا مکتوب صورت میں محفوظ ہوجانا ثابت ہوجانے کے بعد ہمارا یہ دعویٰ پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا کہ احادیث کا اکثر وغالب حصہ قرن اوّل ہی میں قلم بند ہوچکا تھا مگر ابھی نہیں بہت کچھ کہنا ہے ابھی تو مکثرین صحابہ میں سے صرف ایک صحابی کی مرویات کا ذکر ہوا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کا کتابی مجموعہ

مکثرین صحابہ میں سے دوسرے نمبر پر حضرت عبداللہ بن عباس کا نام آتا ہے ان سے روایت ہونے والی احادیث کی تعداد دو ہزار چھ سو ساٹھ (۲۶۶۰) ہے۔ متعدد شواہد ایسے موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی مرویات کا مجموعہ ان کی زندگی ہی میں قلم بند ہوچکا تھا۔

طبقات ابن سعد کی یہ روایت بہت مشہور ہے حدیث کا کوئی طالب علم بھی اس سے بے خبر نہ ہوگا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس کی جب وفات ہوئی تو جو علم انہوں نے چھوڑا وہ اتنی کتابوں کی صورت میں تھا کہ ایک اونٹ کا بوجھ بنتا تھا۔[1] حافظ ابن حجر عسقلانی نے

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۲۱۶

بھی تہذیب التہذیب میں موسیٰ بن عقبہ کا بیان نقل کیا ہے وہ فرماتے تھے :

وضع عندنا کُریبٌ (مولیٰ عبد اللہ بن العباس) حِمْلَ بعیرٍ اَوْ عدلَ بعیرٍ من کتبِ ابنِ عباسٍ (تہذیب جلد ۵)	میرے پاس عبد اللہ ابن عباس کے غلام کریب نے ابن عباس کی کتابیں رکھوائی تھیں جو ایک یا نصف بار شتر تھیں ۔

علم کا یہ کتابی مجموعہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے سوا بھی کچھ ہو سکتا ہے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث قلم بند کرنے میں حضرت عبد اللہ بن عباس کا عالم یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو رافع کے پاس پہونچتے اور حیات نبوی سے متعلق ایک ایک دن کا حال تفصیل سے پوچھتے جاتے اور لکھتے جاتے ۔ الکتانی کی وہ روایت اس پر شاہد ہے جو اُنھوں نے رویانی کی مسند سے بسند متصل نقل کی ہے اس کے الفاظ ہیں :

کَانَ ابنُ عباسٍ یاتی اَبا رافع فیقولُ ماصنع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یومَ کذا معَ ابن عباسٍ من یکتب ما یقول (الکتانی)	ابن عباس ابو رافع کے پاس آتے اور کہتے کہ فلاں دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا اور ابن عباس کے ساتھ ایک شخص ہوتا جو ان باتوں کو لکھتا جاتا ۔

طبقات ابن سعد کی ایک روایت کے مطابق حضرت عبد اللہ ابن عباس نے احادیث نبوی بہت سی تختیوں پر بڑے اہتمام کے ساتھ لکھی ہوئی تھیں جب آپ کسی محفل میں جاتے تو یہ تختیاں اپنے ساتھ لے کر جاتے [1] حضرت ابو رافع کی بیوی حضرت سلمٰی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تختیوں میں وہی علم تھا جو حضرت عبد اللہ ابن عباس نے حضرت ابو رافع سے حاصل کیا تھا ۔ روایت ہے :

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۲

رأیتُ ابن عباسٍ معہٗ الواحٌ یکتبُ علیھا عن ابی رافعٍ شیئًا من فعلِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(الکتانی بحوالہ طبقات ابن سعد)

میں نے ابن عباس کو دیکھا کہ ان کے پاس تختیاں ہیں جن پر وہ ابورافع کی بیان کی ہوئی ان روایتوں کو لکھا کرتے تھے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کے متعلق بیان کیا کرتے تھے۔

یہ تمام شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے اپنی تمام مرویات اپنے طور پر لکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھیں۔ اب کچھ ایسے شواہد بھی ملاحظہ کرلیجئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی مرویات کے کچھ نسخے آپ کے شاگردوں اور دوسرے لوگوں نے بھی تیار کیے ہوئے تھے۔

سنن دارمی میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کے ممتاز ترین شاگرد سعید بن جبیرؒ نے اپنے استاد کی مرویات کے متعدد صحیفے تیار کیے ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس باقاعدہ ان کو املا کراتے جاتے اور وہ لکھتے جاتے۔ انہماک کا عالم یہ ہوتا کہ لکھتے لکھتے اگر کاغذ ختم ہوجاتا تو اپنے کپڑوں پر اور اپنے جوتوں پر ہی لکھنا شروع کردیتے۔ بعض اوقات کچھ نہ ملتا تو اپنی ہتھیلی پر ہی لکھ لیتے اور پھر اپنے گھر جاکر اپنے صحیفوں میں درج کرلیتے۔ حضرت سعید بن جبیر کے اس انہماک کو دیکھ کر اور اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس کے علم کے یہ سب سے بڑے راوی ہیں یہ یقین کرلینے میں کوئی امر مانع نہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عباس کی شاید ہی کوئی حدیث ایسی ہو جو ان کے ہاتھوں تحریر میں آنے سے رہ گئی ہو۔ علم ابن عباس پر مشتمل یہ صحیفے ڈاکٹر صبحی صالح کے بیان کے مطابق مدت مدید تک متداول رہے اور حضرت عبداللہ ابن عباس کے بیٹے حضرت علی ان صحیفوں سے استفادہ کرتے ہوئے دیکھے گئے[1]

---

[1] علوم الحدیث ومصطلحہ

حضرت عبداللہ ابن عباس کی مرویات کے مکتوب ہونے پر ایک اور شہادت آپ کے مشہور آزاد کردہ غلام حضرت عکرمہ کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں:

أنَّ نفراً قدموا علی ابنِ عباسٍ من اھل الطّائفِ بکتبٍ من کتبہٖ فجعل یقرأ علیھم (کتاب العلل)	حضرت ابن عباس کے پاس طائف کے کچھ لوگ ان کی کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے اور ان کے سامنے پڑھنے لگے۔

حضرت عکرمہ کی اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کے خاص خاص شاگردوں کے علاوہ کچھ دوسرے اصحاب نے بھی آپ سے روایت کردہ احادیث کے مجموعے تیار کیے ہوئے تھے اور یہ مجموعے ایک دو نہیں بلکہ متعدد تھے کتُب کا لفظ یعنی جمع کا صیغہ ہی بتلاتا ہے۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مختلف مجموعے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی زندگی ہی میں تیار ہو چکے تھے اور آپ سے ان کی تصدیق بھی کرائی جا چکی تھی۔

حضرت عائشہؓ کی مرویات کا مکتوب ذخیرہ

مکثرین صحابہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تیسرے نمبر پر ہیں۔ محدثین نے ان کی روایت کردہ حدیثوں کی تعداد دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) بتائی ہے۔ عورتوں میں سب سے زیادہ احادیث حضرت عائشہ صدیقہؓ ہی سے مروی ہیں۔ اگرچہ حضرت عائشہ صدیقہ کے اپنے متعلق تو یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے خود اپنی مرویات کا کوئی مجموعہ تیار کیا تھا یا نہیں مگر یہ ضرور ثابت ہے کہ آپ کے براہِ راست شاگرد اور حقیقی بہن کے لڑکے حضرت عروہ بن زبیر نے یقیناً اپنے علم کو ایک کتاب میں محفوظ کیا تھا جس میں ظاہر ہے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی مرویات ہی ہوں گی کیونکہ حضرت عروہ ابن زبیر کا شمار ان لوگوں میں ہے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایتوں کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ ان کا تو سارا سرمایہ ہی اپنی خالہ سے حاصل کیے ہوئے علم میں منحصر تھا۔ حضرت عروہ کے اس مکتوب مجموعے کا ثبوت ان کے اس واقعہ سے ملتا ہے جو حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں واقعۂ حرّہ کے سلسلے میں نقل کیا ہے کہ جب مدینہ

لوٹا اور برباد کیا گیا تو غلط فہمی کی بنا پر انہوں نے اپنے اس مجموعے کو قصداً ضائع کر دیا مگر بعد میں اپنی اس جلد بازی پر تاعمر پچھتاتے رہے۔ اپنے اس مکتوب مجموعے کے ضائع ہو جانے کا حضرت عروہ کو اس قدر افسوس تھا کہ اکثر فرمایا کرتے:

لَوَدِدتُّ اَنِّی کُنتُ فَدَیتُهَا بِاَهلِی وَمَالِی	اچھا ہوتا کہ میں اپنے اہل و عیال اور اپنے مال کو اس کتاب پر قربان کر دیتا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کے امین جس طرح مردوں میں حضرت عروہ بن زبیر تھے اسی طرح عورتوں میں حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن تھیں۔ حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن کے علم کے مکتوب ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے ان کے علم کو ان کے بھانجے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس مشہور فرمان کی بنیاد پر قلم بند کر لیا تھا جس کا ذکر امام بخاری نے بھی کیا ہے۔ اس طرح حضرت عائشہ کی مرویات ایک مرتبہ مکتوب ہونے کے بعد اگر حضرت عروہ کے ہاتھوں ضائع ہو گئی تھیں تو آپ کی خاتون شاگرد حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن کے واسطے سے دوبارہ تحریری صورت میں جمع ہو گئیں۔ حضرت عمرہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی کی گود میں پرورش پائی تھی۔ مشہور محدث شیخ ابن مدینی کا قول ہے کہ عمرہ حضرت عائشہ کی مستند حدیثوں کی جاننے والی تھیں[1]

حضرت عائشہ صدیقہ رض کے تیسرے مشہور شاگرد اور آپ کی مرویات کے امین آپ کے بھتیجے حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر ہیں ان کے علم کو بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فرمان پر ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے ہی قلم بند کیا تھا۔ حضرت عمرہ اور حضرت قاسم کے علم کو جمع کرنے کا حکم دیتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے لکھا تھا:

اَن یَکتُبَ لَهُ مِنَ العِلمِ مِن عِندِ عَمرَةَ بِنتِ عَبدِ الرَّحمٰنِ وَالقَاسِمِ بنِ مُحَمَّدٍ (بخاری)	عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد کے علم (حدیثوں) کو وہ ان کے لیے لکھ کر تیار کریں۔

---

[1] تہذیب

حضرت قاسم کے علم کا زیادہ تر مدار حضرت عائشہ ہی کی مرویات پر تھا کیونکہ ان کے والد محمد بن ابی بکر ان کے بچپن کے زمانے ہی میں مشہور فتنے میں شہید ہو چکے تھے ان کے بعد ان کی تمام تر کفالت حضرت عائشہ نے اپنے ذمے لی تھی اور اپنے اس یتیم بھتیجے کی بڑی شفقت سے تعلیم و تربیت کی تھی۔ بہر حال حضرت قاسم کی راہ سے بھی حضرت عائشہ کی مرویات مکتوب ہو کر محفوظ ہو گئیں ؁

حضرت عبداللہ بن عمر کی مرویات کے تحریری نسخے

حضرت عائشہ رضؓ کے بعد حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا نمبر آتا ہے ان کی روایات کی تعداد ایک ہزار چھ سو تیس (۱۶۳۰) ہے ام المومنین۔ حضرت حفصہؓ کے بھائی ہونے کی حیثیت سے آپ کو چونکہ حرم نبوی میں آمد و رفت کی سہولت حاصل تھی نیز آپ اسلام بھی بہت پہلے لا چکے تھے اس لیے آپ کو احادیثِ نبوی سے استفادے کا خوب خوب موقعہ ملا۔ السنۃ قبل التدوین کے مصنف محمد عجاج الخطیب نے الجامع لاخلاق الراوی و آداب السامعؒ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس اپنی روایات کا مکتوب ذخیرہ موجود تھا۔ لکھا ہے

یُروٰی اَنَّ عبدَ اللهِ بن عمرَ کانَ اذا خرجَ اِلی السوقِ نظرَ فی کتبِہٖ وقد اَکَّدَ الراوی اَنَّ کتبَہٗ ھذہٖ کانت فی الحدیث۔	روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر جب کبھی بازار نکلتے تو اپنی کتابوں کو دیکھ لیتے راوی تاکیداً کہتے ہیں کہ ان کی کتابیں احادیث پر مشتمل تھیں۔

کُتُب کا لفظ اس روایت میں بھی قابلِ غور ہے گویا ایک دو کتابیں نہیں بلکہ متعدد کتابیں تھیں جو حضرت ابن عمر نے اپنی مرویات کی تیار کی ہوئی تھیں راوی نے اس بات کی بطور خاص صراحت کی ہے کہ یہ کتابیں احادیث نبوی پر مشتمل تھیں حضرت ابن عمر کے اس ذاتی مکتوب ذخیرے کے علاوہ بھی آپ کی مرویات آپ کے براہِ راست شاگرد حضرت نافع کے واسطے سے تحریری شکل میں محفوظ ہو گئی تھیں۔ اس کے ثبوت کے لیے شہادت کے طور پر سنن دارمی کی وہ روایت پیش کی جا سکتی ہے جس میں سلمان بن موسیٰ کے حوالہ سے یہ کہا گیا ہے کہ

اَنَّہٗ رَاٰی نافعًا مولی ابنِ عمر علٰی علمہٖ و یکتبُ بین یدیہِ۔	انہوں نے حضرت ابن عمر کے آزاد کردہ غلام حضرت نافع کو دیکھا کہ لوگ ان کے سامنے بیٹھ کر لکھ رہے ہیں۔

طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ حضرت نافع حضرت عبداللہ ابن عمر کے آزاد کردہ غلام اور چہیتے شاگرد تھے اس قدر چہیتے کہ حضرت ابن عمر کبھی کبھی فرمایا کرتے:

لقد منّ اللہ علینا بنافع (تہذیب)	اللہ نے نافع کی صورت میں ہم پر احسان کیا ہے

یہ تیس برس تک مسلسل حضرت ابن عمر کی خدمت میں رہے اس طویل عرصے میں حضرت عبداللہ ابن عمر کے علم سے کیا کچھ مستفیض نہ ہوئے ہوں گے۔ ان کے علم کا مکتوب ہو جانا یقیناً حضرت ابن عمر کے علم کا مکتوب ہو جانا ہے۔

حضرت جابر کے صحیفے

مکثرین صحابہ میں سے اب صرف ایک دو ہی کا ذکر باقی رہ گیا ہے انہی میں حضرت جابر بن عبداللہ ہیں ان کی مرویات کی کُل تعداد ایک ہزار پانچ سو چالیس (۱۵۴۰) ہے۔ اب ان کی مرویات کے قلم بند ہونے کا حال سنئے۔ جہاں تک ان کے اپنے ذاتی مجموعے کا تعلق ہے اتنی بات یقینی ہے کہ انہوں نے بھی ایک صحیفہ رقم کیا ہوا تھا۔ اس صحیفے کی ضخامت معلوم ہوتا ہے سورۂ بقرہ کے برابر یا اس سے کچھ زیادہ ہی تھی کیونکہ مشہور تابعی قتادہ بن دعامۃ السدوسی جنہوں نے اس صحیفہ کو حفظ کیا ہوا تھا کہا کرتے تھے:

لانا بصحیفۃِ جابرٍ احفظ منّی من سورۃ البقرۃ (تاریخ الکبیر۔ امام بخاری)۔	جابر کا صحیفہ تو مجھے سورۂ بقرہ سے بھی زیادہ ازبر ہے۔

حضرت قتادہ ابن دعامہ کے اس قول سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ یہ صحیفہ کافی ضخیم تھا وہاں یہ بھی پتہ لگا کہ یہ صحیفہ لوگوں میں عام طور پر مشہور بھی تھا حضرت قتادہ کے بات کرنے کا انداز یہی بتلا رہا ہے اس صحیفے کی موجودگی کا ثبوت صحیح مسلم کی اس روایت سے بھی ملتا ہے جس میں ذکر ہے کہ حضرت جابر کا صحیفہ حج کے مناسک پر مشتمل تھا۔

حضرت جابرؓ کے اس ذاتی مجموعے کے علاوہ ایسے شواہد بھی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت جابرؓ کے شاگردوں نے بھی اپنے اُستاد کی مرویات کے مجموعے تیار کیے تھے۔ چنانچہ ان کے مشہور شاگرد سلمان بن قیس الیشکری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے حضرت جابرؓ کی روایتوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا اور شعبی و سفیان جیسے بڑے بڑے محدثین نے اس مجموعے کو سلمان بن قیس کی زبان سے لفظ بہ لفظ سنا بھی تھا۔ صاحب تقیید العلم نے محدث ابوسفیان کا ایک قول نقل کیا ہے کہ سلمان حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھا نہیں کرتا تھا۔[۱]

اسی طرح حضرت جابرؓ کے دوسرے مشہور شاگرد وہب بن منبہ کے بارے میں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت جابرؓ جب مسجد نبوی کے حلقۂ درس میں اپنے شاگردوں کو حدیثیں لکھوایا کرتے تو وہب بن منبہ وہ حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ اس روایت سے حضرت جابرؓ کی مرویات حضرت وہب بن منبہ کے ہاتھوں مکتوب ہو جانے کا ثبوت تو ملتا ہی ہے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت جابرؓ اپنے تلامذہ کو باقاعدہ حدیثیں لکھوایا کرتے تھے اس طرح نہ جانے کتنے شاگردوں نے اپنے اُستاد کی مرویات کو لکھ کر محفوظ کر لیا ہوگا۔ مسجد نبوی میں حضرت جابرؓ کے حلقۂ درس کے بارے میں الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ میں بھی ہشام بن عروہ کی ایک روایت موجود ہے کہ

كان لجابر بن عبد الله حلقة في المسجد النبوي يؤخذ عنه العلم	مسجد نبوی میں حضرت جابر بن عبداللہ کا ایک حلقۂ درس تھا جس میں ان سے لوگ علم حاصل کرتے تھے۔

(اصابہ جلد ۱ صفحہ ۴۳)

اس حلقۂ درس میں شریک ہونے والوں میں مشہور تابعی محمد بن الحنفیہ، محمد بن علی ابوجعفر الباقر اور عبداللہ بن محمد بن عقیل جیسی ہستیوں کے نام آتے ہیں ان تینوں حضرات کے بارے میں ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ تینوں حضرت جابرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر احادیثِ نبویہ کے

---

[۱] تقیید العلم صفحہ ۱۰۸

بارے میں دریافت کرتے اور لکھا کرتے تھے۔[1]

حضرت انس کا تحریری مجموعہ

مکثرین صحابہ کی فہرست میں سے ابھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ذکر کرنا باقی ہے حضرت انس رضی بچپن ہی سے لکھنے کے فن سے خوب واقف تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص ہونے کی بنا پر دربار نبوی میں ہمہ وقت حاضری بھی نصیب تھی اس لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث لکھنے کا خوب خوب موقعہ ملا آپ نے نہ صرف احادیث لکھیں بلکہ لکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تصدیق کے لیے پیش بھی کیں۔ حاکم نے مستدرک میں سعید بن ہلال سے روایت کیا ہے کہ

كُنَّا إِذَا اكْثَرْنَا علىٰ انس بن مالك رضى الله تعالىٰ عنهُ فاخرج إلينا مَجَالًا عندهُ فقال هٰذهٖ سمعتها من النبيِّ صلّى الله عليه وسلّم فكتبتها وعرضتها عليه	ہم حضرت انس رض سے زیادہ پوچھ گچھ لگاتے تو وہ اپنے پاس سے ایک چونگہ نکالتے اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنیں اور ان کو لکھا اور لکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔

اسی بات کو خطیب بغدادی حضرت قتادہ رض سے ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں :

كان يُملى الحديث حتى إذا اكثر عليه الناس جاء بمجالٍ من كتب فالقاها ثم قال هذه احاديث سمعتها وكتبتها عن رسول الله وعرضتها عليه (تقييد العلم)	وہ حدیثیں لکھوایا کرتے اور جب لوگ زیادہ آ جاتے تو کتابوں کا ایک چونگہ نکال کر ڈال دیتے اور فرماتے یہ ہیں وہ احادیث جو میں نے رسول اللہ سے سنی ہیں انہیں لکھا ہے اور حضور کے سامنے پیش کیا ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۵

بہر حال ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ نے احادیث کو صرف قلم بند ہی نہیں کیا تھا اصلاح و تصحیح کی غرض سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش بھی کیا تھا اس لحاظ سے شاید یہ واحد صحابی ہیں کہ جن کا مجموعۂ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تصدیق و توثیق شدہ تھا۔

یہ تحریری مجموعہ تو وہ تھا جو حضرت انس نے خود تیار کیا تھا اس مجموعے کے علاوہ بھی بعض مجموعے آپ کے شاگردوں نے بھی تیار کیے تھے مثلاً دارمی میں سلم العلوی سے روایت ہے کہ

رایتُ ابان یکتبُ عندَ انسٍ فی سبوّرۃ۔	میں نے ابان کو دیکھا کہ وہ حضرت انس کے پاس بیٹھے کاپی میں حدیثیں لکھتے تھے۔

شاگردوں کے علاوہ گمان اغلب ہے کہ آپ کی اولاد نے بھی آپ کی مرویات کے مجموعے تیار کیے ہوں گے کیونکہ دارمی ہی میں ان کے بیٹوں کے بارے میں جن کی ایک بڑی تعداد تھی ایک روایت ہے کہ حضرت انسؓ اپنے بیٹوں سے اکثر فرمایا کرتے

یا بنیّ قیدّ وا ھذا العلمَ	میرے بچو اس علمِ حدیث کو قید تحریر میں لے آیا کرو۔

مکثرین صحابہ میں سے اب صرف حضرت ابوسعید خدریؓ کا ذکر باقی رہ گیا ہے ان کے بارے میں اگرچہ کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے معلوم ہو سکے کہ ان کی مرویات قلم بند ہوئی تھیں یا نہیں مگر متذکرہ بالا مکتوب ذخیروں کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوسعید خدری بھی اپنے ساتھیوں سے پیچھے نہ رہے ہوں گے۔ رہی منکرین حدیث کی پھیلائی ہوئی یہ غلط فہمی کہ انہیں احادیث لکھنے سے منع کر دیا گیا تھا اس لیے انہوں نے کوئی حدیث قلم بند کی ہی نہیں تو اس کی اصل حقیقت ممانعت کتابت پر گفتگو کرتے ہوئے واضح کی جا چکی ہے۔

مکثرین صحابہ کے جن تحریری ذخیروں کا اب تک ذکر ہوا ہے ان کی موجودگی میں یہ کہنا کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں کہ عہد نبوت و عہد صحابہ میں حدیث کا دارومدار صرف حفظ پر رہا تحریری شکل میں اس ذخیرے کو محفوظ نہیں کیا جا سکا یہ مکتوب ذخیرے اس بات کا

مثبتہ پولتا ثبوت ہیں کہ احادیث صحیحہ کا اکثر و غالب حصہ ہی نہیں تمام تر حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک اور اس کے متصل زمانے میں ہی قید تحریر میں آکر سینوں کے ساتھ ساتھ سفینوں میں بھی پوری طرح محفوظ ہو چکا تھا۔ اور ابھی تو یہ مکتوب ذخیرے بھی صرف مکثرین صحابہ کی مرویات تک محدود رہے ہیں ابھی تو ایسے کئی صحیفوں کا ذکر نہیں کرنا ہے جو مکثرین صحابہ کے علاوہ دیگر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہیں نیز ان صحف کے علاوہ ابھی ان خطوط، معاہدوں، امان ناموں اور جاگیر و قطائع کے فرامین کا ذکر بھی باقی ہے جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لکھوایا ہے اور جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔

کتابت حدیث کے سلسلے میں جو کچھ اب تک کہا گیا ہے وہ اگرچہ ان شکوک و شبہات کے ازالے کے لیے بہت کافی ہے جو حدیث کو عامۃ المسلمین کے اعتماد سے محروم کرنے کے لیے اس کے غیر محفوظ ہونے کے بارے میں منکرین حدیث کی طرف سے بڑے شد و مد سے اچھالے جاتے ہیں تاہم کتابت حدیث سے متعلق ہماری بات ابھی پوری نہیں ہوئی اس لیے اب ہم مزید چند ایسے قابلِ ذکر صحیفوں کی نشاندہی کرنے لگے ہیں جو مکثرین کے علاوہ دیگر صحابہ کی طرف منسوب ہیں۔ ان میں وہ صحیفے بھی ہیں جو بعض صحابہ نے اپنے طور پر رقم کیے اور وہ صحیفے بھی ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مخصوص حالات میں بعض لوگوں کو خود لکھوا کر عطا فرمائے۔

صحیفۃ الصادقۃ

ان صحف میں سے جس صحیفہ کا ذکر اولیت کا متقاضی ہے وہ صحیفہ صادقہ ہے جس کو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے تیار کیا تھا۔ آپ غالباً سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے احادیث کو کتابی شکل دی[1] جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے آپ کو دربارِ نبوی سے کتابتِ حدیث کی خصوصی اجازت ملی ہوئی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے اور جو کچھ زبانِ نبوی سے نکلتا لکھ لیتے[2] اس طرح آپ نے ایک مستقل کتاب تیار کر لی اور باقاعدہ اس کو الصادقہ کے نام سے موسوم

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ص ۳۶ [2] سنن دارمی، مسند احمد، ابوداؤد

کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب تدوین حدیث میں حوالہ دیئے بغیر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ نام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز فرمایا تھا اگرچہ تلاش بسیار کے باوجود ایسی کوئی روایت نہیں مل سکی تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ خود اس کتاب کو اسی نام سے یاد کرتے تھے - ابن اثیر جزری نے اسد الغابہ میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کا یہ قول نقل کیا ہے :

اَلصَّادِقَةُ صحیفةٌ کتبتها من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقال هی الصادقة فیها ما سمعتهٗ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولیس بینی و بینهٗ احدٌ۔	صادقہ ایک صحیفہ ہے جو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا ہے اس میں وہ کچھ ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اور میرے اور ان کے درمیان جس میں کوئی واسطہ نہیں۔

حدیث کی اکثر کتابوں میں اس صحیفہ کا تذکرہ ملتا ہے امام احمدؒ نے تو اپنی مسند میں اسے جوں کا توں نقل کر دیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں مشہور جلیل القدر تابعی حضرت مجاہد کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے یہ صحیفہ عبداللہ بن عمرو کے پاس دیکھا تھا [1] نیز حضرت عبداللہ بن عمرو کے پوتے عمرو بن شعیب کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ اس صحیفہ سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے [2] سنن دارمی میں بھی اس صحیفے کا تذکرہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے اپنے الفاظ میں اس طرح ہے :

ما یرغبنی فی الحیوٰة الّا خصلتانِ الصادقةُ والوَهطةُ فامّا الصادِقةُ فصحیفةٌ کتبتها عن رسول اللہ الخ۔ (سنن دارمی جلد ۱)۔	مجھے زندگی دو چیزوں کی وجہ سے عزیز ہے ایک صادقہ کی بنا پر اور ایک وھطہ (نامی زمین) کی بنا پر۔ صادقہ وہ صحیفہ ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (سن کر) لکھا .... الخ

---

[1] تہذیب ج ۸ ص ۴۳

[2] تہذیب ج ۸ ص ۵۵

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کو یہ صحیفہ بہت عزیز تھا اور کیوں نہ ہوتا زندگی بھر کی کمائی تھی۔ تذکرۃ الحفاظ میں ہے کہ جب بھی آپ سے کوئی شخص ایسا مسئلہ پوچھتا جس کا جواب زبانی آپ کو یاد نہ ہوتا تو آپ اس صحیفے سے دیکھ کر وہ مسئلہ بتاتے معلوم ہوتا ہے ہر قسم کے مسائل و احکام پر مشتمل احادیث اس صحیفے میں موجود تھیں۔ اس صحیفے میں احادیث کتنی تعداد میں تھیں اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگرچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی کل مرویات کی تعداد سات سو بتائی جاتی ہے لیکن اسد الغابہ میں ابن الاثیر جزری نے حضرت عبداللہ بن عمرو کے تذکرے میں نقل کیا ہے کہ صحیفہ صادقہ میں ایک ہزار احادیث تھیں مگر یہ قول بھی مرجوح نظر آتا ہے اس لیے کہ صحیح بخاری میں منقول حضرت ابوہریرہ کے اس اعتراف کو اگر مدِنظر رکھا جائے جس میں انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو کو اپنے سے زیادہ حدیثوں کا حامل مانا ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ صحیفۂ صادقہ میں ایک ہزار سے کہیں زیادہ احادیث مرقوم تھیں۔ حضرت ابوہریرہ فرمایا کرتے تھے:

ما من اَصحابِ رسولِ اللّٰهِ اَحدٌ اکثر حدیثاً عَنہُ منّی اِلّا ما کانَ من عبدِ اللّٰهِ بنِ عمرٍو فاِنّہٗ کان یکتُبُ و لا اکتُبُ۔	صحابہ میں مجھ سے زیادہ کثیر الروایات اور کوئی نہ تھا البتہ حضرت عبداللہ بن عمرو کا معاملہ جدا گانہ نوعیت کا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

حضرت ابوہریرہ کی مرویات جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ پانچ ہزار تین سو چوہتر ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس روایت کی روشنی میں حضرت عبداللہ بن عمرو کی مرویات پانچ ہزار تین سو چوہتر سے یقیناً زیادہ ہونی چاہئیں اور زیادہ بھی دو چار نہیں بلکہ خاصی تعداد میں ہونی چاہئیں اس لیے کہ عام محاورے میں اکثر کے لفظ سے دو چار عدد کی زیادتی کبھی مقصود نہیں ہوتی بلکہ اکثر کا لفظ معقول تعداد کی زیادتی کو چاہتا ہے گویا احادیث صحیحہ کی جو تعداد بتائی گئی ہے اس کے قریب قریب تعداد کے برابر احادیث تھیں جو حضرت عبداللہ بن عمرو روایت کرتے تھے اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات لکھ لیتے تھے اس لیے یہ خیال

کرنا غلط نہ ہوگا کہ صحیفۂ صادقہ میں دس ہزار کے قریب قریب احادیث مرقوم تھیں اس طرح احادیث کا اگر کوئی اور تحریری ذخیرہ نہ بھی ہوتا تب بھی صحیفۂ صادقہ اکیلا ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ عہدِ نبوت ہی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی اتنی بڑی مقدار خود آپؐ کے حکم سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے ہاتھوں قلم بند ہو چکی تھی۔

صحیفۂ حضرت علی بخاری مسلم اور صحاح کی دوسری کتابوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے ایک صحیفے کا ذکر پایا جاتا ہے جسے وہ اپنی تلوار کی نیام میں رکھا کرتے تھے۔ امام بخاری نے کتاب العلم میں حضرت ابوجحیفہ سے روایت کیا ہے انھوں نے فرمایا

قلت لِعلیؓ هل عندکم کتاب قال لا إلّا کتابُ اللہ أو فهمٌ أُعطیه رجلٌ مسلمٌ أو ما فی هذہ الصحیفة	مَیں نے حضرت علی سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس کوئی کتاب ہے فرمایا نہیں مگر کتاب اللہ یا وہ فہم جو ہر مسلمان کو عطا کیا گیا یا وہ کچھ جو اس صحیفے میں ہے۔

اسی طرح امام مسلم اپنی صحیح میں کتاب الحج کے تحت ایک روایت لائے ہیں جس کو ابراہیم التیمی نے اپنے والد سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ

خطبنا علیؓ فقال ما عندنا کتابٌ نقرؤهٗ إلا کتابُ اللہ وما فی هذہ الصحیفة	ہمیں حضرت علی نے خطبہ دیا تو فرمایا ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں ہے جس کو ہم پڑھتے ہیں سوائے اللہ کی کتاب کے اور اسکے جو اس صحیفے میں ہے۔

اس صحیفے کے مندرجات کے بارے میں مختلف روایات میں مختلف احکام پر مشتمل احادیث کا ذکر کیا گیا ہے بعض روایات میں غلاموں اور قیدیوں کے آزاد کرنے کے احکام کا ذکر ہے بعض میں جراحات و دیت کے احکام اور اونٹوں کی زکوٰۃ کا حوالہ ہے اور بعض نے حرم مدینہ سے متعلق احکام کو خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ اس صحیفے میں مسلمان، کافر اور معاہد کے قصاص سے متعلق احکام پر مشتمل احادیث تھیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس صحیفے میں شریعت کے متعدد اہم مسائل تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو لکھوا دیئے تھے۔ ان متفرق احکام و مسائل کا حوالہ یہ بھی بتلا رہا ہے کہ یہ صحیفہ کافی ضخیم تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ

کو یہ صحیفہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عطا فرمایا تھا چنانچہ ابن شہاب کہتے ہیں کہ میں نے منبر پر حضرت علی رضی کو یہ فرماتے سنا تھا کہ

واللہ ماعندنا کتاب نقرؤہ علیکم الا کتاب اللہ تعالیٰ وھذہ الصحیفۃ اعطانیھا رسول اللہ فیھا فرائض الصدقۃ۔ (مسند احمد)

واللہ ہمارے پاس پڑھنے کی کوئی کتاب نہیں ہے سوائے اللہ کی کتاب کے اور اس صحیفے کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عطا فرمایا اور اس میں احکام زکوٰۃ ہیں۔

مسند احمد میں ہی ابوطفیل سے بھی اسی قسم کا ایک قول منقول ہے کہ جب حضرت علی سے یہ دریافت کیا گیا کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص کیا عطا فرمایا تھا تو آپ نے اس صحیفہ کا حوالہ دیا اور پھر صحیفہ نکال کر بھی دکھایا[1]۔ اشتر کہتے ہیں کہ حضرت علی کے بارے میں یہ بات عام ہوگئی تھی کہ آپ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان ہے استفسار کیا گیا تو آپ ایک صحیفہ نکال کر لائے[2]

صحیفہ سعد بن عبادہ رضی

حضرت سعد بن عبادہ نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشتر ارشادات ایک صحیفہ میں قلم بند کیے تھے۔ دورِ جاہلیت میں جن لوگوں کو کتابت کے فن میں مہارت حاصل تھی ان میں ایک حضرت سعد بن عبادہ بھی تھے[3] انہوں نے اپنی اس مہارت سے یقیناً پورا پورا فائدہ اٹھایا ہوگا۔ ترمذی کی ایک روایت میں اس صحیفے کا ذکر ملتا ہے۔ کتاب الاحکام میں باب "ماجاء فی الیمین مع الشاھد" کے تحت حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعی کی قسم پر صرف ایک گواہ کے ساتھ فیصلہ دے دیا۔ اس روایت کے ایک راوی ربیعۃ اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھ کو حضرت سعید بن عبادہ کے ایک بیٹے نے بتلایا کہ یہ حدیث صحیفۂ سعد بن عبادہ میں موجود تھی۔ ربیعۃ کے الفاظ ہیں :

---

[1] مسند احمد حدیث ص۹۵ [2] مسند احمد حدیث ۹۵۹ [3] تہذیب التہذیب جلد ۳

واخبرنی ابن لسعد بن عبادة قال وجدنا فی کتاب سعد ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قضی بالیمین مع الشاہد	اور مجھے سعد کے ایک بیٹے نے خبر دی کہ ہم نے سعد بن عبادہ کی کتاب میں یہ پایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کر دیا۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ صحیفہ حضرت سعد بن عبادہ کے ایک بیٹے کے پاس بعد میں موجود رہا اور وہ اس صحیفہ سے احادیث روایت کیا کرتے تھے بلکہ مسند امام احمد کی ایک روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کئی پشت تک یہ صحیفہ حضرت سعد بن عبادہ کے خاندان میں محفوظ رہا۔

صحیفہ سمرۃ بن جندب

حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ نے بھی ایک صحیفے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جمع کی تھیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ صحیفہ خاصا ضخیم تھا کیونکہ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اس صحیفے کا ذکر کرتے ہوئے نسخۂ کبیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ حضرت سمرۃ کے بیٹے سلیمان بن سمرۃ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

روی عن ابیہ نسخۃً کبیرۃً	وہ اپنے والد سے ایک بڑا نسخہ روایت کیا کرتے تھے

بڑا نسخہ ظاہر ہے کسی ضخیم اور بڑی کتاب کو ہی کہا جا سکتا ہے غالباً یہ وہی صحیفہ ہے جو حضرت سمرۃ نے اپنے بیٹوں کو بصورت مکتوب روانہ فرمایا تھا امام ابن سیرین بھی اس مکتوب کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس میں علم کثیر تھا۔ ان کے الفاظ ہیں:

فی رسالۃ سمرۃ الی بنیہ فیہ علم کثیر (تہذیب)	بیٹوں کے نام حضرت سمرہ کے خط میں علم کثیر موجود ہے۔

امام ابن سیرین کے اس قول سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت سمرۃ کا متذکرہ صحیفہ خاصا ضخیم تھا۔ ظاہر ہے، چند احادیث کے مجموعے کو تو علم کثیر یا نسخۂ کبیرہ جیسے الفاظ سے

تعبیر نہیں کیا جایا کرتا ۔

صحیفۂ وائل بن حجر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مخصوص لوگوں کو مخصوص حالات میں کچھ چیزیں لکھوا کر عطا فرمائی تھیں جیسا کہ حضرت علی کے بارے میں ابھی ذکر ہوا کہ آپؐ نے انہیں مختلف احکام و مسائل پر مشتمل ایک صحیفہ عطا فرمایا تھا اسی طرح ایک صحیفہ آپؐ نے حضرت وائل بن حجر کو بھی جو حضر موت کے شاہزادوں میں سے تھے اس وقت عطا فرمایا تھا جب وہ مسلمان ہونے کے لیے مدینہ حاضر ہوئے تھے اور کچھ دن قیام فرما کر واپس جا رہے تھے اس صحیفے میں نماز، روزہ، شراب اور سود وغیرہ کے احکام تھے[۱]

صحیفۂ اہل یمن

اسی طرح کنز العمال میں ایک روایت ہے کہ عمرو بن حزم کو جب آپ نے حاکم یمن مقرر فرمایا تو ایک تحریر بھی لکھوا کر ان کے حوالہ کی مسند امام احمد بن حنبل اور مستدرک للحاکم میں بھی یہ روایت موجود ہے اس صحیفے میں فرائض، صدقات، دیات، طلاق، عتاق، صلوٰۃ اور مس مصحف وغیرہ کے احکام تھے دارمی میں اس صحیفے کا ذکر ان الفاظ میں ہے :

اَنَّ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کتب اِلی اھل الیمن اَن لا یَمَسَّ القراٰنَ اِلا طاھرٌ ولا طلاقَ قبلَ مِلاکٍ ولا عِتاقَ حتی یبتاعَ (مسند دارمی)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کو لکھ بھیجا کہ قرآن کریم صرف پاک آدمی چھو سکتا ہے نکاح سے پہلے طلاق نہیں اور غلام خریدنے سے پہلے اس کی آزادی نہیں ۔

کتاب الصدقۃ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں مختلف علاقوں کے حاکموں کو بھیجنے کے لیے کتاب الصدقہ

---

[۱] طبرانی صغیر

لکھوائی تھی مگر ابھی بھیجنے نہ پائے تھے کہ رحلت فرما گئے۔ آپؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے وہ کتاب عاملوں کے پاس بھجوائی۔ اس کتاب میں جانوروں کی زکوٰۃ کے متعلق مسائل تھے۔ ترمذی میں اس کتاب کا ذکر اس روایت میں موجود ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر سے منقول ہے اور جس کو امام ترمذی نے باب "ما جاء فی زکوٰۃ الابل" میں نقل کیا ہے۔ مسند امام احمد بن حنبل اور دارقطنی کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب اصل میں والی بحرین کے نام تھی لیکن دوسرے عاملین کو بھی روانہ کی گئی تھی۔

صحیفۂ ابوشاہ یمنی

حضرت ابوشاہ یمنی رضی اللہ عنہ کی درخواست پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ خطبہ لکھوا کر دیا تھا جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ اس خطبہ کا ہر فقرہ بجائے خود اسلام کا ایک اصول تھا یہ خطبہ اچھا خاصا طویل ہے۔ امام ترمذی ابوداؤد حافظ ابن حجرؒ خطیب بغدادی ابن صلاح اور ابن عبدالبر میں سے ہر ایک نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب حجۃ الوداع کے خطبہ سے فارغ ہوئے تو حضرت ابوشاہ یمنی نے درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھے لکھوا دیا جائے تو آپ نے ارشاد فرمایا اُكْتُبُوا لِأَبِي شَاهٍ (ابوشاہ کے لیے لکھ دو) چنانچہ یہ خطبہ ان کو لکھ کر دے دیا گیا۔ امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ پورا خطبہ شاید لکھ کر نہ دیا گیا ہو بلکہ اس کا کچھ حصہ ہو جس کی نقل کا حکم دیا گیا ہو تو اس شبہ کے ازالے کے لیے امام اوزاعی کی شہادت جو سیر کے امام ہیں بہت کافی ہے ان سے پوچھا گیا کہ کیا پورا خطبہ لکھوا کر دیا گیا تھا تو جواب میں فرمایا:

نعم هذه الخطبة التي سمعها من النبي صلى الله عليه وسلم۔ (عینی ص۵۱۲)	ہاں وہی خطبہ جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔

دیگر چھوٹی بڑی تحریریں

یہ تمام صحیفے جن کا اب تک ذکر ہوا ہے اگر جمع کیے جائیں تو ذرا اندازہ لگائیے کس قدر وافر تحریری ذخیرۂ احادیث

محض انہی صحیفوں سے تیار ہو جاتا ہے۔ اور اس میں بھی ذکر صرف ان صحیفوں تک محدود رہا ہے جو اپنی ضخامت کے اعتبار سے اور متفرق احکام و مسائل کو محیط ہونے کے لحاظ سے اہم اور نمایاں تھے ورنہ ان کے علاوہ بھی اور متعدد چھوٹی بڑی تحریروں کی موجودگی کے ثبوت موجود ہیں مثلاً حضرت عبداللہ بن حکیم صحابی کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نامہ مبارک تھا جس میں مردہ جانوروں کے متعلق احکام تھے[1] حضرت ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر کرائی ہوئی ایک ہدایت تھی جس میں شوہر کی دیت کا حکم تھا۔[2] حضرت معاذ بن جبل کو آپ صلعم کی طرف سے ایک تحریر یمن بھیجی گئی جس میں سبزیوں ترکاریوں پر زکوٰۃ نہ ہونے کا حکم تھا۔ نیز حضرت رافع بن خدیج کے پاس بھی ایک تحریر تھی جس میں یہ درج تھا کہ مدینہ بھی مثل مکہ کے حرم ہے[3] اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن ربیعہ بن مرثد اسلمی اور حضرت سعد بن ربیع انصاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ حدیثیں قلم بند کی تھیں[4]

خطوط و وثائق

اور اب ان سب پر آپ ان خطوط و وثائق کا اور اضافہ کر لیجیے جو مختلف اوقات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سلاطین و امراء اور سرداران قبائل کے نام لکھوائے[5] یا مختلف مواقع پر معاہدے اور میثاق کی صورت میں تیار کرائے۔ مثال کے طور پر وہ خطوط جو آپ صلعم نے قیصر روم، خسرو ایران، مقوقس شاہ مصر، نجاشی بادشاہ حبش، حارث غسانی رئیس حدود شام اور مختلف رؤسائے یمامہ کی جانب لکھوا کر روانہ فرمائے[6] ان میں سے ان خطوط کی تو نقلیں بھی محفوظ ہیں جو مقوقس اور نجاشی کے نام لکھوائے گئے تھے[7] حال ہی میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے الوثائق السیاسیۃ کے نام سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام خطوط شائع کر دیے ہیں۔ وثائق میں وہ تحریری احکام و فرامین ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل کو بھیجے تھے، مشہور صلح حدیبیہ کا

---

[1] معجم صغیر طبرانی [2] ابوداؤد [3] مسند احمد [4] تہذیب التہذیب و شرح بلوغ المرام
[5] بخاری و تذکرۃ الحفاظ [6] طبری و سیرت ابن ہشام [7] البدایہ والنہایہ

معاہدہ نامہ ہے جو سنہ ۶ھ میں حضرت علی کے ہاتھوں تحریر میں آیا اور اس سلسلے کی اہم کڑی وہ دستاویز ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف لانے کے بعد اہل مدینہ کے ساتھ معاہدے کی صورت میں لکھوائی اور جو میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے سیرت ابن ہشام میں اس میثاق کا متن لفظ بہ لفظ نقل کیا گیا ہے۔

حدیث کے مکتوب ذخیروں کے بارے میں جو تفصیلات اوپر گزری ہیں ذرا ان پر دوبارہ نظر ڈالیے، مکثرین صحابہ کی مرویات پر مشتمل طویل طویل تحریری مجموعے، دیگر مختلف صحابہ کی طرف منسوب ضخیم صحیفے، متفرق تحریری احکام، فرامین، معاہدات، وثائق، خطوط اور امان نامے وغیرہ ان سب کو یکجا کر کے دیکھئے کہ عہد نبوت و قرن صحابہ میں حدیث کا کیسا زبردست سرمایہ کتابی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس پر بھی اگر منکرین حدیث یہی رٹتے چلے جائیں کہ احادیث عہد نبوی و عہد صحابہ میں قید تحریر میں نہیں آسکیں تو ہر کوئی خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان کا یہ بے بنیاد دعویٰ کس حد تک کان دھرنے کے قابل ہے ؟



حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرف انکارِ حدیث کی نسبت

حدیث کا انکار کرنے والے اپنی اغراض کے بندے حفاظت حدیث کے سلسلے میں، سادہ لوح مسلمانوں کو جس جس طرح دھوکے دیتے ہیں گذشتہ اوراق میں اس کا پورا نقشہ سامنے آچکا ہے لیکن ان لوگوں کے ایک اور فریب کا پردہ چاک کرنا ابھی باقی ہے۔ ان لوگوں نے خوفِ خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے مذموم مقاصد کو پورا کرنے کی خاطر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہ پر اتہام طرازی اور بہتان تراشی کرتے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کی۔ ناواقف حضرات کو یہ معلوم کر کے شاید حیرت ہو کہ منکرین حدیث کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی انہی کی طرح حدیث کی حجیت کے قائل نہ تھے العیاذ باللہ۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ مختلف بے سروپا باتیں بناتے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور جو سادہ لوح ناواقف حال مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ناکام کوششوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہ باتیں اس قابل تو نہ تھیں کہ انہیں کسی سنجیدہ تحریر کا موضوع بنایا جاتا مگر اصل حقیقتِ حال کی وضاحت بھی ضروری ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ منکرین حدیث کے متذکرہ دعویٰ کا بھی مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

منکرین حدیث کے اس دعوے کا تعلق اگرچہ حجیت حدیث کے موضوع سے ہے جو اس وقت ہمارے زیر بحث نہیں ہے تاہم یہ دعویٰ جس بنیاد پر کیا جاتا ہے وہ چونکہ بلاواسطہ حفاظت حدیث سے ہی متعلق ہے اس لیے موجودہ مرحلے پر ہی ہمیں اس دعوے کا تجزیہ کرنا ہے۔

منکرین حدیث کا الزام

منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دونوں اصحاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث روایت کرنے سے لوگوں کو منع کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ احادیث کو محفوظ نہ رکھا جائے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی لکھی ہوئی احادیث کا مجموعہ نذر آتش کر دیا اسی طرح حضرت عمرؓ نے بھی اپنے زمانۂ خلافت میں بعض لوگوں کے لکھے ہوئے مجموعے منگوا کر ان کو جلا دیا۔ یہ روایت حدیث سے منع کرنا اور احادیث کی حفاظت کرنے کے بجائے ان کے مکتوب مجموعوں کو نذر آتش کرنا بقول منکرین حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دونوں اصحاب حدیث کو دین میں حجت خیال نہ کرتے تھے۔

کیسی ستم ظریفی ہے کہ وہ لوگ جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کا مجسم نمونہ تھا جن کی عبادات جن کے معاملات و اخلاق جن کے امور سیاست و معیشت اور جن کی معاشرت غرض جن کی زندگی کا ہر گوشہ سنتِ نبوی کے رنگ میں رنگا ہوا ہو ان حضرات کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو دین میں حجت نہ سمجھتے تھے ؛

حجیت حدیث اور حضرت ابوبکرؓ

کتنی حیرت کی بات ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے نفاذ کی راہ میں کبھی کسی دنیوی مصلحت اور مادی مجبوری کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا ان کے بارے میں یہ باور کرانے کی کوشش کی جائے کہ وہ احادیث نبوی کو واجب العمل خیال نہ کرتے تھے۔ یہ صریح بہتان ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی نظر میں سنتِ نبوی کی حجیت کس اہمیت کی حامل تھی اس کو ثابت کرنے کے لیے تو کسی طویل و عریض دلیلوں کے طومار کی بھی ضرورت نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جیش اسامہ اور مانعین زکوٰۃ کے سلسلے میں حضرت ابوبکر کا طرزِ عمل ہی اس بات کی شہادت کے لیے بہت کافی ہے۔ ذرا تصور تو کیجئے۔ جھوٹے مدعیان نبوت کے شیطانی فتنوں نے سر اٹھایا ہوا ہے ہر طرف سے ارتداد کی خبریں آرہی ہیں اور دشمنانِ اسلام مدینے پر ہر چہار جانب سے حملے کی تیاریوں میں مصروف ہیں ،

ایسے آڑے وقت میں صحابہ متردد ہیں کہ شام کی طرف جس لشکر کشی کا حکم حضرت اسامہ کی سرکردگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں دیا تھا اس کو روانہ کیا جائے یا نہیں مگر حضرت ابوبکر ہیں کہ انتہائی یقین و اعتماد کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ :-

"اگر مجھ کو اس بات کا بھی یقین ہو کہ اس لشکر کے روانہ کرنے کے بعد مجھے مدینے میں کوئی درندہ تنہا پا کر پھاڑ کھائے گا تب بھی میں اس لشکر کی روانگی کو ہرگز ملتوی نہ کروں گا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ فرمایا تھا" (طبری)

اسی طرح مانعین زکوٰۃ سے قتال کے موقعہ پر صدیق اکبر اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ

"خدا کی قسم کوئی قبیلہ اگر زکوٰۃ کا ایک جانور یا ایک دانہ بھی جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ادا کرتا تھا اب ادا نہ کرے گا تو میں اس سے ضرور قتال کروں گا۔" (طبری)

کیا عزم و استقامت سے بھرپور یہ الفاظ کسی ایسے شخص کی زبان سے نکل سکتے ہیں جو سنت نبوی کو واجب العمل نہ سمجھتا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے سرمو انحراف حضرت ابوبکر کے لیے ناقابل تصور تھا جیش اسامہؓ کی سرداری کے بارے میں جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ کوئی معمر قریشی اس منصب پر مقرر کیا جائے تب بھی جو جواب حضرت ابوبکر نے دیا اس کا بھی ایک ایک لفظ اس بات کا ثبوت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فرمان آپ کے لیے حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا آپ نے فرمایا "جس کا تقرر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس میں کوئی ردوبدل ابوبکر کیسے کر سکتا ہے"۔

پہلا خطبہ

منکرین حدیث حقائق کو مسخ کر کے اپنی مطلب برآری کی کوشش میں ہیں ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس خطبہ سے بے خبر ہوں جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلیفہ چنے جانے کے فوراً بعد دیا تھا اور جس میں واضح الفاظ میں اپنے اس عزم کا اعلان کیا تھا کہ

قرآن کے بعد سنتِ نبوی کا اتباع ہی میری منزلِ مقصود ہے۔ اس خطبے کے الفاظ ہیں:

یا ایہا الناس قد ولیت امرکم ولست بخیرکم ولکن نزل القرآن وسن النبی صلی اللہ علیہ وسلم السنن فعلمنا وعلمنا۔ ایہا الناس انما انا متبع ولست بمبتدع فان احسنت فاعینونی وان زغت فقومونی (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۹)	اے لوگو میں تمہارا والی بنا دیا گیا ہوں مگر میں تم سے بہتر نہیں ہوں لیکن خوب سمجھ لو ہم میں قرآن اترا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سنتیں اور طریقے سکھائے جو ہم نے جانے اور سیکھے اے لوگو میں ان دونوں کی پیروی کرنے والا ہوں کوئی نئی بات نکالنے والا نہیں ہوں اگر میں ٹھیک چلوں تو میرا اتباع کرنا اور اگر انحراف کروں تو مجھے بیدھا کر دو۔

خلافت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد حضرت ابوبکر کا پہلا خطبہ ہونے کی حیثیت سے اس کو جدید اصطلاح میں "پالیسی تقریر" کا نام دیا جا سکتا ہے گویا اس خطبہ میں حضرت ابوبکر نے کاروبار خلافت چلانے کے لیے اپنی آئندہ پالیسی کے خطوط متعین کر دئیے کہ قرآن اور سنت یہ دو چیزیں ہوں گی جن کا اتباع خلافت صدیقی کا رہنما اصول رہے گا۔ اپنی اس پالیسی کو اور زیادہ مؤکد بنانے کے لیے حضرت ابوبکر نے اپنی اطاعت کے مطالبے کو بھی انہی دونوں کی اتباع کے ساتھ مشروط کر دیا علامہ طبری نے اس خطبے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابوبکر کے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں:

اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فان عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعة لی علیکم (طبری: جلد ۲ صفحہ ۴۵۰)	تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو پھر تم پر میری کوئی اطاعت نہیں۔

عام دستور العمل واقعات اس پر شاہد ہیں کہ حضرت ابوبکر کے سامنے جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو آپ اس کے فیصلے کے لیے پہلے قرآن میں اسکی

اصل تلاش کرتے اس میں اگر کوئی اصل نہ ملتی تو سنتِ نبوی میں اس سے متعلق کوئی اثر یا نمونہ ڈھونڈھتے اگر وہاں بھی کچھ نہ ملتا تو پھر اپنا اجتہاد کام میں لاتے حضرت ابوبکر کا یہ عام دستور العمل تھا چنانچہ محقق ابن سیرین آپ کے اس دستور العمل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

أنّ ابابكرٍ إذا نزلت به قضيةٌ لم يجِدْ لها في كتابِ الله اصلاً ولا في السنّةِ اثرًا فقال اجتهدُ برأيي فإنْ يكن صوابًا فمنَ الله وإنْ يكن خطأً فمنّي وأستغفرُ الله

(طبقات ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۱۳۶)

حضرت ابوبکر کے سامنے جب کوئی ایسی صورت حال پیش ہوتی جس کے متعلق نہ اللہ کی کتاب میں کوئی اصل ملتی اور نہ سنتِ نبوی میں اس سے متعلق کسی اثر کا سراغ ملتا تو فرماتے میں اب اپنی رائے سے اجتہاد کرتا ہوں اگر درست ہوا تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہوا تو میری جانب سے اور اس پر میں اللہ سے معافی کا طلب گار ہوں ۔

بلکہ مسند دارمی کی ایک روایت میں تو یہاں تک بھی ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں میں کوئی حکم نہ ملتا تو حضرت ابوبکر اپنے اجتہاد سے بھی پہلے صحابۂ کرام سے مشورہ کرنے کو ترجیح دیتے اور اس مشورے کے نتیجے میں جو کچھ سامنے آتا اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے گویا کتاب وسنت کے بعد اجماع کو تیسرا ماخذ احکام قرار دیتے ۔ مسند دارمی کے الفاظ ہیں :

كانَ ابوبكر إذا وردعليه الخصمُ نظر في كتابِ الله فإنْ وجدَ فيه ما يقضي بينهم قضى و إن لم يكن في الكتاب وعلم من رسولِ الله صلى الله عليه وسلم في ذلك سنّةً، قضى به فإن اعياه ذلك خرج فسأل المسلمين۔

ابوبکر صدیق کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو کتاب اللہ میں نظر فرماتے اگر اس میں حکم پاتے تو اسی کے موافق فیصلہ کرتے اور اگر کتاب اللہ میں نہ ہوتا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں کوئی سنت معلوم ہوتی تو اسکے مطابق فیصلہ فرماتے اور اگر حدیث اور سنت میں بھی اسکے متعلق کوئی حکم نہ ملتا تو باہر نکل کر مسلمانوں سے دریافت فرماتے ۔

غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن میں کوئی حکم نہ ملنے کی صورت میں حضرت ابوبکر حدیث کی طرف رجوع فرماتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے یعنی یہ بات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ حضرت ابوبکر قرآن کے بعد حدیث کو دین میں حجت قرار دیتے تھے تاریخ و سیر سے متعدد واقعات اس کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے پر صحابہ کے درمیان جب اس بات پر اختلاف ہُوا کہ آپ کے جسد مبارک کو دفن کہاں کیا جائے تو حضرت ابوبکر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہی سے سند پکڑی اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس جگہ اللہ کے نبی کی روح قبض ہوتی ہے اسی جگہ اس کو دفن کیا جاتا ہے[1] چنانچہ اس حدیث کے سنتے ہی سب اختلاف رفع ہو گیا۔ اگر حضرت ابوبکر کے نزدیک حدیث حجت نہ تھی تو پھر رفع اختلاف کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پیش کرنا کیا معنی؟ اسی طرح باغ فدک کے مشہور قضیے کے فیصلے کے لیے حضرت ابوبکر نے ایک حدیث نبوی ہی سے استشہاد کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے باغ فدک میں اپنی میراث کا مطالبہ کیا تو حضرت ابوبکر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کیا۔

إنا معشر الانبياء لا نورث ولا نورثُ ما تركنا صدقة۔ (بخاری باب ماجاء فی قصۃ فدک)	ہم گروہ انبیاء نہ وارث ہوتے ہیں اور نہ کوئی ہمارا وارث ہوتا ہے ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

اور اسی ارشاد نبوی کی روشنی میں باغ فدک کو تقسیم کرنے کے بجائے اس کی آمدنی کو حسب سابق آلِ محمدؐ کے لیے مخصوص رہنے دیا گیا۔ کیا حدیث کی عدم حجیت اسی کا نام ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سامنے آتے ہی سارے جھگڑے ختم ہو جائیں اور ہر ایک کا سر اطاعت و

---

[1] مؤطا وابنِ ماجہ ابواب ماجاء فی الجنائز حدیث ۱۵۳۹

تسلیم کے اظہار میں جھجکا نظر آئے ۔

احادیث کی تلاش و جستجو

غرض یہ ایک دو واقعے ہی نہیں اور بھی متعدد واقعات اس ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق دیگر تمام صحابہ کی طرح حدیث کو دین میں حجت تسلیم کرتے تھے۔ تذکرۃ الحفاظ کی وہ روایت کس سے مخفی ہے جس کو زہری نے قبیصہ سے نقل کیا ہے کہ ایک جدّہ یعنی دادی اپنے پوتے کی میراث مانگنے کے لیے حضرت ابوبکر رضؓ کے پاس آئی تو آپ نے فرمایا کہ دادی کے متعلق تو نہ کتاب اللہ میں میں کوئی حکم پاتا ہوں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان ہی مجھ کو اس بارے میں معلوم ہے اس کے بعد آپ نے صحابۂ کرام سے دریافت کیا کہ شاید انہیں ایسی کسی حدیث کا علم ہو تو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضؓ نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دلوایا تھا پھر حضرت محمد بن مسلمہ رضؓ نے بھی اس کی تصدیق کی[1]۔ حضرت ابوبکر نے اسی حدیث کو بنیاد بنا کر اس خاتون کو چھٹا حصہ دلوادیا۔ اب منکرین حدیث بتلائیں یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کی تلاش و جستجو آخر کس لیے تھی ؟ اگر حدیث حجت ہی نہ تھی تو پھر اس سارے تردد کی ضرورت کیا تھی ؟ قرآن میں کوئی اصل نہ ملنے کی صورت میں حضرت ابوبکر کو بلا کھٹکے اپنی رائے سے فیصلہ کر دینا چاہیئے تھا اس فکر میں پڑنا ہی نہیں چاہیئے تھا کہ اس باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا عمل رہا ہے یا اس بارے میں آپ نے کیا فرمایا ہے اور کیا نہیں فرمایا۔ کیا منکرین حدیث کوئی ایک بھی نظیر ایسی پیش کر سکتے ہیں جس سے حضرت ابوبکر کے اس طرزِ عمل کا اظہار ہوتا ہو کہ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپؐ کی سنت ثابتہ کی پروا کیے بغیر اپنی مرضی سے کبھی کوئی فیصلہ کر دیا ہو۔ حافظ ابن قیم اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں :

لا یحفظ للصدیق خلاف	حضرت ابوبکر کی زندگی میں نص کی خلاف ورزی کی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳

نصب واحد ابداً۔

(اعلام الموقعین جلد ۱ صفحہ ۵۴)

ایک مثال بھی نہیں ملتی۔

یا کیا کوئی ایسی نظیر منکرین حدیث تبلا سکتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حضرت ابوبکر نے حدیث کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کیا ہو اور صحابہ میں سے کسی ایک فرد نے ہی یہ اعتراض کیا ہو کہ اے ابوبکر حدیث کی بنیاد پر آپ فیصلہ کیسے دے سکتے ہیں حدیث تو دین میں حجت ہی نہیں۔ اگر کسی ایسی نظیر کی منکرین حدیث نشاندہی نہیں کر سکتے اور یقین ہے کہ نہیں کر سکتے تو پھر ماننا پڑے گا کہ صرف حضرت ابوبکر ہی نہیں تمام صحابہ بالاجماع حدیث کو حجت جانتے اور مانتے تھے۔

روایت حدیث سے ممانعت اور حضرت ابوبکر

حدیث کے حجت ہونے پر حضرت ابوبکر کا موقف اور اس کے مطابق آپ کا طرز عمل پوری طرح واضح ہو جانے کے بعد آیئے اب ہم اس روایت کا جائزہ لیں جس کی بنیاد پر منکرین حدیث یہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابوبکر احادیث نبویہ کی روایت سے منع کرتے تھے اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ آپ حدیث کو دین میں حجت نہ سمجھتے تھے۔ وہ روایت جس سے یہ سارا تانا بانا بنا گیا ہے تذکرۃ الحفاظ میں ذہبی نے ابن ابی ملیکہ سے نقل کی ہے۔ اس روایت کے الفاظ ہیں:

إنّ الصّدّيقَ جَمَعَ النّاسَ بعدَ وفاةِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم فقال إنّكم تحدّثون عن رسولِ اللهِ الأحاديثَ تختلفون فيها والناسُ بعدَكم أشدُّ اختلافاً فلا تحدّثوا عن رسولِ اللهِ شيئاً فمن سألكم فقولوا بيننا و	حضرت ابوبکر صدیق نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور کہا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی احادیث بیان کرتے ہو جن میں تمہارا اختلاف ہے اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے پس تم رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ کیا کرو اگر تم سے کوئی پوچھے تو کہو کہ ہمارے اور

بینکم کتابُ اللہ فاستحلّوا حلالہٗ وحرّموا حرامہٗ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صـ۳)	تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے اس نے جن چیزوں کو حلال کہا انہیں حلال جانو اور جن چیزوں کو حرام کہا انہیں حرام جانو۔

اس روایت کے اصل مفہوم ومنشا پر تفصیلی گفتگو سے پہلے منکرین حدیث کی ایک۔ اور علمی خیانت ذرا ملاحظہ ہو۔ منکرین حدیث اپنی عادت کے مطابق اس روایت کے متن کو تو اپنے مزعومہ دعوے کو ثابت کرنے کے لیے بڑے شد و مد سے اُچھالتے ہیں مگر اس کے فوراً بعد امام ذہبی نے اس روایت سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کو بالکل گول کر جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو اس روایت کے فوراً بعد آنے والے الفاظ تذکرۃ الحفاظ میں نظر ہی نہیں آتے اس لیے کہ وہ الفاظ منکرین حدیث کے مزعومہ دعوے کی تردید کرتے ہیں امام ذہبی اس روایت کو بیان کرنے کے معاً بعد کہتے ہیں :

فھٰذا المرسل یدلك انّ مراد الصدّیق التثبّتُ فی الاخبارِ والتحرّی لاسدّ بابِ الروایۃ الاتراہ انّہٗ لمّا نزل بہٖ امرا لجدّۃِ ولم یجدہ فی الکتابِ کیف سئل عنہ فی السنن فلمّا اخبرہُ الثقۃُ ما اکتفی حتی استظھر بثقۃٍ آخر ولم یقل حسبنا کتاب اللہ کما تقولہ الخوارج (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صـ۳)	اس روایت سے ظاہر ہے کہ صدیق اکبر کا مقصود یہ ہے کہ احادیث کی روایت میں تثبت اور احتیاط لازم ہے روایت کا دروازہ بند کرنا مقصود نہیں کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جب صدیق اکبر سے دادی (کی میراث) کے متعلق دریافت کیا گیا اور اس کا حکم کتاب اللہ میں نہ پایا تو کس طرح اس کے متعلق احادیث نبویہ کو دریافت کیا اور جب ایک ثقہ اور معتبر آدمی نے اس بارے میں حدیث نبوی کی خبر دی تو اس پر اکتفا نہ فرمایا بلکہ ایک دوسرے ثقہ آدمی کی توثیق طلب کی اور خوارج کی طرح یہ نہیں کہا کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔

س بات کو تو ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر حضرت ابوبکر کے پیش نظر روایت حدیث کا دروازہ بند کرنا ہوتا تو مختلف معاملات ومسائل کے تصفیے کے لیے نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں خود لوگوں سے استفسار کیوں فرماتے ۔ امام ذہبی نے ابن ابی ملیکہ کی متذکرہ بالا روایت نقل کرنے کے بعد اسی فکر کی دعوت دی تھی مگر منکرین حدیث نے اس کو در خور اعتنا نہ سمجھا کیونکہ یہ ان کی اپنی خواہش کے خلاف تھی انصاف سے کہئے کیا تلاشِ حق کا یہی طریقہ ہے ؟ تلاشِ حق کو بھی چھوڑئیے کہ منکرین حدیث کا وہ مطمح نظر ہی نہیں کیا علمی دیانت داری بھی کوئی چیز نہیں کیا علم کی دنیا میں اس قسم کی خیانتوں کی گنجائش ہے ؟

ابوبکرؓ اور روایت حدیث

سوال یہ ہے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ احادیث نبویہ کی روایت کا دروازہ بند کرنا چاہتے تھے تو خود اس کے خلاف کیوں کرتے تھے کیا اس بات میں بھی کوئی شبہ ہے کہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے ۔ ابن جوزی نے حضرت ابوبکر کی مرویات کی تعداد بقی بن مخلد کی مسند کے حوالے سے ایک سو بیالیس بیان کی ہے[۱] ۔ حال ہی میں مسند ابی بکر صدیق طبع ہوئی ہے یہ احمد بن علی بن سعید الاموی المروزی (۲۹۲-۲۰۲ھ) کی تصنیف ہے اس کی تحقیق و تعلیق اور تخریج کا کام شعیب ارناووطنے کیا ہے اس مسند میں بھی حضرت ابوبکر کی کل مرویات کی تعداد ایک سو بیالیس ہے ۔ گویا ایک جانب صرف ایک روایت ہے جو بقول منکرین حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت ابوبکر روایت حدیث سے منع کرتے تھے اور دوسری جانب اس ایک روایت کے مقابلے میں دو چار یا دس بیس نہیں پوری ایک سو بیالیس روایتیں ہیں جو اس پر شاہد ہیں کہ دوسروں کو منع کرتا کیا معنی حضرت ابوبکر خود احادیث نبویہ روایت کرتے تھے ۔ بلکہ ایک سو بیالیس ہی نہیں اگر شاہ ولی اللہ کے قول کو لیا جائے تو حضرت ابوبکر کی مرویات کی تعداد ایک سو پچاس تک جا پہنچتی ہے[۲] ۔ اب بتلائیے ایک روایت کے مقابلے میں کیا ڈیڑھ سو روایات سے قطع نظر کیا جا سکتا ہے ؟ اپنے خود تراشیدہ اوہام اور من مانے خیالات کے پیچھے لگ کر کسی روایت سے کوئی الٹا سیدھا نتیجہ نکال لینا بہت آسان ہے مگر علمی سطح پر اس کو نبھانا بہت مشکل ہے ۔

---

۱ تلقیح ۲ ازالۃ الخفا جلد ۲ ص ۲۴

اِس کے علاوہ ذرا یہ بھی تو سوچئے کہ کیا آپ ایسی ہستی کے بارے میں جو صدیقیت کے مقام پر فائز ہے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ معاذ اللہ وہ کہتے کچھ تھے اور کرتے کچھ تھے لوگوں کو روایتِ حدیث سے منع کرتے رہے اور خود اتنی تعداد میں حدیثیں روایت کر گئے ۔ کتنی غیر معقول بات ہے یہ! اس کے ساتھ ہی اس پر بھی غور فرمائیے کہ صحابہ کی ایک کثیر تعداد ہمیشہ حدیثوں کی روایت میں مشغول رہی تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ تمام صحابہ نے حضرت ابو بکر کی اس تجویز کو قطعی طور پر مسترد کر دیا تھا کہ حدیثوں کی روایت کا سلسلہ بقول منکرین حدیث ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جائے اور روایت کے الفاظ یہ بتلا رہے ہیں کہ حضرت ابو بکر نے یہ تجویز سرسری طور پر پیش نہیں کی تھی بلکہ باضابطہ صحابہ کی ایک مجلس منعقد کی تھی اور اس مجلس میں یہ حکم دیا گیا تھا تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صحابہ نے خلیفۂ وقت کے حکم کی کوئی پروا نہ کی۔ غیر معقولیت کی بھی حد ہوتی ہے منکرین حدیث پر حیرت ہے ذرا بھی فکر سے کام نہیں لیتے ؛

ممانعت کی اصل وجہ رفع اختلاف

منکرین حدیث کو ہم ان کے حال پر چھوڑتے ہیں ۔ یہ درست ہے کہ حضرت ابو بکر کے الفاظ فلا تحدّثوا عن رسولِ اللہ شیئًا (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو) سے بظاہر یہی مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر نے روایت حدیث سے روک دیا تھا مگر ان الفاظ کا یہ مطلب اس وقت نکلتا ہے جب اس کو سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے پڑھا جائے ۔ ان الفاظ سے پہلے حضرت ابو بکر نے جو کچھ کہا ہے اسے علیحدہ نہ کیجئے حضرت ابو بکر نے صحابہ کے سامنے یہ تجویز رکھنے سے پہلے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات بیان نہ کی جائے تمہید کے طور پر ایک ایسے امر واقعہ پر صحابہ کو مطلع کیا ہے جس کی طرف اگر بر وقت دھیان نہ دیا جاتا تو فساد دین کا موجب ہو سکتا تھا ۔ اس امر واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے حضرت ابو بکر فرماتے ہیں :

اِنکم تحدِّثون عن رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الاحادیثَ تختلفونَ فیھا و الناسُ بعدَکم اشدُّ اختلافًا ۔	تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی احادیث روایت کرتے ہو جن میں تمہارا اختلاف ہے اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے ۔

گویا حضرت ابوبکر صحابۂ کرام کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ احادیث جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی سہولت پسندانہ خصوصیت کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنے محتاط حکیمانہ طرزِ عمل کے ذریعے انفرادی معلومات تک محدود رکھا ہے ان کا بدستور انفرادی معلومات تک محدود رہنا انتہائی ضروری ہے ورنہ وہ اختلافات جو اس قسم کی احادیث میں قدرتی طور پر موجود ہیں ارادی اور اختیاری مخالفتوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ ابتدا میں عہد نبوت سے قرب کی بنا پر ممکن ہے ان مخالفتوں میں شدت نہ ہو لیکن جوں جوں اس خیرالقرون سے دوری بڑھتی جائے گی یہ مخالفتیں بھی شدید سے شدید تر ہوتی چلی جائیں گی اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی احادیث روایت ہی نہ کی جائیں جس کے پاس جو علم ہے وہ اس کے مطابق عمل کرتا چلا جائے دوسروں کو مجبور نہ کرے کہ وہ بھی اس کے علم کے مطابق عمل کریں کہ دین میں سہولت اور وسعت صرف اسی صورت میں باقی رہ سکتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں دین کے مختلف طریقوں پر عمل کرنے کی نظیریں اسی لیے چھوڑی ہیں اور ان کو قصداً اور ارادتاً اسی لیے کثرت سے اشاعت پذیر نہیں ہونے دیا کہ دین میں کسی قسم کی تنگی پیدا نہ ہونے پائے۔ حضرت ابوبکر نے صحابہ کے سامنے جو تجویز رکھی تھی اس کا مقصد روایتِ حدیث سے مطلقاً روکنا نہ تھا بلکہ مطمح نظر یہ تھا کہ احادیث کی اس طور پر روایت نہ کی جائے جس سے وہ قدرتی اور فطری اختلافات جو امت کی سہولت کے لیے ہیں ارادی اور اختیاری مخالفتوں میں تبدیل ہو کر امت کے لیے زحمت اور تنگی کا سبب بن جائیں۔

قارئین نے محسوس کر لیا ہو گا کہ کسی کلام کے ایک جزو کو اس کے سیاق و سباق سے علیحدہ کر دینے اور ملا کر سمجھنے میں معانی کے اندر کس قدر تفاوت واقع ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر کے الفاظ فلا تحدّثوا عن رسول اللہ شیئاً اپنے ماسبق سے علیحدہ نہیں ہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو اپنے ماسبق کے لازمی نتیجے کے طور پر کہے گئے ہیں۔ عربی زبان سے واقفیت رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ فلا تحدّثوا کی ابتدا میں جو حرف فا (ف) ہے وہ ترتیب پر دلالت کرتا ہے یعنی اس سے پہلے جو بات بیان کی گئی ہے اس کے نتیجہ کا اظہار کرنے کے لیے کلام کی ابتدا فا (ف) کے حرف سے کی گئی ہے۔ گویا پوری بات اس طرح بنتی ہے کہ چونکہ احادیث

کے قدرتی اختلافات کو ارادی مخالفتوں کا ذریعہ بنایا جانے لگا ہے اس لیے اس سے تو بہتر ہے کہ احادیث کو روایت ہی نہ کیا جائے انصاف سے بتلایئے اس پوری بات کے الفاظ سے کیا یہ مطلب نکالنا کسی طرح بھی درست ہے کہ یہ بات کہنے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت کو سرے ہی سے ختم کرنا چاہتا ہے۔ خود ہی سوچیے اس قسم کا مطلب نکالنا بہتان و افترا نہیں تو اور کیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کا مقصود اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مخالفانہ اغراض کو ہوا دینے کے لیے احادیث بیان کرنے سے لوگوں کو روکا جائے۔ وہ صحابہ کرام پر دراصل یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ احادیث نبویہ کا صحیح استعمال یہ نہیں ہے کہ ان کے متعلق جس شخص کے پاس جو معلومات ہیں وہ ان کی پابندی کا خوامخواہ دوسروں سے مطالبہ کرے بلکہ صحیح مسلک ان اختلافات کے متعلق جو اس قسم کی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں یہ ہے کہ امت مسلمہ کا ہر فرد ایک دوسرے کے قدرتی و فطری اختلافات کو برداشت کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے اور اگر کوئی شخص ارادی مخالفتوں کی آگ بھڑکانے کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی احادیث بیان کرے جو دین کے طریقوں کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مختلف نظیروں کی حامل ہوں تو اس کو خاموش کرانے کے لیے فوراً یہ کہا جائے کہ ان تمام نظیروں کے بنیادی اصول و کلیات قرآن کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہیں جو پوری امت مسلمہ کو اتفاقی نقطے پر سمیٹنے کے لیے بہت کافی ہیں حضرت ابوبکرؓ نے متذکرہ روایت کے آخر میں یہی بات ارشاد فرمائی کہ

فَمَنْ سَأَلَكُمْ فَقُولُوا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللّٰهِ فَاسْتَحِلُّوا حَلَالَهُ وَحَرِّمُوا حَرَامَهُ۔	اگر تم سے کوئی پوچھے تو کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے اس نے جن چیزوں کو حلال کیا انہیں حلال جانو اور جن کو حرام کیا انہیں حرام جانو۔

ان الفاظ سے حضرت ابوبکرؓ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک قاعدہ کلیہ بتلا دیا کہ جب کبھی اختلافی اغراض کے لیے احادیث نبویہ کے بارے میں کسی گوشے سے کھود کرید اور پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع ہو تو واضح الفاظ میں اعلان کر دینا چاہیے کہ ان تمام باتوں کا مرکز و محور وہی

اُصول و کلیات ہیں جو قرآن میں محفوظ کر دی گئی ہیں۔

غرض تذکرۃ الحفاظ کی متذکرہ بالا روایت سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابو بکر نے صحابہ کرام کو احادیث نبویہ روایت کرنے سے بالکلیہ روک دیا تھا اور اس طرح وہ بنیاد ہی باقی نہیں رہتی جس پر منکرین حدیث نے حضرت ابو بکر کو متہم کرنے کے لیے عدم حجیت حدیث کے دعوے کی عمارت کھڑی کی تھی۔

مجموعہ حدیث کو نذرِ آتش کر دینا

دوسری چیز جو منکرین حدیث حضرت ابو بکر کی طرف عدم حجیت حدیث کا نظریہ منسوب کرنے کے لیے استشہاد کے طور پر پیش کیا کرتے ہیں وہ واقعہ ہے جس کو ابن اثیر جزری نے اسد الغابہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی نقل کیا ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ سو احادیث پر مشتمل ایک مجموعہ تیار کیا تھا مگر بعد میں خود اپنے ہی ہاتھوں اسے نذرِ آتش کر دیا۔ اس واقعہ سے بھی منکرین حدیث یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر احادیث نبویہ کو دین میں حجت خیال نہ کرتے تھے۔

جہاں تک احادیث نبویہ کو دین میں حجت سمجھنے نہ سمجھنے کا تعلق ہے اس سلسلے میں حضرت ابو بکر کے طرزِ عمل پر گذشتہ اوراق میں اس موضوع پر گفتگو کی ابتدا کرتے وقت تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے اور واضح دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ منکرین حدیث کا یہ دعویٰ سراسر بہتان اور افترا ہے۔ اس وقت تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اپنے مجموعۂ حدیث کو نذرِ آتش کرتے وقت حضرت ابو بکر کے سامنے اصل محرک کیا تھا۔

پورا واقعہ

آیئے پہلے یہ معلوم کریں کہ پورا واقعہ کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے اس واقعہ کے بارے میں اسد الغابہ میں جو روایت منقول ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ حضرت ابو بکر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے بعد احادیث نبویہ کا ایک مجموعہ قلم بند کیا جو پانچ سو احادیث پر مشتمل تھا یہ مجموعہ تحریر کرنے کے بعد آپ نے اسے حضرت عائشہ کے پاس رکھوا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک رات حضرت عائشہ نے دیکھا کہ حضرت ابو بکر بے چین ہیں اور کروٹیں بدل رہے ہیں حضرت عائشہ اپنے والد ماجد

کی یہ غیر معمولی بے چینی دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں سرہانے تشریف لائیں اور پوچھا کہ آپ یہ کروٹیں کسی جسمانی تکلیف کی بنا پر بدل رہے ہیں یا کسی خبر نے آپ کو بے چین کر دیا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کوئی جواب نہ دیا مگر جب صبح ہوئی تو حضرت عائشہ سے فرمایا بیٹی! وہ مجموعۂ احادیث جو تمہارے پاس ہے اسے لے آؤ۔ حضرت عائشہؓ نے وہ مجموعہ لاکر دیا تو حضرت ابوبکرؓ نے لے کر اسے آگ کی نذر کر دیا۔ حضرت عائشہ حیران رہ گئیں کہ اس قدر محنت سے لکھی ہوئی احادیث نبویہ کو آخر کیوں جلا دیا گیا۔ وجہ پوچھنے پر جو جواب حضرت ابوبکر دیتے ہیں وہ اس سارے واقعہ میں بہت اہم ہے۔ یہ جواب ہی دراصل ہمارے بھی ان تمام سوالات کا جواب ہے جو اس سلسلے میں قدرتی طور پر ذہن میں ابھرتے ہیں اور جن کو منکرین حدیث طرح طرح سے ہوا دینے کی کوشش کرتے ہیں حضرت ابوبکر جواب میں فرماتے ہیں:

خَشِيتُ اَنْ اَمُوتَ وهي عندي فيكون فيها احاديثُ عن رجلٍ قد ائتمنتُهُ وَوَثِقْتُهُ ولم يكن كما حدثني فاكون قد نقلت ذاك فهذا لا يصح	مجھے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ میں مر جاؤں اور حدیثوں کا یہ مجموعہ میرے پاس رہ جائے اس حالت میں کہ اس میں ایسے شخص کی بھی حدیثیں ہوں جس کی امانت پر میں نے بھروسہ کیا اور اس کے بیان پر اعتماد کیا مگر جو کچھ اس نے مجھ سے بیان کیا اصل بات ویسی نہ ہو اور میں نے اسے نقل کر دیا۔ پس ایسا کرنا درست نہ ہوگا۔
(اسد الغابہ جلد ۳ صد ۲۲۴)	

واقعہ کا محرک

حضرت ابوبکر کے ان الفاظ میں ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان الفاظ سے ایک عام آدمی کا ذہن تو شاید یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ حضرت ابوبکرؓ نے راویوں کی روایت میں کذب کا احتمال موجود ہونے کی بنا پر اپنے مجموعۂ حدیث میں مرقوم احادیث کو قابلِ اعتماد نہ سمجھا اس لیے ان کو جلا دیا مگر وہ اذہان جو غور و فکر کی صلاحیتوں سے مزین ہیں وہ ذرا سوچیں کہ اگر احتمالِ کذب کی بنا پر حضرت ابوبکرؓ نے ان احادیث کو ناقابلِ اعتماد سمجھا ہوتا تو چاہیئے تھا کہ ابتدا میں ان کو قلم بند ہی نہ کرتے اس لیے کہ یہ احتمال تو اس

وقت بھی موجود تھا۔ اگر باوجود سچ بولنے کے ہر شخص کے بیان کے بارے میں یہ اندیشہ باقی رہتا ہے کہ شاید اس کی خبر میں سچ کے ساتھ جھوٹ بھی ہو تو یہ اندیشہ تو قید تحریر میں آنے سے پہلے بھی ان ساری روایتوں میں موجود تھا باوجود اس اندیشہ کے حضرت ابوبکر نے احادیث کو قلم بند کیا تھا تو ظاہر ہے ان پر اعتماد کرتے ہوئے ہی کیا تھا۔ صدق کے ساتھ کذب کی موجودگی کا محض امکان کسی خبر کو ناقابل اعتماد اور ناقابل قبول قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہوا کرتا بلکہ عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ خبر دینے والا بظاہر معتبر اور ثقہ ہے یا نہیں۔ دنیا کا عام کاروبار اسی بنیاد پر قائم ہے۔ عدالتوں تک میں قانونِ شہادت کی بنیاد یہی اعتماد و اعتبار ہے جس کے تحت حکام آئے دِن فیصلے صادر کرتے رہتے ہیں قطعی اور لازوال یقین حاصل کرنے کی نہ کوئی کوشش کرتا ہے اور نہ اس کا حصول ممکن ہی ہے۔ حضرت ابوبکر نے بھی راویوں کو معتبر اور قابل اعتماد سمجھ کر ہی ان سے سنی ہوئی حدیثوں کو جمع کر لیا تھا۔ احتمالِ کذب کی اہمیت نہ لکھنے سے پہلے تھی اور نہ لکھنے کے بعد۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ مجموعۂ احادیث کا جلانا ان کے ناقابل اعتماد ہونے کی بنا پر نہ تھا۔

ہمارے اس خیال کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ حدیثوں کے اس مجموعے میں یقینی بات ہے وہ احادیث بھی ضرور شامل ہوں گی جن کو حضرت ابوبکرؓ نے بذاتِ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا تھا کم از کم وہ احادیث تو تمام کی تمام حضرت ابوبکرؓ کے لیے ہر قسم کے کذب کے احتمال سے خالی تھیں اگر ناقابل اعتماد سمجھے جانے کی بنا پر احادیث کے مجموعے کو جلایا گیا ہوتا تو اس مجموعے میں سے ان احادیث کو تو یقیناً الگ کر لینا چاہیئے تھا جن میں کذب کا کوئی امکان نہ تھا۔ پورے مجموعے کو جلانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی وجہ احادیث پر عدم اعتمادی ہرگز نہ تھی۔

دین کی سہولت پسندانہ خصوصیت کی حفاظت

معلوم ہوا کہ بیان کرنے والوں کے بیان میں جس شبے کا اظہار حضرت ابوبکر اپنے مجموعے کے جلانے کے سلسلے میں کر رہے ہیں اس کا تعلق ان شکوک و شبہات

سے نہیں ہے جن کی موجودگی و عدم موجودگی کسی خبر پر عدم اعتماد یا اعتماد کا موجب ہوا کرتی ہے بلکہ یہ شبہ اس ظن و گمان کی قبیل سے ہے جس کو قصداً ان حدیثوں میں باقی رکھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصود تھا جن کے متعلق عمومیت اور عام اشاعت کا طریقہ آپؐ نے اختیار نہیں فرمایا تھا۔ اسلام کی سہولت پسندانہ خصوصیت کو برقرار رکھنے کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے محتاط حکیمانہ طرز عمل کے ذریعے جن احادیث کو انفرادی معلومات تک محدود رکھا ہے وہ احادیث ظاہر ہے یقین و اعتماد کا وہ مقام حاصل نہیں کر سکتیں جو تواتر و توارث کی راہ سے منتقل ہو کر آنے والی احادیث کو حاصل ہے۔ اوّل الذکر احادیث میں قصداً اور ارادتاً اس احتمال کی گنجائش چھوڑی گئی ہے کہ بیان کرنے والے کا بیان ممکن ہے صحیح نہ ہو اسی گنجائش نے ان احادیث کے مطالبے کی قوت کو دین کے اس حصے کے مطالبے کی قوت کے مقابلے میں کچھ کمزور کر دیا ہے جس میں قطعاً اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔

حضرت ابوبکرؓ کو خدشہ تھا تو اسی بات کا کہ میرے ہاتھ سے قید تحریر میں آجانے کے بعد ایسا نہ ہو کہ یہ احادیث اس حال پر قائم نہ رہ سکیں جس پر ان کا باقی رہنا لازمی ہے اور اس طرح دین میں جو سہولت کی راہ کھلی ہوئی ہے وہ کہیں بند نہ ہو جائے۔ سوچنے کی بات ہے جو کتاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے خلیفہ اور دینی و سیاسی جانشین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہو اسمیں مرقوم ہو جانے کے بعد کیا ان انفرادی معلومات پر مبنی احادیث کا اپنے مطالبوں کی قوت میں وہ حال باقی رہ سکتا تھا جس کا باقی رکھنا مقصود تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی یہ کتاب اگر باقی رہ جاتی تو اس کی حیثیت سربراہِ حکومت کی جانب سے جاری کیے جانے والے ایک سرکاری وثیقہ کی بن جاتی اور آنے والے زمانوں میں اس کتاب کی حدیثوں کے ساتھ اور ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے احکام و قوانین کے ساتھ عقیدت و گرویدگی کا جو عالم ہوتا وہ کسی بیان و تشریح کا محتاج نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے یہ الفاظ کہ خشیتُ انْ امُوتَ وھِیَ عِندِی (مجھے اندیشہ ہوا کہ میں مر جاؤں اور حدیثوں کا یہ مجموعہ میرے

پاس رہ جائے، تو اس باب میں بہت ہی واضح ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی زندگی میں ان احادیث کی اشاعت نہ بھی کرتے تو آپ کے بعد آپ کے پاس سے محض اس کتاب کا نکل آنا ہی اسں میں موجود احادیث کی اس نوعیت کو بدل دینے کے لیے کافی ہوتا جس کو قصداً باقی رکھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود تھا۔ حق یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مکتوب مجموعے کو جلا کر اس خطرے کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسداد فرما دیا۔

بلکہ دیکھا جائے تو حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مجموعۂ حدیث کو نذرِ آتش کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کو زندہ کیا۔ حدیثوں کے کتابی ذخیرے کو جلانے کا پہلا واقعہ عہدِ نبوت میں ہُوا تھا جب صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کتابت حدیث کی ممانعت کا حکم سُن کر اپنے مکتوب مجموعوں کو جلا دیا تھا اس وقت بھی پیش نظر یہی خدشہ تھا کہ قرآن کے ساتھ ساتھ لکھے جانے کی بنا پر یا کثیر تعداد میں مکتوب مجموعے تیار ہو جانے سے ان میں عمومیت کا رنگ پیدا ہو جانے کی بنا پر کہیں ان اُحادیث سے نکلنے والے احکام و نتائج کے مطالبوں میں وہ قوت نہ پیدا ہو جائے جو قرآن کو یا دین کے اس حصےّ کو حاصل ہے جو قرآن کی عملی تشکیلات پر مشتمل ہے اور اس طرح یہ حدیثیں کہیں امتِ مسلمہ کی دینی زندگی میں ضیق اور تنگی کا سبب نہ بن جائیں۔ اس خطرے کا انسداد کرنے کے لیے پہلی بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حدیثوں کے کتابی ذخیرے کو جلایا گیا تھا اب اسی طریقہ کا احیاء حضرت ابوبکرؓ نے اپنے کتابی ذخیرے کو جلا کر کیا اب بھی مقصود اسی خطرے کا انسداد تھا کہ دین کا وہ حصہ جو تواتر و توارث کی دولت سے مالا مال ہے اور جس کو ہم نے گذشتہ اوراق میں بینات کی قرآنی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے وہ دین کے اس حصےّ سے خلط ملط نہ ہو جائے جس کی بنیاد وہ احادیث ہیں جن کو قصداً اور ارادتاً دین میں سہولت کے پیشِ نظر انفرادی معلومات تک محدود رکھا گیا ہے۔ دین کے ان دونوں حصوّں کے مطالبوں میں قوت و ضعف کو برقرار رکھنے کے لیے جو طرزِ عمل عہدِ نبوت میں اختیار کیا گیا تھا اسی طرزِ عمل کی تجدید حضرت

ابوبکرؓ نے اپنے زمانے میں فرمائی۔

غرض روایت حدیث سے ممانعت کی بات ہو یا مجموعۂ حدیث جلانے کا ذکر ہو حضرت ابوبکرؓ کی طرف حدیث کی عدم حجیت کا نظریہ ثابت کرنے کے لیے کسی طرح بھی یہ دونوں باتیں بنیاد کا کام نہیں دے سکتیں۔ اس لیے بلاخوف تردید یہی کہا جائے گا کہ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں منکرین حدیث کا دعویٰ ایک بہتان سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا ؛

حضرت عمرؓ اور منکرین حدیث کا الزام

منکرین حدیث کی اتہام طرازی کا دوسرا نشانہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ذات۔ نبی ہے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں تو یہ دریدہ دہن لوگ اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ انکو انکار حدیث کے فتنے کا امام قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ احادیث کو معاذاللہ دین سے بالکلیہ خارج کر دینا چاہتے تھے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت کے لیے بھی منکرین حدیث نے انہی دو باتوں کا سہارا لیا ہے جو حضرت ابوبکرؓ کے سلسلے میں ان کا تختۂ مشق بن چکی ہیں یعنی روایتِ حدیث سے ممانعت اور حدیث کے مختلف کتابی ذخیروں کو نذر آتش کر دینا۔ منکرین حدیث اپنی فاسد اغراض کو پورا کرنے کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی روایات لاتے ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح بس یہ ذکر آگیا ہو کہ حضرت عمرؓ نے احادیث نبویہ کو روایت کرنے سے لوگوں کو روکا تھا یا پھر بڑے شد و مد کے ساتھ اس روایت کو اُچھالتے ہیں جس میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے لکھے ہوئے حدیث کے مجموعے منگوائے اور ان کو جلا دیا ؛

منکرین حدیث کی علمی خیانت

ان تمام روایات کا انشاءاللہ تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا مگر اس سے قبل ہم منکرین حدیث کے طرزِ عمل کے بارے میں اپنے اسی سوال کا پھر اعادہ کرتے ہیں کہ آخر یہ لوگ قدم قدم پر علمی خیانت کے مرتکب کیوں ہوتے ہیں حدیث کے جن ذخیروں سے کرید کرید کر انہوں نے اپنے مطلب کی روایات نکالی ہیں کیا انہی ذخیروں میں وہ روایات انہیں نظر نہیں آئیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ روایت سے بالکلیہ لوگوں کو روکنا تو کجا حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود سینکڑوں حدیثیں روایت کرتے رہے ہیں۔ عجب حال ہے ان لوگوں کا ایک طرف روایات

کے تمام ذخیرے کو ناقابل اعتبار ٹھہرایا جاتا ہے۔ جھوٹ کا پلندہ اور عجمی سازش کا نام دے دے کر روایات کی پوری بساط کو لپیٹ کر رکھ دینے کے مشورے دئیے جاتے ہیں۔ دوسری طرف اسی ذخیرۂ روایات میں سے کچھ روائتیں نکال کر اور انہیں اپنے معنی پہنا کر اس پر اصرار کیا جاتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس پر اعتماد کیا جائے جو روایات وہ پیش کر رہے ہیں انہیں حجت کے طور پر قبول کیا جائے۔ روایات تو روایات ہی ہیں اگر منکرین حدیث کی پیش کردہ روایات درست ہو سکتی ہیں تو وہ روایات درست کیوں نہیں ہو سکتیں جو ان کے خلاف دوسروں کی جانب سے حجت کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ اگر رد کرنا ہے تو تمام روایات کو رد کر دیجئے اور اگر قبول کیا ہے تو سب کچھ قبول کیجئے۔ "میٹھا میٹھا ہپ ہپ کڑوا کڑوا تھو" کی منطق تلاشِ حق میں ممد و معین ثابت ہونے کے بجائے ہمیشہ زبردست رکاوٹ بنی رہی ہے۔ اگر ہم سے مطالبہ ہے کہ ہم آپ کی پیش کردہ وہ روایات قبول کریں جن سے آپ حضرت عمرؓ کو بزعم خود انکار حدیث کا امام معاذ اللہ ثابت کرتے ہیں تو ہمیں اس مطالبے کی معقولیت ثابت کرنے کے لیے پہلے یہ بتلائیے کہ ہم ان روایات کو کس دلیل کی بنا پر رد کر دیں جن سے آپ کے دعوے کی کھلی تردید ہوتی ہے جبکہ وہ روایات جو آپ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں ان کی اسناد کو صحت و ثاقت کے لحاظ سے ان روایتوں کی اسناد سے کوئی نسبت نہیں جو حضرت عمرؓ سے مروی ہیں اور آپ کے دعوے کی تردید کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ حضرت عمرؓ سے مروی احادیث عموماً صحاح ستہ کی کتابوں میں بلکہ زیادہ تر بخاری اور مسلم میں پائی جاتی ہیں جن کی اسناد کا قوی ترین ہونا متفق علیہ ہے اور منکرین حدیث کی طرف سے جن روایات کو پیش کیا جاتا ہے ان کا کم از کم صحاح کی کتابوں میں کوئی ذکر نہیں۔ اس کے علاوہ ان روایات کی تعداد دو چار دس پانچ کے عدد سے آگے نہیں بڑھتی جبکہ ان حدیثوں کی تعداد جو حضرت عمرؓ سے مروی ہیں سینکڑوں سے متجاوز ہے۔

حضرت عمرؓ اور روایت حدیث

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے جو احادیث مروی ہیں وہ صاحب تلقیح ابن جوزی کے مطابق پانچ سو سینتیس (۵۳۷) ہیں علامہ ابن حزم نے جوامع السیر میں حضرت عمرؓ کی مرویات

کی تعداد پانچ سو تبلائی ہے۔ ممکن ہے اس تعداد میں طرق کا شمار شامل ہو اگر متون ہی کا اعتبار کیا جائے تب بھی حضرت عمرؓ کی مرویات دو سو سے کچھ اوپر بیان کی گئی ہیں[1]۔ غور تو کیجیے جس ہستی کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ وہ لوگوں کو حدیثیں روایت کرنے سے روکتی تھی وہی ہستی خود دو چار نہیں دس بیس نہیں پوری دو سو سے کچھ اوپر احادیث نبویہ روایت کرتی نظر آتی ہے۔ اگر منکرین حدیث کی بات مان لی جائے تو پھر حضرت عمر فاروق جیسے جلیل القدر اور خلیفۂ رسول صحابی کے اس عملی تضاد کی آخر آپ کیا توجیہ کریں گے کہ ایک طرف لوگوں کو ردکتے رہے اور دوسری طرف دو دو سو احادیث خود روایت کرتے رہے اور یہ دو سو کی تعداد بھی اس وقت ہے جب ہم حضرت عمرؓ کے ان فقہی استدلالات کو شامل نہ کریں جو آپ نے قرآن پاک کی تعبیر و تفسیر اور احکام و مسائل کی توضیح و تبیین میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے کیے ہیں اور فنِ حدیث کے نقطۂ نظر سے وہ حدیث ہی کی تعریف میں آتے ہیں ایسے استدلالاتِ فاروقی کی تعداد ہزار سے بھی اوپر ہے اسی بنا پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ازالۃ الخفا میں کہا ہے کہ حضرت عمرؓ کا شمار مکثرین صحابہ کے طبقہ میں ہونا چاہیے[2] یعنی وہ صحابہ جن کی مرویات کی تعداد ہزار یا ہزار سے اوپر ہے۔ منکرین حدیث ذرا آنکھیں کھولیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے ہزار سے زیادہ استدلالات کرنے والا بھی کہیں منکر حدیث ہو سکتا ہے کیا ایسے شخص کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ احادیث نبویہ کو دین سے معاذ اللہ بالکلیہ خارج کر دینا چاہتا ہے؟

عمّال کو تعلیم حدیث کا حکم

حیرت کی بات ہے جس عمرؓ کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ احادیث نبویہ کو دین سے خارج کر دینا چاہتا تھا وہی عمرؓ ہمیں حج کے موقعہ پر لاکھوں اصحابِ رسول کے سامنے اپنے خطبے میں یہ اعلان عام کرتا نظر آتا ہے:

ایہا الناس لم اعمل عمالا لیضربوا	لوگو! میں تم پر اس لیے حاکم مقرر نہیں کرتا کہ وہ تمہارے

---

[1] تلقیح ص ۱۸۴ بحوالہ ابونعیم اصفہانی [2] ازالۃ الخفا جلد ۲ ص ۲۱۴

ابناءکم ولا لیاخذوا اموالکم وانما ارسلتهم الیکم لیعلموکم دینکم و سنة نبیکم (تاریخ ابن اثیر ص۲۰۸)	بیٹوں کو ماریں اور نہ اس لیے کہ وہ تمہارے مال چھین لیں میں نے ان کو صرف اس لیے بھیجا ہے کہ وہ تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبی کی سنت کی تعلیم دیں۔

کیا سنت نبوی کی تعلیم دینا سنت نبوی کو دین سے خارج کرنا کہلاتا ہے۔ جو شخص اپنے عمّال مقرر کرنے کا مقصد واحد یہ بتلاتا ہے کہ وہ لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سکھائیں اس کے بارے میں کیسے یہ تصوّر کر لیا جائے کہ وہ نبی کی سنت کو دین سے خارج کر دینا چاہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ اپنے عمّال روانہ فرماتے وقت بطور خاص ان کے ذمّے یہ فرض سونپتے تھے کہ وہ اپنے علاقے میں جا کر قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث لوگوں کو سکھلائیں چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کو جب حضرت عمر کی جانب سے بصرہ کا والی بنا کر بھیجا گیا تو جاتے ہی حضرت ابوموسیٰ نے مجمع عام میں جو تقریر کی اس میں انہوں نے اپنے بھیجے جانے کا مقصد تعلیم قرآن و حدیث ہی کو قرار دیا۔ آپ نے فرمایا

بعثنی عمر لاعلمکم کتاب ربکم وسنة نبیکم (دارمی ص۶۵)	مجھے عمر نے بھیجا ہے کہ میں تمہیں تمہارے رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سنت سکھلاؤں۔

عدالتی فیصلوں کی بُنیاد

سنت نبوی کی صرف تعلیم ہی نہیں حضرت عمر کے دربارِ خلافت سے باقاعدہ ہدایت نامے روانہ کیے جاتے تھے کہ قرآن کے بعد حدیث کو مقدمات و خصومات کے فیصلوں کی بنیاد بنایا جائے۔ قاضی شریح کے نام ایک مکتوب میں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے لکھا:

اذا اتاک امرا فاقض بما فی کتاب اللہ فان اتاک مالیس فی الکتب فاقض بما سن فیه رسول اللہ (الموافقات للشاطبی ج ۴ ص۷)	جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو تو اس میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ دو اور اگر کوئی ایسی چیز آئے جو کتاب اللہ میں نہیں تو تم رسول اللہ کی سنت کے مطابق فیصلہ کرو۔

اسی طرح ایک اور موقعہ پر حضرت شریح ہی کے نام ہدایت بھیجی کہ جو چیز تمہیں کتاب اللہ میں مل جائے تو پھر اس میں مزید کسی پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں اسی پر عمل کرو لیکن اگر کوئی چیز کتاب اللہ میں نہ ملے یا مبہم ہو تو پھر سنت رسول کا اتباع کرو۔ حضرت عمرؓ کے الفاظ ہیں:

اُنظُر ما تبیّنَ لک فی کتاب اللہِ فلا تسئل عنہ احداً و ما لم تبیّنْ لک فی کتاب اللہ فاتّبِع فی سنّۃِ رسولِ اللہ۔	تم دیکھو جو چیز تمہارے لیے کتاب اللہ میں واضح ہو اس بارے میں کسی سے مت سوال کرو اور جو چیز کتاب اللہ میں واضح نہیں اس میں سنتِ رسول کا اتباع کرو۔

(الموافقات ج ۴ ص۶)

نبی کی رائے وحی الٰہی ہے

ان شواہد کے بعد بھی اگر کسی کو اس پر اصرار ہے کہ حضرت عمرؓ حجیت حدیث کے قائل نہ تھے یا حدیث کو دین سے خارج کر دینا چاہتے تھے تو ہم اس کا معاملہ خدا پر چھوڑتے ہیں اور اس باب میں حرف آخر کے طور پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک قول پیش کر کے فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ اس سے جو نتیجہ چاہیں اخذ کریں۔ حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں اور علامہ جلال الدین سیوطی نے مفتاح الجنۃ میں حضرت عمر کا یہ قول نقل کیا ہے:

یا ایہا الناس! اِنَّ الرأیَ انّما کانَ مِن رسولِ اللہ مصیباً لانّ اللہ کان یریہ وانّما ھو منّا الظنُّ و التکلّف۔	اے لوگو! جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کا تعلق ہے سو وہ درست ہے کیونکہ اللہ آپکی رہنمائی کرتا تھا لیکن ہماری رائے تو صرف گمان اور تکلف ہے۔

نبی کی رائے کو وحی الٰہی قرار دینے والا بھی اگر منکر حدیث ہے تو پھر مؤید حدیث اور حجیت حدیث کا قائل آپ کسے کہیں گے جو یہ سمجھتا ہو کہ رسول اللہ کی رائے ہر حال میں درست ہے اس لیے کہ اس کی پشت پر اللہ کا ارادہ کام کرتا ہے اس کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ وہ حدیث کو دین سے خارج کرنا چاہتا ہے بہتان اور افترا تو ہے ہی دعوی کرنے والوں کے عقل سے عاری ہونے کی دلیل بھی ہے ⁂

منکرین حدیث کے دعوے کا اصل مدار

حضرت عمرؓ کے اس قول کو اتمام حجت کے طور پر پیش کرنے کے بعد اب ہم ان روایات کا جائزہ لیتے ہیں جو اس سلسلے میں منکرین حدیث کے دعوے کا اصل مدار ہیں۔ منکرین حدیث اپنے دعوے کے ثبوت میں جن روایات کو بہت بڑھ چڑھ کر پیش کرتے ہیں وہ تین طرح کی ہیں :

(۱) وہ روایات جن سے بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ حدیثیں روایت کرنے سے سختی کے ساتھ منع کرتے تھے۔

(۲) وہ روایت جس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حضرت عمر نے حدیثیں روایت کرنے پر بعض صحابہ کو سزا دی تھی۔

(۳) وہ روایت جس میں ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے لکھے ہوئے احادیث کے مجموعے منگوائے اور ان کو جلا دیا۔ اب ہم ان تینوں قسم کی روایات کا تفصیل سے جائزہ لیں گے اور بتلائیں گے کہ ان روایات کے اصل مفہوم کی روشنی میں فی الواقع کیا نتیجہ نکلتا ہے اور منکرین حدیث نے خود ساختہ معنی پہنا کر ان روایات سے کتنے دور از کار نتائج اخذ کیے ہیں ؀

روایت سے منع کرنا

وہ روایات جن کو مختلف سباق و سیاق میں بار بار پیش کر کے منکرین حدیث ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث سے سختی کے ساتھ منع کرتے تھے ان میں سب سے نمایاں روایت وہ ہے جس کو حضرت قرظہ بن کعبؓ صحابی سے امام شعبی نے نقل کیا ہے اور علامہ ذہبی نے اسے تذکرۃ الحفاظ میں حضرت عمرؓ کے حالات بیان کرتے ہوئے جوں کا توں لے لیا ہے۔ حضرت قرظہ بن کعبؓ سے روایت ہے :

خرجنا فشیّعنا عمرُ الی صرارٍ ثُمّ دعا بماءٍ فتوضأ ثم قال أتدرون لِمَ خرجتُ معکم قلنا أردتَ أن	ہم (مدینے سے) نکلے تو حضرت عمر ہماری مشایعت میں صرار نامی مقام تک آئے پھر آپؓ نے پانی طلب کر کے وضو کیا پھر فرمایا تم لوگوں نے سمجھا بھی کہ میں

تشنعنا و تکرمنا قال: إنَّ مع ذلك لحاجة، إخرجت إنكم تأتون بلدة لأهلها دوي بالقرآن كدوي النحل فلا تصدوهم بالأحاديث عن رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتشغلوهم جردوا القرآن واقلّوا الرواية عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امضوا وأنا شریککم

(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص)

تمہارے ساتھ (مدینہ سے) نکل کر کیوں آیا عرض کیا ہم لوگوں کی مشایعت اور عزت افزائی کے لیے فرمایا اس کے سوا بھی ایک ضرورت تھی میرے نکلنے کی وہ یہ کہ تم ایسے شہر میں پہونچو گے جس کے باشندوں میں قرآن کی تلاوت اس طرح گونجتی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ دیکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کر کر کے تم ان لوگوں کو (قرآن کی مشغولیت سے) روک نہ دینا قرآن کو استوار کرتے چلا جانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرنے میں کمی کرنا۔ اب جاؤ میں تمہارا ساتھی ہوں۔

روایت حدیث سے منع کرنے کے ثبوت میں بنیادی طور پر تو یہی روایت منکرین حدیث کی جانب سے بار بار پیش کی جاتی ہے البتہ اس روایت سے جو نتیجہ وہ اخذ کرتے ہیں اس میں قوت پیدا کرنے کے لیے بعض ایسے اقوال بھی بطور تائید پیش کیے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر روایت حدیث سے روکنے میں اس قدر سخت تھے کہ ان کی وفات کے بعد بھی لوگ ان کی سختی کو یاد کر کے کانپ اٹھتے تھے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ کا ایک قول نقل کیا جاتا ہے جس کو ان کے شاگرد ابو سلمہ نے روایت کیا ہے کہ

قلت له كنت تحدث في زمان عمر هكذا فقال لو كنت أحدث في زمان عمر مثل ما أحدثكم لضربني بمخفقة

(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص)

میں نے (حضرت ابوہریرہ سے) پوچھا کہ کیا آپ حضرت عمر کے زمانے میں بھی اسی طرح احادیث روایت کرتے تھے تو انہوں نے کہا اگر میں حضرت عمر کے زمانے میں اسی طرح روایت کرتا جیسے اب کرتا ہوں تو عمر مجھے درّے مارتے۔

اسی سے ملتے جلتے مضمون کا حامل ایک اور قول بھی پیش کیا جاتا ہے جو دوسری صدی ہجری

کے مشہور محدث سفیان بن عیینہ کی طرف منسوب ہے کہ حدیث کے طلبہ جب ان کے حلقۂ درس میں آتے تو کبھی کبھی ان کو مخاطب کر کے حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے :

لَوْ اَدْرَكْنَا وَ اِيَّاكُمْ عُمَرُ لَاوْجَعَنَا ضَرْبًا ۔ (جامع بیان العلم جلد ا صہ ۱۲۵)	اگر حضرت عمر ہمیں اور تمہیں پا لیتے تو ضرور ہمیں مار کر دکھ پہونچاتے ۔

غرض اسی قسم کی مختلف روایتیں پیش کر کر کے منکرین حدیث ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمر روایتِ حدیث کے قائل نہ تھے اور لوگوں کو حدیثیں روایت کرنے سے روکنے میں اس قدر سختی سے کام لیتے تھے کہ لوگ ان سے ڈرتے تھے۔ منکرین حدیث ان روایات سے جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ کس حد تک غلط ہے اس پر گفتگو کرنے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ان میں سے اکثر روایات کی صحت میں محدثین کو کلام ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ بعض لوگوں کو ان روایتوں کی صحت میں شبہ ہے ۔ علامہ ابن حزم نے بھی کتاب الاحکام میں حضرت عمرؓ کی طرف منسوب اس قسم کی روایات کے راویوں پر جرح کر کے ان روایتوں کو مشتبہ و مشکوک قرار دیا ہے ؛

روایت میں کمی کا مشورہ

تاہم ان روایتوں کی صحت و ثاقت سے قطع نظر حیرت تو اس بات پر ہے کہ حضرت قرظہ بن کعب سے مروی وہ روایت جس کی بنیاد پر روایت حدیث سے ممانعت کی ساری عمارت کھڑی کی گئی ہے بجائے تائید کرنے کے منکرین حدیث کے دعوے کی کھلی تردید کرتی ہے۔ حدیث دشمنی کی پاداش میں شاید اللہ نے ان کی عقلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ اتنی تمیز بھی نہ رہی کہ کونسی بات ان کے حق میں جاتی ہے اور کونسی ان کے خلاف اس روایت کے الفاظ پر پہلے اچھی طرح غور تو کر لیا ہوتا۔ حضرت عمر نے روایتِ حدیث سے روکتے وقت یہ نہیں کہا کہ میں تم لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرنے سے منع کرتا ہوں بالکل کوئی حدیث روایت نہ کرنا بلکہ کہا یہ ہے کہ حدیثیں کم روایت کرنا۔ حضرت عمرؓ

کے الفاظ ہیں واقلوا الروایۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں روایت کرنے میں کمی کرنا) ان الفاظ سے روایتِ حدیث کی ممانعت تو بہت دُور کی بات ہے الٹا یہ مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث کا حکم دے رہے ہیں۔ جب کسی کام کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس کام کے کرنے میں ذرا کمی کرنا تو اس کا کھلا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کام کو کرتے ضرور رہنا۔ مخاطب کو اس کام سے جو تعلق خاطر ہے اس کے پیشِ نظر چونکہ خدشہ یہ ہے کہ کہیں حدِ اعتدال سے نکل کر کثرت سے اس کام میں انہماک نہ پیدا ہو جائے جو بعض مصالح کے تحت مقصود نہیں اس لیے کہا یہ جاتا ہے کہ اس کام میں کمی ہی رکھنا کہ وہی مطلوب ہے۔ اس کو ایک قریب کی مثال سے سمجھئے کوئی شخص کھانوں کا بہت شوقین ہو اور اس بنا پر خدشہ یہ ہو کہ انواع و اقسام کے کھانے دیکھ کر اپنے اُوپر قابو نہ رکھ سکے گا۔ ضرورت سے زیادہ کھالے گا اس خدشے کے پیشِ نظر طبیب اسے کہے کہ دعوت میں جا تو رہے ہو مگر کھانے میں کمی ہی رکھنا تو کیا یہ سمجھا جائے گا کہ طبیب نے کھانا کھانے سے اسے بالکل منع کر دیا ہے صاف ظاہر ہے کہ ہر کوئی طبیب کے اس جملے سے یہی مطلب اخذ کرے گا کہ کھانا کھانے سے روکا نہیں جا رہا ہے بلکہ اجازت دی جا رہی ہے کہ کھانا کھاؤ ضرور مگر کم کھاؤ۔ صحابہ کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرنے سے زیادہ کونسی چیز مرغوب ہو سکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ احادیث نبویہ صحابہ کی محبوب ترین روحانی غذا تھی اور حضرت عمرؓ روحانی طبیب ہونے کی حیثیت سے جس چیز سے منع کر رہے تھے وہ یہی تھی کہ روایتِ حدیث میں تمہارے اپنے تعلق خاطر کی بنا پر ضرورت سے زیادہ انہماک نہ ہو جائے گویا بالواسطہ طور پر اس بات کی تو اجازت کیا حکم دے رہے ہیں کہ احادیث نبویہ ضرور روایت کرنا مگر ساتھ ہی اس بات کی تاکید کر رہے ہیں کہ حدِ اعتدال میں رہتے ہوئے حدیثیں روایت کرنے میں کمی کرنا۔

حضرت ابوہریرہ اور حضرت سفیان بن عیینہ وغیرھما کے جو اقوال تائید کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ان کے الفاظ بھی یہی بتلا رہے ہیں کہ ان حضرات کو حضرت عمرؓ کی سختی کا خیال آتا تھا تو کثرت سے حدیثیں روایت کرنے کی بنا پر۔ حضرت ابوہریرہ کا یہ فرمانا کہ

لو کنتُ اُحدِّثُ فی زمان عمرَ مثلَ ما اُحدِّ ثکم (اگر میں حضرت عمر کے زمانے میں اسی طرح حدیث روایت کرتا جیسے اب کرتا ہوں) اسی طرح حضرت سفیان کو روایت حدیث کے لیے باقاعدہ حلقہ بنا کر بیٹھنے پر یہ خیال آتا کہ اگر حضرت عمرؓ اس طرح مجمع بنا کر حدیثیں روایت کرتے ہمیں دیکھ لیتے تو ضرور ہمیں سزا دیتے ان سب سے یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے کہ جس کثرت سے ہم اب حدیثیں بیان کرتے ہیں اسی کثرت سے اگر حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کرتے تو ضرور سزا پاتے۔ مطلق انکارِ روایت کا مفہوم کسی طرح بھی ان اقوال سے سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ واقعہ بھی جس میں ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ نے بعض صحابہ کو حدیثیں روایت کرنے پر سزا دی تھی اور جس پر تفصیلی بحث آگے آرہی ہے۔ یہی ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو ان حضرات سے شکایت تھی تو اس بات کی کہ وہ بہت زیادہ حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ سزا دیتے وقت حضرت عمرؓ نے ان کی غلطی کا ذکر کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ یہی بات کہی تھی کہ اِنّکم قد اَکثرتُم الحدیثَ (تم لوگ بہت زیادہ حدیثیں روایت کیا کرتے ہو)۔ ان الفاظ کا اس کے علاوہ کوئی مطلب نکلتا ہی نہیں کہ بہ کثرت حدیثوں کی روایت سے حضرت عمرؓ منع کرتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے بھی جامع بیان العلم میں ان روایتوں کا تذکرہ کرکے لکھا ہے کہ

ھٰذا یدلُّ علیٰ نھیہٖ عن الاکثار وأمرہٖ بالاِقلالِ من الرّوایۃِ عن رسولِ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔	یہ روایات اس بات کی دلیل ہیں کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث میں کثرت اور زیادتی کو روکنا چاہتے تھے اور اس بات کا حکم کرتے تھے کہ روایت حدیث میں کمی کی راہ اختیار کی جائے۔

(جامع بیان العلم ص ۱۲۲)

بہر حال ان روایات سے جو منکرین حدیث کی طرف سے بار بار پیش کی جاتی ہیں انکے الفاظ کو خواہ کسی طرح توڑ مروڑ لیا جائے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث سے بالکلیہ منع کرتے تھے۔ منکرین حدیث یا تو کوئی اور ایسی روایت پیش کریں جو ان کے دعوے کو واقعی درست ثابت کردے اور یہ یقینی بات ہے کہ وہ کوئی ایسی روایت پیش نہیں کرسکتے تو پھر انہیں یہ مان لینا چاہیئے کہ ان روایات سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر روایت حدیث کی کثرت سے منع فرماتے تھے۔ ظاہر ہے منکرین حدیث یہ بات ماننے کے لیے کبھی تیار نہ ہوں گے کیونکہ وہ اگر یہ

مان لیں تو پھر منطقی نتیجے کے طور پر انہیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث کو ناپسند نہیں فرماتے تھے اس لیے کہ آپ کے نزدیک اگر روایت حدیث ناپسندیدہ ہوتی تو پھر کمی زیادتی کی کیا بحث دونوں ہی سے رک جانے کا حکم دیتے۔ کسی ناپسندیدہ کام کے بارے میں یہ کہنے کا تو کوئی مطلب ہی نہیں کہ اس کام کو کم کرنا ایسے موقعہ پر تو صاف یہ کہا جاتا ہے کہ اس کام کو مت کرنا۔ ان روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہی بات حافظ ابن عبدالبر نے بھی کہی ہے۔ فرماتے ہیں:

ولو کرہ الروایۃ وذمّہا لنھی عن الاقلال والاکثار (جامع بیان العلم ج ۲ صـ ۱۲۳)۔	اگر آپ مطلق روایت کو ناپسند کرتے اور بُرا جانتے تو زیادتی اور کمی دونوں ہی سے منع کرتے۔

سیدھی سی بات ہے معمولی تامّل سے سمجھ میں آ جانے والی بات۔ اگر حضرت عمرؓ کی نظر میں حدیث کی روایت کرنا معاذ اللہ کوئی بُرا کام ہوتا تو پھر ان روایات کا مطلب یہ نکلا کہ حضرت عمرؓ زیادہ بُرا کام کرنے سے روک رہے ہیں لیکن تھوڑا سا بُرا کام کر لینے کی اجازت دے رہے ہیں بلکہ صرف اجازت ہی نہیں کہہ یہ رہے ہیں کہ اس تھوڑے سے بُرے کام میں میں خود بھی تمہارا شریک ہوں آخر میں امضوا وانا شریککم (اب جاؤ میں تمہارا ساتھی ہوں) کہنے کا تو یہی مطلب ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی کیسی غیر معقول بات حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کی جا رہی ہے۔

کثرت روایت سے روکنے کی وجہ

اب رہا یہ سوال کہ حضرت عمرؓ کثرت روایت ہی سے آخر کیوں منع کرتے تھے اگر حدیث روایت کرنا کوئی نیک کام ہے تو پھر جتنا زیادہ یہ نیک کام کیا جاتا بہتر تھا حضرت عمرؓ ایک نیک کام کی انجام دہی میں کمی پر کیوں اصرار کرتے تھے تو اس کے جواب کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے وہ الفاظ کافی ہیں جو ان روایات پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے ازالۃ الخفا میں بطور تبصرہ ارشاد فرمائے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

باستقراء تام معلوم شد کہ فاروق اعظم نظر دقیق را در تفریق میان احادیث کہ بہ تبلیغ شرائع و	اچھی طرح تلاش و تفتیش سے معلوم ہوا کہ فاروق اعظم کی دقیق نظر حدیث کے دونوں حصوں میں امتیاز

تکمیل افراد بشر تعلق دارد از غیراں مصروف
می ساخت۔ لہٰذا احادیث شمائل واحادیثِ
سنن زوائد در لباس و عادات کمتر روایت
می کرد۔ اینہا از علوم تکلیفیہ تشریعیہ نیست
یحتمل کہ چوں اہتمام تام بر روایت آں بکار برند
بعض اشیاء از سنن زوائد بہ سنن ھدیٰ
مشتبہ می گردد۔

(ازالۃ الخفاء ج-۲ ص۱۴۱)

پیدا کرنے پر جمی رہی یعنی وہ حصہ جو شرائع
کی تبلیغ اور انسانی افراد کی تکمیل سے متعلق
تھا اس میں مشغول رکھ کر دوسرے حصے میں
انہماک سے لوگوں کو روکتے تھے اسی لیے شمائل
نبوی سے متعلق احادیث اور سنن زوائد پر مشتمل
احادیث جن کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے لباس اور آپ کی عادات سے تھا ان کو کم
روایت کرتے تھے چونکہ ان حدیثوں کا شمار ان
علوم میں نہیں ہے جن کا لوگوں کو مکلف بنایا گیا
ہے اور عام تشریح وقانون کی حیثیت ان کی
نہیں ہے اس لیے اس کا احتمال تھا کہ اگر زیادہ
توجہ ان کی اشاعت میں کی جائے گی تو سنن زوائد
اور سنن ہدیٰ آپس میں خلط ملط ہو جائیں گے۔

دین کے بیناتی اور غیر بیناتی حصوں میں امتیاز

دراصل یہ وہی بات ہے جو اس سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے ذکر کے ضمن میں عرض کی جا چکی ہے کہ یہ سب کچھ صرف اس لیے تھا کہ خبر آحاد والی روایتوں میں تواتر کی کیفیت پیدا نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے دین کے بیناتی حصہ کے مطالبوں کی جو قوت ہے وہی قوت لوگ ان روایتوں کے مطالبوں میں بھی محسوس کرنے لگیں یعنی دین کے بیناتی اور غیر بیناتی حصے کہیں آپس میں گڈمڈ نہ ہو جائیں دین کے ان دونوں حصوں میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ اختیار فرمایا تھا کہ اول الذکر کی تبلیغ واشاعت میں عمومیت کا رنگ جس حد تک پیدا ہو سکتا تھا اس کے پیدا کرنے پر پورا زور صرف فرمایا اور مؤخر الذکر حصے کو پہنچانے کی حد تک تو آپؐ نے پہونچایا لیکن اس کو ہر شخص تک پہونچانے کی کوشش نہیں کی گئی مقصد یہی تھا کہ دین کے ان دونوں حصوں کے مطالبوں میں

قوت وضعف کا فرق برقرار رہے جو دین میں سہولت و آسانی کے پیشِ نظر بہت ضروری تھا اپنے عہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پوری نگرانی فرمائی آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانے میں اس امتیاز کو برقرار رکھنے پر پورا زور صرف فرمایا اور ایسی ہی غرض حضرت عمرؓ کے پیشِ نظر تھی جس کے لیے آپ کثرتِ روایت سے منع فرماتے تھے۔

کذب سے حفاظت

اس اہم مقصد کے علاوہ ایک اور مصلحت بھی تھی جس کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ کثرتِ روایت سے لوگوں کو منع فرماتے تھے۔ دراصل کثرتِ روایت کی صورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب ہو جانے کا اندیشہ قلتِ روایت کی صورت کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ حضرت عمرؓ کو فکر یہ تھا کہ کہیں کثرتِ روایت کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں جھوٹ سچ کی آمیزش نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے تعداد میں کم احادیث حافظہ میں آسانی سے محفوظ رکھی جا سکتی ہیں جتنی زیادہ احادیث ہوں گی اتنا ہی ان کو یاد رکھنا مشکل ہوگا اور اسی قدر بھول چوک اور غلطی کا امکان بڑھے گا۔ اس لیے بجائے اس کے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ احادیث بیان کرنے کے شوق میں کوئی غلط بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر بیٹھے اور اپنے ہاتھوں جہنم کو اپنا ٹھکانہ بنالے بہتر یہ ہے کہ کم سے کم حدیثیں بیان کرے۔ صحابہ کے درمیان یہ حدیث بہت مشہور تھی جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مَن کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ (جس نے جان بوجھ کر کوئی غلط بات میری طرف منسوب کی اسے چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ بخاری کتاب العلم) کثرتِ روایت سے روکتے وقت معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ کے لیے یہی حدیث ایک محرک قوت کے طور پر کام کر رہی تھی۔ ایک مرتبہ کسی نے حضرت عمرؓ سے قلتِ روایت کے بارے میں استفسار فرمایا تو آپ نے اسی خطرے کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:

لَوْ لَا اَنِّیْ اُکْرِہُ اَنْ اَزِیْدَ فِیْ ... | اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ روایت حدیث میں مجھ سے

الحدیثِ اَوْ اَنقص فحد ثتکم بہ۔
(انساب الاشراف للبلاذری)

کمی بیشی ہو جائے گی تو میں تم سے حدیث بیان کرتا۔

اسی کمی بیشی سے ڈرتے ہوئے حضرت عمرؓ خود بھی حدیثیں کم روایت کرتے تھے اور یہی ڈر ان کو مجبور کرتا تھا کہ دوسرے لوگوں کو بھی کثرت سے حدیثیں روایت کرنے سے روکیں۔ علامہ ذہبی اسی موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

وقد کان عمر من وجلہ یخطی الصاحب علی رسول اللہ یامرھم ان یقل الروایۃ عن نبیھم (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷)

حضرت عمرؓ اس ڈر سے کہ صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں غلطی نہ کریں ان کو حکم دیتے تھے کہ رسول اللہ سے روایت کم کریں۔

روایت میں احتیاط

حضرت عمر دراصل چاہتے یہ تھے کہ صرف ان احادیث کی روایت کی جائے جن کے متعلق راوی کو پورا اطمینان ہو کہ جو اس نے دیکھا یا سنا ہے وہی کچھ وہ بیان کر رہا ہے۔ چنانچہ بعض مرتبہ کوئی حدیث بیان کر کے آپ مخاطبین سے کہتے کہ جس نے اس حدیث کو خوب اپنے حافظے میں جما لیا ہے اسے چاہیئے کہ وہ جہاں جہاں جائے اس حدیث کو بیان کرتا چلا جائے۔ حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں ایسا ہی ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بار ایک حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت عمر نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا :

من وعاھا وعقلھا وحفظھا فلیحدث بھا حیث تنتھی بہ راحلتہ ومن خشی ان لا یعیھا فانی لا احل لہ ان یکذب علی۔
(جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۲۲)

جس نے اس حدیث کو اچھی طرح حافظے میں جما لیا اور اس کو سمجھ لیا اور یاد کر لیا اسے چاہیئے کہ وہ اس حدیث کو ان مقامات تک بیان کرتا چلا جائے جہاں پہنچ کر اس کی سواری رک جائے مگر جسے اندیشہ ہے کہ حدیث کو پوری طرح دل میں جما نہیں سکا میں اس کے لیے جائز نہ کروں گا کہ وہ میری طرف جھوٹ کو منسوب کرے۔

بات یہی ہے حضرت عمرؓ کا اصل مقصود صرف ان لوگوں کو روکنا تھا جن کو اپنی یاد داشت اور حافظے پر پورا اطمینان اور اعتماد نہ ہو۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی وہ مشہور حدیث جس میں تین بار سلام کے ذریعے استیذان کے طریقے کا ذکر ہے اور جس کے روایت کرنے پر حضرت عمرؓ نے تصدیق کے لیے کسی شاہد کا مطالبہ کیا تھا۔ اس میں بھی ذکر ہے کہ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے خاص طور سے جس بات کا ذکر کیا وہ یہی تھی کہ اگر تمہیں حدیث پوری طرح یاد ہے تو خیر ورنہ میں تم کو دوسروں کے لیے باعثِ عبرت بناؤں گا۔ جمع الفوائد میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا :

اِن کانَ ھٰذا شیئًا حفظتَہ، من رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبھا والّا لاجعلنّک عظۃً۔ (جمع الفوائد صـ۱۴۴)۔	اگر یہ کوئی ایسی بات ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر تم نے یاد کر لیا تو خیر ورنہ میں تم کو دُوسروں کے لیے عبرت بناؤں گا۔

حقیقت یہی ہے کہ حضرت عمرؓ کو خوف تھا تو اس بات کا کہ کہیں لوگ ان احادیث کو بھی بیان کرنے پر جری نہ ہو جائیں جو ان کو اچھی طرح محفوظ نہ ہوں یا جن کے بارے میں انہیں اپنی یاد پر پُورا بھروسہ نہ ہو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے ان کی روایت پر جو گواہ طلب کیا گیا تھا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ حضرت عمر کو ان پر اعتماد نہ تھا بلکہ وہ دکھانا یہ چاہتے تھے کہ جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے ساتھ ایسی سختی کا معاملہ ہے تو عام آدمی کو خود ہی سمجھ لینا چاہیئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بے احتیاطی سے کوئی غلط بات منسوب کرنے کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ نے جب حضرت ابوسعید خدریؓ کو اپنی تائید میں پیش کیا تو بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو خطاب کر کے فرمایا :

اَمَا اِنّی لَمْ اَتّھِمْکَ ولکن خشیتُ اَن یتقوّل النّاسُ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔	خبردار میں تم کو غلط بیانی سے متہم نہیں کرتا لیکن ڈرتا ہوں کہیں لوگ غلط باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ منسوب کرنے لگیں۔

غرض حضرت عمرؓ کثرت روایت سے اگر منع کرتے تھے تو آپ کے پیشِ نظر یہی دو مقصود تھے اوّل یہ کہ کثرت روایت کی بنا پر کہیں خبر احاد پر مبنی احادیث میں عمومیت کی کیفیت نہ پیدا ہو جائے اور دوم یہ کہ اس طرح نبی کریم صلی اللہ کی احادیث میں جھوٹ پیج کی آمیزش نہ ہو جائے۔

متذکرہ بالا وضاحتوں کی روشنی میں جو لوگ حق کے طالب ہیں ضد اور تعصب میں مبتلا نہیں ہیں ان پر پوری طرح یہ بات روشن ہو گئی ہو گی کہ حضرت قرظہ بن کعب والی روایت ہو یا اس کی تائید میں پیش کیے جانے والے دیگر اقوال ہوں کسی سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عمرؓ بالکلیہ حدیثیں روایت کرنے سے منع کرتے تھے اور اس طرح حدیث کو معاذ اللہ دین سے خارج کر دینا چاہتے تھے ؛

روایت حدیث پر سزا

اَب رہی وہ روایت جس میں ذکر ہے کہ بعض صحابہ کو حضرت عمرؓ نے حدیثیں روایت کرنے پر سزا دی تھی تو اس کے بارے میں بعض ناواقف حضرات کو یہ معلوم کر کے شاید حیرت ہو کہ یہ حدیث سب کے نزدیک موضوع ہے۔ حیرت کی بات ہے منکرین حدیث ایک طرف وضع حدیث کا رونا روتے رہتے ہیں اور دوسری طرف خود ہی اپنی تائید میں موضوع احادیث سے استدلال بھی کرتے رہتے ہیں اس طرح اندھیرے میں رکھ کر عامۃ الناس کو بھی آخر کب تک یہ لوگ بے وقوف بنا سکیں گے حق چھپا نہیں رہتا بالآخر ان کے فریب کا پردہ چاک ہو ہی جاتا ہے۔ یہ روایت امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں سعید بن ابراہیم کے حوالے سے نقل کی ہے کہ ان کے والد ابراہیم کہتے تھے۔

انّ عمر حبس ثلاثۃً ابنَ مسعودٍ وأبا الدرداء و أبا مسعود ن الانصاریَّ فقالَ اِنّکم قد اکثرتم الحدیثَ عن رسولِ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔
(تذکرۃ الحفاظ جلد ۱)۔

حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت ابوالدرداء اور حضرت ابومسعود انصاری تین آدمیوں کو محبوس کر دیا تھا اور کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تم نے بہت زیادہ حدیثیں بیان کرنا شروع کر دی ہیں۔

علّامہ ابن حزم ظاہری جو روایت بالحدیث اور تمسک بالحدیث میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اس روایت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی سند کو ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں اور اس کے نفسِ مضمون کو کذب و افترا سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں :

إنَّ الخبرَ فی نفسِہ ظاھرالکذب والتولید۔ (کتاب الاحکام جلد ۳)	یہ روایت فی نفسہ کذب اور افترا کا نمونہ ہے۔

اِس روایت کو علّامہ نے سند کے لحاظ سے منقطع قرار دیا ہے اس لیے کہ اس کے اصل راوی ابراہیم بن عبدالرحمٰن کا سماع حضرت عمر سے ثابت نہیں امام بیہقی نے بھی یہی لکھا ہے۔ ابراہیم بن عبدالرحمٰن ۹۵ھ یا ۹۹ھ میں بعمر ۷۵ سال فوت ہوئے بنابریں وہ ۲۰ھ میں خلافت فاروقی کے اواخر میں پیدا ہوئے ظاہر ہے اس قدر چھوٹی عمر میں حضرت عمر سے انہوں نے کیسے یہ روایت سُنی ہو گی اس کے علاوہ سوچنے کی بات ہے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت عمرؓ نے بعض صحابۂ کبار کو صرف اس لیے قید کر دیا تھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرتے تھے تو لازم آتا ہے کہ ہم یہ بھی تسلیم کریں کہ حضرت عمرؓ معاذ اللہ دین کی تبلیغ سے زبردستی روکتے تھے اور احکامِ دین کو لوگوں سے چھپانا چاہتے تھے۔ کتنی غیر معقول بات ہے یہ۔ کسی عام مسلمان سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی چہ جائیکہ حضرت عمرؓ جیسے اولوالعزم خلیفۂ رسول کی طرف اس کی نسبت کی جائے۔ اس کے علاوہ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت عبداللہ بن مسعود کو "علم سے بھرا ہوا ایک ظرف" بھی کہتے جائیں اور پھر اسی بات پر ان کو قید کی سزا بھی دیں کہ انہوں نے اس علم کو دوسروں تک کیوں پہونچایا ہمارا اشارہ اس روایت کی طرف ہے جسکو طبقات ابن سعد میں زید بن وہب سے نقل کیا گیا ہے اور جس میں ذکر ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک دبلا پتلا آدمی آیا تو اس کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے تین بار یہ بات دہرائی کہ "یہ ایک ظرف ہے علم سے بھرا ہوا" اور وہ آنے والا شخص حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے[1]۔

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۱۱۰

حضرت عمرؓ حضرت عبداللہ ابن مسعود کو انتہائی عزیز رکھتے تھے۔ ایک موقعہ پر اپنے ایک عامل کی طرف کسی ضرورت سے ان کو روانہ فرمایا تو عامل کے نام خط میں لکھا کہ میں عبداللہ بن مسعود کو اپنے پاس رکھنے کی بجائے تمہارے پاس بھیجنے میں بڑے ایثار سے کام لے رہا ہوں[1] کیا ایسے عزیز اور محبوب شخص کو حضرت عمرؓ محض اس جرم میں قید میں ڈال دیتے کہ وہ لوگوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتا ہے اسی طرح حضرت ابوالدرداء کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ان کو حضرت عمرؓ نے شام میں مسلمانوں کا معلم مقرر کیا تھا[2]۔ ایک طرف ان کو علم سکھانے پر مقرر کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اسی علم کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے پر ان کو قید کیا جا رہا ہے۔ منکرین حدیث خدارا کچھ تو سوچیں یہ کیسا عملی تضاد ہے جو حضرت عمر جیسے جلیل القدر صحابی کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ اگر حدیثیں روایت کرنے پر سزا دینا مقصود تھا تو حضرت عمرؓ سب سے پہلے ان لوگوں کو سزا دیتے جن کی مرویات سینکڑوں اور ہزاروں سے متجاوز ہیں بڑے تعجب کی بات ہے کہ حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے مکثرین صحابہ کو حضرت عمرؓ کچھ نہیں کہتے اور قید میں ڈال دیتے ہیں تو بے چارے حضرت ابوالدرداء اور ابومسعود انصاری جیسے اصحاب کو جن کی مرویات کی تعداد سو دو سو سے آگے نہیں بڑھتی اور جو بے چارے متوسطین میں بھی نہیں مقلین میں شمار ہوتے ہیں۔

غرض کسی معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے کی بھی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ حضرت عمرؓ نے محض اس بنا پر بعض صحابہ کو قید کر دیا تھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کیا کرتے تھے لہٰذا متذکرہ روایت کے بارے میں علامہ ابن حزم ظاہری کے یہ الفاظ بالکل مبنی برحقیقت ہیں کہ ان الخبر فی نفسہ ظاھر الکذب والتولید (یہ خبر فی نفسہ کذاب وافترا کا نمونہ ہے)۔

---

[1] السنۃ ومکانتہا ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی [2] السنۃ ومکانتہا ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی

البتہ یہ ممکن ہے کہ اس روایت میں حَبَسَ کا لفظ قید کرنے کے معنی میں نہیں بلکہ روک دینے کے معنی میں استعمال ہُوا ہو اس صورت میں ہم کم از کم درایت کے اعتبار سے اس روایت کو قابل قبول قرار دے سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس روایت کو بھی پھر انہی روایات کی قبیل سے تصوّر کیا جائے گا جن میں ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ نے بعض اصحاب کو کثرت روایت سے روک دیا تھا۔ اس روایت کے الفاظ بھی ہمارے اس خیال کی تائید کرتے ہیں اِنّکم قد اکثرتم الحدیث کا یہی مطلب تو ہے کہ تم نے حدیثوں کے بیان کرنے میں اکثار کی راہ اختیار کی ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ اب تم حدیث روایت ہی نہ کیا کرو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ فلاں کام میں چونکہ تم سے احتیاط نہیں برتی جاتی اس لیے اس سے تو اچھا ہے تم وہ کام کرو ہی مت ⁂

مکتوب ذخیرے جلانا

مختصر یہ ہے کہ منکرین حدیث کی طرف سے پیش کی جانے والی کسی روایت سے بھی نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث سے بالکلیہ منع کرتے تھے اور نہ ہی یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے حدیثیں روایت کرنے پر بعض صحابہ کو قید کر دیا تھا۔ اس کے بعد اب ہم اس روایت کا جائزہ لیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے اپنے زمانے میں احادیث کے مکتوب ذخیرے منگوا کر ان کو جلا دیا تھا۔ اس سلسلے میں عموماً جو روایت پیش کی جاتی ہے اس کو ابن سعد نے قاسم بن محمد کے حوالہ سے طبقات میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

اِنّ الاحادیثَ قد کثرت علیٰ عہدِ عمر بنِ الخطّابِ فانشد النّاسَ اَن یّاتوہ بھا فلمّا اتوہ بھا امر بتحریقھا۔	حضرت عمر بن خطّاب کے زمانے میں حدیثوں کی بھر کثرت ہو گئی تب حضرت عمر نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے سامنے پیش کریں جب لوگوں نے پیش کر دیا تو آپ نے ان کو جلانے کا حکم دے دیا۔

(طبقات ج ۔ ۵)

منکرین حدیث کا استدلال

اس روایت کے سلسلے میں بنیادی بات غور کرنے کی یہ ہے کہ حدیثوں کے نذر آتش کرنے کے اس

واقعہ سے منکرین حدیث جو نتیجہ نکالتے ہیں کیا وہ درست ہے۔ منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ احادیث نبویہ کو محفوظ کرنے کے اس قدر مخالف تھے کہ جن لوگوں کے پاس لکھی ہوئی حدیثیں پائی گئیں ان سب کو منگوا کر آپ نے نذرِ آتش کر دیا اور پھر اسی پر اپنی طرف سے ایک نتیجہ مرتب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ حدیث نبوی کو دین میں حجت نہیں سمجھتے تھے ::

حدیث کی مخالفت نہیں حمایت

جہاں تک حضرت عمرؓ کے نزدیک حدیث کے دین میں حجت سمجھے جانے کا تعلق ہے اس پر تفصیلی بحث حضرت عمرؓ سے متعلق گفتگو کی ابتدا کرتے وقت گزر چکی ہے اس وقت تو صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ حدیثوں کے نذرِ آتش کر دینے کے اس واقعے سے حفاظت حدیث کی مخالفت نہیں حمایت ثابت ہوتی ہے منکرین حدیث جو کچھ کہہ رہے ہیں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے حضرت عمرؓ حفاظت حدیث کے مخالف نہیں زبردست داعی تھے۔

اس سلسلے میں منکرین حدیث کی توجہ پہلے اس روایت کی طرف مبذول کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے جس کو بیہقی نے مدخل میں اور ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں عروہ بن زبیر کی زبانی نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

اَنَّ عمرَ بن الخطابِ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اَرادَ اَنْ یکتبَ السُّنَنَ فاستشارَ فی ذلک اصحابَ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاَشاروا علیہ ان یکتبھا فطفِقَ عمرُ یستخیرُ اللہ فیھا شھرًا ثُمَّ اَصبحَ یومًا وقد عزمِ اللہُ لہٗ فقال اِنِّی کنتُ اُریدُ اَنْ اَکتبَ السنن واِنِّی ذکرتُ قومًا کانوا قبلکم کتبوا کتابًا	حضرت عمرؓ نے احادیث نبویہ کی کتابت کا ارادہ فرمایا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے اس سلسلے میں مشورہ طلب کیا سب نے بالاتفاق یہی مشورہ دیا کہ احادیث نبویہ کی کتابت کرانی چاہیے۔ اس کے بعد حضرت عمر ایک ماہ تک اللہ تعالیٰ سے اس بارے میں استخارہ کرتے رہے ایکدن صبح کو اُٹھے اور اس وقت تک حق تعالیٰ نے فیصلہ کی یکسوئی عطا فرما دی تھی تو فرمایا میں نے حدیثوں کو قلم بند کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن مجھ کو گذشتہ

ناکتبوا علیها و ترکوا کتاب اللہ و انی لا اشوب کتاب اللہ بشیٍ ابداً۔ (جامع بیان العلم صـ۳۳)	قوموں کا خیال آیا کہ انھوں نے کتاب لکھی اور اسی پر ٹوٹ پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھیں خدا کی قسم میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کسی اور چیز کا ملانا پسند نہیں کرتا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بار احادیث بنویہ کو قلم بند کرانے کا ارادہ کیا تھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ اگر حفاظت حدیث کے مخالف تھے تو پھر احادیث بنویہ کو قید تحریر میں لانے کا خیال ہی آپ کو کیوں آیا اور اس خیال کو آپ نے اتنی اہمیت کیوں دی کہ اسے صحابہ کی مجلس کے سامنے پیش کیا اس پر بھی اطمینان نہ ہُوا تو مہینہ بھر تک استخارہ کرتے رہے۔ کسی چیز کو قید تحریر میں لانے سے مقصود اس کی حفاظت کرنا ہوتا ہے یا اس کو ضائع کرنا ؟ انکار حدیث کی تو ساری عمارت ہی کتابت و عدم کتابت کے فرق پر استوار کی گئی ہے منکرین حدیث کے نزدیک تو حفاظت کا ذریعہ ہے ہی صرف کتابت تو پھر بتلائیے حضرت عمرؓ کتابت حدیث کرانا چاہتے تھے تو حفاظت مقصود تھی یا نہیں۔ ہاں البتہ اب بات سوچنے کی یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے اس ارادے کو عملی جامہ کیوں نہیں پہنایا جبکہ دیگر صحابہ کا بھی یہی مشورہ تھا کہ احادیث بنویہ کو قلم بند کرا لیا جائے بس یہی ہے وہ سوال جس کے جواب کی روشنی میں اصل حقیقت واضح ہوتی ہے اور حدیثوں کے نذر آتش کرنے کا اصل مقصود کھل کر سامنے آتا ہے:

قرآن اور حدیث میں امتیاز

ہمارے اس سوال کا جواب حضرت عمرؓ نے خود ہی دے دیا ہے حضرت عمر کو خطرہ تھا تو یہی پرانا کہ کہیں قرآن اور حدیث آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں واللہ لا اشوب کتاب اللہ بشیٍ ابداً (خدا کی قسم میں کتاب اللہ کے ساتھ کسی چیز کی آمیزش نہ ہونے دوں گا) کہہ کر حضرت عمرؓ نے در اصل اسی مفہوم کو ادا کیا ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم نے ایک موقعہ پر بعض صحابہ کو کتابت حدیث سے روکتے ہوئے اکتابٌ مع کتابِ اللہ کے الفاظ سے ادا کیا تھا بلکہ بعض روایتوں

میں حضرت عمرؓ کے الفاظ بالکل الفاظ نبویہ سے ملتے جلتے ہیں آپ فرماتے ہیں لاکتاب مع کتاب اللہ (اللہ کی کتاب کے ساتھ کوئی کتاب نہیں) گویا حدیث کی حفاظت تو مقصود ہے مگر ان تمام روایتوں کے ساتھ مقصود ہے جن کی لبطور خاص نگرانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد میں فرماتے رہے اور جن کو باقی رکھنے میں حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا یعنی حدیث کی حفاظت تو ہو مگر اس طرح کہ قرآن اور حدیث آپس میں خلط ملط نہ ہونے پائیں۔ قرآن اور وہ احادیث جو قرآن کے عملی مطالبات کی تشکیل اور اسی نوعیت کے دوسرے بنیادی احکام پر مشتمل ہیں وہ عام احادیث سے ہمیشہ ممیز اور علیحدہ رہیں گویا اس بات کا پورا اہتمام رہے کہ دین کا وہ حصہ جو تواتر و تعامل اور توارث کی دولت سے مالا مال ہے وہ دین کے اس حصے سے خلط ملط نہ ہونے پائے جس کی بنیاد وہ احادیث ہیں جن کو قصداً اور ارادتاً دین میں سہولت کے پیش نظر انفرادی معلومات تک محدود رکھا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ اگر اپنی نگرانی میں بلکہ دوسرے لفظوں میں اگر اپنی خلافت وحکومت کی جانب سے حدیثوں کو قلم بند کرا جاتے تو یہ بنیادی مقصد فوت ہو جاتا ظاہر ہے حضرت عمرؓ کے ہاتھوں مرتب شدہ مجموعے میں جو حدیثیں مندرج ہو جاتیں ان کے نتائج کے مطالبے اور گرفت کی وہ نوعیت قطعاً باقی نہ رہتی جو ان وقت خبر آحاد کی حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج کی ہے۔ حضرت عمرؓ کا مرتب شدہ وہ مجموعہ اگر آج موجود ہوتا تو ذرا اندازہ لگائیے اس مجموعے کی حدیثوں کے ساتھ اور ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے احکام وقوانین کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت و گرویدگی کا کیا عالم ہوتا۔ اس مجموعے کے متعلق مسلمانوں میں وہ احساس قطعاً باقی نہ رہتا جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خبر آحاد کی روایتوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے پیش نظر یہی خطرہ تھا جس کے انسداد کے لیے انھوں نے اگرچہ پہلے خود ہی یہ تجویز رکھی کہ احادیث نبویہ قلم بند کرلی جائیں مگر پھر خود ہی اپنی اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہے۔

صحابہ سے مشورہ اس سلسلے میں صحابہ سے مشورہ کرنا بھی یہی بتلاتا ہے کہ جس وقت حفاظت حدیث کے مقصد کے پیش نظر حضرت عمرؓ یہ سوچ رہے تھے کہ احادیث قلم بند کرالی جائیں اس وقت بھی آپ کے ذہن میں یہ خطرہ موجود تھا ورنہ سوچنے کی بات ہے نیک کام میں مشورے کی کیا ضرورت۔ حضرت عمرؓ دریافت یہ کرنا چاہتے تھے کہ کیا اس مصلحت کی رعایت کرنا اب بھی ضروری ہے جس کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر آحاد کی حدیثوں کی تبلیغ میں بجائے عمومیت کے خاص خاص افراد تک ان کے علم کو محدود رکھا تھا اور خود حضرت عمر بھی شروع شروع میں اسی مصلحت کی بنیاد پر حدیثوں کے بیان کرنے میں اقلال اور کمی پر اصرار کرتے رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ مصلحت وقتی تھی نبوت اور نبوت سے قریب تر زمانوں میں اگر ان حدیثوں میں عمومیت کا رنگ پیدا ہو جاتا تو یقیناً آئندہ زمانے میں ان حدیثوں کے مطالبات میں زیادہ سختی پیدا ہو جاتی جو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقصود نہ تھا۔ مگر بعد کے زمانے میں ان حدیثوں میں عمومیت کا رنگ پیدا ہونے سے اس خطرے کا کوئی امکان نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے مشورہ طلب امر یہی تھا کہ وہ زمانہ گزر گیا ہے یا ابھی ان اسباب کی مزاحمت کے سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے جس سے ان حدیثوں کے مطالبات میں شدت کے پیدا ہونے کا خطرہ پیش آسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے صحابہ کی اس مجلس شوریٰ نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اب وقت خاصا گزر گیا ہے اور اب اگر احادیث قید تحریر میں آکر مسلمانوں کی ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل بھی ہوتی رہیں تو عمومیت اور قطعیت میں اپنے اصل مقام سے بلند نہ ہو پائیں گی یہی مشورہ دیا کہ حضرت عمرؓ اپنی تجویز پر عمل کرتے ہوئے احادیث نبویہ کو قلم بند کرالیں مگر حضرت عمرؓ کو شرح صدر نہ ہوا۔ ان کی نظر میں ابھی خطرہ موجود تھا چنانچہ جیسا کہ حضرت عروہ بن زبیر سے منقول محولہ بالا روایت میں ذکر ہے حضرت عمرؓ نے اس معاملے میں اللہ سے استخارہ کیا اور کامل ایک مہینے تک استخارہ کرتے رہے بالآخر اللہ نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو اور جن خطرات کا اندیشہ تھا ان کے تمام گوشوں کو نئے سرے سے تازہ کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیا اور آپ کے

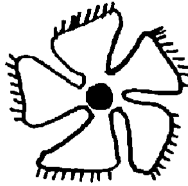
دل میں یہ عزم راسخ پیدا کر دیا کہ اپنی خلافت و حکومت کی نگرانی میں احادیث کو قلم بند نہ کرایا جائے۔ مگر معلوم ہوتا ہے لوگ انفرادی طور پر حدیثیں پھر بھی قلم بند کرتے رہے تا آنکہ اچھے خاصے مجموعے مختلف افراد کے ہاتھوں تیار ہو گئے جیسا کہ اس روایت کے الفاظ سے ظاہر ہے جو طبقات ابن سعد کے حوالے سے حدیثوں کے نذر آتش کر دینے کے واقعہ کے ضمن میں ابھی پیش کی گئی ہے اس روایت کے الفاظ ہیں اِنَّ الاحادیثَ قدکثرت علی عھد عمرَبن الخطّاب فانشد النّاسَ اَن یاتوہ بھا (حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حدیثوں کی پھر کثرت ہو گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے سامنے پیش کریں) ان تمام مجموعوں کو منگا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جلا دیا۔ گویا استخارے کے بعد آپ نے خود تو حدیثیں لکھوانے کا ارادہ ترک کر ہی دیا تھا لیکن لوگوں کے بارے میں آپ شروع میں کچھ ڈھیل سے کام لیتے رہے لیکن بعد میں آپ کو خیال آیا ہو گا کہ خلافت و حکومت کی طرف سے نہ سہی انفرادی طور پر ہی سہی جو تحریر بھی مرتب ہو گی وہ عہد فاروقی ہی کی طرف نسبت کی جائے گی اور اس طرح متذکرہ خطرہ جوں کا توں برقرار رہے گا لہٰذا اس خطرے کا پوری طرح ہی سدّباب کیوں نہ کر دیا جائے چنانچہ

فلمّا اتوہ بھا امر بتحریقھا۔ — جب وہ مجموعے لائے گئے تو آپ نے انہیں جلانے کا حکم دے دیا۔

اب اس سارے پس منظر میں حدیثوں کے نذر آتش کیے جانے کے واقعہ کو دیکھیں تو ہمارے اس دعویٰ کی حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس واقعے سے حفاظت حدیث کی مخالفت نہیں حمایت ثابت ہوتی ہے۔ حدیثوں کے مکتوب مجموعے نذر آتش کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فی الواقع حفاظت حدیث کا فریضہ انجام دیا اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ کام نہ کرتے تو جن رعایتوں کے ساتھ حدیث کی حفاظت مقصود تھی وہ پوری نہ ہوتی اور حفاظت حدیث کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا۔

کتنی حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ وہ کام جو خدمت حدیث کے طور پر پیش

کیے جانے کے قابل ہیں منکرین حدیث کی طرف سے مخالفتِ حدیث کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں بہر حال ہمارے قارئین پر تو یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہو گی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوں یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دونوں اصحاب نے اپنے اپنے زمانے میں حدیث کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے منکرین حدیث کی طرف سے جو اتہام طرازی اور بہتان تراشی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں کی جاتی ہے وہ سادہ لوح ناواقف حال مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ناکام کوشش سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی ٭



حفاظت حدیث
اور
خلفائے راشدین

حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیے جانے والے الزامات کی اصل حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اب ہم مختصر طور پر ان خدمات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو حفاظت حدیث کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر وعمر اور حضرت عثمان وعلی چاروں خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے اپنے عہد میں انجام دیں:

حفاظت حدیث اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ

سب سے پہلے حضرت ابوبکر کا نمبر آتا ہے۔ آپ کی خلافت کا زمانہ اگرچہ مدت کے لحاظ سے ایک بہت ہی مختصر زمانہ ہے یعنی صرف ڈھائی سال اور یہ ڈھائی سال بھی ایسے کہ مختلف قسم کے فتنہ وفساد اور قسم قسم کی شورشوں سے بھرپور۔ اندرون عرب بھی عدم استحکام کی سی صورت اور بیرونی خطرات کا بھی سامنا مگر اس تھوڑی سی مدت میں ہی اور ان تمام مشکلات کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حفاظتِ حدیث کے لیے جس بنیادی کام کی اس وقت ضرورت تھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے باحسن وجوہ انجام دیا۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے تین اُصولی اقدامات کا تذکرہ کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

رفع اختلاف

اوّل یہ کہ آپ نے اس بات کی بطورِ خاص نگرانی کی کہ وہ احادیث جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسلام کی سہولت پسندانہ خصوصیت کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنے محتاط طرزِ عمل کے ذریعے انفرادی معلومات تک محدود رکھا ہے

وہ بدستور انفرادی معلومات تک محدود رہیں اور ان کی روایت اس طور پر نہ کی جائے جس سے وہ قدرتی اور فطری اختلافات جو امت کی سہولت کے پیش نظر ان احادیث میں موجود ہیں وہ ارادی اور اختیاری مخالفتوں میں تبدیل ہو کر امت کے لیے زحمت اور تنگی کا سبب بن جائیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس قسم کی روایات کے سلسلے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک قاعدۂ کلیہ کے طور پر یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرا دی کہ احادیث نبویہ کا صحیح استعمال یہ نہیں ہے کہ ان کے متعلق جس شخص کے پاس جو معلومات ہیں وہ ان کی پابندی کا خواہ مخواہ دوسروں سے مطالبہ کرے بلکہ صحیح مسلک ان اختلافات کے متعلق جو اس قسم کی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں یہ ہے کہ امت مسلمہ کا ہر فرد ایک دوسرے کے قدرتی و فطری اختلافات کو برداشت کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے اور اگر کوئی شخص ارادی مخالفتوں کی آگ بھڑکانے کے لیے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسی احادیث بیان کرے جو دین کے طریقوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مختلف نظیروں کی حامل ہوں تو اس کو خاموش کرانے کے لیے فوراً یہ کہا جائے کہ ان تمام نظیروں کے بنیادی اصول و کلیات قرآن کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہیں جو پوری امت مسلمہ کو اتفاقی نقطے پر سمیٹنے کے لیے بہت کافی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی جانب سے حفاظت حدیث کے لیے کی جانے والی اس پہلی بنیادی خدمت کی پوری کیفیت اور اس پر سیر حاصل تبصرہ گذشتہ اوراق میں گزر چکا ہے قارئین اس پر دوبارہ نظر ڈال لیں۔

دین کے بیناتی و غیر بیناتی حصوں کا امتیاز

دوسری بنیادی خدمت جو حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں حفاظت حدیث کے سلسلے میں انجام پائی یہ ہے کہ آپ نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ جو قریب قریب مؤطا امام مالک کی مرفوع احادیث کی تعداد کے برابر ہے[1] اپنے ہاتھ سے لکھ کر تیار کیا مگر پھر سنت نبوی اور مصلحت پیغمبری کی تجدید کرتے ہوئے اس مجموعہ کو اپنے ہاتھوں ہی جلا کر اس

---

[1] شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مسوّیٰ شرح مؤطا میں ابن حزم کا جو قول نقل کیا ہے اس کے مطابق مؤطا امام مالک میں مرفوع حدیثوں کی کل تعداد پانچ سو سے کچھ اوپر ہے۔

خطرے کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا کہ دین کا وہ حصہ جو قرآن اور قرآن کی عملی تشکیلات پر مشتمل ہے یعنی وہ حصہ جو تواتر و توارث اور تعامل صحابہ کی دولت سے مالامال ہے وہ دین کے اس حصے سے خلط ملط نہ ہو جائے جس کی بنیاد وہ احادیث ہیں جن کو قصداً اور اراداتاً دین میں سہولت کے پیشِ نظر انفرادی معلومات تک محدود رکھا گیا ہے۔ دین کے دونوں حصوں کے مطالبوں میں قوت و ضعف کو برقرار رکھنے کے لیے جو طرزِ عمل عہد نبوت میں اختیار کیا گیا تھا اسی طرزِ عمل کی تجدید حضرت ابوبکر نے اپنے زمانے میں اس طرح فرمائی کہ پہلے احادیث کا مجموعہ خود اپنے ہاتھوں تحریر فرمایا اور پھر اپنے ہی ہاتھوں اسے نذرِ آتش کر دیا۔ حضرت ابوبکر کی اس خدمت پر بھی تفصیلی بحث گذشتہ اوراق میں گزر چکی ہے۔

اُصول شہادت کی بُنیاد

حفاظت حدیث کے سلسلے میں تیسری بنیادی خدمت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ انجام دی کہ آپ نے تحقیق حدیث کے لیے اصولِ شہادت کی بنیاد قائم فرمائی آپ نے اپنے طرزِ عمل سے اس بات کو ایک اُصول کے طور پر پیش کیا کہ ہر وہ بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی جائے محض منسوب ہو جانے کی وجہ سے قابلِ قبول نہیں ہو جاتی بلکہ چھان بین اور تحقیق و تفتیش کے بعد یہ یقین حاصل کرنا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس بات کو منسوب کرنے میں کسی غلط بیانی یا سہو کا دخل نہیں ہے۔

اس بات کو اُصول کے طور پر پیش کرنے میں حضرت ابوبکرؓ کا طرزِ عمل کیا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جس میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں ایک خاتون نے آکر اپنے پوتے کے چھوڑے ہوئے ترکے میں اپنے حصے کی میراث کا مطالبہ کیا۔ اب مشکل یہ پیش آئی کہ قرآن تو اس مسئلے میں خاموش تھا ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد بھی حضرت ابوبکر کو اس بارے میں معلوم نہ تھا چنانچہ آپ نے لوگوں سے دریافت فرمایا حضرت مغیرہؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا میں نے سنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دادی کو چھٹا حصہ دلواتے تھے حضرت ابوبکر نے یہ سُن کر فرمایا کیا تمہارے علاوہ بھی کوئی اس پر شاہد ہے اس پر محمد بن مسلمہ نے شہادت دی ان کی شہادت پر حضرت ابوبکر نے اس خاتون کو چھٹا حصہ

دلوا دیا ۔ اپنے اس طرزِ عمل سے گویا حضرت ابوبکر نے یہ بات جتلادی تھی کہ اخبارِ احاد کے رد و قبول میں لاپروائی سے کام نہ لینا چاہیئے ۔ اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے حافظ شمس الدین ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں :

وکان (ای ابوبکر) اوّلُ من احتاط فی قبولِ الاخبار فروی ابن شہاب عن قبیصۃ بنِ ذویب اَنّ الجدّۃَ جاءت الی ابی بکرٍ تلتمس ان تورث فقال ما اجدُ لک فی کتاب اللّٰہ شیئاً وما علمتُ انّ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ذکرَ لک شیئاً ثُمّ سال النّاسَ فقام المغیرۃ فقال سمعتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یُعطیھا السّدُس فقال لہٗ ھل معک احدٌ فشہد محمّدُ بن مسلمۃَ بمثل ذلک فانفذہٗ لھا۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲)

سب سے پہلے شخص جنہوں نے قبول روایت میں احتیاط کا طریقہ جاری کیا وہ ابوبکر صدیق ہیں جیسا کہ زہری بن شہاب نے قبیصۃ بن ذویب سے روایت کیا ہے کہ ایک دادی اپنے پوتے کی میراث مانگنے حضرت ابوبکر کے پاس آئی حضرت ابوبکر نے فرمایا میں تیرے بارے میں نہ تو کتاب اللہ میں کوئی حکم پاتا ہوں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان اس بارے میں مجھے معلوم ہے پھر آپ نے لوگوں سے دریافت کیا تو حضرت مغیرہ اٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دادی کو چھٹا حصہ دلواتے تھے حضرت ابوبکر نے فرمایا کیا تمہارے ساتھ اس پر کوئی اور بھی شاہد ہے تو محمد بن مسلمہ نے اس پر شہادت دی آپ نے ان کی شہادت پر دادی کو چھٹا حصہ دلوادیا ۔

حافظ ذہبی نے واقعی سچ کہا قبول روایت میں احتیاط کا یہ طریقہ جاری کرنے والے پہلے آدمی حضرت ابوبکر ہی ہیں بعد کے زمانوں میں احادیث کے لیے چھان بین، تحقیق و تلاش اور تنقید و تمحیص کے جتنے علوم وجود میں آئے ان سب کا منبع حضرت ابوبکر کے جاری کردہ اسی چشمے سے پھوٹتا نظر آتا ہے اسی طرح بعد کے زمانوں میں روایتوں میں قوت پیدا کرنے کے لیے

محدثین کے درمیان توابع و شواہد کو جمع کرنے کا جو عظیم الشان سلسلہ جاری ہُوا اس کی ابتدا گویا اسی دن ہو گئی تھی جس دن حضرت ابوبکر کی زبان سے ھل معک احدٌ کے الفاظ نکلے تھے اور حضرت محمد بن مسلمہ نے کھڑے ہو کر حضرت مغیرہ کی بیان کردہ روایت کے لیے اوّلین متابعت و شہادت مہیا کر دی تھی۔

شہادت کی اصل حقیقت

مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ جس طرح فصلِ خصومات کے لیے کم از کم دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے اسی طرح قبولِ حدیث کے لیے بھی حضرت ابوبکر کے اس طرزِ عمل نے کم از کم شہادت کا نصاب دو مقرر کر دیا ہے اس لیے کہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے متعدد روایتیں ایسی مروی ہیں جن کے تنہا وہی راوی ہیں جیسے فدک کی تقسیم کے مطالبے پر انبیاء کی میراث سے متعلق روایت یا وہ روایت جس میں ذکر ہے کہ جس جگہ اللہ کے نبی کی رُوح قبض ہوتی ہے اسی جگہ اس کو دفن کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں حدیثیں تنہا حضرت ابوبکر سے ہی مروی ہیں اور کون نہیں جانتا کہ ان دونوں حدیثوں کی بنیاد پر تاریخ کے کتنے اہم فیصلے طے کیے گئے گویا بغیر کسی دوسری شہادت کے تمام صحابہ نے ان حدیثوں کو قبول کیا۔ اور یہ دو حدیثیں ہی کیا کتنی حدیثیں ہیں جن کو حضرت ابوبکر ہی نہیں آپ کے علاوہ باقی خلفائے راشدین اور دیگر تمام صحابہ صرف ایک صحابی کے بیان پر بھروسہ کر کے عموماً مانتے رہے ہیں ایسی تمام حدیثوں کو اگر جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

علاوہ ازیں سوچنے کی بات ہے کہ اس نوعیت کی حدیثوں پر اعتماد کرنے کے لیے کم از کم دو راویوں کی موجودگی کو اگر قانونی نصاب کی شکل دے دی جائے تو ہمیں ثابت کرنا پڑے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس نوعیت کی حدیثوں کی تبلیغ کے لیے کم از کم دو آدمیوں کو ضرور روانہ فرماتے تھے حالانکہ یہ امر واقعہ کے خلاف ہے۔ روایات کا ایک معتدبہ ذخیرہ ایسا موجود ہے جن کے متعلق خود راوی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور کسی دُوسرے آدمی سے اس بات کا ذکر نہ کیا تھا نیز جس طرح دُنیا کے عام کاروبار میں دستور ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بھی عموماً ضرورتوں کے لیے ایک ہی آدمی کو روانہ فرمایا کرتے تھے لیکن کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے اس آدمی پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہو کہ تم تنہا اکیلے آدمی ہو جب تک تم کوئی دوسرا گواہ نہ پیش کرو ہم کیسے مان لیں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فرمان ہے۔ صدقہ وغیرہ وصول کرنے کے لیے بھی عموماً ایک ہی آدمی روانہ کیا جاتا تھا مگر کبھی کسی نے اس سے اس بات پر گواہی طلب نہیں کی کہ وہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرستادہ ہے۔

مزید اطمینان کی ایک تدبیر

غرض حضرت مغیرہ کی روایت پر حضرت ابوبکرؓ کا گواہی مانگنا اعتماد کی شرط کے طور پر نہ تھا بلکہ محض مزید اطمینان کی ایک تدبیر تھی۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے طرز عمل سے یہ سبق سکھلانا چاہتے تھے کہ دین کا وہی حصہ کیوں نہ ہو جس کی بنیاد اخبار احاد پر ہے اس کے رد کرنے یا قبول کر لینے میں لاپروائی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ آخر ایک صحابی کی روایت پر بھی اگر تائید کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے تو آئندہ آنے والوں کو سوچ لینا چاہیئے کہ ان کی روایتوں کے قبول کرنے میں کس درجہ احتیاط کی ضرورت ہے اور حق یہ ہے کہ آئندہ آنے والوں نے اس سبق کو خوب سیکھا صحابہ سے روایت کرنے والوں کے بارے میں جو ہم سنتے ہیں کہ وہ حتی الوسع اس کی کوشش کرتے تھے کہ ایک ہی روایت جن جن صحابیوں سے سننا ممکن ہو اس میں کمی نہ کی جائے وہ حضرت ابوبکرؓ کے پڑھائے ہوئے اسی سبق کی عملی تفسیر تھی۔ اس لحاظ سے حفاظت حدیث کے سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ نے یہ ایک انتہائی گرانقدر خدمت انجام دی کہ روایتوں میں قوت پیدا کرنے کے لیے متابعت وشہادت کے طریقے کی بنا ڈال دی حقیقت یہ ہے کہ توابع وشواہد کی جو بلند وبالا اور عظیم الشان عمارت تدوین حدیث کی تاریخ میں بعد کے دور میں تعمیر ہوئی اس کی پہلی اینٹ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں ہی رکھی گئی۔

حفاظت حدیث اور حضرت عمرؓ

حفاظت حدیث کے سلسلے میں جہاں تک حضرت عمرؓ کی خدمات کا تعلق ہے تو آپ کی توجہ

زیادہ تر اس بات پر مرکوز رہی کہ حضرت ابو بکرؓ نے اپنے مختصر عہد خلافت میں حفاظت حدیث کے لیے جن جن کاموں کی ابتدا کر گئے تھے ان میں استحکام پیدا کیا جائے۔ گذشتہ اوراق میں منکرین حدیث کے لگائے گئے الزامات کی تردید کرتے ہوئے جو کچھ کہا گیا ہے اس میں حضرت عمرؓ کی جانب سے حفاظت حدیث کے سلسلے میں کیے جانے والے اقدامات کا بھی اگرچہ مفصل تذکرہ آگیا ہے تاہم اب بھی انہی اقدامات کے حوالے سے ہم حضرت عمرؓ کی خدمات کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

کثرت روایت میں احتیاط

حضرت عمرؓ نے اس بات کی بطور خاص نگرانی فرمائی کہ لوگ روایت حدیث میں اکثار سے کام نہ لیں کثرت روایت سے روکنے میں آپ کو اگر سختی سے بھی کام لینا پڑا تو آپ نے اس سے بھی دریغ نہ کیا مقصود اس سے یہ تھا کہ کثرت روایت کی بنا پر کہیں خبر آحاد کی روایتوں میں عمومیت کی ایسی کیفیت پیدا نہ ہو جائے جس کی وجہ سے دین کے بنیادی حصہ کے مطالبوں میں جو قوت ہے وہی قوت لوگ اِن روایتوں کے مطالبوں میں بھی محسوس کرنے لگیں۔ آپ دین کے ان دونوں حصوں کے مطالبوں میں قوت و ضعف کے اس فرق کو برقرار رکھنا چاہتے تھے جو دین اسلام کی سہولت پسندانہ خصوصیت کے پیشِ نظر بہت ضروری تھا اس فرق کو برقرار رکھنے میں حضرت عمرؓ نے اس قدر احتیاط سے کام لیا کہ احادیث نبویہ کو کتابی شکل دینے کی شدید خواہش رکھتے ہوئے بھی آپ انہیں قلم بند کرانے سے احتراز ہی فرماتے رہے ایک مرتبہ لکھوانے کا ارادہ بھی کر لیا صحابہ سے مشورہ کیا تو انھوں نے بھی اجازت دے دی مگر پھر اسی فرق کو برقرار رکھنے کی خاطر نہ صرف خود اپنے ارادہ سے باز رہے بلکہ دوسرے لوگوں کے لکھے ہوئے مجموعے بھی منگا کر ان کو جلا دیا۔ دین کے بنیادی و غیر بنیادی حصوں کے مطالبوں میں اس فرق کو برقرار رکھنے کے علاوہ حضرت عمرؓ کے پیشِ نظر یہ بات بھی تھی کہ کثرت روایت کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب ہو جانے کا خدشہ زیادہ تھا حضرت عمرؓ کو فکر یہ تھا کہ کہیں کثرت روایت کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں جھوٹ سچ کی آمیزش نہ ہو جائے۔ یہ سب کچھ دراصل سنتِ نبوی اور طرزِ صدیقی کا استحکام ہی تھا۔

اپنے عہدِ نبوت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں باتوں کی پوری طرح نگرانی فرمائی آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانے میں ان کو برقرار رکھنے پر پورا زور صرف فرمایا اور اب یہی غرض حضرت عمرؓ کے پیشِ نظر تھی آپ انہی دو باتوں کو یقینی بنانے کے لیے کثرتِ روایت سے منع فرماتے رہے۔

تحقیق حدیث کے لیے تائید مزید کا مطالبہ

دُوسرا کام حفاظتِ حدیث کے سلسلے میں حضرت عمرؓ نے یہ کیا کہ تحقیق حدیث کے لیے جن اُصول شہادت کی بنیاد حضرت ابوبکرؓ رکھ گئے تھے اس کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے کی کوشش فرمائی۔ سنت صدیقی کی پیروی کرتے ہوئے آپ نے بھی بعض صحابیوں کی روایت پر مزید تائید کا مطالبہ کیا بلکہ اپنی خاص فطری طبیعت کے لحاظ سے اس مطالبے میں کچھ شدت کی راہ بھی اختیار کی۔ جیسا کہ استیذان والی اس مشہور روایت میں ہے جو نسائی کے سوا صحاحِ ستہ کی ہر کتاب میں موجود ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ سخت طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے آپ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا کہ تم کو شہادت پیش کرنی پڑے گی ورنہ میں تمہارے ساتھ کچھ کر گزروں گا بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمر نے کہا تھا میں تمہیں دُوسروں کے لیے باعثِ عبرت بنا دوں گا۔ بہرحال یہ سختی تو حضرت عمرؓ کے مزاج کا ایک حصہ تھی دین کے دُوسرے شعبوں میں بھی آپ کے مزاج کی یہ سختی نمایاں ہے تو حدیث کا شعبہ بھی اس سے کیوں محروم رہتا تاہم بتلانا یہ تھا کہ حضرت عمر بھی حضرت ابوبکر کے طریقے کی پیروی کرتے ہوئے صحابہ کی روایت پر مزید تائید کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ کے علاوہ بعض دیگر صحابہ کے ساتھ بھی حضرت عمرؓ نے کئی دفعہ اپنے اسی طرزِ عمل کو دہرایا۔ مسجد نبوی کی توسیع کے سلسلے میں حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کے مکان کے داخل کرنے کے جھگڑے میں جب حضرت ابی بن کعبؓ نے وہ حدیث سنائی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں بیت المقدس کی تعمیر کا واقعہ ذکر کیا ہے تو اس حدیث کی روایت پر بھی حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے گواہ طلب کیا اور جب تک حضرت ابوذر غفاریؓ نے

گواہی نہ دے دی حضرت ابی بن کعب کی جان نہ چھوٹی[۱]۔

صحابہ کی روایتوں پر تائید کا یہ مطالبہ اور اس مطالبے میں یہ سختی ظاہر ہے اس لیے نہ تھی کہ تنہا ابوموسیٰ اشعریؓ یا اکیلے حضرت ابی بن کعبؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کی روایت پر حضرت عمرؓ کو اعتماد نہ تھا کیونکہ اسی نوعیت کی تنہا راویوں کی روایت کردہ نہ جانے کتنی حدیثوں پر حضرت عمرؓ سے بارہا اعتماد کرنا ثابت ہے۔ ان دونوں موقعوں پر بھی حضرت عمرؓ نے خود اس غلط خیال کی تردید برملا پُرزور الفاظ میں فرمائی تھی۔ حضرت ابوموسیٰ والے واقعے میں حضرت ابی بن کعبؓ کی اس تنبیہ پر کہ یا ابنَ الخطّاب فلا تکونَنّ عذاباً علی اصحاب النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم (اے خطاب کے بیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے لیے عذاب نہ بنو) حضرت عمرؓ نے حقیقتِ حال کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

سُبحانَ اللّٰہِ سُبحانَ اللّٰہِ انّما سمِعتُ شیئاً فاحببتُ اَنْ اُثبّتَ (جمع الفوائد)	سبحان اللہ سبحان اللہ میں نے ایک بات سنی میں نے چاہا کہ اسکو پایۂ ثبوت تک پہونچایا جائے۔

اسی طرح دوسرے واقعہ میں جب یہ شکایت کی گئی کہ عمرؓ تم ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں متہم کرتے ہو تو اس وقت بھی حضرت عمرؓ نے یہی جواب دیا کہ خدا کی قسم میں تم کو متہم نہیں ٹھہراتا لیکن میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں یوں ہی لاپروائی سے پھیلادی جائیں[۲] تو بات دراصل یہ نہ تھی کہ حضرت عمرؓ تنہا ایک راوی کی روایت کو کافی نہ سمجھتے تھے بلکہ بات یہی تھی کہ آپ چاہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یونہی لاپروائی سے کوئی بات منسوب نہ کی جائے بلکہ اعتماد میں قوت پیدا کرنے کیلئے جو تائید بھی مل سکتی ہو اس کو حاصل کیا جائے۔ اور یہی ہے وہ بات جس کی ابتدا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کی تھی اور اب حضرت عمرؓ اسے مستحکم سے مستحکم تر بنا دینا چاہتے تھے۔ محدثین کے درمیان بعد کے دور میں متابعات وشواہد جمع کرنے کا جو شوق

---

[۱] ابن سعد ج۔۴ [۲] ابن سعد ج۔۴

پیدا ہوا یعنی ایک ہی حدیث ممکنہ حد تک جتنے زیادہ طریقوں سے مل سکتی ہو ان طریقوں کے تلاش کرنے اور جمع کرنے کا جو والہانہ ذوق ہمیں ان میں نظر آتا ہے وہ سنتِ صدیقی اور طرزِ فاروقی ہی کا پرتو تھا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کی بنیاد رکھی حضرت عمر فاروقؓ نے اسے خوب مستحکم کیا اور بعد کے دور میں محدثین نے اس پر ایک بلند و بالا عمارت تعمیر کر دی۔ حافظ ذہبی نے حضرت عمرؓ کے تذکرے میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی مذکورہ بالا استیذان والی روایت اور اس پر حضرت عمرؓ کی جانب سے تائید طلب کرنے کا واقعہ درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

وفی ذلک حضٌّ علی تکثیرِ طُرُقِ الحدیث (تذکرہ الحفاظ)	حدیثوں کے طرق میں جس کثرت کا خیال (بعد میں لوگوں کو) ہوا اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر لوگوں کو (حضرت عمرؓ کے) اس طرزِ عمل نے ہی آمادہ کیا۔

حافظ ذہبی نے بالکل درست کہا مگر اس طرزِ فاروقی کی بنیاد حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں ہی رکھی جا چکی تھی حضرت عمرؓ نے اس بنیاد کو اس قدر استحکام اور استواری عطا فرمائی کہ آنے والوں کے لیے اس پر عمارت کھڑی کرنا نہایت آسان ہو گیا۔

حفاظتِ حدیث اور حضرت عثمانؓ

حفاظتِ حدیث کے سلسلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے متعلق کسی خاص واقعہ کا ذکر تاریخ حدیث کی کتابوں میں اگرچہ ہمیں نہیں ملتا لیکن ایسی روایتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شیخین رضی اللہ عنہما کے قائم کیے ہوئے طریقے کو باقی رکھا۔ آپ کثرتِ روایت سے پرہیز کرتے رہے اور اس بات کی کوشش فرماتے رہے کہ اخبارِ احاد کا جو مقام عہدِ نبوی اور عہدِ شیخین میں متعین ہو گیا ہے وہ بحال رہے چنانچہ مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عثمان فرمایا کرتے:

مایمنعنی اَنْ اُحدِّثَ عن رسولِ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے

اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم اَنْ لا اَکُوْنَ اَوْعٰی اَصحابہٖ عنہ وَلٰکِنِّیْ اَشْھَدُ لَسَمِعْتُہٗ یَقُوْلُ مَنْ قَالَ عَلَیَّ مَالَمْ اَقُلْ فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ (مسند احمد)۔

بیان کرتے ہیں مجھے یہ چیز نہیں روکتی کہ دوسرے صحابیوں سے حدیثوں کے یاد رکھنے میں میں کچھ کم ہوں لیکن بات یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس نے میری طرف کوئی ایسی بات منسوب کی جو میں نے نہ کہی ہو تو چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنّم میں بنالے۔

معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضؓ کثرت روایت سے پرہیز کرتے تھے اگرچہ دوسرے صحابہ کی طرح آپ کو بھی احادیث خوب یاد تھیں مگر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرح آپ بھی بہت کم حدیثیں روایت کرتے تھے ظاہر ہے اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ اخبار احاد کی عام اشاعت کو پسند نہ فرماتے تھے آپ نے یہ فرما کر کہ احادیث نبویہ یاد رکھنے میں دوسرے صحابہ سے میں کچھ کم نہیں ہوں یہ بھی واضح فرمادیا کہ کثرت روایت سے میرے پرہیز کی یہ وجہ نہیں ہے کہ مجھے اپنے حافظے پر اعتماد نہیں بلکہ ڈر یہ ہے تو یہ ہے کہ ان حدیثوں کی عام اشاعت کے بعد یہ خدشہ قوی ہو جائے گا کہ سن کر روایت کرنے والے کہیں کوئی غلط بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ کردیں۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عثمان کی نظر سے یہ حقیقت بھی مخفی نہ تھی کہ خلیفۂ رسول کی جانب سے ان احادیث کی عام اشاعت انہیں قطعیت کا وہ رنگ پیدا کرنے کا بھی موجب ہوسکتی ہے جو ان احادیث سے شارع علیہ السلام کا مقصود نہیں ہے چنانچہ ایک موقعہ پر ایسی ہی ایک حدیث بیان کرتے ہوئے آپ نے اس حقیقت کا اظہار واضح الفاظ میں فرمایا کہ یہ حدیث میں اس سے پہلے تمہیں سنانے سے محض اس لیے گریز کرتا رہا کہ کہیں تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر محض اسی کی تعمیل کو ضروری نہ سمجھنے لگو پھر فرمایا کہ حدیث کو سننے کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ اپنے لیے جس پہلو کو بہتر سمجھو اختیار کرو مسند احمد کی روایت ہے:

عَنْ اَبِیْ صَالِحٍ مَوْلٰی عُثْمَانَ

حضرت عثمان کے غلام ابو صالح سے مروی ہے وہ

بن عفان رضی اللہ عنہ یقول ایھا الناس انی کتمتکم حدیثاً سمعتہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کراھیۃ تفرقکم عنی ثم بدالی ان احدثکموہ لیختار امرؤ لنفسہ ۔ ما بدالہ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول رباط یوم فی سبیل اللہ تعالیٰ خیر من الف یوم فیما سواہ من المنازل ۔

(مسند احمد ۔ ج ۱)

کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان کو یہ کہتے سنا کہ اے لوگو ایک حدیث جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے اسے تم لوگوں سے اب تک اس لیے چھپاتا رہا کہ تم کو یہ حدیث مجھ سے جدا کر دے گی مگر مجھے یہی محسوس ہوا کہ میں اس حدیث کو تم سے بیان کر ہی دوں پھر اسکو سننے کے بعد آدمی جس پہلو کو چاہے اختیار کرے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ کی راہ میں ایک دن کا رباط (بہ نیت جہاد قیام) دوسری جگہوں میں ہزار دن گزارنے سے بہتر ہے ۔

حضرت عثمان نے یہ کہہ کر کہ آدمی کو اختیار ہے اپنے لیے جس پہلو کو چاہے پسند کرے دراصل خبر احاد کی حدیثوں کے اصل مقام کی وضاحت کی ہے کہ عزم و ہمت رکھنے والے اگر چاہیں تو اس قسم کی حدیثوں کے مطالبوں پر عمل کر کے محبوبیت حق میں ترقی کرتے چلے جائیں اور جو لوگ اس قدر عزم و ہمت سے بہرہ ور نہ ہوں ان کو اجازت ہے کہ وہ اللہ کی دی ہوئی رخصتوں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں ۔

اگرچہ حضرت عثمان کا خود اپنا حال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء مبارک کی اطلاع خواہ آپ کو خبر واحد ہی کی راہ سے کیوں نہ پہنچی ہو اس کی تعمیل کو اپنی سعادت خیال فرماتے تھے ۔ احرام کی حالت میں شکار کے گوشت سے ہاتھ کھینچ لینے کا مشہور واقعہ

اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے اگرچہ وہ شکار نہ حضرت عثمان نے خود کیا تھا نہ اس کے شکار کرنے کا آپ نے حکم دیا تھا قدید نامی گاؤں کے رہنے والوں نے جو احرام کی حالت میں نہ تھے اس کو شکار کیا تھا۔ اور انہی لوگوں نے حضرت عثمان کو کھانے کے لیے بھیجا تھا یہی وجہ تھی کہ حضرت عثمان خود اپنے اجتہاد اور تفقہ کی روشنی میں اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے مگر جب حضرت علی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے فعل کی خبر دی جو بظاہر حضرت عثمان کے اپنے اجتہاد کے خلاف نظر آتا تھا تو حضرت عثمان فوراً دسترخوان سے اُٹھ گئے۔ یہ تھا خبر واحد کی تعمیل میں حضرت عثمان کے عزم و شوق کا انداز۔

روایت حدیث میں متذکرہ تمام تر احتیاط کے باوجود حضرت عثمان کی اپنی مرویات کی تعداد اچھی خاصی ہے امام احمد نے اپنی مسند میں جن روایات کو جمع کیا ہے ان کی تعداد ایک سو چھیالیس ہے۔

حفاظت حدیث اور حضرت علی

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی ابتدا میں اپنے پیش رو خلفائے راشدین کے طرز پر اس بات کا خیال رکھا کہ خبر احاد کی حدیثوں میں عمومیت کا رنگ نہ پیدا ہو جہاں تک ممکن تھا آپ نے بھی اس کی نگرانی میں کوئی کمی نہیں کی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو باتیں احاد کی شکل میں آپ تک پہونچی تھیں اور جن کا ایک حصہ مکتوبہ شکل میں آپ کے پاس موجود تھا آپ نے ان کی اشاعتِ عام سے حتی الامکان احتراز ہی فرمایا۔ حضرت علی نے یہ حدیثیں کس زمانے میں قلم بند فرمائی تھیں اس کے بارے میں تو یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم اتنی بات یقینی ہے کہ آپ کے پاس لکھی ہوئی شکل میں کچھ حدیثیں تھیں ضرور۔ آپ نے یہ نوشتہ اپنی تلوار کی نیام میں رکھا ہوا تھا۔ لوگوں کے اصرار کے باوجود آپ ان حدیثوں کی اشاعت سے انکار ہی کرتے رہے لیکن جب لوگوں کی طرف سے

---

(۱) حوالہ کے لیے دیکھئے مسند احمد جلد ۱

اصرار میں شدت بڑھتی چلی گئی نیز آپ کے انکار سے لوگوں کے درمیان غلط فہمیاں پھیلنے لگیں کہ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغۂ راز میں رکھتے ہوئے کچھ خاص رموز واسرار کی نوعیت کی چیزیں آپ کو عطا فرمائی تھیں حضرت عثمان کے زمانے میں جن لوگوں نے فتنہ وفساد کا باضابطہ پروگرام تیار کیا تھا ان کو موقعہ ملنے لگا کہ اس سے مختلف قسم کے خود تراشیدہ مغالطوں میں لوگوں کو مبتلا کردیں تو آپ نے اس مکتوب میں جو حدیثیں لکھی ہوئی تھیں ان پر لوگوں کو مطلع کردیا مگر اس کے باوجود کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے اس صحیفے کی نقل لینے کی عام اجازت لوگوں کو دے دی ہو۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے فسادیوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا :

مَا عَهِدَ اِلَیّ رسولُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم شیئًا خاصَّةً دونَ النّاسِ اِلّا شیئٌ سمعتُہٗ منہُ فھو فی صحیفةٍ فی قرابِ سیفی (مسند احمد) ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں سے علیحدہ مجھ سے کوئی ایسی بات بطور عہد کے نہیں فرمائی سوائے اس کے کہ میں نے آپ سے چند باتیں سُنی ہیں وہ اس صحیفے میں ہیں جو میری تلوار کی نیام میں ہے ۔

مگر لوگوں کی اس پر بھی تسلی نہ ہوئی اور وہ اس صحیفہ کو دکھانے پر مصر رہے تو حضرت علی نے صحیفہ نکال کر بھی دکھادیا چنانچہ آگے چل کر راوی کا بیان ہے :

فلم یزالوا بہ حتی اخرج الصحیفة (مسند احمد)

لوگ اس کے (دکھانے) پر مصر رہے یہاں تک کہ آپ نے اس کو نکال لیا ۔

مسند احمد میں ہی طارق بن شہاب کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ آپ نے فتنہ پردازوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے لوگوں کو واضح طور سے یہ بھی بتلایا کہ اس صحیفے میں صدقہ و زکوٰۃ سے متعلق چند مسائل ہیں ۔ طارق کی روایت کے الفاظ ہیں :

رأیتُ علیًّا رضی اللہ عنہ علی المنبرِ یخطبُ وعلیہ سیفٌ حلیتہٗ من حدیدٍ فسمعتُہٗ یقولُ واللہِ ما

میں نے منبر پر حضرت علی کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا ان کی کمر میں تلوار تھی جس کا قبضہ لوہے سے سجا ہوا تھا میں نے سُنا آپ فرمارہے تھے اللہ کی قسم

عندنا کتاب نقرؤہ علیکم الا کتاب اللہ تعالیٰ وھذہ الصحیفۃ اعطانیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیھا فرائض الصدقۃ ۔ (مسند احمد جلد ۱)	ہمارے پاس کتاب اللہ اور اس صحیفے کے سوا کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے تم لوگوں کے آگے پڑھوں اور یہ صحیفہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عطا فرمایا ہے اس میں صدقہ کے حصوں کی تفصیل ہے ۔

موقع پرستوں کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کرنے کے لیے حضرت علی نے بر سر منبر اس بات کی تو پوری طرح وضاحت کر دی کہ ان کے پاس رموز و اسرار کی قسم کی کوئی چیز نہیں بلکہ عام دینی مسائل ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی آپ نے اس کی اجازت کسی کو نہ دی کہ وہ ان کے پاس موجود صحیفے کی نقل لے لے کیونکہ اپنے صحیفے کی عام نقول لے لینے کی اجازت اگر آپ نے دے دی ہوتی تو آج معاملہ یہ نہ ہوتا کہ اس صحیفے کے مضامین جن متعدد راویوں سے حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں ان میں ایک راوی جن اجزا کا ذکر کرتا ہے دوسرا راوی ان کے ذکر سے خاموش ہے بلکہ بجائے اس کے وہ دوسرے اجزا کا ذکر کرتا ہے اگرچہ بعض اجزا ساری روایتوں میں مشترک ہیں ۔ اجزا کا یہ اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ ان راویوں میں سے کسی راوی کے پاس بھی حضرت علی کے صحیفے کی نقل موجود نہ تھی سُن سنا کر جو باتیں یاد رہ گئی تھیں وہ ان ہی کو بیان کرتا تھا ۔

روایت حدیث کے طرزِ عمل میں تبدیلی

غرض ابتدا میں حضرت علیؓ نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ غیر احاد کی حدیثوں میں عمومیت کا رنگ پیدا نہ ہو چنانچہ جو باتیں احاد کی شکل میں آپ تک پہونچی تھیں ان کی عام اشاعت سے شروع شروع میں آپ نے احتراز ہی فرمایا مگر معلوم ہوتا ہے جوں جوں زمانہ گذرتا گیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو احساس ہوتا گیا کہ اب تقلیل روایت کا طریقہ ترک کر دینا چاہیئے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رفتہ رفتہ روایت حدیث کے معاملے میں حضرت علی کے طرز عمل میں تبدیلی آتی چلی گئی کوفہ منتقل ہو جانے کے بعد تو آپ کا عالم یہ تھا کہ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ایک طرف لے جاتے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو علم آپ کو پہونچا تھا اس کی تبلیغ فرماتے ۔ تذکرۃ الحفاظ میں

حافظ ذہبی نے کمیل بن زیاد کے ساتھ حضرت علیؓ کی جس طویل گفتگو کا تذکرہ کیا ہے اس میں زیاد کا بیان ہے کہ

اخذ علیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیدیَّ فاخرجنی الی ناحیۃ الجبّان۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد نمبر۱)	میرے دونوں ہاتھوں کو حضرت علی نے پکڑا اور صحرائی میدان کی طرف مجھے نکال کر لے گئے۔

کبھی آپ کسی کو مخاطب کر کے کہتے کہ پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کو اب ہم سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں رہا چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں مصفح عامری کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اسے خطاب کر کے فرمایا:

یا اخا بنی عامر سلنی عمّا قال اللہ ورسولہٗ فانا اہل البیت اعلم بما قال اللہ ورسولہٗ۔ (ابن سعد جلد-٦)	اے بنو عامر سے تعلق رکھنے والے بھائی مجھ سے اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات کے بارے میں پوچھ لے کیونکہ میں اہل بیت میں سے ہوں اللہ اور اسکے رسول کی باتوں کو زیادہ جانتا ہوں۔

کیا تو حضرت علی کا حال یہ تھا کہ لوگوں کے شدید اصرار کے باوجود اپنے صحیفے میں مرقوم احادیث کے بارے میں کسی کو کچھ بتلانے پر تیار نہ ہوتے تھے کہاں لوگ دیکھ رہے تھے کہ کوفہ کے منبر پر کھڑے حضرت علی لوگوں کو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو خدا کی قسم جس چیز کے متعلق مجھ سے دریافت کرو گے میں اس کے متعلق بتاؤں گا۔[لہ] ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اپنا تلوار والا صحیفہ حضرت علی کسی کو دکھانے تک کے روادار نہیں ہیں دوسری طرف یہی کوفے کا منبر ہے اور حضرت علی اعلان کرتے نظر آرہے ہیں کہ ایک درم میں کون مجھ سے علم خریدتا ہے لانے والے ایک درم کے کاغذ خرید کر لا رہے ہیں اور آپ اپنے ہاتھ سے حدیثیں لکھ لکھ کر ان کے حوالے کر رہے ہیں۔ طبقات ابن سعد میں ہے:

لہ تہذیب

أَنَّ عليَّ بنَ ابی طالبٍ خطبَ النَّاسَ فقالَ مَنْ يَشتري علماً بدرهمٍ فاشترى الحارثُ الاعورُ صُحُفاً بدرهمٍ ثمَّ جاءَ بها عليًّا فكتبَ لهُ علماً كثيراً۔

(ابن سعد جلد - ۶)

ایک دن حضرت علی نے خطبہ دیا تو فرمایا ایک درہم میں کون علم خریدنا چاہتا ہے حارث اعور نے ایک درہم میں کچھ کاغذ خریدے اور حضرت علی کے پاس لیکر آئے آپ نے ان کاغذوں پر حارث کے لیے بہت سا علم لکھ دیا۔

طبقات ابن سعد ہی کی بعض دوسری روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حارث اعور کے علاوہ بھی چند دیگر حضرات کو اپنی مرویات حضرت علی نے لکھوا دی تھیں مثلاً حضرت حجر بن عدی کے بارے میں ہے کہ ایک موقعہ پر انہوں نے ایک صحیفہ نکال کر پڑھتے ہوئے کہا یہ وہ روایتیں ہیں جنہیں میں نے علی بن ابی طالب سے سنا[1]۔ اسی طرح حضرت علیؓ کے صاحبزادے حضرت محمد بن الحنیفیتہ کے پاس بھی معلوم ہوتا ہے حضرت علی کی حدیثوں کا کوئی مجموعہ تھا کیونکہ عبدالاعلیٰ بن عامر کے ترجمہ میں آتا ہے کہ

كلُّ شيءٍ روى عبدُ الاعلى عن ابن الحنيفيّةِ انّما هو كتابٌ أَخَذَهُ وَلَمْ يسمعْهُ۔

(ابن سعد جلد - ۶)۔

عبدالاعلیٰ محمد بن حنیفیہ سے جو کچھ روایت کرتے تھے وہ دراصل ایک کتاب تھی اور عبدالاعلیٰ نے براہ راست محمد بن حنیفیہ سے ان روایتوں کو نہیں سنا تھا۔

حضرت امام جعفر صادق کے جو حالات رجال کی کتابوں میں ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پاس بھی حضرت علی کی روایات کا کوئی مجموعہ تحریری شکل میں موجود تھا۔ بہر حال بات یہ ہو رہی تھی کہ کوفہ پہونچنے کے بعد حضرت علی تقلیل روایت کے اصول پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے اور روایتوں کی عمومیت کے جس دروازے کو شیخین رضی اللہ عنہما کے عہد میں سختی کے

---

[1] ابن سعد جلد - ۶

ساتھ بند رکھنے کی کوشش کی گئی تھی وہ دروازہ کھل گیا۔

حضرت علی کا یہ طرزِ عمل بظاہر اپنے پیش رو خلفا کے مقابلے میں عجیب محسوس ہوتا ہے مگر جن حالات میں حضرت علیؓ نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تھا ان کو اگر نظر میں رکھا جائے تو یہ طرزِ عمل عین صواب نظر آتا ہے حضرت علیؓ کو وہی کچھ کرنا چاہیے تھا جو آپ نے کیا۔

طرزِ عمل کی تبدیلی کا پس منظر

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی کو اپنے طرزِ عمل میں یہ تبدیلی کوفہ تشریف لانے کے بعد ہی کرنی پڑی یہ وہی زمانہ ہے جس سے کچھ ہی عرصہ بیشتر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور میں ایک عجیب و غریب اندرونی تحریک دشمنانِ اسلام کی سازشوں کی پشت پناہی میں مسلمانوں کے اندر عام طور پر پھیلانے کی کوشش جاری ہو چکی تھی اس تحریک کے پیچھے دشمنوں کے بہت سے مقاصد کام کر رہے تھے مگر اس تحریک کا اصل محور صحابہ کرام کی جماعت کو بدنام کرنا تھا دشمنوں نے اس جوہری قوت کو قطعی طور پر ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جو اسلام کی نصرت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد صحابیت کی شکل میں قدرت کی طرف سے جمع کر دی گئی تھی۔ اسلام کے دشمن عہدِ عثمانی کے آخری دور میں یہی ارادہ لے کر اُٹھے تھے کہ صحابیت کی اس قوت پر ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منتشر ہو جائے تاکہ اسلام اپنے دینی اور دنیوی دونوں سرمایوں کے اعتبار سے خود بخود صفر ہو کر رہ جائے۔ اس کے لیے انہوں نے صحابہ کو طرح طرح سے بدنام کرنا شروع کیا اور گنے چنے چند صحابیوں کو مستثنیٰ کر کے کہنا شروع کر دیا کہ صحابہ کی اکثریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخلص نہ تھی۔ مگر ظاہر ہے صحابہ کے خلاف عام مسلمانوں کو اس حد تک کھینچ کر لے آنا کہ صحابیت کی قوت عدم محض ہو کر رہ جائے کچھ آسان کام نہ تھا کوفہ کی چھاؤنیوں میں بسنے والوں کی اکثریت مانا ان لوگوں پر مشتمل تھی جو نبوت کی صحبت سے فیض یاب نہ تھے مانا کہ صحرائے عرب کے یہ بدو ہونے کو تو مسلمان ہو گئے تھے مگر اب بھی ان میں بدویانہ خو بو باقی تھی مگر اس سب کے باوجود وہ لوگ بہرحال تھے تو مسلمان ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا سچا پیغمبر اور اسلام کو خدا کا سچا دین مان چکے تھے ان لوگوں کو یہ باور کرانا آسان نہ تھا کہ صحابیت کی ساری قوت اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت

پر خروج ہوتی رہی ۔ اپنی تمام تر علمی و کرداری کمزوریوں کے باوجود کوئی ایک مسلمان بھی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ ہوتا کہ صحابہ کی پوری جماعت میں سے معدودے چند افراد کے علاوہ کوئی بھی نہ اسلام ہی کا دوست تھا اور نہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے کسی اخلاص و عقیدت کا تعلق رکھتا تھا ۔ اس حقیقت سے دشمنان اسلام بھی بخوبی واقف تھے چنانچہ انہیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی تدبیر کارگر نظر نہ آئی کہ جھوٹ کا دھواں اٹھایا جائے اور اس کے ذریعے ایسی تاریکی پھیلادی جائے کہ دن اور رات کی تمیز مشکل ہو جائے ۔ اسی واحد تدبیر کو دشمن کام میں لائے اور اپنی طرف سے جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر ان چند صحابہ کے حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے لگے جن کو انہوں نے اپنی مقصد برآری کی خاطر پہلے ہی صحابہ کی عام جماعت سے مستثنیٰ کر کے ان کے متعلق یہ مشہور کرنا شروع کر دیا تھا کہ بس یہی چند اصحاب ایسے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخلصانہ تعلق رکھتے تھے ۔ سب سے پہلی جھوٹی حدیث گھڑنے والا عبداللہ بن سبا ہی تھا جس کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ صحابہ کی عام جماعت کے خلاف تحریک چلانے والوں کا سرغنہ تھا حافظ ابن حجر عسقلانی نے عامر شعبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ

اَوّلُ مَنْ کَذَبَ عَبْدُ اللّٰہِ بنُ سَبا	سب سے پہلے جس نے جھوٹی حدیث بنائی وہ عبداللہ بن سبا ہے ۔

(لسان المیزان جلد ۳)

عبداللہ بن سبا کی سرگرمیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ وہ علی الاعلان بڑی ڈھٹائی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر بیان کرتا چلا جاتا آخر ایک روز حضرت علیؓ کی جماعت کے مشہور بزرگ مسیب بن نخبہ نے عبداللہ بن سبا کو گردن سے پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے کوفہ کی جامع مسجد میں منبر کے سامنے لا کھڑا کیا اور بلند آواز میں اعلان فرمایا ھٰذا یکذب علی اللّٰہ و رسولہ (یہ شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف جھوٹی باتیں بنا بنا کر منسوب کرتا ہے) مگر بات صرف عبداللہ بن سبا تک محدود نہ رہی تھی اسکے

کارندے کوفہ، بصرہ، شام، حجاز اور مصر وغیرہ تمام بڑے بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے یہ لوگ صحابہ کے خلاف سب سے بڑا حربہ یہی استعمال کرتے تھے کہ جھوٹی حدیثیں گھڑتے اور جہاں ضرورت ہوتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے لوگوں میں پھیلا دیتے۔ جعل سازی اور افترا پردازی کی اس مہم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علاوہ حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت مقداد بن اسودؓ وغیرہ کے ناموں سے کام لیا جاتا سیدھے سادے مسلمان ان جلیل القدر صحابہ کا نام سنتے تو فوراً یقین کر لیتے اور پھر خود بھی ان گھڑی ہوئی بے سروپا روایتوں کا تذکرہ ان کی اصل حقیقت سے بے خبر دوسرے لوگوں کے سامنے پورے اعتماد کے ساتھ کرتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے یہی سب سے بڑا سوال تھا کہ آخر اس فتنے کا سدباب کس طرح کیا جائے روایتوں میں آتا ہے کہ خود حضرت علی کی طرف منسوب کر کے جن باتوں کو عبداللہ ابن سبا اور اس کے ساتھی مسلمانوں کے درمیان پھیلاتے پھرتے تھے وہ سب حضرت علی کے علم میں آتیں تو بے چین ہو جاتے اور بے ساختہ آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ آجاتے کہ

مالی و لھذ الخبیث الاسود (لسان المیزان جلد۳)	اس سیاہ کالے گندے خبیث کو مجھ سے کیا تعلق۔

اور پھر جن بے سروپا باتوں کی تشہیر کی جاتی تھی اس کی تردید فرماتے مگر قصہ کسی ایک جگہ کا نہ تھا مسلمانوں کے تمام بڑے بڑے شہروں اور اہم چھاؤنیوں میں یہ لوگ پھیلے ہوئے تھے جھوٹ کا ایک سیلاب تھا جو ہر طرف چھا گیا تھا ہر صحابی اپنی جگہ حیران تھا ان لوگوں کی خود تراشیدہ باتیں احادیث نبویہ کے نام سے جب ان کے کانوں میں پڑتیں تو ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ سب کچھ ہے کیا۔ بعض صحابہ نے تو اس صورتِ حال سے گھبرا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیثوں کا بیان کرنا ہی چھوڑ دیا تھا ان کی سمجھ میں اس فتنے کے مقابلے کی یہی ایک شکل تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس فتنے کا ذکر کر کے فرماتے:

إنّما كنّا نحدّث عن رسولِ الله صلى الله عليه وسلم إذا لم يكن يُكذب عليه فأمّا إذا ركب الناس الصّعبَ والذّلولَ تركنا الحديث عنه (مقدمہ مسلم)	ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں اس زمانے میں بیان کیا کرتے تھے جب آپؐ پر جھوٹ گھڑنے کا رواج نہ ہوا تھا مگر جب لوگ ہر سرکش اور غیر سرکش (اونٹوں) پر سوار ہونے لگے تو ہم نے حدیثوں کا بیان کرنا ہی چھوڑ دیا۔

حضرت عبداللہ ابن عباس نے صیغہ واحد کے بجائے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے ترکنا الحدیث کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فتنے کے بعد حدیثوں کی روایت کے متعلق جو طرز عمل حضرت عبداللہ بن عباس نے اختیار کیا تھا اس میں وہ تنہا نہیں تھے اس روش کے اختیار کرنے میں ان کے ساتھ دوسرے بھی شریک تھے۔

اب حضرت علی کے سامنے دوہرا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا پہلے تو یہی تھا کہ ان جھوٹی حدیثوں کے زہر کے ازالے کے لیے کیا کیا جائے اب یہ سوال بھی سامنے تھا کہ اس زہر سے بچنے کی خاطر یہ رجحان جو بڑھتا جا رہا ہے کہ قطعی طور پر حدیثوں کی روایت کا سلسلہ ہی بند کر دیا جائے تو اس کو روکنے کی کیا تدبیر کی جائے۔

جھوٹی حدیثوں کا سدّباب

اسی دوہرے مسئلے کے حل کے لیے اور اسی صورت حال کے مقابلے کے لیے حضرت علیؓ کو اپنے اس رویہ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی جو حدیثوں کی تقلیل روایت سے متعلق آپ اب تک اختیار کیے ہوئے تھے ظاہر بات تھی کہ براہِ راست خود حضرت علیؓ کی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی روایات کے مقابلے میں ان بے سروپا اور جھوٹی روایتوں کی بھلا مسلمانوں کی نظر میں کیا وقعت باقی رہ سکتی تھی جو ابن سبا اور اس کے کارندوں نے پھیلائی تھیں۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے روایت حدیث کے بارے میں اپنا طرز عمل بدل دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے متعلق جو معلومات بھی آپ کے پاس تھیں ان کی عام اشاعت تحریراً و تقریراً دونوں

ذریعوں سے وسیع پیمانے پر آپ نے شروع کر دی۔ اس کے علاوہ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے اس سے بہتر اور کوئی تدبیر سوجھ بھی نہ سکتی تھی۔

روایت حدیث پر قسم کا مطالبہ ایک طرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی مرویات کی عام اشاعت کا طریقہ اختیار کیا جس کا مفصل حال گزر ہی چکا ہے دوسری طرف آپ نے اپنی یہ عادت بنا لی کہ جب بھی کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات آپ کے سامنے بیان کرتا تو آپ اس سے قسم لیتے۔ قسم کے بغیر آپ کوئی روایت قبول نہ کرتے۔ حافظ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں:

وکان (ای علی کرم اللہ وجہہٗ) اماماً متحرّیاً فی الاخذِ بحیث اَنّہ یستحلِفُ من یحدّثہٗ بالحدیث (تذکرۃ الحفاظ)	حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ روایت کے قبول کرنے میں اس قدر محتاط تھے کہ حدیث بیان کرنے والے سے قسم لیا کرتے تھے۔

عبداللہ بن سبا اور اس کے ساتھیوں کا زور توڑنے کے لیے آپ بار بار منبر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد دہراتے جس میں جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے کے لیے جہنم کی وعید ہے آپ فرماتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا تکذِبوا علیَّ فاِنّہٗ من یکذِبْ علیَّ یلجُ فی النّار (مسند احمد جلد ۱)	میری طرف جھوٹی بات ہرگز منسوب نہ کیا کرو جو میری طرف منسوب کر کے جھوٹی بات بیان کریگا وہ آگ میں جھونکا جائے گا۔

کبھی اس حدیث کی اہمیت واضح کرنے کے لیے خود اپنی طرف اشارہ کر کے فرماتے:

لَاَنْ اَخِرَّ مِنَ السماءِ اَحبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اکذِبَ علیٰ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مسند احمد)	میں آسمان سے گر پڑوں یہ میرے لیے زیادہ آسان ہے اس بات سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی غلط بات کہوں۔

غرض حضرت علی نے اپنی مرویات کی عام اشاعت کے ساتھ ساتھ احادیث نبویہ پر اعتماد میں قوت پیدا کرنے کے لیے اپنی یہ عادت بنالی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کوئی بات اس وقت تک قبول نہ کرتے جب تک بیان کرنے والے سے قسم نہ لے لیتے۔ نہ صرف دوسروں سے قسم لیتے بلکہ آپ سے بھی اگر کوئی کسی حدیث کے بارے میں استفسار کرتا تو آپ خود بھی جواب میں قسم کھاتے ہوئے فرماتے :

اِیْ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ (مسند احمد جلد ۱)	ہاں! رب کعبہ کی قسم (حضورؐ نے ایسا ہی فرمایا ہے)

طرزِ عمل میں تبدیلی کے دیگر عوامل

روایتِ حدیث کے سلسلے میں حضرت علیؓ کے طرزِ عمل میں یہ تبدیلی کہ ابتدا میں آپ نے اپنے پیشرو خلفا کی طرح تقلیل روایت کا طریقہ اختیار کیے رکھا مگر بعد میں یہ طریقہ ترک فرما دیا اور حدیثوں کی عام اشاعت پر زور دینے لگے اس کی اصل وجہ تو وہی حالات تھے جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے مگر ان حالات کے علاوہ کچھ اور بھی ایسے عوامل تھے جو ہمیں حضرت علیؓ کے طرزِ عمل کی تبدیلی میں محرک عنصر کے طور پر کام کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کوفے میں ایسے لوگوں سے واسطہ زیادہ پڑا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دولت سے تو سرفراز ہوئے تھے لیکن شرفِ صحابیت سے محروم تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو اپنے کانوں سے سننے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت انہیں حاصل نہ تھی۔ ان کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو جاننے کا شوق اور ولولہ فطری طور پر بہت زیادہ تھا جب صحابہ کرام کی ایک کثیر تعداد کوفے پہنچی تو یہ لوگ اپنے پیغمبر کے حالات جاننے کے لیے بیتابانہ ان پر ٹوٹ پڑے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنے محبوب پیغمبر کو صرف سنا تھا اپنی آنکھوں سے دیکھا نہ تھا وہ جب ان ہستیوں سے ملتے ہوں گے جن کی آنکھیں دیدار نبوی سے مشرف رہی تھیں اور جنہیں براہ راست مجلس نبوی میں حضوری کی سعادت میسر آئی تھی تو کس کس طرح وہ ان حضرات پر اپنے سوالوں کی بارش نہ کرتے ہوں گے۔ صحابہ تو صحابہ تابعین کے گرد لوگ اس طرح جمع رہتے کہ ان کو لیٹنا بیٹھنا محال ہو گیا تھا۔ ابن سعد نے طبقات میں حسن بصریؒ کے متعلق ثابت البنانیؒ کی

شہادت بیان کی ہے کہ

مَنعوۃَ القایلۃَ وَمنعوۃُ النَّومَ (ابنِ سعد جلد ۷)	ان کو لوگ نہ دن کو لیٹنے کا موقعہ دیتے نہ سونے کا۔

جب تابعین کے ساتھ مشتاقان اسوۂ نبوی کا یہ حال تھا تو صحابہ کو تو کیا کیا تنگ نہ کرتے ہوں گے۔ حضرت عبداللہ ابن عون جو تابعی بھی نہیں تبع تابعین میں سے ہیں خود اپنا حال سناتے ہوئے فرمایا کرتے:

قد قطعوا علیَّ الطریق ما اقدرُ اَنْ اخرجَ لحاجۃٍ یعنی مما یسئلونہ عن الحدیث (ابن سعد جلد ۷)	لوگوں نے میرا راستہ روک رکھا ہے کسی ضرورت سے بھی میں نہیں نکل سکتا یعنی لوگ مجھ سے حدیث پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔

غرض معلوم ہوتا ہے تقلیل روایت کے معاملے میں حضرت علی کے طرزِ عمل کی تبدیلی میں کچھ اس صورت حال کو بھی دخل تھا مدینہ منورہ میں جب تک رہے تو وہاں احادیث نبویہ کے بارے میں نہ پوچھنے والوں کی اتنی کثرت تھی اور نہ بتانے والوں کی کوئی کمی مگر کوفے میں صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ پوچھنے والے بے شمار اور بتلانے والے ان کے مقابلے میں محدود۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں حضرت علیؓ نے اپنے پیش رو خلفا کے طرز کو نبھانا چاہا اور کثرت روایت سے پرہیز ہی فرماتے رہے مگر زیادہ عرصہ تک یہ معاملہ متذکرہ بالا صورتِ حال کی موجودگی میں نبھ نہ سکا۔

رہا یہ سوال کہ حضرت علیؓ کے طرز عمل کی اس تبدیلی سے کیا وہ مصلحت فوت نہیں ہوئی جس کی وجہ سے عہد نبوت اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں حدیثوں کی عام اشاعت وکتابت کی حوصلہ شکنی کی جاتی رہی تھی۔ عام اشاعت کی بنا پر یہ خطرہ کہ آئندہ آنے والوں کے درمیان ان روایتوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جائے گی کیا اب باقی نہ رہا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ حضرت علی کی خلافت کا زمانہ عہدِ نبوت سے کچھ اتنا دُور نہ تھا لیکن ایک طرف تو سیاسی حالات کی وہ پیش رفت جس نے حضرت عثمان کے آخری دَور میں فتنے کی شکل اختیار کر لی تھی اور جس کی بنا پر

تقدس واحترام کے وہ جذبات جو امتِ مسلمہ کے اندر شیخین رضی اللہ عنہما کے متعلق عہد میں لوگوں کے اذہان میں پائے جاتے تھے اضمحلال پذیر ہونے لگے تھے دوسری طرف عبداللہ بن سبا اور اس کے کارندوں کی پیدا کردہ وہ صورتِ حال جس کا اُوپر ذکر ہو چکا ہے جس نے مسلمانوں کی اجتماعی وحدت کو ہلا کر رکھ دیا تھا ان دونوں باتوں نے مل کر واقعی اس خطرے کا وجود باقی نہ رہنے دیا تھا جس کے پیشِ نظر روایت حدیث کی عام اشاعت سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آج ہم اپنی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی خلافت کے زمانہ میں یا اس کے بعد جو چیزیں لکھی گئیں یا جن کی زبانی عام اشاعت کی گئی ان کو امتِ مسلمہ میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جس کا اندیشہ تھا۔

مکتوب مجموعوں کی تیاری

بہر حال روایتِ حدیث میں حضرت علیؓ کے طرزِ عمل کی اس تبدیلی کا ایک سب سے بڑا فائدہ یہ ہُوا کہ صحابہ کو احادیث نبویہ کو تحریری شکل میں لانے کا خوب خوب موقعہ ملا جہاں حال یہ ہو کہ خود رسول کا خلیفہ راشد اپنے ہاتھ سے لکھ لکھ کر لوگوں کو احادیث کے مجموعے دے رہا ہو وہاں بھلا دوسروں کو اس کام سے روکنے والی کیا چیز ہو سکتی تھی۔ ہم نے "کتابت حدیث اور صحابہ" کے عنوان کے تحت جن جن صحابہ کرام کے بارے میں تفصیل کے ساتھ یہ بتلایا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی مرویات کے مکتوب مجموعے تیار کیے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر نے یہ حدیثیں حضرت علی کے طرزِ عمل کی اس تبدیلی کے بعد ہی قلم بند کی تھیں۔ ان میں سے صرف دو اصحاب یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما تو یقیناً اس سے مستثنیٰ ہیں اس لیے کہ ان دونوں اصحاب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت پر بلکہ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں احادیث کو قلم بند کیا تھا۔ بہر حال ان دو مستثنیات کو چھوڑ کر باقی جن جن صحابیوں کی طرف بھی یہ منسوب کیا گیا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی روایتیں قلم بند ہو چکی تھیں اور جن کا ذکر

گذشتہ اوراق میں تفصیل سے ہو چکا ہے ان سب نے یہ کام بظاہر حضرت علیؓ کے طرز عمل میں متذکرہ تبدیلی ہی کے بعد کیا تھا۔ حضرت ابوہریرہ کا پانچ ہزار سے اوپر احادیث پر مشتمل کتابی ذخیرہ، حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر کتابیں، حضرت عائشہ کے علم کے ان کے شاگردوں کے ہاتھوں تیار شدہ مکتوب مجموعے، حضرت عبداللہ ابن عمرو اور حضرت جابر کے صحیفے وغیرہ یہ سب علمی خزانے بظاہر حضرت علیؓ کے طرز عمل میں تبدیلی کے بعد ہی وجود میں آئے۔ اس لحاظ سے حضرت علی کے طرز عمل کی یہ تبدیلی وقت کا ایک اہم تقاضا اور قدرت کی طرف سے ایک انمول عطیہ ثابت ہوئی۔

حفاظتِ حدیث
اور
تابعین و تبع تابعین

حفاظتِ حدیث سے متعلق اصل حقیقتِ حال کی وضاحت میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ اگرچہ اپنی جگہ پر اس قدر کافی ہے کہ اب مزید کسی تفصیل و بیان کی ضرورت باقی نہیں رہی تاہم اب ہم مختصر طور پر ان کوششوں کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو تابعین اور تبع تابعین نے حفاظت حدیث کے سلسلے میں انجام دیں۔ قارئین نے اب تک محسوس کر لیا ہوگا کہ زیر نظر تحریر کا مقصد حدیث کی تاریخ مرتب کرنا نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے ہمارے پیشِ نظر صرف یہ رہا ہے کہ منکرین حدیث کی جانب سے حدیث کے ذخیرے کو بے اعتماد بنانے کے لیے حفاظت حدیث کے ضمن میں شکوک و شبہات کے جو پہاڑ کھڑے کیے گئے ہیں ان کا بے بنیاد اور اندر سے کھوکھلا ہونا ثابت کر دیا جائے اور قارئین گواہی دیں گے کہ الحمدللہ ہم اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔

یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے کہ حدیث کی حفاظت کے لیے تابعین اور تبع تابعین نے بھی صحابہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے حفظ اور کتابت دونوں سے کام لیا :۔

حفظ حدیث کا اہتمام

جہاں تک حفظ سے کام لینے کا تعلق ہے قارئین دیکھ چکے ہیں کہ صحابہ کے زمانے سے ہی حفظ حدیث کا رواج عام ہو چکا تھا یہ رواج بعد میں بھی نہ صرف قائم رہا بلکہ اور زیادہ ترقی

کرتا گیا لوگ جس طرح قرآن کو سبقاً سبقاً یاد کرتے تھے اسی طرح حدیث کے حفظ کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ قرآن کے حفظ کے لیے جس طرح شروع ہی سے بچوں کو قرآن یاد کرنے پر لگا دیا جاتا ہے اسی طرح قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث بھی زبانی یاد کرانے کے لیے لوگ اپنے بچوں کو اساتذہ کے پاس بھیجا کرتے تھے چنانچہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بعض لوگ اپنے بچوں کو اسی مقصد کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ محمد بن سیرین کو ان کے والد نے بچپن ہی سے حضرت ابوہریرہ کے سپرد کر دیا تھا۔ محمد بن سیرین کے ایک بھائی یحییٰ نامی بھی تھے وہ بھی حضرت ابوہریرہ کے پاس حدیث پڑھنے آیا کرتے تھے۔[1] حضرت عبداللہ ابن عباس کے غلام عکرمہ اپنی تعلیمی سرگزشت بیان کرتے ہوئے کہا کرتے تھے:

کان ابنُ عباسٍ یضع الکبلَ فی رِجلی علی تعلیم القرآن والسنن۔ (تذکرۃ الحفاظ ص۹۵)	حضرت ابن عباس میرے پاؤں میں قرآن اور حدیث کی تعلیم دینے کے لیے بیڑی ڈال دیتے تھے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس کا اپنے شاگردوں کے ساتھ یہ طرزِ عمل دراصل اس فکر اور اس توجہ کی نشاندہی کرتا ہے جو احادیث کو زبانی یاد کراتے ہیں اساتذہ اپنے شاگردوں پر صرف کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قرآن حفظ کرنے والوں کا آموختہ سنا جاتا ہے حدیث یاد کرنے والوں کا آموختہ بھی لوگ اسی طرح سنتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے اور خصوصی شاگرد حضرت عروہ بن زبیر کے بارے میں ہے کہ وہ اپنے صاحبزادوں کو جو حدیثیں پڑھاتے اور زبانی یاد کراتے ان کا آموختہ باقاعدہ سب بیٹوں کو سامنے بٹھا کر سنا کرتے تھے چنانچہ آپ کے بڑے بیٹے ہشام بن عروہ اپنے تعلیمی دور کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے کہ میرے والد مجھے

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۷ ص۱۵۰

اور میرے دوسرے بھائیوں عبداللہ، عثمان اور اسماعیل وغیرہ کو حدیثیں پڑھا دیتے تو پھر ان کو ہم سے دوبارہ سنتے اور کہتے :

كَرِّرُوا عَلَىَّ وَكَانَ يُعجِبُهُ مِن حِفظِي (تاریخ کبیر بخاری ص۴)	(جو کچھ یاد کیا ہے) مجھے سناؤ اور وہ میری یادداشت کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ۔

حضرت عبداللہ ابن عباس بھی اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے کہ جو کچھ تم نے مجھ سے سن کر یاد کیا ہے وہ میرے سامنے دہراؤ۔ آپ کے شاگرد حضرت سعید ابن جبیر بتلاتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عباس مجھ سے کہا کرتے :

اُنظُر كَيفَ تُحَدِّثُ عَنِّى فَإِنَّكَ قَد حَفِظتَ عَنِّى حَدِيثًا كَثِيرًا (ابن سعد جلد ۶ ص۱۶۹)۔	مجھے بتاؤ تم مجھ سے حدیثیں کس طرح روایت کرو گے کیونکہ تم نے حدیثوں کا ایک کثیر ذخیرہ مجھ سے سن کر یاد کیا ہے ۔

مذاکرۂ حدیث جس طرح قرآن کا ایک مرتبہ یاد کرا دینا کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ بار بار اس کا دور کرتے رہنا ضروری ہے اسی طرح زبانی یاد کرائی ہوئی احادیث کے بارے میں بھی ہر استاد اپنے شاگردوں کو یہی تاکید کرتا رہتا تھا کہ انہیں بار بار دہراتے رہو ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے وہ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے :

أَكثِرُوا ذِكرَ الحَدِيثِ فَإِنَّكُم إِن لَم تَفعَلُوا يَدرُسُ عِلمُكُم (جامع بیان العلم جلد ۱ ص۱۰۱)	حدیث کو بار بار دہراتے رہو اگر ایسا نہ کرو گے تو تمہارا علم فرسودہ ہو کر مٹ جائے گا ۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ان الفاظ میں بیان فرماتے :

تَذَاكَرُوا الحَدِيثَ فَإِنَّ حَيَاتَهُ مُذَاكَرَتُهُ (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص۱۴۱)	بار بار حدیث کو دہراتے رہو۔ یہ اس کو زندہ رکھنے کی ہی ایک شکل ہے ۔

حدیث کا مذاکرہ اصل میں قرآن کے دور کی طرح ہے جس طرح حفاظ قرآن باہم مل کر ایک دوسرے کو اپنا یاد کیا ہوا قرآن سنایا کرتے ہیں اسی طرح باہم مل جل کر زبانی یاد

کی ہوئی احادیث کا اعادہ کرنے کو مذاکرے سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ احادیث کے باہمی مذاکرے کا طریقہ صحابہ ہی کے زمانے میں رواج پاگیا تھا چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ کے حلقۂ درس حدیث کا ذکر کرتے ہوئے عطا کہتے ہیں۔

كنا نكون عند جابر بن عبد الله فيحدثنا فإذا خرجنا من عنده تذاكرنا حديثه (ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۳۵۴)	ہم حضرت جابر بن عبداللہ کے پاس ہوتے اور وہ ہمیں حدیثیں سناتے پھر جب ان کے پاس سے باہر آتے تو ان کی بیان کردہ حدیثوں کو ہم باہم دوہراتے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں کو تاکید کرتے رہتے تھے کہ

تذاكروا الحديث (ابن سعد)	حدیث کا مذاکرہ کرتے رہو۔

بلکہ حضرت ابوسعید خدری تو یہاں تک فتویٰ دیتے کہ

مذاكرة الحديث أفضل من قراءة القرآن (تدریب صفحہ ۱۸۰)۔	حدیث کا مذاکرہ قرآن پڑھنے سے بہتر ہے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس حدیث کا مذاکرہ کرتے رہنے کو شب بیدار رہ کر عبادت کرنے سے زیادہ افضل قرار دیتے تھے۔ تدریب الراوی ہی میں ہے کہ حضرت ابن عباس اپنے تلامذہ کو مذاکرۂ حدیث کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے:

مذاكرة العلم ساعة خير من أحياء ليلة (تدریب صفحہ ۱۸۰)	علم کا مذاکرہ کرنا شب بیداری کی عبادت سے زیادہ بہتر ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ اس زمانے میں علم نام ہی حدیث کا تھا۔ غرض حدیث کے مذاکرے کا رواج صحابہ کے زمانے میں ہی عام ہوچکا تھا اور جس طریقے کو صحابہ نے پسند کیا تھا اس طریقے کو بھلا ان کے شاگرد کیسے چھوڑ دیتے بعد میں تو یہ طریقہ تعلیم حدیث کا ایک لازمی جزو بن گیا ہر استاد اپنے شاگردوں کو مذاکرۂ حدیث کی تاکید کرتے

رہنا اپنا فرض خیال کرتا تھا حضرت حسن بصری اپنے شاگردوں کو فرماتے :

غائلۃ العلم النسیان و ترك المذاکرۃ (جامع بیان العلم ص۱۲۱)	علم کی آفت اس کا بھول جانا اور اس کا مذاکرہ چھوڑ دینا ہے ۔

عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ اپنے تلامذہ سے کہتے :

اِنَّ احیاء الحدیثِ مذاکرتُہٗ فتذاکروا (جامع ص۱۱۱)	حدیث کو زندہ رکھنا اس کو دوہراتے رہنے میں ہے پس دوہراتے رہو ۔

غرض حدیث کا مذاکرہ کرتے رہنا حدیث کے پڑھنے پڑھانے والوں کے فرائض میں داخل سمجھا جاتا تھا ۔ صرف تعلیم ہی کے دوران نہیں بلکہ ایام تعلیم کی مشغولیتوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی محدثین اپنی پڑھی ہوئی اور یاد کی ہوئی حدیثوں کو دوہراتے رہتے تھے بالکل اسی طرح جس طرح قرآن کے حافظ حفظ سے فارغ ہونے کے بعد بھی اس کا دور کرتے رہتے ہیں بعض محدثین کو اگر سننے والا کوئی نہ ملتا تو مذاکرۂ حدیث کا فرض پورا کرنے کے لیے مکتب خانے چلے جاتے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو جمع کر کے انہیں اپنی یاد کی ہوئی حدیثیں سناتے ۔ اسماعیل بن رجاء کے بارے میں آتا ہے کہ

اِنَّہٗ کان یجمعُ صبیان الکتابِ فیحدّثھم لئلا ینسیٰ (جامع بیان العلم ص۱۰۲)	اسماعیل مکتب خانے کے بچوں کو اکٹھا کرتے اور ان سے حدیثیں بیان کرتے تاکہ بھول نہ جائیں ۔

عطاء خراسانی کے متعلق بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کی بھی یہی عادت تھی کہ جب کوئی نہ ملتا تو قریب جوار کے غرباء کو جمع کرتے اور ان کو اپنی یاد کی ہوئی حدیثیں سناتے مقصد یہی ہوتا کہ جو یاد کیا ہے وہ ذہن سے نکل نہ جائے ۔ جامع بیان العلم ہی میں ایک روایت ہے کہ عطاء خراسانی کی یہ عادت تھی کہ

اِذا لم یجدْ اَحدًا اَتی	جب کوئی ان کو نہ ملتا تو مساکین کی جماعت میں

المساکین نحدثهم یرید بذلك یحفظ (جامع بیان العلم جلد ۱ صلا)

آکر ان یث بیان کرتے مطلب حدیثوں کو یاد رکھنا تھا۔

..ت ابراہیم نخعی اپنے شاگردوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کرتے :

إذا سمعتَ حديثاً فحدِّث به حين تسمعُهُ ولو أن تحدِّث به من لا يشتهيه۔

(جامع بیان العلم ص۱۰۱)

جب تم کوئی حدیث سنو تو سنتے ہی زور ہ دن سے بیان کرنا شروع کردو خواہ کسی ایسے ہی کے سامنے کیوں نہ ہو جو تم سے حدیث سننا نہ چاہتا ہو۔

مقصود یہی تھا کہ کوئی سنے نہ سنے جو باتیں یاد کی ہیں وہ سناتے سے اور زبان سے دہراتے رہنے سے ذہن میں خوب محفوظ ہو جائیں۔

قرآن ہی کی طرح حدیث کے بھی حفظ کا اہتمام

غرض یہ تمام روایات اس پر شاہد ہیں کہ محدثین کے درمیان قرآن ہی کی طرح حدیث کے بھی حفظ کا اہتمام تھا ان میں بعض لوگوں سے تو صراحتہً اس قسم کے الفاظ بھی منقول ہیں کہ ہمیں احادیث نبویہ کو قرآن کی طرح اہتمام کے ساتھ یاد کرنا چاہیئے مثلاً ابن عساکر نے اسماعیل بن عبید محدث کا قول نقل کیا ہے وہ کہا کرتے تھے :

ينبغي لنا أن نحفظ حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم كما نحفظ القرآن۔

(تاریخ دمشق جلد ۲ صلا)

ہم لوگوں کو چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو اسی طرح یاد کریں جس طرح ہم قرآن یاد کرتے ہیں۔

مشہور حافظ حدیث ابن خزیمہ کے بارے میں تذکرۃ الحفاظ میں ذہبی نے ابوعلی نیشاپوری کے حوالے سے لکھا ہے کہ

كان ابنُ خُزَيمةَ يحفظُ الفقهيّاتِ

فقہی حدیثوں کو ابن خزیمہ اسی طرح یاد کرتے

من حدیثہٖ کما یحفظ القاریُ السورۃ (تذکرہ جلد ۲ صہ ۲۶۱)۔	تھے جس طرح قاری قرآنی سورتوں کو یاد کرتا ہے۔

اسی طرح اسرائیل بن یونس اپنے دادا ابو اسحاق کی روایت کردہ حدیثوں کے متعلق خود کہا کرتے تھے:

کنتُ احفظُ حدیثَ ابی اسحاق کما اَحفظُ السورۃ من القرآن (تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ صہ ۱۹۹)	میں ابو اسحاق کی روایتوں کو اسی طرح یاد کرتا تھا جس طرح میں قرآن کی سورت یاد کرتا تھا۔

بہرحال اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ راویان حدیث نے احادیث نبویہ زبانی یاد کرنے میں اسی طرح پوری توجہ اور محنت صرف کی جس طرح حفاظ قرآن کلام اللہ یاد کرنے میں پوری جانفشانی سے کام لیتے ہیں عام طور پر صحیح حدیث کی شرائط کو بیان کرتے ہوئے عدالت اور حفظ وغیرہ کے جو الفاظ ہمیں ملتے ہیں اس میں حفظ سے مراد یہ نہیں ہے کہ راوی کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی ہو تو صحیح حدیث کا راوی بن سکتا ہے بلکہ مراد یہی ہے کہ راوی نے حدیث کے یاد کرنے میں پوری توجہ اور محنت صرف کی ہو خواہ قوتِ حافظہ اس کی معمولی ہو یا غیر معمولی۔ یاد کر لینے کے بعد معمولی حافظے والے آدمی کی یاد کی ہوئی چیز اسی طرح بھروسے اور اعتماد کے قابل ہو جاتی ہے جس طرح کسی غیر معمولی حافظے والے کی۔ آخر یاد کرتے سے قرآن کے تیس پارے حفظ ہو جاتے ہیں اور ہر کوئی حافظ قرآن پر اعتماد کرتا ہے تو اسی لگن اور اسی محنت سے محدثین اگر حدیث کا ذخیرہ ذہن میں محفوظ کر لیتے تھے تو ان پر بے اعتمادی کا کیا سوال۔

محدثین کی قوتِ حافظہ اور یادداشت کے جو حیرت انگیز واقعات ہمیں رجال کی کتابوں میں ملتے ہیں وہ اس وقت تک ہی عجیب نظر آتے ہیں جب تک ہم انہیں محض غیر معمولی یادداشت کا کرشمہ سمجھتے رہیں لیکن جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ محدثین احادیث نبویہ کو سبقاً سبقاً ایک ایک دو دو حدیث کر کے بڑی جانفشانی سے یاد

کرتے تھے اور پھر اپنا یاد کیا ہوا محفوظ رکھنے میں پوری توجہ اور محنت سے کام لیتے تھے تو ان واقعات میں تعجب اور حیرانی کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اگرچہ اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہ نسبت پچھلوں کے اگلوں کا حافظہ زیادہ قوی تھا تاہم قوت حفظ و یادداشت میں زیادہ تر دخل محدثین کی توجہ محنت اور جانفشانی کو تھا۔

کتابت حدیث میں شغف کا عالم

احادیث نبویہ کو اس قدر محنت اور توجہ سے حفظ کر لینے کے بعد اگرچہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی کہ حفاظت حدیث کے لیے فن کتابت سے کام لیا گیا تھا یا نہیں تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ حفظ کے ساتھ ساتھ تابعین و تبع تابعین نے احادیث کو قلم بند کرنے کا بھی اسی طرح اہتمام کیا جس طرح صحابہ کرام کو اپنے زمانے میں انہوں نے کرتے دیکھا اور سنا تھا۔ اس سلسلے میں جو جو خدمات تابعین و تبع تابعین کے ہاتھوں انجام پائیں ان کا تفصیلی ذکر تو آپ کو تاریخ و تدوین حدیث کی کتابوں میں ملے گا تاہم یہاں بھی ہم مختصراً ان خدمات کے پس منظر کے طور پر اپنے قارئین کو یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ تابعین و تبع تابعین کے زمانے میں حفاظت حدیث کے لیے فن کتابت سے کام لینے میں کسی قسم کی کوتاہی کو روا نہیں رکھا گیا۔

احادیث کو قلم بند کرنے میں محدثین کے شغف کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ صرف اسی ایک واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر کے بارے میں آتا ہے کہ لکھتے لکھتے جب ان کے کاغذ بھر جاتے تو جو کچھ سامنے آتا وہ اسی پر لکھنا شروع کر دیتے حتیٰ کہ اور کچھ نہ ملتا تو دارمی کی روایت کے مطابق اپنے ہاتھوں پر ہی لکھنا شروع کر دیتے۔ ہاتھ تو ہاتھ ان کو اور کچھ نظر نہ آتا تو اپنے جوتے پر ہی لکھنے لگتے یہاں تک کہ وہ بھی بھر جاتا چنانچہ طبقات ابن سعد کی ایک روایت میں ہے

کان سعید بن جبیر یکتب عن ابن عباس فاذا امتلأت	سعید بن جبیر حضرت عبداللہ بن عباس سے سُن کر لکھا کرتے تھے جب صحیفے بھر جاتے

صحفہ' کتب فی نعلہ حتیٰ یملاھا۔ (ابن سعد جلد ۶ صفحہ ۱۸۹)۔ | تو اپنے جوتے پر لکھتے حتیٰ کہ وہ بھی بھر جاتا۔

حضرت سعید ابن جبیر حضرت عبداللہ بن عباس کے ممتاز ترین شاگردوں میں سے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس بھی تحصیل حدیث کے لیے جایا کرتے تھے کبھی کبھی خود اپنی تعلیمی سرگزشت سناتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ

کنت آسیر بین ابن عمرو ابن عباسٍ فکنت اسمع الحدیث منھما فاکتبہ' علی واسطۃ الرحل حتی انزل فاکتبہ۔ (جامع بیان العلم جلد ۱ صفحہ ۷۲)۔ | میں عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن عباس کے پاس جاتا تو ان دونوں سے حدیث سن کر اونٹ کے کجاوے کی تختیوں پر لکھ لیتا پھر جب اترتا تو اسے لکھ لیتا۔

محدثین اساتذہ اپنے شاگردوں کو تاکید کرتے رہتے تھے کہ جو حدیث سنو اسے قید تحریر میں لے آؤ۔ حضرت انس اپنے بیٹوں سے فرمایا کرتے یا بُنَیَّ قیدّوا ھذا العلم (میرے بچو اس علم حدیث کو قید تحریر میں لے آیا کرو۔ دارمی) یہی نہیں کہ احادیث کو قلم بند کرنے کی تاکید کرنے پر ہی اکتفا کرتے بلکہ روایات اس پر شاہد ہیں کہ اپنے سامنے بٹھا بٹھا کر لکھواتے چنانچہ دارمی ہی میں ہے راوی کہتا ہے کہ

رأیت ابان یکتب عند انس (دارمی) | میں نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انسؓ کے پاس بیٹھے لکھ رہے ہیں۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر کے مولیٰ حضرت نافع کے بارے میں ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو اپنے سامنے بٹھا لیتے اور جو حدیثیں حضرت نافع سناتے جاتے شاگرد لکھتے جاتے۔ دارمی ہی کی ایک روایت میں ہے بلکہ طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت موجود ہے سلمان بن موسیٰ کہتے ہیں کہ انہوں نے

انہ' رأی نافعا مولی ابن عمر علی علم ویکتبون بین یدیہ (دارمی)۔ | ابن عمرؓ کے مولیٰ نافع کو دیکھا کہ لوگ ان کے سامنے بیٹھے لکھ رہے ہیں۔

یہی نہیں کہ شاگرد اپنے طور پر لکھتے تھے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نافع باقاعدہ اپنے شاگردوں کو املا کراتے تھے ایک روایت میں اس کی تصریح موجود ہے سنن دارمی ہی کی روایت ہے کہ

نافع مولیٰ ابن عمرؓ یملی العلم علیٰ طلابہ وطلابہ یکتبون بین یدیہ ۔ (سنن دارمی جلد ۱ ص ۱۲۶ تا ۱۲۹)

نافع مولیٰ ابن عمر اپنے طالب علموں کو علم (حدیث) کا املا کراتے اور طالب علم ان کے سامنے بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔

حضرت عطاء بن ابی رباحؒ مشہور تابعی ہیں دارمی ہی کی ایک روایت کے مطابق وہ خود بھی احادیث لکھتے بچوں کو بھی لکھاتے اور طلبہ بھی ان کے سامنے بیٹھ کر لکھتے رہتے۔ کتابت حدیث کے لیے ان کی لگن کا عالم یہ تھا کہ بچوں کو بُلا بُلا کر بٹھاتے اور کہتے کہ حدیثیں لکھو جن کو لکھنا نہ آتا ان کو خود لکھ کر دیتے جن کے پاس کاغذ نہ ہوتا اُن کو کاغذ بھی اپنے پاس سے دیتے چنانچہ ابی حکیم الھمدانی کہتے ہیں:

کنت عند عطاء بن ابی رباحؒ ونحن غلمان فقال یا غلمان تعالوا! اُکتبوا فمن کان منکم لا یحسن کتبنا لہ، ومن لم یکن معہ قرطاس اعطینا ہ من عندنا۔ (المحدث الفاصل)

میں عطاء بن ابی رباح کے پاس تھا اور ہم اس وقت بچے تھے آپ نے فرمایا بچو ادھر آؤ اور لکھو تم میں جو اچھا نہیں لکھتا اسے ہم لکھ دیں گے اور جس کے پاس کاغذ نہیں ہے ہم اسے اپنے پاس سے کاغذ دیں گے۔

حضرت عامر الشعبیؒ جو کوفے کے بلند پایہ تابعین میں سے ہیں اور جنہوں نے حضرت علیؓ حضرت ابوہریرہؓ حضرت عائشہؓ اور دیگر متعدد صحابہ سے روایت کی ہے اپنے شاگردوں کو کتابتِ حدیث کی تاکید کرتے ہوئے کہا کرتے:

إذا سمعتم منی شیئا فاکتبوہ ولو فی حائط (جامع جلد ۱ ص ۷۳)

جب تم مجھ سے سنو تو لکھ لو خواہ دیوار پر ہی کیوں نہ ہو۔

"قتادہ بن دعامۃ السدوسی کے بارے میں ہے کہ جب کوئی ان سے کتابت حدیث کے بارے میں سوال کرتا تو جواب میں بڑے ہی پتے کی بات ارشاد فرماتے آپ سائل سے مخاطب ہو کر کہتے :

وَمَا يمنعكَ اَن تكتبَ وَ اخبرك اللطيفُ الخبيرُ انّه يكتبُ قال علمُهَا عندَ ربّي فى كتاب الآية (تقييد العلم ص۱۰۳)	تجھے لکھنے سے کون منع کرتا ہے جبکہ لطیف و خبیر کہتا ہے کہ وہ لکھتا ہے (پھر یہ آیت پڑھتے) فرمایا اس کا علم میرے رب کے پاس لکھا ہوا ہے ۔

مکتوب مجموعے غرض اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کتابت حدیث کے ساتھ اس درجے کے شغف کی موجودگی میں احادیث کے کتنے مجموعے کتابی شکل میں تیار ہو گئے ہوں گے امام زہری کے علاوہ جن کی کتابیں کئی اونٹوں کا بوجھ بنتی تھیں دیگر وہ لوگ جن کے بارے میں تصریح کے ساتھ روایات میں یہ آتا ہے کہ ان کے پاس احادیث کے مکتوب مجموعے موجود تھے ان میں عروۃ بن زبیر (۹۳ھ) خالد بن معدان الکلاعی (م ۱۰۴ھ) ابو قلابہ عبد اللہ بن زید الجرمی (م ۱۰۴ھ) حسن بصری (۱۱۰ھ) مکحول شامی (۱۱۲ھ) محمد باقر علی بن الحسین (م ۱۱۴ھ) بکیر بن عبد اللہ بن الاشج (۱۱۷ھ) قیس بن سعد المالکی (۱۱۷ھ) اور قتادہ بن دعامۃ السدوسی (۱۱۸ھ) کے نام قابل ذکر ہیں ۔ ان حضرات کے علاوہ بھی متعدد تابعین اور ان کے تلامذہ کے بارے میں یہ ذکر رجال کی کتابوں میں ملتا ہے کہ ان کے پاس احادیث نبویہ کے مکتوب ذخیرے تھے ۔

صحیفہ ہمام ابن منبہ حضرت ہمام ابن منبہ کے بارے میں گذر ہی چکا ہے کہ اُنھوں نے اپنے اُستاد حضرت ابوہریرہ کی مرویات کا مجموعہ تیار کیا تھا ۔ اگرچہ یہ مجموعہ صحیفۂ ہمام ابن منبہ کے نام سے مشہور ہے مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے کا نام الصحیفۃ الصحیحۃ[1] تھا۔

---

[1] کشف الظنون ص۷۶

اپنی عمر کے آخری ایام تک حضرت ہمام ابن منبہ اپنے اس صحیفے کا باقاعدہ درس دیتے رہے اور املا کراتے رہے[1] آپ کے بعد آپ کے شاگرد معمر بن راشد یمنی نے اس صحیفے سے روایت کا سلسلہ جاری رکھا پھر معمر سے ان کے تلمیذ رشید عبدالرزاق بن نافع الحمیری اور پھر ان سے ان کے شاگرد ابوالحسن احمد یوسف السلمی اس صحیفے کو روایت کرتے رہے اور پھر اسی طرح نسلاً بعد نسل یہ صحیفہ روایت ہوتا رہا[2]۔ عبدالرزاق بن نافع الحمیری ہی سے امام احمد بن حنبل نے اس صحیفے کو روایت کیا اور اسے اپنی مسند کے باب ابوہریرہ کی ایک خاص فصل میں جوں کا توں ضم کر دیا ؛

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مساعی

علاوہ ازیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مساعی سے جمع و تدوین حدیث کا جو مہتم بالشان کام انجام پایا وہ سب کے سامنے ہے۔ آپ نے جمع و تدوین حدیث کا کام جن لوگوں کے سپرد کیا تھا ان میں نمایاں لوگ حضرت ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم، قاسم بن محمد بن ابی بکر اور محمد بن مسلم بن شہاب زہری ہیں۔

ابوبکر بن محمد عامل مدینہ تھے ان کو احادیث نبویہ جمع کرنے کا حکم دیتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے لکھا تھا:

اکتب الی بما ثبت عندک من الحدیث عن رسول اللہ وبحدیث عمرۃ فانی خشیت دروس العلم و ذھابہ۔	جو کچھ تمہارے ہاں حدیث رسول میں سے ہے یا حدیث عمرہ سے ثابت ہے وہ مجھے لکھ بھیجو کیونکہ علم کے مٹ جانے اور غائب ہو جانے کا ڈر ہے۔

(سنن دارمی جلد ۱ صفحہ ۱۲۶)

یہ عمرہ جن کا اس روایت میں ذکر ہے عمرہ بنت عبدالرحمان ہیں جنہوں نے حضرت عائشہ کے پاس پرورش پائی تھی اور جو حضرت عائشہ کے علم کی امین سمجھی جاتی تھیں۔ یہ خالہ تھیں

---

[1] صحیفہ ہمام ابن منبہ حاشیہ صفحہ ۵۲ [2] صحیفہ ہمام ابن منبہ حاشیہ صفحہ ۵۶-۵۵

حضرت ابوبکر بن محمد کی۔

اسی قسم کا حکم حضرت عمر بن عبدالعزیز نے قاسم بن محمد بن ابی بکر کو دیا تھا جو مدینہ کے فقہا میں سے تھے یہ بھی اپنی پھوپی حضرت عائشہ رضؓ کے علم کے امین خیال کیے جاتے تھے کیونکہ انہوں نے بھی حضرت عائشہؓ ہی کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور ان سے ہی علم حاصل کیا تھا۔

تیسرے شخص جن کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جمع حدیث کا کام سونپا تھا امام ابن شہاب زہری ہیں۔ احادیث جمع کرنے میں ان کے شغف کا عالم یہ تھا کہ گھر گھر جاتے اور جو شخص ملتا اس سے حدیث نبوی کے بارے میں سوال کرتے۔ جوانوں، ادھیڑ عمر کے لوگوں اور بوڑھوں سے حتیٰ کہ پردہ دار خواتین تک سے احادیث معلوم کر کر کے قلم بند کرتے جاتے۔ احادیث جمع کرنے میں ان کی اس لگن کا حال بیان کرتے ہوئے ابراہیم بن سعد بن ابراہیم اپنے والد کے حوالے سے کہتے ہیں کہ

قلتُ لابی بِمَ فاقھم ابن شھاب قال کانَ یاتی المجالِسَ مِن صدورِھا ولا یلقی فی المجلسِ کھلاً اِلّا سَاَلَہٗ ولا شاباً اِلّا سَاَلَہٗ ثم یاتی الدارَ مِن دورِ الانصارِ فلا یلقی فیھا شاباً اِلّا سَاَلَہٗ ولا کھلاً ولا عجوزاً ولا کھلۃً اِلّا سَاَلَہٗ حتی یحاوِلَ ربات الحجال۔

(تہذیب التہذیب ج ۹ صہ ۴۴۹)۔

میں نے والد صاحب سے کہا کہ زہری کو کیسے فوقیت ہوئی تو کہنے لگے کہ وہ مجالس میں پہلے آتے اور مجلس میں بوڑھے جوان ہر ایک سے سوال کرتے پھر وہ انصار کے گھروں میں سے کسی گھر جاتے تو وہاں بوڑھے جوان، بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورت جو بھی ملتا اس سے پوچھتے حتیٰ کہ پردہ دار خواتین سے بھی۔

امام ابن شہاب زہریؒ کی انہی کوششوں کے نتیجہ میں وہ مکتوب ذخیرہ تیار ہوا تھا جس کے بارے میں آتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے کئی اونٹ

درکار ہوتے تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان تین حضرات کے علاوہ بھی اپنے تمام عمال کے نام یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث ملے لکھ کر جمع کرلو۔ سنن دارمی میں ہے کہ آپ نے اپنے عمال کو لکھا:

انظروا احدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبوہ فانی خفت دروس العلم و ذھاب اھلہ (دارمی جلد ۱ صفحہ ۱۲۶)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو دیکھو تو اس کو لکھ لو کیونکہ علم کے مٹ جانے اور اہلِ علم کے اُٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔

غرض حضرت عمر بن عبدالعزیز نے احادیث نبویہ جمع کرنے کا جو طریقہ بھی ممکن تھا وہ اختیار کیا۔ اس طرح جو ذخیرہ اکٹھا ہوا اس کو ابن شہاب زہری نے ترتیب و تہذیب سے مزین کیا۔ یہی وہ ترتیب و تہذیب ہے جسے ہم تدوین حدیث کا پہلا قدم قرار دیتے ہیں یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ان کوششوں کے نتیجے میں حدیث کا جو مکتوب ذخیرہ تیار ہوا اسے ہم تدوین حدیث کا پہلا قدم قرار دے رہے ہیں کتابتِ حدیث کا نہیں۔ منکرینِ حدیث اپنی مقصد برآری کی خاطر تدوین اور کتابت دونوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں اس لیے حفاظت حدیث کے سلسلے میں ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے۔ قارئین دیکھ چکے ہیں کہ جہاں تک کتابت حدیث کا تعلق ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں شروع ہو چکی تھی بعد میں وہ روز افزوں ترقی کرتی گئی اور حدیث کے لاتعداد مکتوب مجموعے تیار ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں جو کچھ ہوا وہ ان مکتوب مجموعوں کی باقاعدہ تدوین تھی جس کی آخری شکل ابن شہاب زہری کے ہاتھوں وجود میں آئی اور اسی لیے ان کو اوّلین مدوّنِ حدیث کے لقب سے یاد کیا گیا۔

علمائے حدیث کا قول ہے:

اول من دون العلم ابن شہاب (علوم الحدیث صفحہ ۲۵)	پہلا شخص جس نے علم (حدیث) کو مدوّن کیا وہ ابن شہاب ہیں۔

امام ابن شہاب زہری خود بھی اپنے بارے میں کہا کرتے تھے :

لم یدوّن ھذا العلم احدٌ قبل تدوینی (تدریب الراوی صنہ ۴) ۔	اس علم کو مجھ سے پہلے کسی نے مدوّن نہیں کیا ۔

غرض امام ابن شہاب زہری کے ہاتھوں تدوین شدہ حدیث کے اس ذخیرے کو مختلف رسائل کی شکل میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تمام ملک میں پھیلا دیا چنانچہ امام زہری ہی کا بیان ہے :

أمرنا عمر بن عبد العزیز لجمع السنن فکتبناھا دفترًا دفترًا فبعث الی کلّ ارضٍ لہٗ علیھا سلطان دفترًا ۔ (جامع بیان العلم جلد نمبر ۱ صلہ ۷)	ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے احادیث جمع کرنے کا حکم دیا تو ہم نے مختلف رسالے لکھے حضرت عمر نے ان تمام علاقوں میں جن پر ان کا اقتدار تھا یہ رسالے بھیجے ۔

امام زہری کی اس تالیف کے بعد تو پھر مختلف تالیفات کا تانتا بندھ گیا ۔ امام زہری کی راہ پر چلتے ہوئے مختلف شہروں کے بڑے بڑے جلیل القدر محدثین تدوین حدیث کے کام میں مشغول ہو گئے ۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں ابن جریج نے، مدینہ طیبہ میں امام مالک بن انس اور صاحب المغازی محمد بن اسحاق نے، بصرہ میں ربیع بن صبیح اور سعید بن عروبہ نیز حماد بن سلمہ نے کوفے میں سفیان ثوری نے، شام میں امام اوزاعی نے، یمن میں معمر نے، مصر میں لیث بن سعد نے، واسط میں ہشیم نے، رے میں جریر بن عبدالحمید نے اور خراسان میں عبداللہ بن مبارک نے تدوین حدیث کے میدان میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں ۔ تدوین حدیث کا یوں سمجھ لیجئے یہ پہلا دَور تھا جو دوسری صدی ہجری کے اواخر تک جاری رہا کیونکہ اس سلسلے کے سب سے آخری آدمی حضرت عبداللہ بن مبارک ہیں جن کی وفات ۱۸۱ھ میں ہوئی ۔ اس دَور کے مدوّنات میں سے ہم تک فقط مؤطا امام مالک پہونچی ہے ۔ اس دَور میں دو قسم کی تالیفات مرتب ہوئیں ایک قسم وہ

جس میں صحیح اسناد کا التزام نہیں کیا گیا بلکہ جو حدیث پہونچی درج کر دی گئی اور دُوسری قسم وہ جس میں صحت کا التزام کیا گیا مگر پھر بھی مرفوع[1] احادیث کا التزام کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ مرسل، منقطع اور آثار صحابہ حتی کہ اقوال تابعین کو بھی مرفوع احادیث کے ساتھ مخلوط رکھا گیا۔

تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں جب تدوین حدیث کا دُوسرا دَور شروع ہوا تو محدثین نے ضرورت محسوس کی کہ احادیث مرفوعہ کو مراسیل و آثار سے بالکل ممیز کر دیا جائے چنانچہ اس دَور کی تصانیف میں مرفوع احادیث کو دوسری تمام چیزوں سے علیحدہ کر دیا گیا اور احادیث کو صحابہ کی ترتیب پر جمع کیا گیا۔ اس قسم کے مجموعوں کو مسند کا نام دیا گیا۔ مشہور بلاد اسلامیہ میں بڑے بڑے محدثین نے مسانید تالیف کیں چنانچہ کوفے میں عبداللہ بن موسیٰ نے، بصرہ میں مسدّد بن مسرید نے اور مصر میں یعقوب بن شیبہ مالکی نے صحابہ کی ترتیب پر تالیفات مرتب کیں۔ یعقوب بن شیبہ مالکی نے تو اتنا ضخیم مسند لکھنا شروع کیا تھا کہ اگر اختتام تک پہونچتا تو تقریباً دوسو جلدوں کا ذخیرہ ہوتا۔ علی ہذا القیاس سمرقند میں حافظ حسن بن احمد بن محمد نے مسانید لکھیں امام ذہبی نے لکھا ہے کہ انہوں نے اتنی بڑی کتاب لکھی تھی کہ اس میں ایک لاکھ بیس ہزار احادیث کا ذخیرہ تھا[2] اسی قبیل سے مسند امام احمد بن حنبل ہے اس میں انہوں نے اپنی حفظ کی ہوئی ستر لاکھ پچاس ہزار احادیث میں سے انتخاب کر کے ایک لاکھ چالیس ہزار احادیث اپنی مسند میں جمع کیں۔ ائمہ اربعہ میں سے امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کے مسند بھی ہیں لیکن علماء کا خیال ہے کہ یہ دونوں مسند

---

[1] مرفوع وہ حدیث ہے جس میں کوئی صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل یا قول کی خبر دے جبکہ مرسل وہ حدیث ہے جس میں تابعی پہلے صحابی راوی کا ذکر نہ کرے اور منقطع وہ حدیث ہے جس کی اسناد میں مختلف راوی مختلف مقامات سے حذف کر دیے گئے ہوں۔

[2] تذکرۃ الحفاظ

خود اماموں کے تالیف کردہ نہیں ہیں بلکہ بعد میں کسی نے جمع کیے ہیں۔ بہرحال تدوین حدیث کے اس دوسرے دور کی تصانیف میں مرفوع احادیث غیر مرفوع احادیث سے علیحدہ ہوگئیں تاہم ایک کام اس دور کی تصانیف میں بھی باقی رہا وہ یہ کہ احادیث مرفوعہ کی تخریج میں صحت کا پورا پورا التزام نہیں کیا گیا صحیح، حسن اور ضعیف سب ملی جلی رہیں۔

یہ کام تدوین حدیث کے تیسرے دور میں انجام پایا جو تیسری صدی ہجری کے تقریباً نصف سے شروع ہوتا ہے اس دور میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے امام بخاری کو اس خدمت کے لیے منتخب کیا۔ امام بخاری نے اپنی حفظ کی ہوئی چھ لاکھ احادیث میں سے انتخاب کر کے صحیح بخاری مرتب کی۔ ہر حدیث کے انتخاب میں پورے حزم و احتیاط اور غایت اہتمام سے کام لیا اوّل ہر حدیث کی صحت کو مکمل غور و فکر سے جانچا پھر ہر حدیث کی تخریج سے پہلے غسل کیا اور دو رکعت صلوٰۃ الاستخارہ پڑھی اس کے بعد جب اس حدیث کی تخریج پر پوری طرح رائے جم گئی تب اس کو اپنی صحیح میں درج کیا اسی اہتمام کے ساتھ پوری کتاب کی تصنیف سے سولہ سال کی مدت میں فارغ ہوئے[۱] وہ حدیثیں جو اس کتاب میں جمع ہوئیں ان سب کی مجموعی تعداد مکررات، معلقات اور متابعات سب ملا کر نو ہزار بیاسی ۹۰۸۲ بنی۔

امام بخاری کے بعد امام مسلم نے اپنی صحیح مرتب کی۔ انہوں نے اپنی صحیح کا انتخاب تین لاکھ ایسی روایات سے کیا جن کو انہوں نے براہِ راست اپنے شیوخ سے سنا تھا پھر اس میں بھی صرف اپنی ذاتی تحقیق پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مزید احتیاط کے پیشِ نظر صرف وہی حدیثیں درج کیں جن کی صحت پر مشائخ وقت کا بھی اتفاق تھا اس پر بھی مزید یہ کہ کتاب مکمل ہونے پر اپنے زمانے کے زبردست حافظ حدیث حضرت ابو زرعہ کی خدمت میں اسے پیش کیا حضرت ابو زرعہ علل حدیث اور فن جرح و تعدیل کے امام مانے جاتے تھے۔ صحیح مسلم کی جس جس روایت کے بارے میں انہوں نے کسی علت کی طرف اشارہ کیا امام مسلم نے اسے اپنی کتاب سے خارج کر دیا اس طرح پندرہ سال کی محنت شاقہ کے بعد

---

[۱] تاریخ بغدادی جلد ۲ صفحہ ۱۴

بارہ ہزار احادیث صحیحہ پر مشتمل یہ مجموعہ تیار ہُوا۔

علمائے کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم کے بعد اصح الکتب یعنی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ صحیح یہی دو کتابیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں۔ ساری امت ان دونوں کتابوں کے قبول واستناد پر متفق ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی اشاعت کے بعد تو مدوّنات حدیث کا کبھی نہ ختم ہونے والا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جن کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیئے تاریخ حدیث کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے چونکہ ان کتابوں کی اشاعت کے بعد ان روایتوں کی حیثیت جن پر حدیث کی یہ کتابیں مشتمل ہیں متواتر روایتوں کی ہو گئی ہے اور اپنے مصنفین کی طرف نسبت کے اعتبار سے یہ تمام کتابیں ہر قسم کے شکوک وشبہات سے بالاتر ہو چکی ہیں اس لیے حفاظت حدیث کے سلسلے میں جو زیر نظر تحریر کا اصل موضوع تھا اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی ۔

جُزوِ دوم

حجّیتِ حدیث

هُوَ الَّذِي

بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

(الجمعة ٢)

قرآن کی جامعیّت

منکرین حدیث کی جانب سے حفاظت حدیث کے سلسلے میں جو شکوک و شبہات عام سادہ لوح مسلمانوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے کے لیے اٹھائے جاتے ہیں ان سب کا تفصیلی جائزہ زیر نظر تحریر کے پہلے حصے میں لیا جا چکا ہے۔ اب ہم منکرین حدیث کے ان اعتراضات کی طرف رُخ کرتے ہیں جو حجیت حدیث کو مشکوک بنانے کے لیے ان لوگوں کی جانب سے طرح طرح کے انداز بدل کر بار بار پیش کیے جاتے ہیں۔

منکرین حدیث کا دعویٰ اور دلائل

وہ بات جو اس سلسلے میں نہایت شد و مد کے ساتھ اور بہت ہی نمایاں انداز میں پیش کی جاتی ہے یہ ہے کہ قرآن اپنے آپ میں ایک جامع اور مفصّل و مکمل کتاب ہے اس کی موجودگی میں ہمیں کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں۔ منکرین حدیث اس بات کو زیادہ سے زیادہ جاذب توجہ بنانے کے لیے نئے نئے انداز اختیار کرتے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ ہم عامل بالقرآن ہیں ہم سے زیادہ قرآن پر عمل کرنے والا کوئی نہیں کبھی کہتے ہیں ہمارے لیے جو کچھ ہے قرآن ہے تمام احکام شریعت کا منبع وہی ہے اور کبھی بڑے ہی فصیح و بلیغ انداز میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ ماخذ دین ہونے کی حیثیت سے قرآن ہمیں ہر کسی دوسری چیز سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ یہ تمام باتیں اپنی جگہ پر بڑی جاذب توجہ ہیں اور ظاہر نظر میں بڑی حسین نظر آتی ہیں خصوصاً جب یہی باتیں ایک عام آدمی کے سامنے بڑے ہی منطقی انداز میں اور پورے خطیبانہ رنگ کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں تو فوراً ان کے دل و دماغ کو متاثر کرتی ہیں کون مسلمان ایسا ہے جو اس بات سے انکاری ہو سکتا ہے کہ قرآن ایک جامع اور مکمّل و مفصّل

کتاب ہے کون ایسا ہے جو قرآن کو تمام احکام شریعت کا منبع نہیں مانتا یا کون مسلمان ایسا ہے جو قرآن کے ماخذ دین ہونے کی حیثیت کو چیلنج کرتا ہو لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ ان تمام باتوں سے کیا منکرین حدیث کی وہی مُراد ہے جو سیدھے سادے طریقے سے ان باتوں سے ایک عام آدمی کی سمجھ میں آتی ہے۔ بے چارے سادہ لوح عام مسلمانوں کو کیا پتہ کہ ان خوبصورت الفاظ کے پیچھے معاندین حدیث نے خود تراشیدہ معانی کا کیسا تانا بانا بُنا ہوا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ منکرین حدیث دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی اتباع اور آپ کے طریقہ کار کی پیروی کی کوئی ضرورت نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات قرآن کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا، احکام قرآنی پر جس طرح عمل کر کے دکھایا اور قرآنی نظام پر مبنی جس طرح ایک مکمل معاشرہ قائم کر کے دکھایا ان سب کو ایک طرف رکھ دو اس لیے کہ یہ سب کچھ اس وقت کے حالات و واقعات کے مطابق تھا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اس وقت کی زندگی پر منطبق کر کے دکھایا اسی طرح ہم بھی آج کی زندگی پر اپنی سمجھ اور اپنی عقل کی مدد سے قرآن کو منطبق کر سکتے ہیں۔ منکرین حدیث کا دراصل دعوٰی یہ ہے کہ ہم صاحبِ وحی کی مدد کے بغیر ہی وحی الٰہی کی اصل مراد معلوم کر لینے کی صلاحیت سے اسی طرح بہرہ ور ہیں جس طرح خود صاحب وحی تھا ان کی نظر میں اللہ کا پیغام پہونچا دینے کے بعد نبی کا کام ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد سے لوگوں سے کچھ کہنے سننے کا کوئی حق نہیں رہتا اللہ تعالےٰ کا پیغام پہونچا دینے کے بعد نبی کی حیثیت ایک عام آدمی کی سی رہ جاتی ہے۔

قرآن کی جامعیت اور اس کے منبع احکام شریعت ہونے کا اگر یہی مفہوم ہے جو منکرین حدیث پیش کرتے ہیں تو ہر صادق القول مسلمان یقیناً اس سے براءت کا اظہار کرے گا کوئی سچا مسلمان یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ہادی برحق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول اور نبی تو تسلیم کرے مگر آپ کے اقوال

اور آپ کے افعال کو حجت ماننے سے انکار کر دے ۔

قرآن کی جامعیت کا اصل مفہوم کیا ہے اس پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دلائل کا جائزہ لے لیا جائے جو منکرین حدیث کی طرف سے اس سلسلے میں اپنے مزعومہ مفہوم کو ثابت کرنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں :

قرآن مفصّل ہے

منکرین حدیث اپنے دعوے کے ثبوت میں جن آیات قرآنی کو بطور استشہاد پیش کیا کرتے ہیں ان میں نمایاں حیثیت ان آیات کو حاصل ہے جن میں قرآن کے لیے تفصیلاً لِّكُلِّ شَيْءٍ اور تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں مثلاً سورہ نحل میں ہے :

ونزّلنا عليك الكتاب تِبيانًا لِّكلِّ شيءٍ (النحل ۸۹) ۔	اور ہم نے آپ پر کتاب اتاری جو ہر چیز کا کھلا بیان ہے ۔

منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ جب قرآن نے اپنے بارے میں خود اعلان کر دیا ہے کہ وہ ہر چیز کی پوری تفصیل اور ہر شے کے پورے بیان کا حامل ہے تو پھر قرآن سے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے ۔ قرآن میں ہر مسئلہ کی تفصیل موجود ہے قرآن نے تمام اصول و فروع اور تمام کلیات و جزئیات کو مفصّل طور سے اور کھول کھول کر بیان کر دیا ہے تو پھر حدیث کی ضرورت ہی کیا رہ گئی ۔ منکرین حدیث کے نزدیک تفصیلاً لکل شیءٍ اور تبیاناً لکل شیءٍ کے الفاظ اس بات کا ثبوت ہیں کہ شریعت کا کوئی معمولی سے معمولی مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جو قرآن میں تفصیل و وضاحت سے نہ ملتا ہو ۔

قرآن کی جامعیت کے بارے میں منکرین حدیث کا یہ دعویٰ اس قدر مضحکہ خیز ہے کہ خود آپ اپنی تردید کر رہا ہے دنیا میں ایسی کسی کتاب کا وجود ممکن ہی نہیں جس میں تمام جزئیات محصور ہوں ۔ جزئیات تو لامحدود ہیں اور ہر ہر قدم پر نئی نئی حاجتیں پیش آتی رہتی ہیں ۔ جزئیات کا عالم تو یہ ہے کہ قرآن کو نازل ہوئے آج چودہ سو سال ہونے کو آئے اور آج تک اس کی تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکا قرآن کی جزئیات

بیان کرنے کے لیے حدیث کی سینکڑوں جلدیں وجود میں آگئیں تفسیر و فقہ کے کروڑوں صفحات پر مشتمل ضخیم ذخیرے مرتب ہو گئے مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان سب میں مل کر بھی تمام جزئیات محصور ہو گئی ہیں اگر ان چودہ صدیوں میں صرف ان مسائل کو جمع کیا جائے جو وضوء اور غسل و طہارت کے لیے پیش آتے ہیں تو قرآن کریم سے کم ضخیم جلد نہ ہو۔ ایسا ہی معاملہ دیگر مسائل کا ہے اور ابھی بہت سی جزئیات ایسی بھی ہوں گی جو ابھی وجود ہی میں نہیں آئیں قیامت تک نہ جانے کتنی مزید جزئیات سے واسطہ پڑے گا۔ غرض یہ دعویٰ تو بالکل ہی بدیہی البطلان ہے کہ قرآن تمام اُصول و فروع اور تمام کلیات و جزئیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تفصیلاً لکل شیءٍ کا اگر یہی مطلب ہے جو منکرین حدیث سمجھے ہیں تو پھر ہمیں ماننا پڑے گا کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو سات یا دس تختیاں اللہ نے عطا کی تھیں ان میں بھی دُنیا کی تمام ضروریات و جزئیات مذکور تھیں کیونکہ قرآن نے ان تختیوں کے لیے بھی "تفصیلاً لکل شیءٍ" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۂ اعراف کی یہ آیت:

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (الاعراف ۱۴۵)۔	اور ہم نے اس کو (موسیٰ کو) تختیوں پر ہر چیز لکھ دی نصیحت کی بات اور ہر چیز کی تفصیل۔

کیا تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ ان تختیوں میں دُنیا کی تمام جزئیات و فروعات کا بیان ہوگا۔ ان کے بارے میں بائبل کا بیان ہے کہ ان میں احکام عشرہ تھے[1] کیا یہ کہنا عقل کی بات ہوگی کہ ان دس احکام میں انسانی زندگی کی تمام ضروریات و جزئیات سمائی ہوئی تھیں۔

منکرین حدیث سے کوئی پوچھے کہ کیا قرآن کریم میں جہاں کہیں "کل" کا لفظ آیا ہے ہمیشہ استغراق حقیقی کے لیے آیا ہے یعنی کُل کے لفظ سے کیا ہمیشہ وہ عموم مُراد لیا

---

[1] استثنا باب ۲۵

گیا ہے جو تمام افراد کو شامل ہو۔ قرآن نے شہد کی مکھی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے :

ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ (النحل-۶۹)	پھر تو ہر قسم کے پھلوں سے (رس) چوستی پھر۔

تو کیا منکرین حدیث کے قاعدے کے مطابق یہاں یہ سمجھا جائے گا کہ شہد کی مکھی کو اللہ کی جانب سے یہ الہام کیا گیا تھا کہ دُنیا کا کوئی پھل نہ چھوڑے بھلا ایک شہد کی مکھی کے لیے یہ ممکن ہی کہاں ہے کہ دُنیا کے تمام پھلوں سے رس چوس کر اپنے چھتے میں جمع کرے۔ اسی طرح قرآن نے جب یہ کہا کر

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ (الحج - ۲۷)	اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور ہر قسم کی دبلی اونٹنیوں پر بھی۔

تو کیا کلّ ضامر سے دنیا کی تمام دبلی اُونٹنیاں مُراد تھیں۔ ظاہر ہے کوئی بھی صاحب عقل کُل کے لفظ سے اس مغالطے میں نہیں پڑ سکتا ہر کوئی یہی کہے گا کہ یہاں مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ لوگ ہر طرح حج کے لیے پہونچیں گے خواہ انہیں پیدل آنا پڑے اور خواہ ان کی سواریاں مشقت سفر سے ہلکان ہو ہو جائیں۔

غرض کُل کا لفظ ضروری تو نہیں کہ ہمیشہ استغراق حقیقی کے لیے استعمال ہُوا ہو جس طرح پہلی آیت میں کُل کے لفظ سے دُنیا کے تمام پھل مُراد نہیں لیے جا سکتے اور جس طرح دُوسری آیت میں دُنیا کی تمام دبلی اونٹنیاں مُراد لینا درست نہیں اسی طرح تبیاناً لکلّ شیٔ یا تفصیلاً لکل شیٔ میں کل کے لفظ کو شریعت اسلامیہ کے تمام اصول و فروع اور کلیات و جزئیات پر حاوی سمجھنا ہرگز ہرگز درست نہیں۔ کُل کے صحیح مفہوم کو مزید اچھی طرح سمجھنے کے لیے ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے کون نہیں جانتا کہ قرآن میں ملکۂ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا جو قصہ مذکور ہُوا ہے اس کی روشنی میں یہ بات یقینی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس لوازمات حکومت و سلطنت ملکۂ سبا سے کہیں زیادہ تھے مگر دیکھیے قرآن ملکۂ سبا کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

وَ اُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ (النمل: ۲۳) | اور اسے ہر چیز دی گئی ہے۔

اب بتلایئے یہاں کل کو آپ کس معنی میں لیں گے۔ لازماً آپ یہی کہیں گے کہ یہاں "کل" استغراق حقیقی کے لیے استعمال نہیں ہوا یہاں کل شیء" کے عموم میں اس کے تمام افراد شامل نہیں۔

لہٰذا جس طرح کل الثمرات سے تمام قسم کے پھل کل ضامر سے دُنیا کے تمام اُونٹ اور کل شیءٍ" سے دُنیا کی تمام اشیاء مُراد نہیں ہیں اسی طرح تبیاناً لکل شیءٍ" سے قرآن کا شریعت کی تمام کلیات و جزئیات کو شامل ہونا مُراد نہیں لیا جا سکتا اس لیے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی کتاب تمام انسانی ضروریات و جزئیات کا احاطہ کرے۔

اس کے علاوہ یہ دعوٰی کہ قرآن تمام اُصول و فروع اور کلیات و جزئیات کو تفصیلاً بیان کرتا ہے حقیقت اور مشاہدے کے بھی خلاف ہے۔ قرآن میں بہت سے ایسے احکام ہیں جن کے متعلقہ مسائل کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں قرآن نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا ہے مگر نمازوں کے اوقات رکوع و سجود وغیرہ اور زکوٰۃ کی مقادیر و مدت وغیرہ جیسی تفصیلات سے بالکل خاموش ہے۔ روزے کا حکم تو قرآن میں موجود ہے مگر اس سے متعلق بہت سے ایسے احکام ہیں جن کا قرآن میں صراحتہً کوئی ذکر نہیں۔ اسی طرح حج اور مناسک حج کا حال ہے۔ ذبیحہ، نکاح، خرید و فروخت اور قصاص کی کوئی تفصیلات قرآن میں نہیں ملتیں۔ اب تبلایئے قرآن ہر قسم کی تمام تفصیلات بیان کرنے والا کہاں رہا۔

غرض تفصیلاً لکل شیءٍ" یا تبیاناً لکل شیءٍ" کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ قرآن میں شریعت کے ہر مسئلے کی تفصیل موجود ہے بلکہ اس قسم کی آیات قرآنی کا سیدھا سادا مفہوم یہ ہے کہ قرآن نے دین کے تمام بنیادی اُصول اور تمام مہمات شریعت کو بغیر کسی اینچ پیچ کے پوری وضاحت و تفصیل سے اس طرح بیان کر دیا ہے کہ اشتباہ و ابہام کا شائبہ تک باقی نہیں رہا۔

قرآن نے کچھ نہیں چھوڑا

منکرین حدیث کی طرف سے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں سورۂ انعام کی یہ آیت بھی پیش کی جاتی ہے :

ما فرّطنا فی الکتابِ من شیءٍ (الانعام - ۳۸)	ہم نے کتاب میں کسی چیز کو بھی نہیں چھوڑا ۔

اور کہا جاتا ہے کہ کتاب سے مُراد قرآن ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے بڑی صراحت کے ساتھ یہ فرما دیا ہے کہ ہم نے قرآن میں کسی چیز کو بھی نہیں چھوڑا سب کچھ اس میں لکھ دیا ہے تو پھر قرآن کے علاوہ کسی چیز کی خواہ وہ حدیثِ رسول ہی کیوں نہ ہو کیا ضرورت رہی ۔

آیت قرآنی کے اس ٹکڑے کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرنا منکرین حدیث کی علمی بددیانتی کا شاہکار ہے ۔ ان الفاظ کا صحیح مفہوم اسوقت تک پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک پوری آیت کے ساتھ ملا کر ان کو نہ پڑھا جائے ۔ پوری آیت اس طرح ہے :

وَما من دابّةٍ فی الارض ولا طائرٍ یطیرُ بجناحیهِ الّا اممٌ امثالکم مافرّطنا فی الکتاب من شیءٍ ثمّ الٰی ربّهم یُحشرون ۔ (الانعام - ۳۸) ۔	اور جو بھی زمین پر چلنے والا جانور ہے اور جو بھی اپنے دونوں بازوؤں سے اڑنے والا پرندہ ہے یہ سب تمہارے ہی طرح کے گروہ ہیں اور ہم نے اپنی کتاب میں کوئی چیز (بے لکھے) نہیں چھوڑی پھر یہ سب اپنے پروردگار کے پاس جمع کیے جائیں گے ۔

اب پوری آیت پڑھنے سے بات کھل کر سامنے آگئی ۔ سیاق و سباق صاف بتلا رہا ہے کہ یہاں کتاب سے مُراد قرآن نہیں ہے اور کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا تعلق شریعت کے مسائل و احکام سے نہیں ہے دراصل یہاں کتاب سے مُراد لوح محفوظ ہے جو علم الٰہی کی امین ہے ۔ اس آیت اور اس سے ماقبل کی آیات میں قیامت کے روز تمام خلائق کے جمع کیے جانے کا ذکر ہو رہا ہے اور بتلایا جا رہا ہے کہ حشر کے میدان میں انسانوں کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے جانور بھی دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ قیامت کے دِن زندہ ہو کر اٹھنے میں جانور بھی اے انسانو تمہاری ہی طرح کے گروہ ہیں اور

اگرچہ یہ سب جانور اپنی کثرت کی وجہ سے عرفاً بے انتہا ہوں لیکن ہمارے حساب میں سب منضبط ہیں کیونکہ ہم نے اپنے رجسٹر یعنی لوح محفوظ میں کوئی چیز بھی جو قیامت تک ہونے والی ہے بے لکھے نہیں چھوڑی۔

ذرا سوچ کر تبلائیے آیت کے اس مفہوم کو کوئی دُور کی بھی نسبت ہے اس مفہوم سے جو منکرین حدیث سیاق وسباق سے بے نیاز ہو کر اپنی مقصد برآری کے لیے اس آیت سے نکال لیتے ہیں۔

الکتاب کا لفظ اور بھی متعدد جگہ قرآن میں لوح محفوظ اور علم الٰہی کے لیے استعمال ہُوا ہے مثلاً سورۂ انعام ہی میں ہے:

وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔ (الانعام - ۵۹)۔	اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر یہ کہ وہ اسے جانتا ہے اور کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر یہ کہ (یہ سب) روشن کتاب میں (موجود) ہیں۔

ظاہر ہے روشن کتاب سے مُراد لوح محفوظ ہی ہے کائنات کے ذرّے ذرّے کا علم جس میں منضبط ہے۔ اسی طرح سورۂ سبا کی اس آیت میں بھی کتاب مبین کے الفاظ لوح محفوظ ہی کے لیے استعمال ہوتے ہیں:

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرُ اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔ (سبا - ۳)۔	اس سے کوئی ذرّہ برابر بھی غائب نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی اور نہ کوئی بڑی مگر (یہ کہ یہ سب) کتاب مبین میں (درج) ہے۔

غرض کتاب سے ضروری نہیں کہ قرآن ہی مراد لیا جائے۔ کتاب کے لفظ کو قرآن نے لوح محفوظ اور علم الٰہی کے لیے بھی استعمال کیا ہے چنانچہ منکرین حدیث کی پیش کردہ اس

آیت مافرّطنا فی الکتٰب من شیءٍ میں بھی الکتاب سے لوح محفوظ ہی مُراد ہے قرآن مُراد نہیں ۔

قرآن کافی ہے

ایک اور آیت جو منکرین حدیث اس سلسلے میں پیش کیا کرتے ہیں سورۂ عنکبوت کی یہ آیت ہے :

اَوَلَمْ یَکْفِہِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنا علیکَ الکتٰبَ یُتْلٰی علیہم اِنَّ فی ذٰلکَ لَرَحْمَۃً وَّ ذِکْرٰی لِقومٍ یؤمنون ۔ (عنکبوت - ۵۱) ۔	کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ کے اُوپر کتاب نازل کی ہے جو ان کو سنائی جاتی رہتی ہے بے شک اس کتاب میں ایمان والوں کے لیے بڑی رحمت اور نصیحت ہے ۔

اس آیت سے استشہاد کرتے ہوئے منکرین حدیث کہا کرتے ہیں کہ جب قرآن خود کہہ رہا ہے کہ وہ ہمارے لیے کافی ہے اور سراپا رحمت و نصیحت ہے تو پھر حدیث کے سہارے کی کیا ضرورت ہے ۔

اس آیت کو بھی منکرین حدیث نے اپنے ماہرانہ فن کا کمال دکھلاتے ہوئے اصل سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے پیش کیا ہے اس آیت میں کہا کچھ اور جا رہا ہے اور منکرین حدیث کچھ اور ہی معنی اپنی طرف سے اسے پہنائے جا رہے ہیں منکرین حدیث کا یہ استدلال بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی قرآن کی آیت لَاتَقْرَبُوْا الصّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰارٰی میں سے صرف لَاتَقْرَبُوا الصّلٰوۃَ کے الفاظ لے کر کہے کہ قرآن تو کہتا ہے نماز کے قریب بھی مت جاؤ ۔ جس قدر مضحکہ خیز یہ استدلال ہے اس سے زیادہ مضحکہ خیز بلکہ احمقانہ یہ استدلال ہے کہ سورہ عنکبوت کی منذکرہ بالا آیت سے حدیث کی عدم احتیاج ثابت ہوتی ہے ۔ اس آیت سے پہلے جو آیت ہے وہ ذرا پڑھیے اس سے پہلے کی آیت میں مشرکین مکّہ کے اس مطالبے کو نقل کیا گیا ہے کہ یہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نشانیاں کیوں نہیں دکھلاتے ۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْہِ اٰیٰتٌ	اُنہوں (مشرکین مکّہ) نے کہا اس (نبی) پر اسکے

مِن ربِّہٖ قُلْ اِنَّمَا الآیات عند اللہ وَ اِنَّمَا اَنَا نذیرٌ مبین۔ (عنکبوت۔ ۵۰)

رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں نازل ہوتیں کہہ دیجئے نشانیاں اللہ کے اختیار میں ہیں میں تو بس کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔

اس کے فوراً بعد مشرکین مکہ کے اس مطالبے کا رد کرتے ہوئے فرمایا اَوَلَمْ یَکْفِھِمْ الخ یعنی یہ لوگ اور کوئی نشانی کیوں طلب کرتے ہیں ان کے پاس تو سب سے بڑی نشانی اللہ کی کتاب آچکی کیا وہ ان کے لیے کافی نہیں ہے اس روشن اور عظیم ترین معجزے کے ہوتے ہوئے جو سراپا رحمت و نصیحت ہے دوسرا معجزہ طلب کرنا سراسر بے عقلی کی بات ہے اس سیاق و سباق کو سامنے رکھتے ہوئے ہر کوئی خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہاں سنّت و حدیث کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے ان آیات میں تو مشرکین مکّہ کے ایک غیر معقول مطالبے کا رد کرنا مقصود ہے۔ حیرت ہوتی ہے منکرین حدیث حقائق قرآنی کو کس جرأت کے ساتھ توڑتے مروڑتے رہتے ہیں انہیں نہ خدا کا خوف ہے اور نہ اس بات کا کوئی خیال کہ علمی دیانتداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

کیا حدیث کی مشغولیت گمراہی ہے؟

مذکورہ بالا استدلالات کے بارے میں تو حسن ظن سے کام لیتے ہوئے بہرحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید کسی غلط فہمی کی بنا پر یا ماہرانہ علمی صلاحیت سے محرومی کی بنا پر ان آیات سے سنت و حدیث کے خلاف استشہاد کرایا گیا ہو مگر ہم منکرین حدیث کا ایک اور استدلال پیش کرنے لگے ہیں جو قرآنی تحریف اور حدیث دشمنی کا کھلا شاہکار ہے۔ اس استدلال میں جو طرز عمل اختیار کیا گیا ہے اس کے پیش نظر تو یقین نہیں آتا کہ ان لوگوں کی طرف سے سنت و حدیث کی مخالفت دیانتدارانہ طور پر محض کسی غلط فہمی کی بنا پر کی جا رہی ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ لوگ سورۂ لقمان کی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَشْتَرِیْ لَھْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ یَتَّخِذَھَا ھُزُوًا (لقمان۔ ٦)۔

لوگوں میں سے کوئی انسان ایسا بھی ہے جو اللہ سے غافل کرنے والی باتیں خریدتا ہے تاکہ بے سمجھے بوجھے اللہ کی راہ سے لوگوں کو بھٹکائے اور اس راہ کی ہنسی اڑائے۔

اور بڑی دیدہ دلیری سے کہتے ہیں کہ دیکھئے اس آیت میں حدیث کی مشغولیت کو گمراہی قرار دیا گیا ہے۔ العیاذ باللہ کہاں لھوالحدیث اور کہاں حدیث نبوی۔ حدیث دشمنی میں یہ لوگ کتنی دور نکل گئے ہیں قرآن کے اندر معنوی تحریف کرتے ہوئے بھی انہیں شرم نہیں آتی۔ ان لوگوں کی کتابوں میں اس آیت کا جو ترجمہ ملتا ہے وہ قرآنی آیات میں بلاواسطہ معنوی تحریف کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ حافظ اسلم صاحب جو ان لوگوں کی صفوں میں بہت بڑے عالم سمجھے جاتے ہیں اس آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"اور لوگوں میں سے وہ ہیں جو حدیث کے مشغلے کے خریدار ہوتے ہیں
تاکہ اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں"۔ (مقام حدیث جلد ا صفحہ ۱۵۶)

حالانکہ ہم نہیں سمجھتے کہ حافظ صاحب اتنی بات بھی نہ جانتے ہوں کہ حدیث کے معنی عربی زبان میں بات کے ہیں اس لغوی معنی کے اعتبار سے حدیث کا لفظ خدا کی بات، رسول کی بات، صحابہ اور عام مسلمانوں کی بات بلکہ کافروں کی بات حتی کہ شیطان کی بات پر بھی بولا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک معنی کے لیے حدیث کا لفظ خود قرآن میں استعمال ہوا ہے مثلاً

اللہ نزّل أحسنَ الحديث (الزمر: ۲۳)	اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے۔

اس آیت میں حدیث کا لفظ کلام الٰہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح ایک آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سرگوشی کو حدیث کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے :

وإذ أسرّ النبی إلی بعض أزواجه حديثا۔ (التحریم : ۳)	جب پیغمبر نے ایک بات اپنی کسی بیوی سے چپکے سے فرمائی۔

صحابہ اور عام مسلمانوں کی گفتگو پر لفظ حدیث کا اطلاق اس آیت میں ہوا ہے :

ولا مستأنسين لحديث۔ (الاحزاب : ۵۳)۔	اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھے رہا کرو۔

اعدائے اسلام اور کفار و مشرکین کی گفتگو پر لفظ حدیث کے اطلاق کے لیے یہ آیت

پیش کی جا سکتی ہے۔

حتیٰ یخوضوا فی حدیث غیرہٖ (النساء : ۱۴۰)	یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔

یعنی کافر اور مشرک اگر اپنی مجالس میں اسلام کا مذاق اڑا رہے ہوں تو مومنین کو چاہیے کہ ان کی ہم نشینی سے اجتناب کریں حتیٰ کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔

ان تمام آیات میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حدیث کا لفظ جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے بات ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس اصطلاحی معنی میں حدیث کا لفظ کہیں بھی استعمال نہیں ہوا جو محدثین اور فقہا کے درمیان معروف ہے۔ منکرین حدیث کی طرف سے پیش کردہ زیر بحث آیت میں بھی لہو الحدیث سے وہ تمام شیطانی باتیں مراد ہیں جن میں مشغول ہو کر انسان خدا سے غافل ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ انسانیت کے لیے گمراہی اور فساد کا باعث بن جاتا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عباس کا قول ہے:

لھو الحدیث ھو الغناء واشباھہ۔ (قرطبی)	لہو الحدیث سے مراد گانا اور اس کے مشابہ چیزیں ہیں

گویا ہر بیکار اور غیر مفید مشغلہ جو حق کی طرف سے غفلت اور بے رغبتی پیدا کرنے والا ہو لہو الحدیث کے تحت داخل ہے اس طرح اس آیت کو حدیث کے اس اصطلاحی معنی سے دور کا بھی تعلق نہیں جو محدثین اور فقہا کے توسط سے امت میں شروع سے منقول ہوتا چلا آیا ہے۔ منکرین حدیث کی جسارت پر تعجب ہوتا ہے وہ لفظ جو شیطانی باتوں اور بیکار مشغلوں کے لیے قرآن میں استعمال ہوا تھا اپنی مذموم مقصد برآری کی خاطر اس لفظ کو حدیث رسول جیسے پاک ومطہر کلام پر چسپاں کر دیا اور ان لوگوں کی علمی بے خبری کا عالم یہ ہے کہ اپنے حق میں دلیل دینے کے جوش میں یہ تک بھول گئے کہ یہ آیت مکی ہے یا مدنی۔ سورۂ لقمان مکی سورتوں میں سے ہے مکی دور میں مشرکین مکہ کے ظلم وستم کا جو حال تھا اس سے کون واقف نہیں۔ مسلمان بے چارے مکی دور میں ایسی کس مپرسی کے عالم میں تھے کہ حدیث تو کجا قرآن کی کتابت وترتیب کا موقع بھی انہیں بسہولت میسر نہ

تھا۔ مکّی زندگی کے پُرآشوب زمانے میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مسلمان حدیث کے مشغلے یا مجموعے خریدتے پھرتے سچی بات یہ ہے کہ قرآن نے تو یہودیوں کے لیے کہا تھا کہ یحرّفون الکلم عن مواضعہ (وہ کلام کو اس کے اصل مقام سے بدل دیتے ہیں) مگر آج اللہ کا یہ قول منکرین حدیث پر حرف بحرف صادق آرہا ہے۔

قرآن کی جامعیت کا اصلی مفہوم

غرض منکرین حدیث کی کسی بھی دلیل سے قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن میں شریعت کے تمام اصول و فروع اور تمام کلیات و جزئیات مفصلاً مذکور ہیں اور اس لیے ماخذ دین ہونے کے لحاظ سے حدیث رسول اور سنت رسول کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس سلسلے میں منکرین حدیث کی طرف سے پیش کیے جانے والے دلائل کا حشر تو قارئین نے دیکھ ہی لیا۔ آئیے اب ہم قرآن کی جامعیت کا اصل مفہوم معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم تو کسی طرح عقل میں آنے والا نہیں کہ اس نے احکام دین کے تمام غیر متناہی جزئیات کا احاطہ کر لیا ہے فرائض و واجبات، مستحبات و سنن کی تمام حدود اس نے قائم کر دی ہیں، ارکان و شرائط اسباب و موانع کی تمام تفصیلات اس میں مذکور ہیں یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی نہیں کہ قرآن کی کسی آیت میں کوئی اجمال، کسی عموم میں کوئی تقیید اور کسی مراد میں کوئی ابہام نہیں رہا۔ کسی کتاب کے جامع ہونے کا نہ یہ مطلب ہوتا ہے نہ عقلاً یہ ممکن ہے اگر درحقیقت قرآن کی جامعیت اور اس کی وضاحت و تفصیل اسی درجہ کی ہوتی تو رسول کی بعثت بے فائدہ رہتی۔ قرآن کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعوث فرمانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اپنے آپ میں جامع ہونے کے باوجود تعلیم و توضیح کا محتاج ہے نبی کا کام یہ ہے کہ وہ اس کتاب کے مطالب سمجھائے اور اس پر عمل کرنا سکھلائے۔

قرآن اس لحاظ سے یقیناً جامع ہے کہ اس نے عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق سے متعلق تمام کلیات کھول کر بیان کر دی ہیں وہ ماضی کی خبروں، مستقبل کی

اطلاعوں اور حال کے احکام کا احاطہ کیے ہوئے ہے وہ جہاں بانی کے رموز و اسرار کے لیے مکمل آئین ہے گدائی کے عمیق و دقیق اصول بھی اس نے انتہائی سادہ اور جامع الفاظ میں بیان کر دیے ہیں۔ یہی نہیں کہ دینیات کا کوئی گوشہ اپنی اصولیت اور کلیت کے لحاظ سے اس سے باہر نہیں بلکہ سیاست، معیشت، معاشرت، معاملات، اخلاق اور نفسیات کے تمام اصول و قوانین بھی وہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

مگر قرآن کی یہی جامعیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کی تعبیرات اصولیت اور کلیت کی انتہا کو پہونچی ہوئی ہوں اس کے لفظ لفظ میں حقائق و معارف کے دریا پوشیدہ ہوں اس کا ایک ایک اشارہ معارف الٰہیہ کا مخزن ہو' اس کا ایک ایک لفظ اعجازی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہو۔ قرآن کی جامعیت ہی کے نتیجے میں لازم ہے کہ قرآنی آیات میں سے کوئی آیت خفی ہو تو کوئی مجمل کوئی مشکل ہو تو کوئی کتاب کا پہلو لیے ہوئے ہو۔

حدیثِ رسول کی احتیاج

اور قرآن کی جامعیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انہی اصولی و کلی تعبیرات کی اصل مرادات متعین کرنے کے لیے ہم حدیثِ رسول کے محتاج ہیں۔ نبی کا واسطہ درمیان میں نہ ہو تو کس کے بس کی یہ بات ہے کہ وہ ان حقائق و معارف پر مطلع ہو سکے جو قرآن کے جامع ہونے کی وجہ سے اس کے ایک ایک لفظ میں پوشیدہ ہیں۔ نبوت کی رہنمائی کے بغیر ان اشارات کو کون سمجھ سکتا ہے جو قرآن نے اپنی جامعیت کی بنا پر اپنے وجود میں سموئے ہوئے ہیں اگر یہ صحیح ہے کہ عاشق کی رمزیں صرف عشق آشنا ہی جان سکتا ہے تو یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ اشارات ربانی کی اصل مُراد کو صرف رب آشنا ہی پا سکتا ہے۔

قرآن جو اپنے جامع ہونے کی بنا پر اعجازی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کے کلمات کی ایک ایک تہہ اور ایک ایک شکن میں صدہا علوم لپیٹے ہوئے ہیں اس کے دقائق و حقائق پر اطلاع پانے کے لیے ایک ایسے واسطے کا ہونا لازمی ہے جو ایک لحاظ سے ذات حق سے قریب تر ہو اور ایک لحاظ سے بندوں میں شامل ہو وہ لامحدود ذات و صفات کی حامل ہستی سے صادر ہونے والے کلام کے علوم و معارف پر

بلا واسطہ خود اسی ہستی سے اطلاع پائے اور پھر اسی کی رہنمائی میں عامۂ خلائق کو ان پر مطلع کرے۔ اس کلام میں کوئی خفا ہو تو وہ اس کا اظہار کرے کوئی اجمال ہو تو اس کی تفصیل کر دے کوئی ابہام ہو تو اس کو کھول دے۔ اس کلام کے کسی حصے سے مختلف محتملات مفہوم ہوتے ہوں تو اصل احتمال متعین کر دے۔ اس کلام میں جتنے احکام بیان کیے گئے ہیں ان میں سے جس حکم کی توجیہ بیان کرنا ضروری ہو اس کی توجیہ بیان کرے جس حکم کی حدود کا تعین ضروری ہو اس کی حدود متعین کرے۔ کسی حکم کے خواص و آثار بتلانے ضروری ہوں تو ان خواص و آثار پر مطلع کرے۔ غرض قرآن کی جامعیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تمام اُصولی و کلی تعبیرات کی اصل اصل مرادات متعین کر دے ؛

بعثت کے تین اہم مقاصد

قرآن کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر درحقیقت اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں پر بڑا احسان فرمایا ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہماری تعلیم و ہدایت کا سامان نہ کرتا تو ہم یقیناً مدت العمر قرآن کی صحیح مُراد حاصل نہ کر پاتے۔ اللہ تعالیٰ اسی احسان کو یاد دلاتے ہوئے فرماتا ہے :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ۔ (آل عمران - ۱۶۴)	اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ کی بعثت کے تین اہم مقاصد بتلائے گئے ہیں ایک یہ کہ آپ اللہ کی کتاب لوگوں کو پڑھ کر سنائیں دوسرے یہ کہ آپ لوگوں کا فرد کے لحاظ سے بھی اور اجتماعی ہیئت کے لحاظ سے بھی تزکیہ کریں یعنی اپنی تربیت سے ان کی

انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کریں اور تیسرے یہ کہ آپ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں اور اس کی منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر قرآن کی جامعیت کا وہی مطلب ہوتا جو منکرین حدیث بیان کرتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا صرف ایک ہی مقصد ہونا چاہیئے تھا کہ وہ اللہ کی کتاب لوگوں کو پڑھ کر سنادیں اور بس۔ بلکہ اس کی بھی ضرورت نہ تھی قرآن کریم لکھا لکھایا ایک کتاب کی صورت میں لوگوں کے ہاتھ میں تھمادیا جاتا اور اس کے لیے ظاہر ہے کسی رسول کے مبعوث کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی کسی پہاڑ یا اونچے درخت پر نازل کردیا جاتا جہاں سے لوگ خود اٹھا کر اسے لے آتے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا اور طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ پہلے ایک فخر الرسل کو مبعوث فرمایا پھر وحی کے ذریعے قرآن کو اس پر نازل کیا اور پھر اس کے ذمے مستقل طور پر یہ کام لگایا کہ وہ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا طریقہ سکھلائے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن جامع ہونے کے باوجود تعلیم و توضیح کا محتاج ہے۔ اور اس بات کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ کسی کتاب کی تعلیم و توضیح کتاب سے ظاہراً علیحدہ ہوتے ہوئے بھی حقیقتاً اس کتاب سے کوئی جدا اور علیحدہ چیز نہیں ہوا کرتی۔ کسی کتاب کا متن اور اس کی شرح اگرچہ لفظاً مختلف ہوتے ہیں مگر معناً دونوں باہم متحد ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیم و توضیح کے لیے جو کچھ فرمایا اور جو کچھ کر کے دکھایا اور جسے ہم سنت یا حدیث کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ اگرچہ اپنے وجود کے اعتبار سے قرآن سے علیحدہ ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ قرآن ہی کا ایک حصہ ہے اس سے زائد یا اس سے باہر کوئی چیز نہیں کہ قرآن کی جامعیت کے منافی ہو۔ قرآن متن ہے اور حدیث اس کی شرح۔

تعلیم و توضیح قرآن قرآن کی تعلیم و توضیح کی ذمہ داری بعثت کے مقاصد میں سے کتنا اہم مقصد ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے

کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت و نبوت کی تفصیل بیان کی وہاں دیگر مقاصد کے ساتھ ساتھ اس مقصد کا بطور خاص ذکر فرمایا۔ حتیٰ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سورۂ بقرہ میں جب حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی اس دُعا کا ذکر آیا جس میں اُنہوں نے اپنی اولاد میں سے ایک رسول مبعوث کیے جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو اس وقت بھی حالانکہ وہ محض ایک دُعا تھی بعثت کے اس مقصد کو خاص طور سے دُعا کے الفاظ کا ایک مستقل جزء بنا دیا گیا۔ ارشاد ہے:

واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل ... ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیھم آیٰتک ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ ویزکیھم۔ (البقرۃ: ۱۲۹)

اور جب ابراہیم و اسمٰعیل اس گھر (کعبہ) کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے تو انہوں نے دُعا کی .... اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر تحویل قبلہ کے حکم کی حکمتوں کے ضمن میں بتلانا صرف یہ ہے کہ جس طرح تحویل قبلہ کا حکم دے کر ہم نے تم پر انعام کیا ہے اسی طرح تم ہی میں سے ایک رسول بھیج کر تم پر اتمام نعمت کر دیا ہے مگر اس موقع پر بھی بعثت کے یہی تینوں مقاصد علیحدہ علیحدہ اہتمام کے ساتھ بیان فرمائے۔ ارشاد ہے:

کما ارسلنا فیکم رسولاً منکم یتلوا علیکم اٰیٰتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتٰب والحکمۃ ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون

(البقرۃ: ۱۵۲)

جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

سورۂ جمعہ میں بھی اپنی پاکی و برتری کے بیان کے فوراً بعد جب اللہ تعالیٰ نے العزیز الحکیم کہہ کر اپنا حکیم ہونا ظاہر فرمایا اور اپنی حکمت کو اس طرح پر جتلایا:

هُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ (الجمعۃ : ۲)	وہی ہے جس نے امیوں کے درمیان خود انہیں میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے ۔

تو بعثت کے مقاصد بطور خاص گناتے اور ان میں تعلیم کتاب کو علیحدہ ذکر فرمایا

غرض جہاں کہیں بھی بعثت کا ذکر آ گیا تو اس کے مقاصد گناتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے تعلیم و توضیح قرآن کا ضرور ذکر فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم و توضیح قرآن کے بغیر بعثت کا مقصد پورا نہ ہوتا تھا دوسرے لفظوں میں قرآن اپنی ذات میں جامع اور مفصل ہونے کے باوجود تعلیم و توضیح کے بغیر اپنے مقصدِ نزول کے اعتبار سے نامکمل رہتا تھا۔

اب اس میں تو کسی کو کلام ہی نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کے تمام مقاصد باحسن وجوہ پورے فرمائے ۔ آپؐ نے قرآنی آیات سنا دینے پر ہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنے اقوال اپنے افعال اور اپنے طرز عمل سے لوگوں کو کتاب کی تعلیم بھی دی اس کتاب کی منشار کے مطابق کام کرنے کی حکمت بھی سکھائی اور ان کی انفرادی و اجتماعی خرابیوں کو دور کر کے ان کے اندر اچھے اوصاف و اطوار بھی پیدا کیے ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و توضیح قرآن کا فریضہ کس طرح انجام دیا اس کی وضاحت کے لیے چند ایک مثالیں پیش خدمت ہیں تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے اور قرآن کی جامعیت کا اصل مفہوم پوری طرح کھل کر سامنے آجائے نیز قرآن اور حدیث کا باہم ربط واضح ہو جائے ۔

مجملات کی تفصیل

تعلیم و توضیح قرآن کے کام کی پہلی قسم وہ ہے جس میں قرآن نے بعض مجمل احکام صادر کیے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تفصیل بیان فرمائی ۔ مثال کے طور پر قرآن نے جا بجا نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے ستر سے زیادہ مقامات پر کسی نہ کسی پیرائے میں اس کا ذکر ہے مگر نماز کے تفصیلی احکام اور اس کے اوقات وغیرہ کے ذکر سے قرآن خاموش ہے قرآن نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے اس تاکیدی حکم کی تعمیل آخر

کس طرح پر کی جائے اس کے لیے کیا کچھ کرنا ہوتا ہے اس میں قیام ہے تو اس کی کیا ہیئت ہے اس کے دوران کیا کچھ پڑھنا ہے' رکوع کی کیا کیفیت ہے' رکوع ایک ہے کہ دو' رکوع کے دوران پڑھے جانے والے کلمات کیا ہیں، سجدوں کی تعداد کتنی ہے، نماز میں بیٹھ کر بھی کچھ پڑھنا ہے یا نہیں، رکوع و سجود قیام و قعدہ کی باہم ترتیب کیا ہے' نماز سے باہر آنے کا طریقہ کیا ہے، نماز کے ارکان' فرائض' سنن اور مستحبات وغیرہ کا بھی قرآن نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ نماز میں سہو ہو جائے تو کیا کرے کن کن صورتوں میں نماز فاسد ہو جاتی ہے' مکروہات نماز کیا ہیں' کن کن اوقات میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور کن اوقات میں حرام' نماز کے اوقات کی صحیح صحیح تعیین کیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے نماز سے متعلق دیگر احکام اور مختلف تفصیلات کے بارے میں قرآن بالکل خاموش ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کی تعلیم دی ان تمام تفصیلات کو بتایا سمجھایا اور سکھایا۔

اسی طرح روزے کا حکم قرآن میں موجود ہے مگر اس کے تفصیلی احکام کے ذکر سے قرآن خاموش ہے قرآن آپ کو یہ نہیں بتائے گا کہ کن کن حالات میں روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور کن صورتوں میں کفارہ لازم آتا ہے۔ فدیہ دینے کی اجازت ہے تو کن لوگوں کے لیے' وہ کیا حالات ہیں جن میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے' وہ کونسی صورتیں ہیں جن میں رکھا ہوا روزہ توڑ دینے کی اجازت ہے۔ اس قسم کی جتنی تفصیلات روزے سے متعلق ہیں قرآن نے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ تمام تفصیلات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کیں۔

نماز اور روزے ہی کی طرح دوسرے دو ارکان دین حج اور زکوٰۃ کا بھی حال ہے حج اور زکوٰۃ کا حکم تو قرآن میں مل جائے گا مگر مناسک حج اور مسائل زکوٰۃ کی تفصیلات قرآن میں نہیں ملیں گی۔ حج ادا کرنے کا طریقہ' احرام کے کپڑوں کی تعداد' حدود میقات کا تعین' طواف کے چکروں اور سعی کے اشواط کی تعداد' رمل اور رمی کا طریقہ' قربانی کے تفصیلی احکام اور حج کی جنایات وغیرہ غرض حج سے متعلق تمام تفصیلی احکام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے تعلیم فرمائے۔ زکوٰۃ کے متعلق بھی تمام تفصیلات آپؐ ہی نے بتائیں۔ زکوٰۃ کا نصاب' اس کی شرح' اس کی مدت' مختلف قسم کے اموال پر زکوٰۃ کے مختلف نصاب' ہر ایک مال پر زکوٰۃ کی مختلف

شرح' حیوانات کی زکوٰۃ کے تفصیلی احکام زمین کی پیداوار کی صورتیں اور عشر و خراج کے مسائل وغیرہ یہ سب تفصیلات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ہمیں معلوم ہوئیں۔

یہی حال شریعت کے اور بہت سے مسائل کا ہے مثلاً ذبیحہ' نکاح و طلاق' خرید و فروخت اور قصاص وغیرہ کی تمام تر تفصیلات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے ذریعے ہی ہم تک پہونچیں قرآن میں بنیادی طور پر ان کے احکام ضرور موجود ہیں مگر ان کی بہت سی ضروری تفصیلات سے قرآن خاموش ہے۔

اب ان تمام تفصیلات کی عدم موجودگی کی بنا پر کیا قرآن کو غیر جامع خیال کیا جائیگا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے ذریعے معلوم شدہ یہ تمام تفصیلات کیا قرآن سے باہر یا قرآن سے زائد کوئی چیز سمجھی جائیں گی۔ ظاہر ہے دونوں باتوں کا جواب نفی میں ہے۔ اس لیے کہ نہ صورت یہ ہے کہ قرآن ان احکام کے ذکر سے یکسر خاموش ہے کہ اس کی جامعیت میں کوئی فرق آئے اور نہ یہ صورت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تفصیلات بیان کی ہیں جن کی اصل قرآن میں موجود نہیں کہ ان تفصیلات کو زائد از قرآن کوئی چیز قرار دیا جائے بلکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ قرآن نے جو احکام اپنی جامعیت کی بنا پر مجمل طور پر بیان کیے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ان کی تفصیلات کی نشاندہی کر دی ہے۔ اس لیے یہ تمام تفصیلات قرآن سے علیحدہ ہوتے ہوئے بھی قرآن ہی کا ایک حصہ ہیں۔

یہی بات بالکل اسی انداز میں مشہور صحابی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو سمجھائی تھی جس نے آپ کے سامنے یہ مطالبہ پیش کر دیا تھا کہ

لا تحدثونا الا بالقرآن	قرآن کے سوا ہمارے سامنے اور کچھ نہ بیان کرو۔

حضرت عمران بن حصین نے اس شخص کو اپنے قریب بلایا اور اس کو سمجھانا شروع کیا۔ آپ نے فرمایا:

أرأيتَ لو وُكلتَ أنت وأصحابُك	کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اور تمہارے رفقا صرف قرآن پر

إِلَى الْقُرْآنِ أَكُنْتَ تَجِدُ فِيهِ صَلَاةَ الظُّهْرِ أَرْبَعًا وَصَلَاةَ الْعَصْرِ أَرْبَعًا وَالْمَغْرِبِ ثَلَاثًا (الموافقات جلد ۴ صد ۲۶ و جامع بیان العلم ج ۲ صد ۱۹۱)	تکیہ کرو گے تو کیا قرآن میں تم پا سکتے ہو کہ ظہر کی نماز چار رکعتوں پر اور عصر کی بھی چار اور مغرب کی نماز تین رکعتوں پر مشتمل ہے ۔

پھر اسی طرح آپ نے مناسک حج کا ذکر کرتے ہوئے اس شخص سے پوچھا

أَرَأَيْتَ لَوْ وُكِلْتَ أَنْتَ وَأَصْحَابُكَ إِلَى الْقُرْآنِ أَكُنْتَ تَجِدُ الطَّوَافَ بِالْبَيْتِ سَبْعًا وَالطَّوَافَ بِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ سَبْعًا ۔ (ایضاً)	کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اور تمہارے رفقا صرف قرآن پر تکیہ کرو گے تو کیا قرآن میں تم پا سکتے ہو کہ بیت اللہ کا طواف سات دفعہ کرنا چاہیئے اور صفا و مروہ کا طواف بھی سات دفعہ کرنا چاہیئے ۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمران بن حصینؓ نے مناسک حج کا ذکر کرتے ہوئے عرفات میں وقوف اور رمی جمار کے مسئلے کے بارے میں بھی اس شخص سے پوچھا کہ کیا ان کی تفصیلات تمہیں کہیں قرآن میں ملتی ہیں ۔ اس کے بعد چور کے ہاتھ کاٹنے کے حکم کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے اس کو سمجھاتے ہوئے پوچھا کہ بھلا بتاؤ قرآن میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا اسلامی حکمرانوں کو جو ذمہ دار بنایا گیا ہے تو کیا اس کا تعین بھی قرآن میں کہیں کیا گیا ہے کہ ہاتھ کس طریقے سے اور کہاں سے کاٹا جائے ۔ آپؓ نے فرمایا

وَالْيَدُ مِنْ أَيْنَ تُقْطَعُ أَمِنْ هٰهُنَا أَوْ مِنْ هٰهُنَا ۔ (ایضاً)	اور ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے ، یہاں سے یا وہاں سے ۔

راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمران بن حصینؓ نے پہلے گٹے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا کہ کیا یہاں سے ؟ پھر کہنی پر اور پھر اس کے بعد کندھے کے قریب ہاتھ لے جاکر پوچھا کہ کیا یہاں سے ؟ غرض حضرت عمران بن حصینؓ نے مختلف احکام کا حوالہ دے کر اس شخص کو سمجھانے کے انداز میں پوچھا کہ کیا ان احکام کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں اور پھر آخر میں فرمایا یہ

احکام خدا کی کتاب میں مجمل ہیں اور سنت ان کی تفصیل پیش کرتی ہے۔ آپؐ کے الفاظ ہیں

اِنَّ کِتَابَ اللّٰہِ اَبْھَمَ ھٰذَا وَاِنَّ السُّنَّۃَ تُفَسِّرُ ذٰلِکَ (ایضاً)	کتاب اللہ نے اس کو مبہم رکھا پھر سنتِ رسول نے اس کی تفسیر کر دی۔

مبہمات کی توضیح

مجمل احکام کی تفصیل بیان کرنے کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض ان شبہات کا ازالہ بھی فرمایا جو قرآنی آیات کی صحیح مراد سمجھنے میں صحابہ کرام کو پیش آتے تھے یا آئندہ آنے والوں کو پیش آسکتے تھے مثلاً یہ بتایا کہ قرآنی آیت اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ (جو لوگ ایمان لائے پھر انہوں نے اپنے ایمان میں کوئی ظلم شامل نہیں کیا یہی لوگ ہیں جن کو امن ملے گا اور یہی ہدایت یافتہ ہیں) میں ظلم سے مراد شرک ہے۔ یا یہ کہ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ (کھاتے پیتے رہو) یہاں تک کہ سیاہ و سفید دھاگے میں تمہیں فرق معلوم ہونے لگے) میں سیاہ و سفید دھاگوں سے شب کی تاریکی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔ اس قسم کی متعدد مثالیں ہم نے حفاظت حدیث پر گفتگو کرتے وقت "حدیث اور حفاظت خداوندی" کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان کی ہیں قارئین ان پر دوبارہ نظر ڈال لیں ؛

مشکلات کی تیسیر

علاوہ ازیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قرآنی مشکلات کا حل بھی فرمایا مثلاً

(۱) قرآن میں بار بار آتا ہے کہ مرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر زندہ ہونا ہے اب ذہن میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مٹی ہو کر ریزہ ریزہ ہو کر پھر نئے سرے سے زندگی کیوں کر ہو گی۔ صحابہ کے استفسار پر اس اشکال کو حل فرماتے ہوئے آپؐ نے فرمایا کبھی بارش سے قبل تم نے زمین کی حالت دیکھی ہے کیسی خشک اور کیسی بے آب و گیاہ نظر آتی ہے مگر بارش کے بعد وہی زمین پھر سے سرسبز اور تروتازہ دکھائی دینے لگتی ہے وہ تنکے جو ابھی زمین پر مردہ لیٹے ہوئے تھے ایک چھینٹا پڑتے ہی اکڑتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں اسی

طرح مرنے کے بعد تم بھی پھر جی اُٹھو گے ۔

(۲) تقدیر کے مسئلے میں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہمارے اعمال پہلے سے طے شدہ اور لکھے جا چکے ہیں تو اب آئندہ عمل کی جدو جہد کرنا بے کار ہے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر کیوں نہ بیٹھے رہیں صحابہ نے اس مشکل کا حل دریافت کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم سعید لکھے جا چکے ہو تو تم سے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم نیک کام نہ کرو اور اگر خدا نخواستہ تقدیر دُوسری طرف جا چکی ہے تو نیک عمل کرنے کی تم ہزار کوشش کرو تم کر ہی نہ پاؤ گے۔ تم سمجھتے ہو کہ عمل کی جدو جہد کرنا تقدیر سے باہر کوئی بات ہے ایسا نہیں بلکہ تقدیر جس طرح سزا و جزا کو محیط ہے اسی طرح اعمال صالحہ اور اعمال بد کو بھی محیط ہے لہٰذا عمل کیے جاؤ تم سے وہی عمل صادر ہوں گے جو تمہاری تقدیر کے موافق ہیں۔ پھر آپؐ نے اس حقیقت پر متنبہ کرنے کے لیے کہ نیکی کی توفیق اور بدی سے احتراز سب اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام سے میسر آتا ہے یہ آیت پڑھی فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی (سو جس نے دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات کو سچا سمجھا سو ہم اس کے لیے راحت کی چیز آسان کر دیں گے اور جس نے بخل کیا اور لا پرواہی برتی اور اچھی بات کو جھٹلایا سو ہم اس کے لیے مصیبت کی چیز آسان کر دیں گے)۔

یہ اجمال و ابہام اور اشکالات قرآنی وغیرہ سے متعلق ایک ایک دو دو مثالوں پر اکتفا صرف اس خیال کے پیشِ نظر ہے کہ تفہیم کے لیے اتنا ہی کافی ہے ورنہ قرآن سے ایسی بہت سی مثالیں ہر ہر عنوان کے تحت پیش کی جا سکتی ہیں ۔

اشارات کی تشریح

قرآن فہمی کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی مثالوں میں ایک قسم ان اشارات کی تشریح بھی ہے جو قرآن میں متفرقاً موجود ہیں - مثلاً

(۱) قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جو قصہ طلب ہیں جب تک وہ واقعہ پُورا معلوم نہ ہو ان آیات کا صحیح مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قصوں کی تفصیل بیان فرمائی۔ مثال کے طور پر سورۂ توبہ میں ہے وَعَلَی الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا

(اور ان تینوں پر بھی (توجہ فرمائی) جو پیچھے رہ گئے تھے) اب جب تک جنگِ تبوک کا سارا واقعہ اور بعض مخلص صحابہ کا جنگ میں شامل نہ ہو سکنے کا قصہ معلوم نہ ہو یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ وہ تین اصحاب کون تھے جن کا اس آیت میں حوالہ دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اس قسم کی قصہ طلب بہت سی آیات ہیں۔

(۲) قصوں کے علاوہ قرآن کے بعض تفسیری اجزا بھی ایسے ہیں جن کا علم صاحبِ وحی کے بتلائے بغیر نہیں ہو سکتا اور ان کو معلوم کیے بغیر متعلقہ آیاتِ قرآنی کا پورا مفہوم ہی واضح نہیں ہوتا۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ (جنہوں نے ظلم کیا تھا انہوں نے جو کلمات کہنا انہیں بتائے گئے تھے وہ بدل ڈالے) قرآن میں اس سے ماقبل کی آیت میں ان کلمات کا ذکر تو موجود ہے جو بنی اسرائیل کو شہرِ موعود میں داخل ہوتے وقت پڑھتے رہنے کے لیے بتلائے گئے تھے وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ" یعنی جب دروازے میں داخل ہو تو حِطَّۃ" (اے اللہ ہمارے گناہ بخش دے) کہتے ہوئے داخل ہونا لیکن قرآن نے ان مہمل اور گستاخانہ کلمات کا کوئی ذکر نہیں کیا جو ضد میں آکر بنی اسرائیل نے بکے تھے۔ قرآن ان کا ذکر کرتا بھی کیوں وہ اس قابل ہی کب تھے کہ انہیں نقل کیا جاتا۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بیان کر کے اس قوم کی نافرمانی و سرکشی کا حال ظاہر فرمایا آپؐ نے بتلایا کہ انہوں نے حِطَّۃٌ" کے بجائے حَبَّۃٌ فِیْ شَعْرَۃ کے مہمل کلمات بکنے شروع کر دیے۔

قارئین ان مثالوں کو محض سرسری نظر سے دیکھتے نہ چلے جائیں بلکہ اچھی طرح غور کرتے جائیں کہ قرآن سے متعلق یہ تمام توضیحات و تشریحاتِ نبوی لفظاً اپنے الگ وجود کی حامل ہوتے ہوئے بھی معناً کسی طرح بھی قرآن سے زائد یا قرآن سے باہر نہیں ہیں اور اسی بنا پر کسی لحاظ سے بھی قرآن کی جامعیت کے منافی نہیں ہیں بلکہ فی الحقیقت قرآن کی جامعیت کا ثبوت ہیں۔

متقابلین میں تخصیص تعلیم و توضیحِ قرآن ہی کے ضمن میں وہ احکام بھی آتے ہیں جن کو قرآن دو متقابل حیثیتوں سے صادر کرتا

ہے اور کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ ان متقابلین میں سے کسی ایک میں داخل و شامل سمجھی جائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کے بارے میں فیصلہ فرما دیتے ہیں کہ یہ چیز ان دو حکموں سے فلاں حکم کے تحت شمار ہوگی۔ مثلاً

(۱) قرآن نے طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام قرار دیا ہے لیکن بعض اشیاء ایسی ہیں جن کے بارے میں قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ طیبات میں شامل ہیں یا خبائث میں مثلاً درندے اور شکاری پرندے نیز خرگوش، ناخنہ اور بیڑ وغیرہ کے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس قسم میں داخل ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا کہ پہلی قسم طیبات میں اور دوسری قسم خبائث میں شامل ہے۔ آپ کے الفاظ ذِیْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ اور ذِیْ مِخْلَبٍ مِنَ الطَّیْرِ نے اس الجھن کو سلجھا دیا۔

(۲) قرآن نے مُردار کو حرام اور ذبیحہ کو حلال قرار دیا ہے اب سوال یہ پیدا ہے کہ جو بچہ ذبیحہ کے پیٹ سے ذبح کرتے وقت مردہ حالت میں نکل آئے اس کو حلال سمجھا جائے کہ حرام۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرما دیا کہ "ماں کو ذبح کرنا اس کے بچے کو ذبح کرنا ہے" یعنی ماں کو ذبح کرنے سے پیٹ میں موجود بچہ بھی ذبیحہ ہی کے حکم میں ہو جاتا ہے ؛

قیاسی ملحقات کی تعیین

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرآن کسی علت کی بنا پر ایک حکم صادر کرتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض دوسری جزئیات میں وہی علت پائے جانے کی بنا پر ان جزئیات کو بھی اس حکم کے تحت درج کر دیتے ہیں :

(۱) قرآن نے دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے اس حکم میں علت یہ تھی کہ اس وجہ سے ان میں قطع رحمی پیدا ہو جائے گی۔ دو بہنوں کے درمیان جو شرعاً صلہ رحمی واجب تھی اس کو نقصان پہونچتا تھا اس علت کو دیکھتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دوسرے ایسے رشتوں کو بھی اسی حکم میں درج فرما دیا جن میں یہی قطع

رحمی کا خطرہ موجود تھا مثلاً پھوپی بھتیجی یا خالہ بھانجی ۔

(۲) قرآن نے ربوٰا اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ عام رواج تھا کہ قرض کی مہلت بڑھا کر اصل رقم میں اضافہ کر دیا کرتے تھے۔ قرضخواہ کہتا کہ یا تو رقم ادا کر دو ورنہ رقم میں سود کو شامل کر لو۔ قرآن نے اس کو اس لیے حرام قرار دیا تھا کہ قرض کی رقم میں جو اضافہ کر دیا جاتا تھا وہ کسی چیز کے عوض میں نہیں ہوتا تھا وہ ایک قسم کا ناجائز منافع تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علت کے پیشِ نظر قرض میں ہر قسم کا ناجائز نفع حاصل کرنا منع فرما دیا مثلاً ایک شخص کسی کا مقروض ہے تو قرضخواہ کو یہ حق نہیں کہ وہ اس دباؤ میں مقروض کے مکان میں مفت رہا کرے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا ناجائز نفع ہے جو وہ اپنے قرض کے دباؤ میں بلا وجہ حاصل کر رہا ہے ۔

بات کچھ طویل ہو گئی مگر تفہیم مقصود کے لیے یہ طوالت بھی ضروری تھی تا قارئین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مجمل احکام کی تفصیلات ہوں یا مبہم آیات کی توضیحات، قرآنی مشکلات کی تعبیرات ہوں یا قرآنی اشارات کی تشریحات، دو متقابل احکام کے درمیان تخصیصات ہوں یا قیاس کے طریقے پر تعیین شدہ قرآنی آیات کے ملحقات ہوں یہ تمام تفصیلات تعلیم و توضیح قرآن میں داخل و شامل ہونے کی بنا پر قرآن سے باہر یا قرآن سے زائد کوئی چیز نہیں ہیں بلکہ دراصل قرآن ہی کا ایک حصہ ہیں اور یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہو گی کہ قرآن کی جامعیت احادیث رسول کے تسلیم کرنے سے مانع نہیں ہے بلکہ خود قرآن کی جامعیت ہی اس کی متقاضی ہے کہ اس کے اصولی احکام کی تفریعات اور اس کے کلی امور کی جزئیات بیان کی جائیں کیونکہ کسی کتاب کے جامع ہونے کا مفہوم ہی یہ ہوتا ہے کہ اس میں منتشر اور مختلف جزئیات کے احکام کو اصول اور کلیات کی شکل میں جمع کر دیا گیا ہو ۔

جامعیت قرآن کی مزید وضاحت

قرآن کی جامعیت کے اصل مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے امام شاطبی فرماتے ہیں :

القرآن علی اختصارہ جامع ولا	قرآن کریم مختصر ہونے کے باوجود جامع کتاب ہے

يكون جامعًا إلّا و المجموع فيه أمور كليات۔ (الموافقات ج ۳ ص۳۶۷)

اور یہ جامعیت اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس میں کلیات مذکور ہوں۔

کسی کلام کے جوامع الکلم ہونے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اس میں ایسی کلیات مذکور ہوتی ہیں جو اپنی تمام ماتحت انواع و افراد کو پوری طرح حاوی ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان افراد کے حکم پر بھی دلالت کرتی ہیں جو اس کے الفاظ کی قید سے خارج ہو گئے ہیں۔ تاہم جوامع الکلم کے الفاظ میں ایسی تنگی بھی نہیں ہوتی کہ مراد کے خلاف کچھ اور وہم پیدا ہونے لگے۔ اس کے علاوہ اس کے الفاظ اتنے مبہم بھی نہیں ہوتے کہ جو مراد ان کی بتلائی جائے وہ ان سے ظاہر نہ ہو۔ کلام کی جامعیت کا کمال اس میں ہے کہ اپنے تمام تر اختصار کے باوجود اس کے الفاظ اتنے صاف ہوں کہ جب ان کی تفصیل و تشریح کی جائے تو ہر تفصیل اور ہر تشریح پر وہ اس طرح صادق نظر آئیں گویا اسی کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ قرآن کے علاوہ کوئی بھی کلام جامعیت کے ان اوصاف پر پورا نہیں اترتا۔ قرآن کے علاوہ ہر کلام میں دو خامیوں میں سے ایک خامی ضرور نظر آتی ہے وہ اگر شان جامعیت میں ممتاز ہوگا تو اس میں اغلاق و ابہام کا عیب ضرور نظر آئے گا اور اگر واضح اور صاف ہوگا تو اس میں شان جامعیت مفقود ہوگی۔ ان دو متضاد صفتوں کا اجتماع آیات قرآنیہ ہی میں نظر آتا ہے البتہ بعض احادیث نبویہ بھی اس کی مظہر ہیں۔

متن اور شرح کی نسبت

غرض قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ اسے تفصیل و تشریح کی حاجت نہیں ہے یا وہ اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے کسی معلّم و مفسر کی ضرورت نہیں۔ اُوپر جو تفصیلات تعلیم و توضیح قرآن کی ہم نے دی ہیں ان کو سامنے رکھ کر دیکھئے آپ لازماً اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ قرآن اور حدیث میں متن اور شرح کی نسبت ہے پھر یہ متن شرح میں اور شرح متن میں اس طرح درج ہے کہ ایک کا اقرار و انکار دوسرے کا اقرار و انکار بن جاتا ہے۔ قرآن اور حدیث میں باہم ایک ایسا ربط ہے کہ قرآن کو تسلیم کر کے حدیث کا انکار ممکن نہیں اور حدیث کا انکار کر کے قرآن کو ماننے کی کوئی صورت نہیں بلکہ اگر آپ متن اور شرح کے درمیان جو نسبت اور

تعلق ہے اس پر غور کریں گے تو حدیث کی اہمیت فزوں سے فزوں تر نظر آئے گی۔ جس طرح متن شرح کا محتاج ہے اسی طرح قرآن کو حدیث کی ضرورت ہے۔ امام اوزاعی کا جو قول ہے:

اَلْکِتَابُ اَحْوَجُ اِلَی السُّنَّةِ مِنَ السُّنَّةِ اِلَی الْکِتَابِ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۱)	کتاب اللہ سنت کی طرف زیادہ محتاج ہے بہ نسبت سنت کے کتاب اللہ کی طرف۔

تو اس کا یہی مطلب ہے کہ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و توضیح کا محتاج ہے۔ ہم قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ جاننے کے لیے اس ہستی کے یقیناً محتاج ہیں جو قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والا تھا۔ شیخ مطرف بن شخیر سے کسی شخص نے کہا کہ آپ ہم سے قرآن کے سوا اور کچھ مت بیان کیجیے آپ نے جواب دیا:

وَاللّٰهِ مَا نُرِیْدُ بِالْقُرْاٰنِ بَدَلًا وَّلٰکِنْ نُرِیْدُ مَنْ هُوَ اَعْلَمُ بِالْقُرْاٰنِ۔ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۱)	خدا کی قسم قرآن کے بدلے ہم کوئی اور کتاب نہیں چاہتے لیکن ہم اس سے قطع نظر نہیں کرسکتے جو قرآن کا سب سے زیادہ جاننے والا تھا۔

مطلب یہی ہے کہ ہم قرآن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کے بغیر سمجھنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ امام اوزاعی کے متذکرہ بالا قول کی مراد بیان کرتے ہوئے حافظ ابو عمر فرماتے ہیں:

یُرِیْدُ اَنَّهَا تَقْضِیْ علیه وتبین المراد منه۔ (الموافقات ج ۴ ص ۱۰)	امام اوزاعی کا مطلب ہے کہ سنت قرآن کے لیے فیصل ہے اور اس کی مراد بیان کرتی ہے۔

قرآنی احکام کے لیے فیصل

سنت قرآن کے مجملات کی تفصیل اس کے مبہمات کی توضیح اور اس کی مشکلات کی تیسیر کرتی ہے اور اس لحاظ سے قرآنی احکام کے لیے واقعی فیصل کے مقام پر ہے۔ حافظ ابو عمر نے امام اوزاعی کے قول کی جو مراد بیان کی ہے اس کی تائید خود امام اوزاعی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے حسان بن عطیہ سے نقل کیا ہے کہ

كان الوحي ينزل على رسول الله صلى الله عليه وسلم ويحضره جبريل بالسنة التي تفسر ذالك (الموافقات ج ۴ ص۱۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اترا کرتی تھی اور پھر جبرئیل آپ کے پاس وہ سنت لے کر آتے جو اس کی تفسیر کر دیتی تھی۔

امام اوزاعی کے اس قول کو کہ کتاب اللہ سنت کی زیادہ محتاج ہے منکرین حدیث اپنی کم فہمی کی بنا پر نہ جانے کیا کیا معنی پہناتے ہیں۔ امام اوزاعی کے اس قول کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس طرح وہ سنت کو قرآن پر فوقیت دینا چاہتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے وہ یہ بات کہہ کر قرآن کی جامعیت ثابت کرنا چاہتے ہیں تشریح کا محتاج وہی کلام ہُوا کرتا ہے جو جامع ہوتا ہے جیسا کہ ہم ابھی اوپر بتا چکے ہیں کہ جامع کلام اپنے تمام افراد و انواع کو حاوی ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے ان افراد و انواع کا علم حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئے گی جو چیز بھی اس ضرورت کو پورا کرے گی ہم کہیں گے کہ وہ جامع کلام اس چیز کا محتاج ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ احتیاج کلام کے نفس مضمون کے اعتبار سے نہیں بلکہ کلام کے مخاطبین کے اعتبار سے ہوتی ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن سنت کا محتاج ہے تو دراصل ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کے مخاطبین قرآن کو سمجھنے کے لیے سنت کے محتاج ہیں۔

امام شاطبی امام اوزاعی کے قول کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لان الكتاب يكون محتملا لامرين فاكثر فتاتى السنة بتعيين احدهما فيرجع الى السنة ويترك مقتضى الكتاب۔ (الموافقات ج ۱ ص۱۰۴)

قرآن کی عبارت میں کبھی دو باتوں کا اور کبھی اس سے بھی زیادہ کا احتمال ہوتا ہے حدیث آ کر ان میں سے ایک احتمال کو متعین کر دیتی ہے پس سنت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور قرآن کے دوسرے احتمالات کو ترک کر دیا جاتا ہے۔

یعنی جب سنت کتاب اللہ کی مراد متعین کر دے تو پھر کتاب اللہ کے اجمال اور لفظی احتمالات پر عمل نہ کیا جائے اس کی مثال کے طور پر قرآن نے کہا والسارق والسارقۃ فاقطعوا

أَيْدِيَهُمَا (اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ المائدۃ : ۳۸) مگر یہ نہیں بتلایا کہ ہاتھ کاٹنے کی یہ سزا کتنا مال چرانے پر ہے نیز اس کی بھی کوئی تفصیل نہیں کی کہ سزا دینی ہو تو ہاتھ کس قدر کاٹا جائے۔ اب قرآن کے اس حکم میں کئی احتمالات ہیں ممکن ہے ہاتھ کاٹنے کی سزا صرف اس وقت دی جا سکتی ہو جب خاصی کثیر مقدار میں کوئی مال چوری کیا جائے مگر ساتھ ہی یہ بھی احتمال ہے کہ ہر چوری پر ہاتھ کاٹ دیا جائے خواہ چھوٹی چوری ہو خواہ بڑی۔ اسی طرح سزا کی کیفیت میں بھی ہو سکتا ہے کہ ہاتھ بالکل جڑ سے یعنی مونڈھے کے قریب سے ہی کاٹ دینے کا حکم دیا گیا ہو یا ممکن ہے کہنی سے کاٹنا مراد ہو اور یہ بھی امکان ہے کہ صرف پہونچے پر سے کاٹنے کے لیے کہا گیا ہو۔ سنت نے ان تمام احتمالات کو صاف کر کے بتلا دیا کہ جس مال کی چوری پر ہاتھ کاٹا جا سکتا ہے اس کی مقدار کم از کم دس درہم کے برابر ہونی چاہیئے نیز ضروری ہے کہ وہ مال محفوظ بھی ہو تاکہ اس پر چوری کا لفظ صادق آسکے۔ اسی طرح سزا کی کیفیت و مقدار کے بارے میں بتایا کہ جب ہاتھ کاٹا جائے تو پہونچے پر سے کاٹا جائے۔ اب غور کیجئے قرآن نے ایک حکم دیا جس میں کئی احتمالات تھے سنت نے ایک احتمال متعین کر دیا اب اس تعیین کے بعد اس قرآنی حکم کے دوسرے احتمالات کو ترک کر دیا جائے گا اور سنت کے متعین کردہ احتمال کو قول فیصل کے طور پر قبول کر لیا جائے گا۔

یہی بات ہے جس کو حافظ ابن عبدالبر نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے

اَلسُّنَّةُ قَاضِيَةٌ عَلَى الْكِتَابِ۔ (جامع بیان العلم)	سنت کتاب کے (احکام کے) بارے میں فیصلہ کرنے والی ہے۔

اس کا مطلب معاذ اللہ یہ تو نہیں ہے کہ سنت کتاب اللہ کے احکام کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے بارے میں فیصلہ کرنے والی ہے بلکہ قاضی علی الکتاب کا مطلب یہی ہے کہ سنت قرآن کی اصل مراد کے بارے میں قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ اوپر کی مثال میں ہم نے دیکھا کہ چوری کی سزا کے حکم میں سنت نے آکر فیصلہ کیا کہ قرآن کی اصل مراد کیا ہے۔

غرض قرآن اور حدیث میں متن اور شرح کی نسبت ہے اور اس حیثیت سے حدیث قرآن کی جامعیت کے منافی نہیں اس کی مؤید ہے۔ بقول امام شاطبی

فکان السنۃ بمنزلۃ التفسیر والشرح لمعانی احکام الکتب (الموافقات ج ۱ ص ۱)	گویا سنت کتاب اللہ کے احکام کے لیے بمنزلہ تفسیر اور شرح کے ہے۔

حدیث کی مستقل حیثیت

رہی وہ احادیث جو بظاہر ایسے احکام پر دلالت کرتی نظر آتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے اور نفیاً یا اثباتاً کسی طرح بھی ان کا ذکر نہیں کرتا۔ مثلاً وہ احادیث جن میں شفعہ کے احکام مذکور ہیں یا وہ احادیث جن سے شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے اور غیر شادی شدہ کو جلاوطن کرنے کا حکم ہے یا اسی طرح دادی کی وراثت کے حکم پر مشتمل حدیث تو ان احادیث کو ہم قرآن کی تفسیر اور شرح کیونکر کہیں گے، اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسی احادیث سے جن احکام کا اثبات ہوتا ہے وہ اگرچہ صراحتہً وعبارۃً قرآن میں مذکور نہیں ہوتے تاہم وہ کسی نہ کسی طرح نصوص قرآن ہی کے زمرے میں آتے ہیں۔ کسی صحیح حدیث سے کوئی ایسا حکم ثابت نہیں ہوتا جو قرآن میں وارد نہ ہو وہ کسی نہ کسی نص یا قاعدے کے تحت ضرور داخل ہوتا ہے امام شاطبیؒ فرماتے ہیں :

لیس فی السنۃ الا و اصلہ فی القرآن (الموافقات ج ۴)	حدیث میں کوئی حکم ایسا نہیں جس کی اصل قرآن میں نہ ہو۔

اس کے علاوہ قرآن نے ایک کلی اصول بتلا دیا ہے کہ

وما آتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا (الحشر - ۷)	جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لو اور جس سے منع کر دے اس سے رک جاؤ۔

اس آیت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم کو فی الحقیقت قانون خداوندی کا ایک حصہ بنا دیا ہے اب آپؐ جس کام کے بھی کرنے کا حکم دیں گے یا جس کام سے بھی روکینگے

خواہ اس کی اصل قرآن میں صراحتاً ہو خواہ مخفی ہر حالت میں وہ اس آیت کے تحت داخل ہو کر قرآن ہی کا حکم بن جائے گا۔

اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جسم گدوانے والی عورتوں پر لعنت بھیجنے کو قرآنی حکم سے تعبیر کیا تھا۔ ایک مرتبہ قبیلہ بنی اسد کی ایک عورت حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس آئی اور کہنے لگی اے ابو عبدالرحمٰن! میں نے سنا ہے آپ ان عورتوں پر لعنت بھیجتے ہیں جو اپنے اعضا کو گود کران میں رنگ بھرواتی ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب میں فرمایا ہاں! میں اس پر لعنت کیوں نہ بھیجوں جس پر اللہ اور اس کے رسول نے لعنت کی ہو اور جو خود قرآن میں بھی مذکور ہو، اس عورت نے کہا قرآن تو از اوّل تا آخر میں نے بھی پڑھا ہے مگر یہ بات تو قرآن میں مجھے کہیں نہیں ملی آپ نے فرمایا اگر تو قرآن کو سمجھ کر پڑھتی تو تجھے اس میں یقیناً یہ بات مل جاتی کیا قرآن میں یہ آیت نہیں ہے وَمَا آتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس آیت کا حوالہ دے کر قرآن کی جامعیت کا اصل مفہوم گویا واضح کر دیا (الموافقات ج ۔۴ ص ۲۴)

اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن یزیدؓ نے ایک شخص کو حالتِ احرام میں سِلے ہوئے کپڑے پہنے دیکھا تو اسے منع فرمایا اس نے کہا قرآن کی کسی آیت میں یہ حکم دکھلا دیجئے آپ نے جواب میں یہی آیت تلاوت فرما دی۔

اس قسم کے تمام آثار اسی حقیقت کا پتہ دے رہے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم قابلِ اتباع ہے اس لیے کہ آپ کا کوئی حکم قرآن سے باہر نہیں ہے آپ کے ہر حکم کی اصل قرآن میں موجود ہے اور یہی قرآن کی جامعیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

قرآن کی جامعیت کے مفہوم میں یہ توسّع خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے بھی ثابت ہے۔ ایک بار ایک دیہاتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے لڑکے نے زنا کر لیا ہے میں نے اس کی سزا کے متعلق لوگوں سے دریافت کیا تو کچھ لوگوں نے مجھے بتلایا کہ اسے رجم کر دینا چاہیئے میں نے اس کے

بدلے میں سو بکریاں اور ایک باندی ادا کر دی اس کے بعد کچھ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے لڑکے کے لیے تو سو کوڑے اور سال بھر جلا وطنی کی سزا ہے آپؐ نے یہ سن کر فرمایا لأقضين بينكما بكتاب الله (میں کتاب اللہ کے مطابق تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا) پھر اس کے بعد فرمایا کہ تیری باندی اور بکریاں تجھے واپس ہیں اور تیرے لڑکے پر سو کوڑے اور سال بھر جلا وطنی کی سزا۔ اس کے ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی حضرت انیس کو حکم دیا کہ تم اس عورت کے پاس جاؤ جس سے یہ زنا کا فعل منسوب کرتا ہے اگر وہ اقرار کر لے تو اسے رجم کر دو انیس گئے اس نے اقرار کر لیا اور رجم کر دی گئی۔

(بحوالہ ترجمان السنۃ)۔

اس واقعے میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فیصلے کو کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ قرار دیا ہے حالانکہ کتاب اللہ میں رجم اور جلا وطنی کی سزا کہیں مذکور نہیں اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قرآن کی جامعیت کا مفہوم کیا تھا:

قرآن کی جامعیت اور اسوۂ رسول

قرآن کی جامعیت کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیئے کہ قرآن صرف ایک علمی کتاب ہی نہیں ہے بنی نوع انسانی کے لیے ایک دستور العمل بھی ہے گویا قرآن کی دو حیثیتیں ہیں ایک علمی دوسری عملی۔ علمی حیثیت سے قرآن کو سمجھنے کے لیے اگر ہمیں ایک معلم کی تعلیم کی ضرورت ہے تو عملی حیثیت سے قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیں ایک ہادی کے نقشۂ عمل کی بھی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے قرآن کی جامعیت کے تقاضے کے تحت ہم تعلیم نبوی کے ساتھ ساتھ اسوۂ نبوی کے بھی محتاج ہیں۔ دنیوی علوم میں بھی بہت سے علم ایسے ہیں جو اول تو عملی مشق کے بغیر سمجھ ہی میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جائیں تو جب تک کوئی عملی نمونہ سامنے نہ ہو ان کو عمل میں لانا ممکن نہیں ہوتا مثلاً طب اور ڈاکٹری ہی کا علم ہے اس علم میں مہارت حاصل کرنے کے لیے صرف کتابوں کا پڑھ لینا کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ عملی تجربہ اس کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا ہے اسی طرح انجینیرنگ کا فن ہے یا دیگر سائنسی علوم

ہیں ان کا صرف پڑھ لینا ان کی پوری حقیقت سمجھنے کے لیے اور ان علوم میں پوری مہارت حاصل کرنے کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے قرآن صرف ایک علمی کتاب ہی نہیں عملی ہدایت نامہ بھی ہے اس کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک ایسے نقشۂ عمل کی بھی ضرورت ہے جس کو دیکھ دیکھ کر ہم قرآن کے عملی تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ یہ نقشۂ عمل ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی صورت میں عطا فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (احزاب ۔ ۲۱) ۔	تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک عمدہ نمونۂ تقلید ہے ۔

اور قرآن چونکہ ایک جامع کتاب تھی اس لیے اس کے نقشۂ عمل کو بھی تمام نقشوں میں جامع تر بنایا گیا۔ قرآن کے ہر چھوٹے بڑے عمل کی ایک مکمل تصویر اس نقشہ میں مہیا کر دی گئی قرآن کریم میں اگر نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے احکام مذکور تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں ان عبادات کا مکمل نقشہ بہم پہونچایا گیا۔ قرآن اگر امارت و امامت غزوات و جہاد، نظم ونسق اور فصل خصومات سے متعلق ہدایات کا حامل تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو ان ہدایات کی مکمل تفصیلات کا آئینہ بنایا گیا۔ قرآن نے ازدواجی زندگی، باہمی معاملات اور جنگ و صلح کی تدابیر جیسے مسائل کی نشاندہی کرنا انسانیت کی تکمیل کے لیے اگر ضروری سمجھا تو ان مسائل کی نزاکتوں کے تمام رنگ اس نقشے میں ایک ایک کر کے بھرے گئے حتی کہ قرآن نے انسان کو صحیح انسانی زندگی گزارنے کا ایک بنیادی لائحۂ عمل عطا کیا تھا تو اس کے عملی نقشے میں انسانی زندگی کے معمولی معمولی گوشوں مثلاً بول و براز، طعام و شراب، رفتار و گفتار، خندہ و گریہ اور نوم و بیداری وغیرہ تک کے خطوط واضح کیے گئے۔ غرض قرآن جامع تھا اسی لیے اس کے عملی نقشے کو بھی انتہائی جامع بنایا گیا جو کچھ قرآن میں اصولی اور کلی طور پر کہا گیا تھا وہ سب تمام جزئیات و تفصیلات کے ساتھ اس نقشے میں دکھلا دیا گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی حقیقت کی نشاندہی کی تھی جب کسی شخص نے ان سے سوال کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے تو آپ نے فرمایا

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ (قرآن ہی آپؐ کا خلق تھا) خلق میں اقوال اور افعال سب داخل ہیں مطلب یہ تھا کہ آپؐ کا کوئی قول اور کوئی فعل ایسا نہ تھا جو قرآن سے باہر ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ اسے کسی تفصیل و تشریح کی حاجت نہیں یا وہ اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے کسی معلم و مفسر کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا مفہوم جیسا کہ ہماری اب تک کی گفتگو سے واضح ہو چکا ہے مختصراً یہ ہے کہ قرآن خدا شناسی اور آداب عبدیت کے تمام اصولوں پر حاوی ہے اس نے انسانی زندگی سے متعلق تمام اصول ایسے جامع اور سادہ الفاظ میں بیان کیے ہیں کہ دنیا کے مختلف تمدنوں کی مختلف ضروریات میں سے کبھی کوئی ضرورت ایسی پیش نہیں آسکتی جس کے متعلق قرآن کریم کے ان الفاظ میں پوری روشنی نہ ملے۔ قرآن جامع ہے اس معنی میں کہ اس نے عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق سے متعلق تمام کلیات کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔ قرآن جامع ہے اسلیئے کہ وہ ماضی کی خبروں، مستقبل کی اطلاعوں اور حال کے احکام کا احاطہ کیے ہوتے ہے۔ قرآن جامع ہے اس لحاظ سے کہ وہ سیاست، معیشت اور معاشرت کے مسائل کے لیے ایک مکمل آئین کی حیثیت کا حامل ہے اور قرآن جامع ہے اس طور پر کہ اس کے ایک ایک لفظ میں حقائق و معارف کے دریا پوشیدہ ہیں جن پر اطلاع پانے کے لیے ہم حدیث رسول کے محتاج ہیں۔



حدیث کی تشریعی حیثیت

احادیث کی تین قسمیں

علماء اس بات پر متفق ہیں کہ احادیث بنویہ کی تین قسمیں ہیں:

(۱) اوّل وہ احادیث جو قرآنی احکام کی مؤیّد اور اجمال و تفصیل میں ان کے موافق ہیں ہوتا یہ ہے کہ قرآن کریم میں پہلے سے کوئی حکم موجود ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی مزید تائید و حمایت فرما دیتے ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی فرضیت کے احکام قرآن میں پہلے سے موجود تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرما کر ان احکام کی مزید تائید و توثیق فرما دی کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، ماہ رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔

(۲) دوسری قسم کی وہ احادیث ہیں جو قرآنی احکام کی وضاحت کرتی ہیں جن سے قرآن کے مطلق احکام کی تقیید، مجملات کی تفصیل اور عام احکام کی تخصیص ہوتی ہے۔ اسی قسم میں وہ احادیث بھی شامل ہیں جو مبہمات قرآنی کی توضیح، اس کی مشکلات کی تیسیر اور اس کے اشارات کی تشریح کرنے والی ہیں۔ اس قسم کی احادیث کی مثالیں ہم "قرآن کی جامعیت" کے عنوان کے تحت ابھی بیان کر چکے ہیں۔

(۳) تیسری قسم کی احادیث وہ ہیں جو ایسے احکام پر دلالت کرتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے اور نفیاً یا اثباتاً کسی طرح بھی ان کا ذکر نہیں کرتا مثلاً وہ احادیث جن میں مذکور ہے کہ پھوپی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جمع نہیں کیا جا سکتا۔ یا وہ احادیث جن میں شفعہ کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ اسی طرح وہ احادیث جن میں شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے اور غیر شادی شدہ زانی کو جلا وطن کرنے کے حکم یا دادی کی وراثت کے حکم اور اسی قسم کے دیگر احکام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

احادیث نبویہ کی یہ تقسیم محض نفسِ مضمون کے اعتبار سے ہے ورنہ جہاں تک حدیث کے تشریعی مقام کا تعلق ہے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ حدیث کی یہ تینوں قسمیں دین میں برابر کی حیثیت سے حجت ہیں اگرچہ حدیث کی تیسری قسم بعض علماء کے نزدیک اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے راجع الی الکتاب ہو کر حجت ہے جبکہ بعض علماء اسے ایک الگ مستقل ماخذِ تشریع قرار دے کر حجت مانتے ہیں ظاہر ہے یہ محض لفظی نزاع ہے۔ ورنہ اپنے ثبوت کے اعتبار سے دونوں فریق کے نزدیک احادیث کی تیسری قسم بھی اسی طرح حجت ہے جس طرح اوّل الذکر دو قسمیں۔

مگر اللہ ہدایت دے منکرین حدیث کو، وہ حدیث کی ان تینوں قسموں میں سے کسی قسم کو بھی دین میں حجت ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ حدیث کی آخری دو قسمیں تو ان کے نزدیک قابلِ اعتنا ہیں ہی نہیں پہلی قسم کی احادیث کے بارے میں بھی وہ اپنا معروف گومگو کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں بنیادی طور پر تو وہ اس قسم کی احادیث کو جو قرآن کی مؤید ہیں تسلیم کرتے ہیں کیونکہ ان احادیث کا انکار بلاواسطہ اور بالکل بدیہی طور پر قرآن کا انکار بن جاتا ہے مگر جب احادیث کے ذخیرے کو مشکوک اور ناقابلِ اعتماد قرار دینے پر اترتے ہیں تو ہر قسم کی احادیث کو لپیٹتے لیے چلے جاتے ہیں اور اس طرح قرآن کی مؤید احادیث بھی خود بخود حجیت کے خانے سے خارج ہو جاتی ہیں۔

اور یہ کہہ کر تو وہ حدیث کی حجیت کا خواہ اس کا تعلق مذکورہ تینوں قسموں میں سے کسی بھی قسم سے ہو جھگڑا ہی چکا دیتے ہیں کہ رسول کا کام صرف اتنا ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کا کلام سنا دے قرآن سنا کر رسالت کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ رسالت کا حق ہم پر صرف یہ ہے کہ جو قرآن رسول نے پڑھ کر ہمیں سنایا ہے اس کو ہم رسول کے اعتماد پر اللہ کا کلام تسلیم کر لیں اس کے بعد رسول اور ہم برابر ہیں جس طرح ان کے پاس عقل ہے ہمارے پاس بھی ہے جس طرح وہ قرآن سمجھتے ہیں ہم بھی سمجھ لیتے ہیں۔ دین کے معاملات میں رسول کی رائے کا بھی وہی وزن ہے جو ہماری رائے کا۔ مختصر یہ کہ قرآن سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے ہمیں رسول کی رہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں۔

العیاذ باللہ نقل کفر کفر نباشد ۔

اب اس کے بعد حدیث کی کونسی قسم ایسی رہ گئی جو منکرین حدیث کے نزدیک قابل حجت سمجھی جاتی ہو۔ چلئے منکرین حدیث کو ان کے حال پر چھوڑتے ہیں اور اب اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ یہ تینوں قسم کی احادیث ماخذ دین ہونے کی حیثیت سے کس مقام پر ہیں :۔

مؤید قرآن احادیث کی حجیت

جہاں تک پہلی قسم کی احادیث کا تعلق ہے وہ قرآنی احکام کی مؤید اور اجمال و تفصیل میں ان کے موافق و مطابق ہونے کے لحاظ سے عین قرآن ہیں اس لیے ان احادیث کو تو ماخذ دین ماننے بغیر چارہ نہیں جو ان کو ماخذ دین نہیں مانتا وہ دراصل قرآن ہی کو ماخذ دین تسلیم نہیں کرتا اور جو قرآن کو دین کی بنیاد نہیں مانتا وہ اس وقت ہمارا مخاطب ہی نہیں :۔

موضح قرآن احادیث کی حجیت

رہی دوسری قسم کی احادیث جو قرآنی احکام کی وضاحت کرتی ہیں اور قرآن کا بیان ہونے کی حیثیت کی حامل ہیں ان کی حجیت و عدم حجیت پر گفتگو کرنے سے پہلے دراصل اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیئے کہ کیا ہم بھی قرآن کی مرادات صحیح صحیح متعین کرنے کی اہلیت سے اسی طرح بہرہ ور ہیں جس طرح ایک رسول یا نبی ہوتا ہے کیونکہ دعویٰ عدم حجیت کا اصل مبنیٰ فی الحقیقت یہی ہے کہ قرآن فہمی کے لیے رسول کی رہنمائی کی ضرورت ہی کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

مرادات قرآنی کا صحیح تعین اور ہم

کیا کوئی شخص اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کریم اپنی ذات میں ایک معجزہ ہے اور اس کی یہ اعجازی شان صرف الفاظ ہی کے لحاظ سے نہیں معانی کے لحاظ سے بھی ہے نہ الفاظ کی ترکیب و ترتیب اور انداز بیان ہی میں مخلوق کے ہاتھوں اس کا مثل لایا جانا ممکن ہے اور نہ ہدایت و احکام کی جامعیت ہی کے لحاظ سے اس کی نظیر کا بنالیا جانا مخلوق کے قبضۂ قدرت میں ہے چنانچہ قرآن کے بار بار چیلنجوں کے باوجود دنیا آج تک قرآن کی ایک چھوٹی سے چھوٹی آیت کی مثل نہ لاسکی الفاظ کی طرح ہی قرآن کی معنوی دستوں

سنے بھی دنیا کو عاجز کر کے رکھ دیا قرآن جیسی جامع علوم و معارف کوئی کتاب یا اس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے جزو جیسا کوئی جزو چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی تیار نہ کیا جا سکا۔ ذرا سوچ کر بتایئے ایسا کیوں ہوا۔ جن و انس مل کر بھی قرآن جیسا کوئی کلام کیوں نہ بنا سکے اس کا جواب لازماً آپ یہی دیں گے کہ ان کے ذہن و ذکا اور ان کی فہم و عقل میں وہ ہمہ گیری اور لامحدودیت نہیں ہے جو ایسے اعجازی کلام کے لیے درکار ہے۔ بس آپ کے اسی جواب میں ہماری مُراد بھی مضمر ہے اسی تنگیِ فہم، محدودیتِ ذہن اور اسی قلتِ علم کی بناء پر جن و انس اس قابل بھی نہیں ہیں کہ وہ قرآن جیسے وسیع و عمیق معجزانہ کلام کے تمام مشمولات کو بلا کسی ایسی رہنمائی کے جو صاحب کلام ہی کی جانب سے ہو از خود سمجھ سکیں۔ صاحب کلام کی طرف سے یہ رہنمائی نبوت کی صورت میں مہیا کی گئی قرآن کے الفاظ میں سموئے ہوئے لاتعداد معارف اور قرآنی کلمات میں چھپے ہوئے بے شمار علوم کا ادراک نبوت و رسالت کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نبی بھی بھیجا جو وحی الٰہی ہی کی روشنی میں قرآنی علوم و معارف اللہ کے بندوں کو سمجھا سکے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے اسی طرح اس کی صفات بھی لامحدود ہیں اور انہی لامحدود صفات میں سے اللہ تعالیٰ کی ایک صفت صفتِ کلام بھی ہے اس صفت کا بھی دوسری صفات الٰیہ کی طرح لامحدود ہونا لازمی ہے دوسری طرف انسان اپنے ظاہر و باطن، جسم و روح، قلب و دماغ، فکر و فہم اور عقل و فراست غرض ہر لحاظ سے محدود اور متناہی ہے بھلا اس کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی اس محدودیت کے ساتھ ایک لامحدود لامتناہی ذات سے صادر ہونے والے ایسے کلام کو جو لامحدود المعارف ہے محض اپنے طور پر سمجھ سکے اس کے لیے تو کسی ایسی ہی ہستی کی ضرورت ہے جو ایک لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی لامحدود ذات سے قریب تر ہو اور ایک لحاظ سے بندوں میں شامل رہے۔ اسی ہستی کو ہم نبی کہہ کر پکارتے ہیں اسی ہستی نے لامحدود ذات حق کو پہچان کر اس کے کلام کے

علوم و معارف پر اطلاع پائی اور پھر اسی کی زیر نگرانی عامۂ خلائق کو وہ علوم و معارف سمجھائے اور سکھلائے نبی کا واسطہ درمیان میں نہ ہو تو ایک عام آدمی کے بس کی یہ بات ہی نہیں کہ وہ قرآنی علوم پر اطلاع پا سکے ۔

قرآن ہمارے پاس ایسے علوم لے کر آیا ہے جو نسل انسانی کو آخری معراج تک پہونچانے کے ضامن ہیں' ہماری سیاست' معیشت' معاشرت' اخلاق' دین' مذہب غرض ہماری زندگی کا ہر گوشہ قرآن کی روشنی کا محتاج ہے ایسی صورت میں ذرا سوچئے تو سہی اگر قرآن کو عام انسانی فہم پر چھوڑ دیا جاتا تو کیا ہوتا ہر شخص اپنی افتاد طبع' اپنے علم' اپنے نظریات اور اپنے حالات کے مطابق قرآن کی شرح بیان کرتا اور ہر کوئی یہ اصرار کرتا کہ قرآن کی جو مرادات میں نے متعین کی ہیں وہی درست ہیں انہی کو مانو اور انہی پر عمل کرو ۔ ہر شخص کا یہ دعویٰ ظاہر ہے بلا دلیل ہوتا اور ہمارے پاس کوئی معیار نہ ہوتا جس پر پرکھ کر ہم کہہ سکتے کہ فلاں نے قرآن کی صحیح مراد کو پا لیا اور فلاں اس کو پا لینے میں ناکام رہا ۔ کتاب اللہ محض رائے زنی اور دماغی مشاقی کا میدان بن کر رہ جاتی اور حقیقت کا سراغ لگنا ناممکن ہو جاتا ۔ اللہ کا دین جیسا کتاب اللہ کے نزول سے پہلے مجہول تھا نزول کے بعد اس سے زیادہ مجہول بن جاتا اور قرآن کے نزول کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ظاہر بات ہے جو کتاب خالصتاً عمل کرنے کے لیے نازل ہوئی ہو وہ اگر محض دماغی کد و کاوش کا مشغلہ بن کر رہ جائے تو اس کے نازل کرنے کا جو اصل مقصد تھا وہ تو ہاتھ سے جاتا رہا ؛

بیان قرآن کی ذمہ داری اور رسول

رائے زنی اور دماغی مشاقی کا تختۂ مشق بننے سے حفاظت ہی منظور تھی کہ کتاب اللہ کے بیان کی ذمہ داری بطور خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کی گئی ۔ ارشاد ہوا

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل : ۴۴)۔	ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے تاکہ وہ (ہدایات) جو ان کے لیے اتری ہیں آپ لوگوں پر خوب واضح کر دیں ۔

اگر ہر انسان قرآن کے احکام کو حسب منشاء خداوندی سمجھنے پر قادر ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان وتشریح کی خدمت سپرد کرنے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ "لِلنَّاسِ" کا لفظ بتلا رہا ہے کہ قرآن کے بیان کو ہر شخص سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس قصور کی وجہ سے ہی قرآنی احکام کی تشریح وتوضیح کے لیے رسول بھیجا جاتا ہے اور اس کے ذمے یہ خدمت سپرد کی جاتی ہے کہ جو چیز لوگ خود نہیں سمجھ سکتے آپؐ ان کو سمجھادیں۔

اب اگر احادیث کے اس ذخیرے کو آپ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو قرآن کے بیان پر مشتمل ہے تو آپ کے اس انکار کی بنیاد دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ اس حکم کی خلاف ورزی کی کہ اللہ نے آپؐ کے ذمے قرآن کو بیان کردینے کی جو ذمہ داری سونپی تھی اسے پورا نہ کیا یا پھر آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بیان کی ذمہ داری پوری تو کی تھی مگر جو کچھ آپؐ نے بیان کیا تھا وہ محفوظ نہیں رہا۔ دونوں صورتوں میں ذرا سوچ لیجئے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ پہلی صورت تو انتہائی خطرناک ہے اس کے کہنے سے پہلے اس کے مضمرات پر غور کر لیجیے۔ جو شخص یہ کہنے کی جسارت کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی اسے اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیئے۔ دوسری صورت بھی کچھ کم خطرناک مضمرات کی حامل نہیں ہے۔ دوسری صورت کا ماننے والا گویا مان یہ رہا ہے کہ قرآن بحیثیت معنے وبیان محفوظ نہیں رہا اس کا صاف مطلب یہ نکلے گا کہ اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے قرآنی احکام کی وضاحت تو کرادی مگر اس کی حفاظت نہ کی اور اس طرح معاذ اللہ خود اپنے وعدے کے خلاف کیا کہ ایک طرف وَ إِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ کا اعلان بھی کیا جاتا رہا اور دوسری طرف اسے ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا جو اس کی حفاظت نہ کرسکے۔ (حفاظت کے موضوع پر تفصیلی گفتگو ہم زیر نظر تحریر کے پہلے حصے میں کر چکے ہیں قارئین دوبارہ نظر ڈال لیں) بہرحال یہ دونوں صورتیں حدیث کے انکار کی نہیں قرآن اور رسالت کے انکار کی صورتیں بنتی ہیں۔

اس سے پہلے بھی ہم کہیں کہہ چکے ہیں کہ بیان قرآن کی ذمہ داری کا قرآن نے

جابجا مقاصد بعثت میں سے ایک مقصد کے طور پر ذکر کیا ہے۔ اب جو شخص بیان قرآن پر مشتمل احادیث کو نہیں مانتا وہ دراصل مقاصد بعثت میں سے ایک مقصد کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ، سورۂ آلِ عمران اور سورۂ جمعہ کی ان متعدد آیات[1] کا انکاری ہے جن میں قرآن کے بیان کو تعلیم کتاب کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد تبلایا گیا ہے۔

حیرت ہوتی ہے اپنی عقل کے بل پر قرآن فہمی کا دعویٰ کرنے والوں کو اتنی سی بات بھی سمجھ کیوں نہیں آتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو درمیان سے علیحدہ کردیا جائے تو قرآن کی صحیح مرادات تک پہونچنا ناممکن ہوجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا ہی احسان فرمایا کہ اپنے کلام کی مرادات کی تلاش ہمارے ذمے نہیں ڈالی بلکہ ہم میں اپنا ایک رسول بھیج دیا جس نے اس کلام کو پہلے خود صاحب کلام سے پڑھا اس کے موافق و

---

[1] سورۂ بقرہ کی آیت ہے کما أرسلنا فیکم رسولاً منکم یتلوا علیکم آیاتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتاب والحکمۃ (جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) اور سورۂ آلِ عمران کی آیت ہے لقد منّ اللہ علی المؤمنین إذ بعث فیھم رسولاً من أنفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ (اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے[164]) اسی طرح سورۂ جمعہ کی آیت ہے ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیٰتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ (وہی ہے جس نے امیوں کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات سناتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ ۲)

مطالب کو خود صاحب کلام سے سمجھا اور پھر خود صاحب کلام ہی کی ہدایتِ خاص اور حفاظتِ خاص کے سایے میں اپنے امتیوں کو پڑھایا، سمجھایا، اس کی اصل مرادات کو متعین کیا اور اس کے احکام پر عمل کر کے دکھلایا۔ اگر اللہ تعالےٰ اس طرح ہماری تعلیم و ہدایت کا سامان نہ کرتا تو ہم یقیناً تا قیامت قرآن کی صحیح مُراد حاصل نہ کر پاتے۔

اب بات صاف ہو گئی جب قرآن کی صحیح صحیح مرادات متعین کرنے کی ہم میں اہلیت ہی نہیں اور قرآن کو سمجھنا موقوف ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے پر تو حدیث کی ضرورت سے ہم بے نیاز کیسے ہو سکتے ہیں۔ حدیث کی یہ دُوسری قسم جس کی حجیت و عدم حجیت اس وقت زیرِ بحث ہے ان کی حیثیت قرآن کے بیان ہی کی تو ہے قرآن اگر حجت ہے تو اس کا بیان حجت کیوں نہیں۔ جس کتاب کے متن کو ماخذ دین ہونے کی حیثیت حاصل ہے اس کتاب کی شرح کو ہم کس دلیل کے تحت ماخذ دین ماننے سے انکار کر سکتے ہیں اور شرح بھی وہ شرح کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری شرح ممکن ہی نہیں، اس لیے کہ وہ شرح بھی اسی کی طرف سے ہے جس کی طرف سے متن ہے۔ جو ماتن ہے وہی شارح بھی ہے۔ کسی کلام کی جو شرح خود صاحبِ کلام متعین کر دے وہی درست اور اصل شرح ہے اس کے علاوہ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ صاحبِ کلام کے اصل مقصود سے ہٹ کر اپنی طرف سے اس کلام کی شرح کرتا پھرے اگر کرے گا تو کسی صاحبِ عقل کے نزدیک وہ شرح صاحبِ کلام کی شرح کے مقابلے میں کبھی قابلِ قبول نہ ہو گی۔

بیانِ قرآن بھی منزل من اللہ ہے

اور یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی جو مرادات متعین فرمائیں وہ اپنی طرف سے نہیں فرمائیں بلکہ جس طرح قرآن منزل من اللہ تھا اسی طرح اس کی مرادات کا تعین بھی منزل من اللہ تھا۔ چنانچہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آیاتِ قرآنی کو سامنے رکھ کر غور فرماتے ہوں کہ اس آیت کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے اور ایک یہ، ان میں سے فلاں مطلب چونکہ اس آیت کے الفاظ پر زیادہ چسپاں ہے اس لیے یہی مُراد خداوندی ہو گا۔ جس طرح قرآن کے الفاظ آپؐ پر وحی کیے جاتے

تھے اسی طرح اس کے معانی اور اس کی شرح بھی آپ ؐ کے قلب مبارک پر وحی کی جاتی تھی جس طرح قرآن کے الفاظ منزل من اللہ تھے اسی طرح اس کے مجملات کی تفصیل اس کے مبہمات کی توضیح اور اس کی مشکلات کی تعبیر بھی منزل من اللہ تھی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون اور اپنا کلام خود ہی نازل کرنے کا ذمہ لیا کہ مخلوق اس قسم کا جامع اور اٹل قانون بنانے پر قادر نہ تھی اسی طرح اس کے شرح و بیان کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی لی کیونکہ مخلوق بلا بتائے اس قانون کی اصل مرادات کو از خود پا لینے پر قادر نہ تھی چنانچہ اس حقیقت کا قرآن کریم میں واضح طور سے اعلان فرمایا گیا۔ ارشاد ہوا :

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۔ (القیمۃ ۱۷ : ۱۹)	اس قرآن کا (آپ کے سینے میں) جمع کر دینا اور آپ کی زبان سے اسے پڑھوانا ہمارے ذمے ہے جب ہم اس قرآن کو پڑھیں تو آپ صرف سنتے رہیئے پھر ہمارے ہی ذمے اس قرآن کا بیان بھی ہے۔

ان آیات میں پہلے الفاظ قرآن کے بارے میں اطمینان دلایا گیا کہ ان کو بلا کم و کاست سینۂ نبوت میں اتار دینا اور محفوظ کر دینا ہمارے ذمّے ہے پھر الفاظ قرآنی کے معانی و بیان اور ان کی مرادات واضح کر دینے کے بارے میں تسلی دی کہ اس کا ذمہ بھی ہم نے ہی لیا ہوا ہے ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ یعنی پھر اس قرآن کا بیان بھی ہمارے ہی ذمّے ہے۔ اب بتلایئے بیان قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح الفاظ قرآنی کے صرف نقل کرنے والے ہیں اسی طرح معانی قرآنی کے بھی صرف ناقل ہی ہیں۔ نہ قرآن کے الفاظ آپ کے اپنے ہیں نہ ان الفاظ کے معانی آپ ؐ نے اپنی طرف سے متعین کر لیے۔ الفاظ کا نزول بھی اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوا اور معانی و مطالب کی تعیین بھی اللہ تعالیٰ ہی نے فرمائی۔ جب یہ بات ہے تو پھر اس طرز عمل کا کیا جواز ہے کہ دو چیزیں جو منزل من اللہ ہیں ان میں سے ایک کو تو دین میں حجت تسلیم کیا جائے مگر دوسری کی حجیت سے انکار کر دیا جائے۔ حجت

ماننا ہے تو دونوں کو ماننا پڑے گا ورنہ پھر دونوں کا انکار کیے بغیر چارہ نہیں درمیان کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

یہاں یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ میں بیان سے مُراد الفاظ قرآنی کو سنا دینا ہے اس لیے کہ الفاظ کے سنا دینے کو بیان نہیں کہتے قرارت کہتے ہیں جس کی ذمہ داری إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ کہہ کر پہلے ہی علیحدہ بیان فرمادی گئی بیان تو کسی پوشیدہ بات کو کھول دینے یا کسی غیر معلوم بات کو علم میں لے آنے کا نام ہے۔ بیان کے لفظ کو اگر الفاظ سنا دینے کے معنے میں لیا جائے تو اس کا ذکر ہی بیکار ٹھہرتا ہے اس لیے کہ الفاظ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں پہلے سے موجود رہیں جیسا کہ سابقہ آیات میں بتلادیا گیا ہے اس کے بعد الفاظ کے معانی و مطالب ہی ہیں جو الفاظ سن لینے کے بعد بھی مخفی رہ سکتے ہیں۔ معلوم ہوا بیان کا لفظ معانی و مطالب ہی کے لیے لایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اس پر بھی تو غور کیجئے کہ یہ قرأت اور بیان کو علیحدہ علیحدہ بیان کرنا پھر دونوں کے لیے الگ الگ عَلَيْنَا لاکر اپنی ذمہ داری کا اعلان کرنا اور پھر دونوں کے درمیان فصل کے لیے ثُمَّ کا لانا کلام کا یہ انداز اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ الفاظ قرآن کی ذمہ داری اور بیان قرآن کی ذمہ داری دونوں جُدا جُدا حیثیت کی حامل ہیں ایک ذمہ داری کا دوسری سے کوئی تعلق نہیں اگر یہ بات نہ ہو تو ان دو آیتوں کے درمیان فصل بھی بلاضرورت قرار پائے گا عَلَيْنَا کی تکرار بھی عبث ہوگی اور ثُمَّ کا لانا بھی بے کار ٹھہرے گا اور یہ کلام الٰہی میں محال ہے اس لیے لازماً ماننا پڑے گا کہ قرآن کی قرأت اور قرآن کا بیان دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں اور متذکرہ آیت کی روشنی میں دونوں منزل من اللہ ہیں ::

بیان قرآن کے نزول کی صورت

اب رہا یہ سوال کہ قرآن کا بیان بھی اگر منزل من اللہ ہے تو اس کے نزول کی صورت کیا تھی تو اس سلسلے میں اتنی بات تو واضح ہے کہ قرآن کے الفاظ اگر بذریعۂ قرأت پہونچائے گئے تھے تو قرآن کا بیان بذریعۂ تعلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک

پر القا کیا گیا تھا چنانچہ ارشاد ربانی ہے :

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (النسار ۱۱۳) | اور ہم نے تم کو وہ باتیں تعلیم کیں جو تم نہیں جانتے تھے۔

مگر اس تعلیم کے سینۂ نبوی میں القا کیے جانے کی کیفیت کیا تھی اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں اس لیے کہ وہ سینۂ نبوی میں خواہ کسی طرح بھی القا کی گئی ہو اس نے لازماً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک میں پہونچ کر بالآخر کسی ملفوظ ہی کی شکل اختیار کی ہوگی۔ تعلیم کی یہ آخری شکل ہی قرآن کا بیان ہے اور اسی کا نام حدیثِ نبوی ہے۔

غرض متذکرہ بالا دوسری قسم کی احادیث کو بھی جو قرآنی احکام کی وضاحت کرتی ہیں اور قرآن کا بیان ہونے کی حیثیت کی حامل ہیں دین میں حجت مانے بغیر چارہ نہیں۔ جو شخص قرآن کا ماخذ دین ہونا تسلیم کر چکا ہے اس کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ قرآن کے بیان کو بھی ماخذ دین کی حیثیت سے تسلیم کرے۔ ایک کو مان کر دوسرے کے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

مستقل تشریعی حیثیت کی حامل احادیث

اب آئیے تیسری قسم کی ان احادیث کی طرف جو بظاہر ایسے احکام پر دلالت کرتی نظر آتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے۔ ان کے بارے میں جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم وضاحت کر چکے ہیں پہلی بات تو یہی ہے کہ یہ احادیث صرف ظاہر نظر میں ہی قرآن سے باہر نظر آتی ہیں ورنہ محققین کے نزدیک کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں جس کی اصل قرآن میں موجود نہ ہو کسی بھی صحیح حدیث سے کوئی ایسا حکم ثابت نہیں ہوتا جو کسی نہ کسی نص یا قاعدے کے تحت قرآن میں وارد نہ ہو۔ اس کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم خود قرآن ہی کی رو سے قانون خداوندی کا ایک حصہ ہے۔ قرآن نے بڑی صراحت کے ساتھ اپنے ماننے والوں کو ایک مستقل ہدایت کے طور پر یہ حکم سنا دیا ہے کہ

وَمَا آتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر۔۷) | جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لو اور جس سے منع کردے اس سے رک جاؤ۔

رسول کا حکم قرآن ہی کا حکم ہے

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم بھی دیں وہ قابلِ اطاعت ہے۔ گویا آپ انسانی زندگی کے جس مسئلے کے بارے میں جو حکم صادر فرمادیں گے وہ اس آیت کے تحت داخل ہو کر قرآن ہی کا حکم بن جائے گا اگرچہ اس کی اصل قرآن میں صراحتاً موجود نہ ہو۔ یہ آیت اگرچہ مالِ فے کی تقسیم کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے مگر چونکہ آیت کے الفاظ عام ہیں اس لیے مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت صرف اموال کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ احکام بھی اس میں داخل ہیں اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی حکم یا مال یا اور کوئی چیز آپ کسی کو عطا فرما دیں وہ اس کو لے لینا چاہیے اور اس کے مطابق عمل کے لیے تیار ہو جانا چاہیے اسی طرح جس کام اور جس چیز سے آپ روک دیں اس سے رک جانا چاہیے۔ یوں بھی آتیٰ کے بالمقابل نھیٰ کا لفظ لانا اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں آتیٰ دراصل اَمر کے معنی میں ہے جو نھیٰ کا صحیح مقابل ہے۔ صحابۂ کرام نے اسی مفہوم کو اختیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم کو اس آیت کی بنا پر قرآن ہی کا حکم قرار دیا ہے اس کی چند مثالیں ہم "قرآن کی جامعیت" کے عنوان کے تحت آثارِ صحابہ میں سے پیش کر چکے ہیں۔ امام شافعی کے بارے میں بھی منقول ہے[1] کہ انہوں نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا کہ تمہارے ہر سوال کا جواب قرآن سے دے سکتا ہوں پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے ایک شخص نے عرض کیا کہ ایک محرم نے زنبور (تتیا) مار ڈالا تو اس کا کیا حکم ہے امام شافعی نے محولہ بالا آیت پڑھ کر حدیث سے اس کا حکم بیان فرما دیا۔

منکرین حدیث نے اس آیت کے شان نزول کو بنیاد بنا کر اپنی قرآن دانی کا ایک اور عجیب و غریب ثبوت مہیا کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ "مَا آتٰكُمُ... الخ" کی آیت صرف

---

[1] تفسیر قرطبی

مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں ہے حدیث سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔نہی کے بالمقابل واقع ہونے کی بنا پر آتیٰ کو اَمَرَ کے معنی میں لینا ان کے نزدیک محض ایک غلط فہمی ہے ۔ اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کی خاطر منکرین حدیث دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آتیٰ کا لفظ قرآن میں جہاں کہیں آیا ہے دینے ہی کے معنی میں آیا ہے اور حدیثیں اقوال ہیں اس لیے ان پر دینے کے لفظ کا اطلاق درست نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو چیز دی ہے وہ قرآن ہے[1] ۔

منکرین حدیث کا یہ استدلال خود اپنے اندر ہی تضاد بیانی کا شکار ہے ایک طرف وہ اس آیت کو صرف مال فئے کی تقسیم کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ کہتے ہیں کہ آتاکم سے قرآن کا دینا مراد ہے حدیثوں کا نہیں کیونکہ وہ اقوال ہیں ۔ اگر اس آیت کا تعلق صرف مال کے دینے نہ دینے سے ہے تو پھر قرآن یا حدیث کے دینے نہ دینے کا کیا ذکر ۔خود ہی ایک بات کہتے ہیں اور خود ہی اس کے خلاف دلیل قائم کرتے ہیں اس بوالعجبی کی آخر کیا توجیہ کی جائے ۔کیا یہ تصور کیا جائے کہ بے چارے بات کہہ کر بھول جاتے ہیں لیکن اس پر لوگوں کی زبان پر بے ساختہ اگر یہ آ گیا کہ دروغ گو را حافظہ نباشد تو پھر کیا جواب ہوگا اور اگر بھول جانے والی بات نہیں ہے تو پھر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے ۔ آپ نے اپنے قول پر خود ہی ہماری طرف سے دلیل قائم کر دی ۔ اتنی بات تو آپ نے خود ہی تسلیم کر لی کہ آتاکم کا لفظ قرآن دینے کے معنی میں استعمال ہو سکتا ہے گویا اس پر تو آپ ہم سے متفق ہیں کہ یہ آیت مال فئے کی تقسیم کے ساتھ ہی خاص نہیں دیگر معنی کو بھی شامل ہے اب ذرا یہ بتلائیے کہ آتاکم کا لفظ اگر قرآن دینے کے معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے تو حدیث دینے کے معنی میں کیوں نہیں ہو سکتا آپ کا کہنا یہ ہے کہ حدیثیں تو اقوال ہیں ان کو دیا نہیں جاتا بلکہ کہا جاتا ہے ۔تو کیوں صاحب کیا آپ کے نزدیک قرآن اقوال کا مجموعہ نہیں ہے اگر اقوال

---

[1] علم حدیث از (مولانا) محمد اسلم جیراج پوری

کے اس مجموعے کو دیا جا سکتا ہے تو اقوال کے دوسرے مجموعے حدیث کو کیوں نہیں دیا جا سکتا کیا آپ نے قرآن کریم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی ایسی ہی ایک جلد بندھی بندھائی کتاب تصور کر لیا ہے جیسی ہمارے زمانے میں اب کتب خانوں میں دستیاب ہے یا پھر کہیں آپ یہ خیال تو جمائے نہیں بیٹھے کہ قرآن بھی تورات کی طرح ایک کتاب کی صورت میں نازل ہوا تھا اگر ایسا نہیں ہے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی متفرق آیتیں متفرق اوقات میں نازل ہوتی تھیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے سامنے ان آیتوں کو پڑھ کر ہی سناتے تھے اس کے باوجود آپؐ کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی آیات قرآنی پر اگر آتی کا لفظ بولا جا سکتا ہے تو اسی زبان مبارک سے نکلی ہوئی احادیث پر آتی کا لفظ کیوں نہیں بولا جا سکتا۔

اس کے علاوہ منکرین حدیث کا یہ کہنا بنیادی طور پر ہی غلط ہے کہ اقوال کے لیے آتیٰ کا لفظ نہیں بولا جاتا اس لیے کہ خود قرآن نے اقوال کے لیے آتیٰ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورۂ صٓ میں ہے:

وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔ (صٓ: ۲۰)	اور ہم نے انہیں حکمت اور فیصلہ کرنے والی بات عطا کی تھی۔

خطاب کے معنی بات، قول اور تقریر کے ہیں اس آیت اور اس سے ماقبل کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد پر کیے گئے کچھ انعامات کا ذکر کیا ہے انہی میں سے ایک انعام یہ بھی تھا کہ آپ بڑے اونچے درجے کے خطیب تھے ان کے زورِ بیان اور ان کی قوت خطابت کے اظہار کے لیے فصل الخطاب کا لفظ استعمال کیا گیا یعنی ایسی تقریر جو نہایت واضح اور جامع ہو۔ تقریر ظاہر ہے اقوال کا مجموعہ ہوتا ہے اور اس کے لیے قرآن نے آتیٰ کا لفظ استعمال کیا ہے:

مزید برآں آتیٰ کا لفظ قرآن میں جا بجا ایسے معنی میں مستعمل ہوا ہے جو حدیث پر بھی پوری طرح صادق آتے ہیں۔ مثلاً متعدد جگہ آتیٰ کا لفظ علم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورۂ مجادلہ میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (المجادلۃ : ۱۱)	اور ان کے جنہیں علم دیا گیا ہے درجات (بلند کرے گا)۔

اگر علم کے لیے آتی کا لفظ بولا جا سکتا ہے تو حدیث بھی ایک علم ہے۔ اسی طرح قرآن نے ایک جگہ حکمت کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے اور حدیث کے حکمت ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں اس لیے کہ خود قرآن نے حدیث کو حکمت سے تعبیر کیا ہے اپنے مقام پر اس کی تفصیل آرہی ہے۔ غرض قرآن میں حکمت کے لیے آتی کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ (لقمان-۱۲)	اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی۔

اسی طرح قرآن نے عقل وفہم کے لیے بھی آتی کا لفظ استعمال کیا چنانچہ سورۂ مریم میں ہے۔

وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (مریم ۱۲)	اور ہم نے اس کو لڑکپن ہی میں عقل وفہم دے دی تھی۔

بہرحال اگر علم کے لیے حکمت کے لیے اور عقل وفہم کے لیے آتی کا لفظ بولا جا سکتا ہے تو حدیث پر بھی بولا جا سکتا ہے جو یقیناً علم بھی ہے حکمت بھی ہے اور عقل وفہم کا سرچشمہ بھی ہے۔

مختصر یہ کہ ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا کے الفاظ عام ہیں اور اس لیے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم اور جو چیز بھی تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔ بنا بریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم قابل اطاعت ہے آپ انسانی زندگی کے جس مسئلے کے بارے میں جو حکم صادر فرمادیں گے وہ اس آیت کے تحت داخل ہو کر قرآن ہی کا حکم بن جائے گا اور اس طرح وہ احادیث جو بظاہر ایسے احکام پر دلالت کرتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے اس آیت کی رو سے قرآن ہی کے احکام میں سے ایک حکم کی مظہر و مثبت بن جائیں گی۔

اطاعتِ رسول کے وجوب کی مستقل حیثیت

علاوہ ازیں قرآن کریم کی متعدد آیات میں رسول کی اطاعت کو مستقل حیثیت سے واجب قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں تقریباً بیس جگہ اطاعتِ رسول کا

حکم ہے اور اکثر آیات میں اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت دونوں کا ذکر ایک ساتھ مگر اس طرح علیحدہ علیحدہ کر کے بیان کیا ہے کہ دونوں اطاعتوں کی علیحدہ اور مستقل حیثیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۂ نساء کی مشہور آیت ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (النساء: ۵۹)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولو الامر ہوں پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو جائے تو اس کو پھیر دو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو

اس آیت میں اطیعوا اللہ سے مراد قرآن ہے اور اطیعوا الرسول احادیث نبوی کا واجب الاطاعت ہونا ثابت کر رہا ہے اس آیت میں غور کرنے کی بات ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے امر کا صیغہ اطیعوا بار بار دہرایا گیا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت کی طرح ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اپنی جگہ کوئی امتیازی مستقل حیثیت نہ رکھتی ہوتی تو اطیعوا کے لفظ کو دوبارہ لانے کی ضرورت ہی نہیں تھی بلکہ جس طرح اولو الامر کی اطاعت کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ماتحت درج کیا گیا ہے اسی طرح رسول کی اطاعت کے لیے بھی جداگانہ امر فرمانے کے بجائے اللہ کی اطاعت کے تحت درج کیا جاتا اور کہا جاتا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ وہ دو اطاعتیں جو مستقل حیثیت رکھتی تھیں ان کو علیحدہ علیحدہ مستقل حیثیت سے بیان کیا گیا اور تیسری اطاعت جس کی حیثیت غیر مستقل تھی اس کو پہلی دو اطاعتوں کے تابع بنا کر بیان کیا گیا۔

مرجع نزاع اطاعت رسول کی مستقل حیثیت اور زیادہ واضح کرنے کے لیے اسی آیت میں یہ بھی بتلا دیا گیا کہ اگر کسی معاملے میں کوئی نزاع برپا ہو جائے تو فیصلے کے لیے آخری سند صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو

جائے تو اس کو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف پھیر دو) ظاہر ہے اگر اطاعت رسول کی مستقل حیثیت نہ ہوتی تو نزاعات میں فیصلے کے لیے مرجع صرف اللہ تعالےٰ کی ذات ہوتی اور صرف فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ کہا جاتا۔ یہ رسول کا صراحت کے ساتھ علیحدہ ذکر کرنا صاف بتلا رہا ہے کہ مرجع نزاع ہونے کے لحاظ سے رسول کی ذات بھی مستقل حیثیت کی حامل ہے یعنی نزاعات کے موقع پر رسول کا فیصلہ بھی حکم آخر ہوگا رسول سے نزاع نہیں ہو سکتی ۔یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اولوالامر کی ذات مورد نزاع بن سکتی ہے کیونکہ مرجع نزاع بتلاتے وقت اس کے ذکر کو حذف کر دیا گیا ہے اور تاریخ بھی اس پر شاہد ہے کہ خلفاء اور ائمہ کو اپنی اطاعت کے لیے قرآن و حدیث پیش کرنا پڑی ہیں بلکہ بعض مواقع پر انہیں اپنے قول سے رجوع بھی کرنا پڑا ہے اس کے مقابلے میں تاریخ میں ایسی مثال ایک بھی نہیں ملتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بعد صحابہ نے کبھی آپؐ سے اس پر دلیل پیش کرنے کا مطالبہ کیا ہو۔

معلوم ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث واجب الاطاعت ہے خواہ اس کی اصل قرآن میں ہمیں معلوم ہو سکے یا نہ ہو سکے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بعض احادیث کی اصل قرآن میں موجود نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے لیے اللہ تعالےٰ نے ہمیں اس کا مکلف ہی نہیں بنایا کہ اس کی اصل کتاب اللہ میں تلاش کی جائے۔ ہم سے تو مطالبہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسول کی اطاعت اللہ ہی کا ایک حکم سمجھ کر کریں۔

اطاعتیں دو مگر مطاع ایک

اس سلسلے میں یہ بات البتہ خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی علیحدہ علیحدہ دو اطاعتیں واجب ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مطاع بھی دو بن گئے مطاع دراصل دونوں جگہ خدا ہی کی ذات رہتی ہے قرآن نے اس حقیقت کو بڑے واضح الفاظ میں جتلایا ہے ارشادِ ربانی ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ (النساء: ۸۰)۔	جو رسول کی اطاعت کرے اسی نے اللہ کی اطاعت کی۔

یعنی رسول کی اطاعت کی صورت میں بھی اطاعت دراصل خدا ہی کی ہوگی اطاعت کے تعدد سے مطاع میں تعدد نہ سمجھنا چاہیئے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ رسول کا کوئی بھی حکم جس کی اطاعت کی جارہی ہے اس لحاظ سے اگرچہ ایک مستقل حیثیت کا حامل ہے کہ قرآن میں اس تفصیل کے ساتھ مذکور نہیں جس تفصیل کا احاطہ بیان رسول نے کیا ہے تاہم اس اعتبار سے کہ یہ تمام تفصیل بعینہٖ قرآن ہی کی کسی اصل کی فرع ہے اس کی حیثیت مستقل ہونے کے بجائے قرآن ہی کے تابع ہو جاتی ہے۔ پہلی حیثیت کے لحاظ سے مطاع بظاہر رسول کی ذات نظر آتی ہے مگر فی الحقیقت دوسری حیثیت کے اعتبار سے مطاع خدا ہی کی ذات رہتی ہے۔ پس احادیث رسول پر عمل کرنے والا بلحاظِ بیان و تفصیل تو رسول کا مطیع کہلاتا ہے لیکن بلحاظ اصل و مراد خدا ہی کا مطیع ہوتا ہے گویا احادیث پر عمل کرنے والا دراصل قرآن ہی پر عمل کرنے والا رہتا ہے فرق ہے تو صرف اتنا کہ قرآن پر عمل کرنے والا اللہ تعالےٰ کے الفاظ پر عمل کرتا ہے اور حدیث پر عمل کرنے والا اللہ تعالےٰ کی مراد پر عمل کرتا ہے اسی بنا پر اطاعتیں اگرچہ دو نظر آتی ہیں مگر مطاع دراصل ایک ہی رہتا ہے۔

منکرین حدیث کو دراصل سب سے بڑا مغالطہ یہی لگا ہے کہ وہ دو اطاعتوں کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ مطاع بھی دو بن گئے۔ رسول کی اطاعت میں یہ سمجھنا کہ مطاع اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہوتی بڑی غلط فہمی ہے نیز قرآن سے ناواقفی کی دلیل ہے۔ اسی غلط فہمی اور ناواقفی کی بنا پر منکرین حدیث کو ہر اس آیت میں کھینچا تانی کرنا پڑی جس میں رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ مستقل حیثیت سے بیان کیا گیا تھا۔

رسول کے لفظ سے قرآن مُراد لینا

مثلاً محولہ بالا آیت ہی کے بارے میں کہا گیا کہ رسول سے مراد آیات الٰہیہ یعنی خود قرآن ہے پیغمبر مُراد نہیں ہے مگر یہ کہنا ظاہر ہے بالکل ہی بلا دلیل تھا۔ قرآن میں کہیں بھی رسول کا لفظ کتاب یا آیات الٰہیہ کے لیے نہیں آیا جہاں کہیں بھی آیا ہے پیغمبر کے لیے آیا ہے یا پھر فرشتے کے لیے آیا ہے۔ بلکہ ایسی آیات بھی متعدد موجود ہیں جن میں ایک ساتھ رسول کا بھی ذکر ہے اور آیات کا بھی ذکر ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ دو جُدا جُدا چیزیں ہیں وہ تمام آیات

جن میں تلاوت قرآن کو رسول کا منصب تبلایا گیا ہے اسکی نظیریں پیش کی جا سکتی ہیں : اسکے علاوہ ذیل کی آیت تو اس باب میں اتنی صریح ہے کہ کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ارشاد ربانی ہے :

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا (النساء: ٦١)	اور جب انکو کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی نازل کردہ (کتاب) کی طرف اور رسول کی طرف تو تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ وہ تم سے کنی کتراتے ہیں۔

اس آیت میں ما انزل اللہ سے مُراد قرآن ہے اس کا ذکر کرنے کے بعد رسول کا ذکر مستقل حیثیت سے کیا گیا ہے اور صاف تبلا دیا گیا ہے کہ دین میں اصل مرجع دو ہیں۔ ایک قرآن اور دوسرے رسول۔ دونوں مستقل حیثیت سے واجب الاطاعت ہیں ان دونوں سے مُنہ موڑنا منافق کا کام ہے نہ کہ مومن کا۔ گویا رسول کو مستقل حیثیت سے دین کا مرجع ماننا مدار ایمان ہے۔ اس آیت میں کسی طرح بھی رسول کو قرآن کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ کیا منکرین حدیث یہاں بھی رسول کو قرآن کے معنی میں لیکر یہ ثابت کرنیکی کوشش کریں گے کہ قرآن میں بلا ضرورت تکرار لفظی سے کام لیا گیا ہے۔

بھلا کوئی پوچھے رسول سے مُراد اگر قرآن ہے تو پھر اس آیت کے آپ کیا معنی بیان کریں گے لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ (اللہ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا۔ ۱۷) کیا آپ یہ کہیں گے کہ اللہ نے اپنی کتاب کا خواب سچا کر دکھایا۔ خواب انسان دیکھا کرتا ہے کتاب نہیں دیکھا کرتی۔ اسی طرح قرآن کہتا ہے يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (اے رسول پہونچا دے جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے۔ المائدہ۔ ۶۷) رسول کا مطلب اگر کتاب ہے تو ذرا سوچئے کتاب پر بھی کبھی کچھ نازل کیا جاتا ہے؟

اطاعت کو موافقت کے معنی میں لینا

جب کسی طرح بات بنتی نظر نہ آئی تو کہا گیا کہ اطیعوا الرسول میں دراصل اطاعت سے مُراد موافقت ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کرنے میں رسول کی موافقت اختیار کرو۔ یہ بات پہلے سے بھی زیادہ عجیب تھی اطاعت کے معنی اگر موافقت کے ہیں تو آیت میں دونوں جگہ ایک ہی معنی لینے چاہئیں اطیعوا اللہ کا بھی پھر یہی ترجمہ کرنا چاہیئے کہ اللہ کی موافقت اختیار کرو ایک ہی آیت میں ایک ہی لفظ کے دو معنی بیک وقت کیسے قبول کیے جا سکتے ہیں۔

اطاعت رسول کو اطاعت الٰہیہ کی تفسیر قرار دینا

جب یہ بات بھی نہ چلی تو کہنے لگے کہ واطیعوا الرسول میں واؤ تفسیری ہے اطیعوا اللہ کی تفسیر اطیعوا الرسول سے کی جا رہی ہے یعنی اللہ کی اطاعت کا حکم دیکر اسکی تشریح کی جا رہی ہے سمجھایا جا رہا ہے کہ اللہ کی اطاعت کا مطلب کیا ہے لیکن یہ توجیہ بھی کسی طرح ذہن کو اپیل نہ کر سکی ظاہر بات ہے کہ واؤ تفسیری دو مرادف یا دو ہم مصداق لفظوں یا فقروں کے درمیان آتا

ہے اور یہاں ایسا نہیں ہے اللہ اور رسول کو کسی طرح بھی باہم مرادف ثابت نہیں کیا جا سکتا اور پھر تفسیر کی ضرورت تو وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی بات مبہم ہو جو بات پہلے ہی سے واضح ہو اس کی تفسیر کی حاجت نہیں ہوا کرتی أطیعوا اللہ (اللہ کی اطاعت کرو) میں کونسا ابہام ہے جاہل سے جاہل آدمی کو بھی اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو سکتی پھر آخر اس تفسیر کی ضرورت ہی کیا پیش آئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ جو لفظ پہلے سے واضح ہے اس کی تفسیر ایک ایسے لفظ سے کی جا رہی ہے جو اس کے مقابلے میں مبہم ہے، طریقہ تو یہ ہے کہ مبہم کی تفسیر واضح سے کی جاتی ہے مگر یہاں معاملہ الٹ ہے "اللہ" بالکل واضح ہے ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ خدا کا نام ہے اسکے دوسرے کوئی معنی ہی نہیں اللہ کے معنی میں کسی قسم کے بھی ابہام کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اب کیسے یہ بات قبول کر لی جائے کہ اس واضح کی تفسیر ایک ایسے لفظ سے کی جا رہی ہے جو مقابلتاً مبہم ہے رسول کے کئی معنی ہیں مختلف معانی کی محتملات نے اسے اللہ کے لفظ کے مقابلے میں مبہم بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اللہ کے لفظ کو مبہم مان بھی لیا جائے اور اس لیے اس کی تفسیر کی ضرورت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ایک دو جگہ اس مبہم کی تفسیر کر دینا کافی تھا قرآن میں بیسیوں جگہ اطیعوا اللہ کو اطیعوا الرسول کے ساتھ ملا کر اسی طرح بیان کیا گیا ہے آخر ہر جگہ بالالتزام اس تفسیر کی کیا ضرورت تھی، معمولی سے معمولی مصنف بھی اس قسم کا تکرار اپنی تصنیف میں روا نہیں رکھتا۔

اطاعت رسول کے لیے حیات نبوی کی شرط

آپ نے دیکھا اپنی بات کی پچ نبھانے کے لیے منکرین حدیث کو آیاتِ قرآنی میں کیسی کیسی دور از کار تاویلات کا سہارا لینا پڑا۔ اسی پر بس نہیں جب مذکورہ بالا مضحکہ خیز توجیہات میں سے کوئی توجیہ بھی عقل کے معیار پر پوری اترتی نظر نہ آئی تو منکرین حدیث نے ایک اور رُخ پلٹا۔ اگرچہ دیانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس کا اعتراف کر لیتے اور اپنے غلط خیال سے رجوع کر لیتے مگر انہوں نے دُوسرا راستہ اختیار کیا اور کہنا شروع کر دیا کہ اطاعتِ رسول کا حکم صرف آپؐ کی حیات تک تھا اس لیے کہ

اطاعت کا لفظ صرف نمبروں کے لیے مستعمل ہوتا ہے گزرے انسانوں کی اطاعت نہیں کی جایا کرتی پیروی کی جایا کرتی ہے منکرین حدیث کے نزدیک اطاعت انسانوں کی ہوا کرتی ہے اقوال کی نہیں اقوال کے لیے اطاعت کا نہیں پیروی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

اقوال کی اطاعت

کرنے کو تو منکرین حدیث نے یہ اعتراض کر دیا مگر یہ تک نہ سوچا کہ قرآن بھی تو اقوال الٰہی کا مجموعہ ہے تو پھر اس کے لیے بھی اطاعت کا لفظ استعمال نہیں کیا جانا چاہیئے تھا۔ اللہ تعالےٰ کی اطاعت بھی تو ہم براہ راست نہیں کر سکتے وہاں بھی تو اطاعت کے معنی یہی ہیں کہ اللہ کے کلام کی اطاعت کی جائے۔ اگر اللہ کے کلام کے لیے اطاعت کا استعمال درست ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے لیے اطاعت کا استعمال کیوں درست نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس پر بھی غور کیجئے کہ اسی زیر بحث آیت میں نزاعات کے وقت فیصلے کے لیے دو مرجع بتائے گئے ہیں ایک اللہ دوسرے اللہ کا رسول۔ پھر جب اللہ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں اس وقت تک خود آپؐ کی ذات مبارک کی طرف رجوع کیا جائے اور جب آپؐ دنیا سے رحلت فرما جائیں اور براہ راست آپؐ سے استفادہ کی صورت باقی نہ رہے تو آپؐ کے اقوال و افعال کی طرف رجوع کیا جائے بلکہ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو آپؐ کی حیات میں بھی مرجع نزاع بڑی حد تک آپؐ کے اقوال و افعال ہی تھے اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانے میں اسلامی حکومت دس بارہ لاکھ مربع میل کے وسیع و عریض علاقے یعنی پورے جزیرۂ عرب پر پھیلی ہوئی تھی۔ اتنے وسیع ملک میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے لیے ہر معاملے کا فیصلہ براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کرانا کسی طرح ممکن نہ تھا لامحالہ اس زمانے میں بھی معاملات کے فیصلے کرنے کے لیے قرآن کے بعد جس طرف رجوع کیا جاتا تھا وہ آپؐ کے اقوال و افعال ہی تھے۔ غرض یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ اقوالِ رسول پر اطاعت کا اطلاق نہیں کیا

جا سکتا اور اس لیے اطاعتِ رسول کا حکم صرف اس وقت تک تھا جب تک براہِ راست آپؐ کی اطاعت ممکن تھی یعنی جب تک آپؐ بقید حیات تھے۔ لغت عرب میں بھی اطاعت کے معنی میں اس قسم کی کوئی تحدید ثابت نہیں کہ یہ لفظ صرف زندہ انسانوں پر بولا جاتا ہو یا اقوال کے لیے اس کا استعمال درست نہ ہو۔ تے کی کوئی نظیر ملتی ہو۔ منکرین حدیث اس قسم کی کوئی نظیر قرآن سے یا مستند لغتِ عرب سے پیش نہیں کر سکتے جو ان کے دعوے کو ثابت کرنے والی ہو اس کے برعکس ہمارے پاس اس بات کے ثبوت ہیں کہ اطاعت کا استعمال صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات تک ہی محدود نہ تھا خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نظیر موجود ہے آپ نے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد جو سب سے پہلا خطبہ دیا اس میں اپنی اطاعت کی حدود واضح کرتے ہوئے فرمایا أَطِيعُونِي مَا أَطَعْتُ اللهَ وَرَسُولَهُ[1] (اس وقت تک میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں) دیکھ لیجیے یہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے اہل زبان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحلت فرما جانے کے بعد آپؐ کی پیروی کے لیے لفظ اطاعت استعمال کیا ہے۔

ہر مذہب کا بہترین زمانہ وہ ہوتا ہے جو صاحب مذہب سے قریب ہو اس زمانے کے لوگ صاحبِ مذہب کے مقصد کو جتنا زیادہ سمجھ سکتے ہیں زمانۂ بعید کے لوگ اتنا نہیں سمجھ سکتے اور صاحب مذہب کی لائی ہوئی ہدایت کی تشریح جو اس کے اصحاب یا قریب زمانے کے لوگ کرتے ہیں وہی صحیح ہوتی ہے اس لیے قرآن و حدیث کا جو ترجمہ جو مطلب صحابۂ کرام اور سلف صالحین بتا گئے ہیں درست صرف اسی کو تسلیم کیا جائے گا یہ کیسے مان لیا جائے کہ تیرہ چودہ سو برس تک أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ کا صحیح مطلب کوئی بھی نہ سمجھ سکا حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو قرآن کے مخاطب اوّل تھے۔

غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو مستقل حیثیت سے واجب قرار دیا ہے۔ بنا بریں قرآن ہی کا ہم سے یہ مطالبہ ہے کہ ہم

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۳۱۷

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول اور ہر فعل کو ایک مستقل اور علیحدہ حیثیت سے واجب الاطاعت تسلیم کریں۔ گویا قرآن پر اس وقت تک پورا عمل ممکن ہی نہیں جب تک ہم حدیث رسول کو بھی قانون خداوندی کا ایک حصہ مان لیں۔

اطاعت رسول کی مستقل حیثیت اور قرآن

حدیث رسول کی مستقل حیثیت قرآن کی نظر میں کتنی اہم ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ رسول پر اس کی اطاعت کے بغیر ایمان لانا قرآن کے نزدیک ایمان ہی نہیں ہے۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النساء: ۶۵)۔

پس (اے نبی) تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اس کے بعد تیرے فیصلے سے اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور پوری طرح اسکے سامنے سر جھکا دیں۔

یعنی رسول پر ایمان لانے کے لیے صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ زبان سے بس آمنت کہہ لیا جائے بلکہ کوئی شخص اس وقت تک مومن ہی نہیں ہو سکتا جب تک وہ ہر معاملے میں رسول کو اپنا حکم نہ بنا لے۔ باہمی جو اختلاف بھی ہو اس میں اسی کا فیصلہ حرف آخر نہ جانے بلکہ وہ فیصلہ اپنے مخالف ہو تو بھی اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کرے۔

رسول کا فیصلہ سننے کے بعد قرآن کسی کو یہ حق بھی نہیں دیتا کہ وہ اس فیصلے کے بارے میں کسی قسم کی چون وچرا کرے بلکہ ایمان لانے والوں سے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ رسول کا فیصلہ سنتے ہی وہ کہہ دیں کہ بس ہم نے سنا اور مان لیا چنانچہ سورۂ نور میں ہے۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (النور: ۵۱)۔

مومنوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول انکے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔

گویا مومن کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں جب تک وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے سامنے سمع وطاعت کا رویہ اختیار نہ کرے۔ قرآن کے نزدیک رسول جس بات کا فیصلہ کر دے تو اس کے بعد کسی کو اس معاملے میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہ جاتا چنانچہ ارشاد ہے:

مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ۔ (الاحزاب: ۳۶)	جب خدا اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو کسی مومن مرد یا عورت کو پھر اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سمع وطاعت اور خود سپردگی کا یہ رویہ صرف ایمانیات یا عبادات وغیرہ ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس کے تحت معمولی معمولی اطاعتیں بھی درج ہیں چنانچہ سورۂ نور کی یہ آیت ملاحظہ ہو:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَکَ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ (النور: ۶۲)۔	جو لوگ آپ سے اجازت لے کر جاتے ہیں یہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔

معلوم ہوا استیذان جیسی معمولی اطاعت بھی اتنی اہم ہے کہ ایمان باللہ والرسول کی حدود میں داخل ہے۔ غور کیجئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بغیر کہیں جانا بھی درست نہیں تو آپ کے کسی شرعی حکم کی حدود سے باہر نکلنا کیسے درست ہوگا۔

بہر حال یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ اطاعت رسول کی مستقل حیثیت کو تسلیم کرنا دراصل قرآن ہی کے ایک حکم کو تسلیم کرنا ہے اس لیے جس حکم کے بارے میں ہمیں یہ ثابت ہو جائے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حکم ہے تو پھر ہمیں اس تلاش کی ضرورت نہیں کہ اس کی اصل قرآن میں صراحتاً موجود ہے یا نہیں ہمارے لیے اس کی اطاعت لازمی ہے

مختصر یہ کہ تیسری قسم کی وہ احادیث بھی جو بظاہر ایسے احکام پر دلالت کرتی نظر آتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے دین میں اسی طرح حجت ہیں جس طرح وہ احادیث جو قرآنی

احکام کی مؤید یا قرآنی احکام کا بیان ہیں ۔

رسول کا ہر عمل وحی الٰہی کی اتباع میں ہے

دراصل حدیث رسول کی تشریعی حیثیت کا تعین کرتے وقت اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا اور جو کچھ کر کے دکھایا خواہ اس کی حیثیت قرآن کی تائید کی ہو خواہ وہ قرآن کا بیان ہو اور خواہ اس کا تعلق ان مسائل و احکام سے ہو جن سے قرآن بظاہر خاموش ہے وہ سب کا سب وحی الٰہی کی اتباع میں ہے سورۂ نجم میں ہے :

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى (النجم: ۳-۴)	اور وہ اپنی خواہش سے باتیں نہیں بناتے وہ تو تمام تر وحی ہی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے ۔

وحی متلو و غیر متلو

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ دو قسم کی تھی ایک تو قرآن کریم کی آیات جن کے الفاظ اور معانی دونوں منزل من اللہ تھے اس وحی کو علماء کی اصطلاح میں "وحی متلو" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے دوسری قسم وحی کی وہ ہے جو قرآن کریم کا حصہ نہیں بنی لیکن اس کے ذریعے آپ کو بہت سے احکام عطا فرمائے گئے اس وحی کو "وحی غیر متلو" کہتے ہیں یعنی وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی ۔ وحی کی اس قسم میں عموماً صرف مضامین آپ پر نازل کیے گئے ان مضامین کی تعبیر کے لیے الفاظ کا انتخاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ۔ یہ "وحی غیر متلو" صحیح احادیث کی شکل میں محفوظ ہے [۱] وحی متلو کو وحی جلی اور وحی غیر متلو کو وحی خفی کا نام بھی دیا جاتا ہے ۔

قرآن کے علاوہ وحی کا نزول

یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی نازل ہوتی تھی اس پر خود قرآن

---

[۱] الاتقان جلد ۱ صفحہ ۵۴ النوع السادس

گواہ ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ (النساء: ۱۱۳)۔	اور اللہ نے تجھ پر نازل کی کتاب اور حکمت اور تجھے سکھایا وہ کچھ جو تو نہیں جانتا تھا۔

معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب کے علاوہ ایک چیز حکمت بھی نازل کی گئی تھی اس سے انکار نہیں کہ قرآن بھی سراپا حکمت ہے لیکن واو عطف کے ساتھ کتاب کے بعد حکمت کا بطور خاص ذکر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں قرآن کے علاوہ دوسری شے مراد ہے اب ظاہر ہے کہ قرآن کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے علاوہ اور کیا چیز ہے جسے حکمت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ حکمت و دانائی بھی وحی کی گئی تھی جس کی روشنی میں آپ قرآن کریم کے لائے ہوئے لائحہ حیات کو عملی جامہ پہنانے کا کام انجام دیتے تھے۔ قرآن کریم کی دیگر متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس حکمت کی لوگوں کو تعلیم بھی دیتے تھے قرآن کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض نبوت گنواتے ہوئے جا بجا کہا ہے وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (وہ لوگوں کو کتاب کی اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (وہ تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) کتاب کے بعد یہ حکمت کی تعلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے سوا اور کیا ہے یہ حکمت دراصل وہ علم و دانش اور وہ بصیرت و فراست ہے جو قرآن کے ساتھ ساتھ آپ پر وحی کی گئی اور جس کے ذریعے آپ نے زندگی کی راہوں میں صحیح اور غلط کا فرق واضح فرمایا جس کی مدد سے زندگی کے مسائل حل کیے اور جس کی روشنی میں آپ نے اخلاق و روحانیت، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور قانون و سیاست کی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔

حکمۃ کا صحیح مفہوم یہاں یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ حکمت کے لفظ سے بھی قرآن ہی مراد ہے اور الکتاب اور الحکمۃ کے درمیان جو واؤ

ہے وہ تفسیری ہے عطف کا نہیں۔ اس لیے کہ جو شخص عربی زبان کی معمولی سی شدبد بھی رکھتا ہے وہ بھی اتنی بات جانتا ہوگا کہ واؤ کو تفسیری صرف اسی صورت میں قرار دیا جاسکتا ہے جبکہ دو لفظ جن کے درمیان یہ حرف آیا ہو باہم مترادف المعنی ہوں یا قرینے سے یہ معلوم ہو رہا ہو کہ متکلم انہیں مترادف قرار دینا چاہتا ہے لیکن جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں واؤ کا استعمال یا تو دو الگ الگ چیزوں کو جمع کرنے کے لیے ہوگا یا عام کو خاص پر، یا خاص کو عام پر عطف کرنے کے لیے ہوگا ایسے مقامات پر واؤ کے تفسیری ہونے کا دعویٰ بالکل مہمل ہے۔ اب یہاں دیکھئے جہاں تک لغت کا تعلق ہے ظاہر ہے کتاب اور حکمت دو مترادف الفاظ نہیں ہیں دونوں کے معنی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں رہی قرآن کی بات تو وہ بھی حکمت کو کتاب کے ہم معنی قرار نہیں دیتا۔ قرآن نے جگہ جگہ حکمت کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن کہیں بھی اس کو کتاب کے معنی میں نہیں لیا۔ غور کیجئے سورۂ نحل میں ہے :

ادع الی سبیل ربك بالحکمۃ (نحل : ۱۲۵)	اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ دعوت دو۔

کیا آپ اس آیت کا یہ ترجمہ کریں گے کہ اپنے رب کے راستے کی طرف قرآن کے ساتھ دعوت دو۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں ہے :

ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً۔ (بقرہ : ۲۶۹)	جسے حکمت دی گئی اسے بڑی دولت دے دی گئی۔

ذرا بتلائیے کیا یہاں حکمت سے کتاب مراد لی جاسکتی ہے۔ سورۂ لقمان میں حکیم لقمان کے متعلق فرمایا گیا :

ولقد آتینا لقمٰن الحکمۃ (لقمٰن : ۱۲)	ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی۔

کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ حکیم لقمان کو اللہ تعالےٰ نے کتاب عطا کی تھی۔ دراصل قرآن میں کہیں بھی کتاب بول کر حکمت مُراد نہیں لی گئی اور حکمت بول کر کتاب مراد نہیں لی گئی۔ کتاب کا

لفظ جہاں کہیں بھی آیا ہے آیات الٰہی کے مجموعے کے لیے آیا ہے اور حکمت کا لفظ جہاں کہیں استعمال ہوا ہے اس دانائی اور فہم و بصیرت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس سے انسان حقائق کے سمجھنے اور فکر و عمل میں صحیح رویہ اختیار کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ چیز کتاب میں بھی ہو سکتی ہے، کتاب کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے اور کتاب کے باہر بھی۔ چنانچہ قرآن میں اللہ تعالےٰ نے جہاں کہیں قرآن یا کتاب کے لیے حکیم کی صفت استعمال کی ہے اس کے معنی یہ تو ضرور ہیں کہ کتاب کے اندر حکمت ہے مگر یہ معنی نہیں ہیں کہ کتاب خود حکمت ہے یا حکمت صرف کتاب میں ہے اور اس کے باہر کوئی حکمت نہیں ہے جیسا کہ منکرین حدیث مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

بنابریں وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ کا یہ مطلب لینا کسی طرح درست نہ ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف کتاب نازل کی گئی بلکہ اس کے صحیح معنی یہی ہوں گے کہ آپ پر کتاب کے ساتھ وہ دانائی بھی نازل کی گئی جس سے آپ اس کتاب کا منشاء ٹھیک ٹھیک سمجھیں اور انسانی زندگی میں اس کو بہترین طریقے سے نافذ کر کے دکھا دیں اسی طرح یعلمھم الکتٰبَ والحکمۃ کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ آپ صرف کتاب کے الفاظ پڑھوا دیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کو کتاب کا مطلب سمجھائیں اور انہیں اس دانشمندی کی تعلیم و تربیت دیں جس سے وہ دنیا کے نظام زندگی کو کتاب اللہ کے مطابق ڈھالنے کے قابل ہو جائیں۔

غرض کتاب کے ساتھ حکمت کے نزول کا ذکر اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن ہی کی شہادت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی۔ قرآن ہی کی ایک اور شہادت اس باب میں اس سے بھی زیادہ صریح ہے۔ قرآن نے ایک مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے کی تین صورتیں بتائی ہیں ان میں سے قرآن ہی ہمیں بتلاتا ہے کہ وہ صرف ایک قسم کی وحیوں پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے باقی دو صورتیں قرآن کے علاوہ ہیں۔

وحی کے نزول کی تین صورتیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے کی تین صورتوں کا ذکر سورۂ شوریٰ کی اس آیت میں کیا گیا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ (الشوریٰ: ۵۱)

کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے گفتگو کرے مگر (یا تو) وحی کے طریقے پر یا پردے کے پیچھے سے یا کسی قاصد (فرشتے) کو بھیج دے اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ اللہ چاہتا ہے۔

اس آیت کے مطابق وحی کی ایک صورت تو یہ تھی کہ براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں کوئی بات ڈال دی جاتی تھی۔ اس قسم کی وحی میں نہ فرشتے کا کوئی واسطہ ہوتا تھا اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت سامعہ اور حواس کا۔ اس میں کوئی آواز آپؐ کو سنائی نہیں دیتی تھی بلکہ بس ایک بات قلب میں جاگزیں ہو جاتی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے۔ وحی کی اس قسم کو 'وَحْيًا' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دُوسری قسم کی وحی کو 'أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے یعنی پردے کے پیچھے سے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ہم کلامی کا شرف عطا فرماتا تھا اس میں بھی کسی فرشتے کا واسطہ نہیں ہوتا تھا لیکن آپؐ کو آواز سنائی دیتی تھی۔ تیسری قسم کی وحی یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتے جبریل علیہ السلام کے ذریعے آپ تک اپنا پیغام پہنچاتا تھا۔

صرف ایک قسم کی وحی قرآن ہے

اب آپ قرآن ہی سے سنیے کہ وحی کی ان تینوں صورتوں میں سے صرف تیسری قسم کی وحیاں قرآن میں جمع کی گئی ہیں۔ سورۂ بقرۃ میں ہے:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ ... الخ (البقرۃ : ۹۷)	اے نبی کہہ دیجئے کہ جو کوئی دشمن ہو جبریل کا اس بنا پر کہ اس نے یہ قرآن اللہ کے حکم سے آپ کے قلب پر نازل کیا ہے......

بعض یہود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سن کر کہ قرآن جبریل علیہ السلام لے کر آتے ہیں یہ کہا کرتے تھے کہ ان سے تو ہماری عداوت ہے اگر میکائیل وحی لایا کرتے تو ہم مان لیتے ان کی رد فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ کوئی شخص اگر جبرئیل سے عداوت رکھتا ہے تو اس عداوت کو قرآن کے نہ ماننے میں کیا دخل۔ کیونکہ جبرئیل علیہ السلام تو سفیر محض ہیں سو سفارت کے طور پر انہوں نے یہ قرآن آپ کے قلب تک پہونچا دیا ہے۔ بہرحال اس آیت نے یہ بتلا دیا کہ قرآن جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے نازل کیا گیا ہے۔ یہی بات اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ سورہ شعراء میں کہی گئی ہے:

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۙ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۙ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ○ (الشعراء: ۱۹۵ - ۱۹۲)	اور بے شک یہ (قرآن) پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے اسے روح الامین نے آپ کے قلب پر اتارا ہے تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں صاف عربی زبان میں۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ کے الفاظ بتلا رہے ہیں کہ قرآن پورے کا پورا روح الامین یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ اتارا گیا ہے تو ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کیے جانے کی باقی دو صورتیں جن کا ذکر سورۂ شوریٰ میں کیا گیا ہے وہ قرآن کے علاوہ ہیں۔

عام انسانوں سے اللہ کی ہمکلامی اور وحی

یہاں یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ سورۂ شوریٰ والی آیت میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں بلکہ ہر بشر کے ساتھ اللہ کے ہم کلام ہونے کے طریقوں کا ذکر ہے منکرین حدیث اس آیت کی یہی توجیہ کرتے ہیں وہ کہتے ہیں اس آیت کے

پہلے دو حصوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کلام ہونے کے دو طریقوں کا ذکر ہے جبکہ آخری حصّے میں عام انسانوں سے بات کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ یہ بات اس لیے درست نہیں کہ اس آیت کے فوراً بعد اللہ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ بندے سے اللہ کی ہم کلامی کے متذکرہ تینوں طریقوں کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کیے جانے سے ہے۔ قرآن اٹھا کر دیکھ لیجئے اس آیت کے فوراً بعد ارشاد ربانی ہے:

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُورًا نَهْدِي بِهٖ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔ (شوریٰ: ۵۲)	اور اسی طرح (اے نبی) ہم نے تمہاری طرف وحی کی اپنے حکم کی رُوح تم کو پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے مگر ہم نے اس کو ایک نور بنا دیا جس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں رہنمائی کرتے ہیں اور یقیناً تم راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتے ہو۔

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ کے الفاظ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں۔ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اس آیت سے پہلے اللہ کی ہم کلامی کے جن تین طریقوں کا ذکر ہوا ہے ان تینوں کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کیے جانے سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا یہ رہا ہے کہ انہی تین طریقوں سے ہم نے اپنے فرمان کی روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ فرمان کی روح سے مراد وہ تمام ہدایات ہیں جو مذکورہ تینوں طریقوں سے آپؐ پر وحی کی گئی۔ یہاں روح کا لفظ دیکھ کر بلا سوچے سمجھے منکرین حدیث کہہ دیا کرتے ہیں کہ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا سے روح الامین یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں بھلا کوئی پوچھے کہ کیا جبرئیل علیہ السلام کی ذات بھی وحی کی جا سکتی ہے۔ اگر روح کے لفظ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہوتے تو أَوْحَيْنَا کے بجائے أَرْسَلْنَا کہا گیا ہوتا۔

اسی طرح اس آیت سے پہلے والی آیت کے آخری حصّے کو عام انسانوں سے اللہ کی ہمکلامی کے ساتھ مخصوص کرنا بھی قطعاً غلط ہے۔ منکرین حدیث کے خیال کے مطابق آیت کے آخری حصّے میں یہ بتایا گیا ہے کہ عام انسانوں سے اللہ کی ہمکلامی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان کی

طرف رسول بھیجتا ہے پھر اس رسول پر وحی نازل کرتا ہے اور اللہ کا رسول اس وحی کو عام انسانوں تک پہونچاتا ہے حالانکہ آیت کے الفاظ ہیں اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَاءُ (یا کسی قاصد کو بھیج دے اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے وہی کچھ جو اللہ چاہتا ہے) اس فقرے میں اگر "رسول" سے مراد فرشتے کے بجائے بشر رسول لیا جائے تو اس کے معنی یہ بن جائیں گے کہ رسول بھی عام انسانوں پر وحی کرتا ہے۔ کسی عجیب بات ہے وحی کے تو معنی ہی اشارۂ لطیف اور کلام خفی کے ہیں۔ یہ لفظ نہ تو لغت ہی کی رو سے اس تبلیغ کے لیے استعمال ہو سکتا ہے جو اللہ کا رسول علانیہ خلق خدا کے درمیان کرتا ہے اور نہ قرآن ہی میں کہیں اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے یہاں تو رسول کا لفظ صاف طور پر اس فرشتے کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ کے نبیوں اور رسولوں کی طرف وحی لانے کے کام پر مامور ہے یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام۔

قرآن کے علاوہ وحی کے نزول پر قرآنی شہادتیں

غرض قرآن کی ان آیات کی روشنی میں جو اس باب میں بالکل صریح ہیں کہ قرآن تمام تر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے نازل ہوا ہے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ قرآن صرف ایک قسم کی وحیوں پر مشتمل ہے۔ وحی کی باقی دو صورتیں جن کا ذکر سورۂ شوریٰ والی آیت میں کیا گیا ہے وہ قرآن کے علاوہ ہیں۔ ان دو صورتوں سے جو ہدایات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی جاتی تھیں ان کے بارے میں بھی شواہد خود قرآن ہی کے اندر موجود ہیں۔ مثلاً

(۱) ہر کوئی جانتا ہے کہ قرآن کریم جس ترتیب کے ساتھ اس وقت موجود ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس ترتیب سے نازل نہ ہوا تھا بلکہ ضرورت اور حالات کے مطابق نزول کی ترتیب اس سے مختلف تھی ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ کاتبین وحی کو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھی جائے گی چنانچہ وہ آپ کے بتائے ہوئے مقام پر درج ہو جاتی تھی اب قرآن کی اس تنزیلی ترتیب کو بدلنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی مرضی سے تو ممکن نہیں اس لیے کہ قرآن نے

واضح طور سے فرما دیا تھا :

قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (یونس : ۱۵)	جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کوئی کھٹکا نہیں ہے وہ کہنے لگتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس کو بدل دو آپ کہہ دیجئے مجھ سے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اسے اپنے جی سے بدل دوں میں تو بس اسی کی پیروی کروں گا جو میرے پاس وحی سے پہونچتا ہے ۔

معلوم ہوا قرآن کی نزولی ترتیب کی یہ تبدیلی وحی الٰہی کے مطابق تھی لیکن قرآن میں یہ وحی کہیں مذکور نہیں ہے ظاہر ہے یہ وحی قرآن کے علاوہ تھی ۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا (جب قرآن پڑھا جائے تو سنو۔ الاعراف ۲۰۴)
پڑھی وہ چیز جاتی ہے جو لکھی ہوئی ہو مگر قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اے نبی جب قرآن نازل ہوا کرے تو لکھ لیا کرو لہٰذا ثابت ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآنی آیات کو قید تحریر میں لانا وحی غیر قرآنی کے تحت تھا ۔

(۳) مسجد حرام کو قبلہ بنائے جانے سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے تقریباً سترہ مہینے تک بیت المقدس کو قبلہ بنائے رکھا ۔ تحویل قبلہ کا حکم دیتے وقت اللہ تعالیٰ نے اس بات کی توثیق فرمائی کہ بیت المقدس کا قبلہ بنایا جانا بھی ہمارے ہی حکم سے تھا جیسا کہ ارشاد ہے :

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰي عَقِبَيْهِ (بقرۃ : ۱۴۳)	اور جس قبلے پر آپ (اب تک) تھے اسے تو ہم نے اسی لیے رکھا تھا کہ ہم پہچان لیں رسول کا اتباع کرنے والوں کو الٹے پاؤں واپس جانے والوں میں سے ۔

جب بیت المقدس کا قبلہ بنایا جانا وحی الٰہی کے تحت تھا تو قرآن تو اس حکم سے بالکل ساکت ہے سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نہیں آتی تھی تو یہ قبلے کا حکم آپؐ کو کس ذریعے سے ملا - کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ احکام ایسے بھی ملتے تھے جو قرآن کے علاوہ ہوتے تھے - یہ آیت جہاں اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی وہاں یہی آیت پوری صراحت کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان احکام کا اتباع کرنے پر بھی مامور ہیں جو قرآن میں مذکور نہ ہوں کیوں کہ اللہ تعالےٰ کا یہ فرمانا کہ ہم نے یہ قبلہ مقرر ہی اس لیے کیا تھا کہ ہم دیکھیں کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے منہ موڑتا ہے اسی بات پر دلالت کر رہا ہے گویا اللہ تعالیٰ کے یہاں مسلمانوں کے ایمان بالرسالۃ کی آزمائش ہی اس طریقہ سے ہوتی ہے کہ رسول کے ذریعے سے جو حکم بھی دیا جائے اس کے بارے میں دیکھا جائے کہ وہ اسے بے چون و چرا تسلیم کرتے ہیں یا نہیں -

(۴) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی کو ایک راز کی بات بتائی انہوں نے اس راز کی بات کا دوسروں سے ذکر کر دیا - آپؐ نے باز پرس فرمائی تو وہ پوچھنے لگیں کہ آپؐ کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ میں نے یہ بات دوسروں سے کہہ دی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے - قرآن اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِہٖ وَ اَظْہَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَھَا بِہٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَکَ ھٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ	اور جب نبی نے ایک بات اپنی کسی بیوی سے چپکے سے فرمائی پھر جب ان بیوی نے وہ بات (کسی اور کو) بتلا دی اور اللہ نے نبی کو اس کی خبر کر دی تو نبی نے اس کا کچھ حصہ بتلا دیا اور کچھ کو ٹال گئے پھر جب نبی نے ان بیوی کو وہ بات جتلائی تو وہ بولیں آپ کو کس نے خبر دی آپ نے کہا مجھے علیم و خبیر

الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ۔ (التحریم : ۳)	خدا نے بتایا۔

اس آیت میں وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ (اور اللہ نے نبی کو اس کی خبر کردی) کے الفاظ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں اللہ تعالٰی نے بذریعہ وحی اس ساری کارروائی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کر دیا تھا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ (آپ نے کہا مجھے علیم و خبیر خدا نے بتایا) کے الفاظ بھی اسی پر دلالت کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ وحی کے ذریعے ہی آپؐ کو معلوم ہوا۔ اب بتلایئے قرآن میں وہ آیت کہاں ہے جس کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ آپؐ کی بیوی نے آپؐ کی راز کی بات دوسروں سے کہہ دی ہے اگر قرآن کریم میں یہ آیت موجود نہیں ہے تو اس کے علاوہ آپ اور کیا کہیں گے کہ یہ وحی قرآن کے علاوہ تھی۔

(۵) سورۂ حشر کی ایک آیت ہے:

مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (الحشر : ۵)	کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹے اور جو کھڑے رہنے دیئے یہ دونوں کام اللہ کی اجازت سے تھے۔

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے قبیلے بنی نضیر کی مسلسل بدعہدیوں سے تنگ آکر جب مدینے سے متصل ان کی بستیوں پر چڑھائی کردی تو دورانِ محاصرہ اسلامی فوج نے گرد و پیش کے باغات کے بہت سے درخت کاٹ ڈالے تاکہ حملہ کرنے کے لیے راستہ صاف ہو جائے اس پر مخالفین نے شور مچا دیا کہ باغوں کو اجاڑ کر اور ہرے بھرے پھل دار درختوں کو کاٹ کر مسلمانوں نے فساد فی الارض بپا کیا ہے۔ مخالفین کے اس بے جا شور و غوغا کا جواب دینے کے لیے قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی جس میں بتلایا گیا کہ اسلامی فوج نے جو کچھ کیا ہے اللہ کی اجازت سے کیا ہے۔ اب ذرا بتلایئے کہ اللہ کی یہ اجازت قرآن کی کس آیت میں ہے۔ اگر یہ اجازت قرآن میں نہیں دکھلائی

جا سکتی تو معلوم ہوا یہ اجازت اس وحی کے ذریعے تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ اترنی تھی۔

(۶) سورۂ انفال جیسا کہ معلوم ہے جنگِ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے اس سورت میں پوری جنگِ بدر پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس تبصرے کا آغاز کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ وَیُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ۔ (انفال : ۷)	اور جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا دو جماعتوں میں سے ایک کے لیے کہ وہ تمہارے ہاتھ آجائیں گی اور تم چاہ رہے تھے کہ غیر مسلم جماعت تمہارے ہاتھ آجائے ورنہ اغالیکہ اللہ کو منظور یہ تھا کہ حق کا حق ہونا ثابت کردے اپنے احکام سے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

یہ آیت بتلا رہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مسلمانوں کو لیکر مدینے سے نکلے تو اللہ تعالےٰ نے بذریعہ وحی آپؐ کو یہ بتلا دیا تھا کہ قریش کے تجارتی قافلے اور مشرکین مکہ کے لشکر ان دونوں جماعتوں میں سے ایک جماعت مسلمانوں کے ہاتھ آجائے گی۔ اب پورے قرآن شریف میں اس آیت کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جس میں اللہ کے اس وعدے کا ذکر ہو ظاہر ہے۔ یہ وعدہ وحی غیر قرآن کے ذریعے کیا گیا تھا۔

(۷) قرآن میں نماز سے پہلے اذان دیے جانے کا ذکر آیا ہے مثلاً سورۂ مائدہ میں ہے:

وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّلَعِبًا۔ (مائدہ : ۵۸)	اور جب تم نماز کی طرف (بلانے کے لیے) اذان دیتے ہو تو وہ (مشرکین) اسے کھیل کود بنا لیتے ہیں۔

اسی طرح سورۂ جمعہ میں ہے:

إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۔ (الجمعۃ : ۹)	جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔

ان دونوں آیتوں میں نماز جمعہ اور عام نمازوں سے پہلے اذان دئیے جاتے کا ذکر ایک رائج شدہ نظام کی حیثیت سے کیا گیا ہے لیکن ہمیں قرآن میں وہ آیت کہیں نہیں ملتی جس میں حکم دیا گیا ہو کہ نماز کے لیے اذان دیا کرو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ یہ حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وحی کے ذریعے دیا گیا تھا جو قرآن کے علاوہ تھی۔

(۸) قرآن صلوٰۃ خوف کا ذکر کرتے ہوئے جہاں یہ کہتا ہے کہ اگر عام قاعدے کے مطابق نماز با جماعت ادا کرنے میں کسی دشمن کی طرف سے خوف ہو تو نماز جس طرح بھی ممکن ہو سکے پڑھ لو خواہ پیادہ پا ہو کر خواہ سواری کی حالت میں تو اس کے فوراً بعد کہتا ہے:

فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ (البقرۃ : ۲۳۹)	پھر جب تم امن میں آجاؤ تو اللہ کو یاد کرو (یعنی نماز پڑھو) جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے۔

نماز کی یہ تعلیم کیا کوئی بتا سکتا ہے اللہ نے قرآن کی کس آیت میں دی ہے۔ اگر قرآن میں یہ تعلیم موجود نہیں ہے تو پھر یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان کیا ہوا اور سکھلایا ہوا نماز کا طریقہ اللہ نے آپؐ کو اس وحی کے ذریعے تعلیم فرمایا تھا جو قرآن کے علاوہ تھی۔

بہر حال یہ چند آیات مثال کے طور پر پیش کر دی گئی ہیں اسی قسم کی اور متعدد آیات اس بارے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ تمام آیاتِ قرآنی اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی اور جب یہ بات ثابت ہو گئی تو پھر ایک قسم کی وحی کو قابل اطاعت سمجھنا اور دوسری قسم کی وحی سے انکار کر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

وحی پر ہمارے ایمان کی اصل بنیاد

معاملہ وحی قرآنی کا ہو یا غیر قرآنی کا اس سلسلے میں سب سے اہم بات غور

کرنے کی یہ ہے کہ وحی پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت و اتباع کرنے کی اصل بنیاد کیا ہے۔ وحی خواہ کسی نوعیت کی بھی ہو سوال یہ ہے کہ کیا وہ ہمارے پاس براہِ راست آئی ہے کہ ہم از خود اس کے منزل من اللہ ہونے یا نہ ہونے کو معلوم کر سکیں ظاہر ہے ایسا نہیں ہے وحی ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ ہدایت میرے پاس خدا کی طرف سے آئی ہے گویا ہم وحی کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان لانے سے پہلے رسول کے مرسل من اللہ ہونے پر ایمان لاتے ہیں پھر اس کے بیان پر اعتماد کرکے اس پر اترنے والی وحی کو اللہ کی بھیجی ہوئی وحی مانتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ہمارے ایمان کی وجہ قرآن نہیں ہے بلکہ قرآن پر ہمارے ایمان کی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان ہے۔ یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی بھی معقول آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ جب یہ بات ہے تو ذرا سوچئے کہ جس رسولؐ کے اعتماد پر ہم نے قرآن کو وحی مانا ہے وہی رسولؐ اگر ہمیں یہ بتلائے کہ قرآن کے علاوہ بھی مجھ پر وحی آتی ہے اور مجھے قرآن کے علاوہ بھی ہدایات و احکام ملتے ہیں تو اس کی تصدیق نہ کرنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تنبیہ کے انداز میں ارشاد فرمایا ہے:

أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ (ابوداؤد)	خبردار رہو کہ مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اس کا مثل بھی (دیا گیا)۔

پھر قرآن ہی کی طرح اس مثل کا بھی واجب الاطاعت ہونا واضح کرتے ہوئے فرمایا:

وَإِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُولُ اللّٰهِ كَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)	جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا وہ (اطاعت میں) ایسا ہی ہے جیسا اللہ نے حرام کیا۔

ایک اور موقع پر اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ تبلایا کہ میں قرآن کے علاوہ بھی تمہیں احکام سناتا ہوں اور تم پر اس کی اطاعت بھی اسی طرح واجب ہے جس طرح قرآن میں دیئے جانے والے احکام کی۔ ارشاد ہے:

اَلَا وَاِنِّیْ وَاللّٰہِ قَدْ اَمَرْتُ وَوَعَظْتُ وَنَھَیْتُ عَنْ اَشْیَاءَ اِنَّھَا لَمِثْلُ الْقُرْاٰنِ اَوْ اَکْثَرَ (ابو داؤد)	خبردار قسم ہے اللہ کی میں نے تمہیں حکم دیا ہے نصیحت کی ہے اور روکا ہے بہت سی چیزوں کے بارے میں۔ یہ چیزیں بقدر قرآن کے ہیں بلکہ اس سے زائد بھی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محولہ بالا ارشادات کو سامنے رکھ کر سوچیئے کہ جب اللہ کا رسول خود تبلا رہا ہے کہ قرآن کے علاوہ بھی اس پر وحی آتی ہے تو آخر اس پر اتاری جانے والی ایک وحی اور دوسری وحی میں فرق کس بنا پر۔ جب ایمان بالرسالۃ ہی وحی پر ہمارے ایمان کی اصل بنیاد ہے تو اطاعت کرنے والے کے لیے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ رسولؐ نے خدا کا ایک حکم قرآن کی کسی آیت کی شکل میں ہمیں پہونچایا ہے یا اپنے فرمان یا عمل کی شکل میں۔ اطاعت کرنے والے کے لیے تو دونوں وحیاں اس حیثیت سے واجب الاتباع ہیں کہ وہ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ۔ (اعراف: ۳)۔	جو کچھ تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو۔

"جو کچھ بھی نازل کیا گیا ہے" کے الفاظ دیکھ لیجئے اپنے مفہوم میں کس قدر واضح ہیں یعنی وہ تمام تعلیمات و ہدایات جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہیں خواہ وہ آیات قرآنی کی صورت میں ہوں یا کسی اور صورت میں وہ سب کی سب واجب الاتباع ہیں۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار ہا کتاب اللہ اور اپنی سنت کو علیحدہ علیحدہ بیان کر کے دونوں کی اطاعت کا حکم دیا۔ حضرت مالک بن انس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُولِهِ (موطا امام مالک)۔

میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں جب تک انہیں تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے۔

اس حدیث کو بیہقی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ ہی سے ایک اور روایت امام بخاری بھی لائے ہیں اس میں سنت سے انکار کرنے والے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت سے محرومی کی وعید سنائی ہے ارشاد نبوی ہے:

كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى قِيلَ وَمَنْ أَبَى قَالَ مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى (بخاری)

انکار کرنے والے کے سوا میری امت میں سے ہر شخص جنت میں جائے گا پوچھا گیا کہ انکار کرنے والا کون ہے آپؐ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔

ایک اور موقعہ پر آپؐ نے اختلاف کے موقعہ پر اپنی سنت اور اپنے صحابہ کے طریقے پر جمے رہنے کی بڑے ہی پر تاثیر انداز میں تاکید فرمائی چنانچہ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی پھر اس کے بعد ایسا اثر انگیز وعظ کہا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہنے لگے اور دل لرزنے لگے صحابہ نے عرض کیا حضور یہ تو آخری وعظ معلوم ہوتا ہے کچھ وصیت فرما دیجئے آپ نے فرمایا میں تمہیں اللہ سے ڈرتے رہنے اور سمع و طاعت پر جمے رہنے کی وصیت کرتا ہوں خواہ میرے بعد تمہارا امیر حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو میرے بعد جس کو جینا نصیب ہوا وہ بڑا اختلاف دیکھے گا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا:

فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۸۲)

تم پر واجب ہے کہ میری سنت کو اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم پکڑو انہی پر بھروسا کرو اور انہی کو مضبوط پکڑے رہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ان واضح ارشادات کے بعد بھی جو شخص آپؐ کی سنت کے واجب الاتباع ہونے سے انکار کرتا ہے وہ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار کرتا ہے:

صحابہؓ کے درمیان حدیث کی تشریعی حیثیت

حدیث رسول کی تشریعی حیثیت پر غور کرتے وقت ایک اور مسلّمہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیئے۔ وہ یہ کہ ہر مذہب کا بہترین زمانہ وہ ہوتا ہے جو صاحب مذہب سے قریب ہو جیسا اس زمانہ کے لوگ صاحب مذہب کی مُراد کو درست طور پر سمجھ سکتے ہیں زمانۂ بعید کے آدمی نہیں سمجھ سکتے۔ ہندوؤں سے پوچھئے ان کے مذہب کا بہترین زمانہ وہ تھا جو بیاسؔ اور اس کے شاگردوں کا تھا بیاس کے اقوال کو جتنا اس کے شاگرد سمجھتے تھے دوسرا کوئی نہ سمجھتا تھا یہودیوں سے استفسار کیجئے وہ اصحاب موسیٰ کو حضرت موسیٰ کی لائی ہوئی آسمانی تعلیمات و ہدایات کا بہتر طور پر سمجھنے والا قرار دیں گے۔ عیسائیوں سے سوال کیجئے وہ حضرت عیسیٰ کے حواریین کو انجیل کا صحیح سمجھنے والا اور حضرت مسیح کی صحیح پیروی کرنے والا بتائیں گے غرض ہر مذہب کا بہترین زمانہ اس کا ابتدائی زمانہ ہوتا ہے۔ مذہبی احکام کی جو تعبیر اس زمانے کے لوگوں میں مستند قرار پا جائے وہی تعبیر صحیح اور درست مانی جاتی ہے اس مسلّمہ حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اوّلین مخاطبین یعنی صحابہ کرام کے درمیان حدیث تشریعی حیثیت کی حامل تھی یا نہیں۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم تاریخی مواد کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ صحابۂ کرام کے درمیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہمیشہ تشریعی حیثیت کی حامل رہیں۔

صحابۂ کرام کے دَور میں حدیث کی تشریعی حیثیت کا مسلّم ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس پر گفتگو کرنا بدیہی کو نظری بنانا ہے۔ کتبِ احادیث اٹھا کر دیکھئے شریعت کے کسی ایک باب میں نہیں بلکہ قتال، حج، جنایت، بیع، وراثت، عدت، مزارعت غرضیکہ شریعت کے تقریباً تمام ابواب میں ایسی حدیثیں ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا

ہے کہ صحابہ کے درمیان حدیث تشریعی حیثیت کی حامل تھی۔ حضرت ابوبکرؓ سے لے کر حضرت عثمان اور حضرت علی کی خلافت تک بلکہ اس کے بعد بھی ہر دور میں حلال و حرام کے مسائل میں ہمیشہ حدیثیں ہی پیش کی جاتی رہیں اور ہر نزاع و اختلاف کے مواقع پر سب نے احادیث ہی کو فیصل تسلیم کیا۔ ہم یہاں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند واقعات پیش کرتے ہیں جن سے ہمارے دعوے کی سچائی روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلا اختلاف صحابۂ کرام کے درمیان آپؐ کے دفن کے متعلق ہوا۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ اس اختلاف کا فیصلہ ایک حدیث ہی کی بنیاد پر ہوا جو اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے سنائی تھی آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس جگہ اللہ کے نبی کی روح قبض ہوتی ہے اسی جگہ اس کو دفن کیا جاتا ہے۔ (موطا و ابن ماجہ)

(۲) اسی طرح سقیفۂ بنی ساعدہ میں خلافت کے مسئلے پر جب جنگ کا سا سماں تھا تو ایک صحابی حضرت بشیر انصاری کی زبان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک أَلأئمة من قريش کے الفاظ نکلنے کی دیر تھی ہر طرف سناٹا چھا گیا اور ہر ایک کا سر اطاعت کے لیے جھکا ہوا نظر آنے لگا۔ (مسند دارمی)

(۳) حضرت ابوبکر صدیق کے پاس ایک عورت آئی اور اپنے پوتے کے ترکے میں سے حصہ ملنے کی دعویدار ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا میں تیرا حصہ کتاب اللہ میں نہیں پاتا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو حصہ دلوایا ہے فرمایا تمہارے اس قول پر کوئی شاہد ہے محمد بن مسلمہ بولے میں شہادت دیتا ہوں آپ نے دادی کے حق میں فیصلہ دے دیا اور اس کو چھٹا حصہ دلوا دیا۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص۳)

(۴) حضرت عمر کی یہ رائے تھی کہ بیوی کو شوہر کی دیت کی رقم میں سے وراثت نہیں ملنی چاہئے لیکن جب حضرت ضحاک بن سفیان نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اشیم الضباری کی بیوی کو شوہر کی دیت دلوائی تھی تو حضرت عمرؓ نے فوراً اپنے قول سے رجوع فرما لیا۔ (ابو داؤد نیز الرسالہ للامام الشافعی ص۴۲۶)

(۵) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کہ کیا کسی شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ سنا ہے کہ اگر جھگڑے میں کسی عورت کا حمل ساقط ہو جائے تو اس کی جزا کیا دینی چاہیئے۔ یہ سن کر حمل بن مالک کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ ایک مرتبہ میری دو لونڈیوں میں لڑائی ہو گئی ایک نے دوسرے کے کدال دے ماری جس کے صدمے سے دوسری لونڈی کا حمل ساقط ہو گیا مقدمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا آپؐ نے اس پر ایک لونڈی یا غلام بطور دیت لازم فرمائے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر ہم یہ حدیث نہ سنتے اور اپنی رائے سے فیصلہ کرتے تو شاید اس کے خلاف فیصلہ دیتے۔ (الرسالہ ص۴۲۷)

(۶) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک بار عدت سے متعلق ایک معاملہ فیصلہ طلب تھا آپ نے حضرت فریعہ بنت مالک بن سنان کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سلسلے میں کیا حکم دیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ آپؐ نے اسی گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا تھا جس میں وہ اس وقت رہائش پذیر تھیں تو حضرت عثمانؓ نے اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیا۔ (جامع بیان العلم جلد ۲)

(۷) حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہ کے درمیان طویل جنگ کے دوران دونوں طرف سے اپنی اپنی حمایت کے لیے حدیثیں ہی پڑھی گئیں۔ تمام تر اختلافات کے باوجود کسی طرف سے بھی یہ آواز کبھی نہیں اٹھی کہ احادیث تو قابل استناد ہی نہیں ان سے دلیل کیوں پکڑتے ہو۔

(۸) حضرت عبداللہ بن عمر مزارعت میں مخابرہ کے قائل تھے اور چنانچہ خود مخابرہ کیا کرتے تھے لیکن جب حضرت رافع بن خدیجؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ممانعت روایت کی تو آپ نے مخابرہ کرنا چھوڑ دیا اور اپنے

قول سے رجوع کر لیا۔ (جامع بیان العلم جلد ۲)

(۹) حضرت عبداللہ ابن عباس نے ایک مرتبہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا ہے یہ سُن کر حضرت عروہؓ کے مُنہ سے نکل گیا کہ شیخین تو تمتع کی ممانعت کرتے تھے اس پر حضرت عبداللہ بن عباس کو غصہ آگیا اور فرمایا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تم ابوبکر و عمر کا نام لیتے ہو میرا گمان ہے ان باتوں سے تباہی آئے گی (ترجمان السنۃ از مولانا بدر عالم)

(۱۰) حضرت زید حائضہ کے لیے بھی طواف صدر کرنا واجب سمجھتے تھے لیکن جب حضرت عبداللہ بن عباس نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حائضہ کو طواف صدر ترک کرنے کی اجازت دی ہے تو حضرت زید نے فوراً اپنے قول سے رجوع کر لیا۔ (ترجمان السنۃ)

یہ چند واقعات نمونے کے طور پر پیش کر دیے گئے ہیں ورنہ اگر آثار صحابہ میں سے اس قسم کے واقعات تلاش کیے جائیں تو مستقل ایک تصنیف بن سکتی ہے بہرحال یہ چند واقعات بھی اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ صحابہ کرام کے درمیان حدیث کی تشریعی حیثیت کو ایک عقیدے کا درجہ حاصل تھا۔ اس کے بعد جو شخص حدیث کی تشریعی حیثیت کا انکار کرتا ہے وہ ایسی بات کہہ رہا ہے جس کو ان حضرات کی سند حاصل نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوّلین مخاطب تھے اور آپؐ سے انتہائی قریب ہونے کی بنا پر آپؐ کی لائی ہوئی ہدایت کے اصل مرتبہ و مقام کو درست طور پر سمجھنے کے سب سے زیادہ اہل تھے۔

عہدِ رسالت کے فیصلوں میں ردّ و بدل کا الزام

اس موقعے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات و اعتراضات کا بھی جائزہ لے لیا جائے جن کو بڑے شدومد کے ساتھ پیش کر کے منکرین حدیث یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلوں کو تغیرِ حالات کے مطابق قابلِ ترمیم سمجھتے تھے

اور یہ بات ان کے نزدیک اس بات کا ثبوت ہے کہ صحابۂ کرام کے درمیان حدیث کو تشریعی حیثیت حاصل نہ تھی۔

اس سلسلے میں اپنی مقصد برآری کے لیے منکرین حدیث نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور کو اصل تختۂ مشق بنایا ہے۔ حجیت حدیث کے بارے میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے اصل طرزِ عمل پر ہم نے اس کتاب کے پہلے حصے میں اس مقام پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے جہاں منکرین حدیث کے اس بے بنیاد الزام کا رد کیا گیا ہے کہ معاذ اللہ یہ دونوں حضرات انکار حدیث کے قائل تھے۔ قارئین اس بحث پر دوبارہ نظر ڈال لیں یہاں ہم صرف ان واقعات کا ذکر کرنے لگے ہیں جن سے بے سروپا غلط نتائج اخذ کر کے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ صحابۂ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلوں میں ترمیم و تبدل کو جائز سمجھتے تھے:

جیش اسامہ کی روانگی

اس ضمن میں جو واقعات منکرین حدیث کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جیش اسامہ کو شام کی طرف بھیجے جانے کے موقعہ پر بعض صحابۂ کرام کے اس اصرار کا ذکر ہے کہ ان خطرات کے پیش نظر جن کا طوفان اس وقت عرب میں اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا اس لشکر کشی کو ملتوی کر دیا جائے اور اس اصرار کے جواب میں حضرت ابوبکرؓ نے کہا تھا کہ جس کام کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں کر چکے تھے اسے بدل دینے کا میں کسی طرح مجاز نہیں۔ اس واقعہ کو پیش کر کے منکرین حدیث کہتے ہیں کہ اس لشکر کشی کے التوا پر صحابہ کا اصرار یہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے سوا باقی تمام صحابہ اس بات کو جائز سمجھتے تھے کہ حالات کے تغیر کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلے کو بدلا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس واقعے میں جب یہ ذکر آتا ہے کہ آخر میں حضرت عمرؓ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ کم از کم اسامہؓ کو ہی اس لشکر کی قیادت سے ہٹا دیں کیونکہ بڑے بڑے

صحابہ اس نوجوان لڑکے کی ماتحتی میں رہنے سے خوش نہیں ہیں تو منکرین حدیث اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ تک اس بات کے قائل تھے کہ حالات کے بدلنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے بدلے جا سکتے ہیں بلکہ اس موقعے پر تو تغیر حالات کا بھی سوال نہیں تھا حضرت عمرؓ اس سالار لشکر کو جس کو اللہ کے رسول نے اپنی زندگی میں مقرر کیا تھا صرف اس لیے بدلنا چاہتے تھے کہ صحابہ اس سے خوش نہیں تھے۔

اس واقعہ سے منکرین حدیث جو غلط نتیجہ اخذ کرتے ہیں اس کا بے بنیاد ہونا تو ایسی ثابت ہوا جاتا ہے مگر اس بحث و تحیص کے دوران اللہ نے ایک حق بات انہی کے منہ سے نکلوا دی کم از کم حضرت ابو بکرؓ کے بارے میں تو انہوں نے تسلیم کر لیا کہ وہ حجیت حدیث کے قائل تھے اور کسی صورت میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلے کو بدل دینے کا کسی کو مجاز نہ سمجھتے تھے رہا دوسرے صحابہ کرام کا سوال تو ان کے متذکرہ بالا اصرار سے وہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا جو منکرین حدیث نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ صورتِ حال یہ نہ تھی کہ حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلے کو بدلنے سے انکار کر رہے ہوں اور صحابہ اس پر مصر ہوں کہ از روئے شرع تو آپ اس فیصلے پر عمل کرنے کے پابند نہیں ہیں اس لیے بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر آپ اس فیصلے کو بدل دیجیے بلکہ اس کے برعکس وہاں تو معاملہ یہ تھا کہ لشکر کشی کے التوا پر یہ اصرار اور تبدیلی قیادت کی خواہش کا یہ اظہار صرف اسی وقت تک تھا جب تک حضرت ابو بکرؓ نے رسول اللہ کے فیصلے کا حوالہ نہیں دیا تھا جونہی حضرت ابو بکرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کا حوالہ دیا سب کے سر اظہار اطاعت میں جھکے نظر آنے لگے حضرت عمرؓ سمیت کسی نے بھی اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا جیش اسامہ روانہ ہوا، اسامہ ہی اس کے قائد رہے اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ نے ان کی قیادت کو راضی خوشی قبول کر لیا ؛

طلاق ثلاثہ کے مسئلے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ

دوسرا واقعہ جس سے منکرین حدیث استدلال کرتے ہیں یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک شمار کر کے طلاق رجعی قرار دیا جاتا تھا حضرت عمر نے اپنے زمانے میں اسے تین ہی شمار کر کے طلاق مغلّظہ مثلّثہ قرار دے دیا۔ منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کا یہ فیصلہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کا حالات کے مطابق بدل دینا درست جانتے تھے۔

منکرین حدیث کا یہ استدلال بھی کسی طرح درست نہیں اس لیے کہ اس معاملے میں اصل صورت حال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی تین طلاق تین ہی سمجھی جاتی تھیں چنانچہ احادیث شاہد ہیں متعدد مقدمات میں آپؐ نے ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کر کے فیصلہ دیا ہے لیکن ہوتا یہ تھا کہ جو شخص تین مرتبہ طلاق کا الگ الگ تلفظ کرتا تھا وہ اگر یہ عذر پیش کرتا کہ اس کی نیت ایک ہی طلاق کی تھی اور باقی دو مرتبہ اس نے طلاق کا لفظ محض تاکید کے طور پر کہا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا یہ عذر قبول فرما لیتے تھے۔ حضرت عمر نے اپنے زمانے میں اس سلسلے میں جو کچھ کیا وہ صرف اتنا ہے کہ جب لوگ کثرت سے تین طلاقیں دے کر ایک طلاق کی نیت کا عذر پیش کرنے لگے تو انہوں نے طلاق کے معاملے کو کھیل بنائے جانے سے بچانے کی خاطر یہ اعلان کر دیا کہ اب یہ عذر قبول نہیں کیا جائے گا اور تین طلاقیں دینے کی صورت میں تین ہی طلاقیں نافذ العمل سمجھی جائیں گی اس کو تمام صحابہ نے بالاتفاق قبول کر لیا ظاہر ہے حضرت عمر کا یہ فیصلہ عہد رسالت کے کسی قانون میں ترمیم کی حیثیت کا حامل نہ تھا اس لیے کہ نیت کے عذر کو قبول کرنا قانون نہیں ہے اس کا انحصار تو قاضی کی اس رائے پر ہے کہ وہ نیت بیان کرنے والے کو صادق القول سمجھتا ہے یا نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس طرح کا عذر پیش کرنے والے جانے پہچانے چند گنے چنے لوگ تھے جن کی راستبازی اوّل تو

یوں بھی آپؐ کے نزدیک بے گرد و غبار ہو گی دوسرا نہ روئے وحی بھی ان لوگوں کی راست بازی سے آپؐ کے واقف ہو جانے میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عذر قبول کر لیا۔ لیکن حضرت عمر کے زمانے میں ایران سے مصر تک اور یمن سے شام تک پھیلی ہوئی سلطنت کے ہر شخص کا یہ عذر عدالتوں میں لازماً قابل تسلیم نہ ہو سکتا تھا بالخصوص جبکہ لوگوں نے بکثرت تین طلاق دے کر ایک طلاق کی نیت کا عذر پیش کرنا اپنا وتیرہ بنا لیا ہو اس لیے اس مسئلے میں حضرت عمر کے فیصلے کی نوعیت یہ نہ تھی کہ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے کسی فیصلے یا آپؐ کے بنائے ہوئے کسی قانون میں کوئی تغیر و تبدل کر دیا تھا بلکہ اصل نوعیت یہ تھی کہ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ ایک قانون کی اصل روح کو برقرار رکھنے کا انتظام فرمایا تھا۔

مفتوحہ اراضی کی تقسیم

اسی ضمن میں ایک اور مثال دیتے ہوئے منکرین حدیث یہ بھی کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تھیں لیکن حضرت عمر نے اپنے عہد میں مفتوحہ زمینوں کی یہ تقسیم بند کر دی اور اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے ہٹ کر اپنی صوابدید کے مطابق ایک نیا طرز عمل اختیار کر کے یہ جتلا دیا کہ تغیر حالات کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں سے ہٹ کر بھی ایک نیا فیصلہ روبہ عمل لایا جا سکتا ہے۔

یہاں بھی منکرین حدیث نے بے بنیاد مغالطہ دینے کی کوشش ہے حضرت عمر نے اپنے عہد میں صحابہ کے مشورے سے مفتوحہ اراضی کا جو بندوبست کیا اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں ردّ و بدل کی مثال نہیں قرار دیا جا سکتا اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کبھی نہیں فرمایا تھا کہ مفتوحہ اراضی ہمیشہ مجاہدین میں تقسیم کی جاتی رہیں اگر ایسا کوئی حکم آپؐ نے دیا ہوتا اور حضرت عمر نے اپنے عہد میں اسکے خلاف عمل کیا ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے میں

رد و بدل کر دیا یا پھر یہ بات اس وقت صادق آسکتی تھی جبکہ حضرت عمر نے ان زمینوں کو جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں مجاہدین میں تقسیم کیا تھا ان سے واپس لے لیا ہوتا ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بھی پیش نہیں آئی تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے سے ہٹ کر ایک نیا فیصلہ صادر کر دیا۔ اس معاملے میں اصل صورت حال یہ ہے کہ مفتوحہ زمینوں کو لازماً مجاہدین میں تقسیم کر دینا سرے سے کوئی اسلامی قانون تھا ہی نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مفتوحہ اراضی کے معاملے میں حسب موقع وضرورت مختلف مواقع پر مختلف فیصلے فرمائے تھے۔ بنونظیر، بنو قریظہ، خیبر، فدک، وادی القریٰ، مکہ اور طائف کی مفتوحہ زمینوں میں سے ہر ایک کا بندوبست عہد رسالت میں الگ الگ طریقوں سے کیا گیا تھا۔ ایسا کوئی ضابطہ یا قانون نہیں بنایا گیا تھا کہ آئندہ مفتوحہ اراضی کا بندوبست لازماً فلاں فلاں طریقے پر کیا جائے ایسی صورت میں حضرت عمر کا اپنے زمانے میں مفتوحہ اراضی کا کوئی بھی بندوبست عہد رسالت کے کسی ضابطے یا قانون کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مؤلفۃ القلوب اور حضرت عمرؓ کا استدلال

منکرین حدیث اپنے دعوے کے ثبوت میں بلا سوچے سمجھے مؤلفۃ القلوب، کے مسئلے کو بھی زیر بحث لاتے ہیں کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مؤلفۃ القلوب کو صدقات کی مد سے امداد دی جاتی تھی حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اسے ختم کر دیا معلوم ہوا حضرت عمرؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں رد و بدل کو جائز سمجھتے تھے۔

یہاں اعتراض کرنے کے جوش میں منکرین حدیث یہ بھی بھول گئے کہ صدقات کی مد میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا تھا۔ ذرا سورۃ توبہ کی وہ آیت دوبارہ نکال کر دیکھ لیجئے جس میں صدقات کی آٹھ مدات کا بیان ہوا ہے غور سے دیکھئے اس میں مؤلفۃ القلوب کی مد شامل

ہے یا نہیں کیا اب منکرین حدیث یہ کہیں گے کہ حضرت عمرؓ معاذ اللہ قرآن کے فیصلوں کو بھی حسب ضرورت تبدیل کر دینے کے قائل تھے اگر منکرین حدیث نے تھوڑا سا غور و فکر سے کام لے لیا ہوتا تو مؤلفۃ القلوب کے مفہوم ہی پر غور کر لیا ہوتا۔ صدقات کی مد میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ شامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ صدقات میں سے ان لوگوں کو بھی مال دیا جا سکتا ہے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو حضرت عمرؓ کا استدلال یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلامی حکومت کو تالیفِ قلب کے لیے مال دینے کی ضرورت تھی اس لیے آپؐ اس مد سے لوگوں کو دیا کرتے تھے لیکن اب اسلامی حکومت اتنی طاقتور ہو گئی ہے کہ اس غرض کے لیے اب کسی کو مال دینے کی حاجت نہیں رہی اس لیے اب ہم اس مد میں کوئی پیسہ خرچ نہیں کریں گے۔ اب غور کر کے بتائیے کیا اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ہوا کوئی فیصلہ بدل ڈالا کیا واقعی آپؐ کا فیصلہ یہی تھا کہ تالیفِ قلب کی حاجت ہو یا نہ ہو بہر حال کچھ لوگوں کو ضرور مؤلفۃ القلوب قرار دیا جائے اور صدقات میں سے ہمیشہ ہمیشہ ان کا حصہ نکالا جاتا رہے۔ کیا خود قرآن نے بھی یہ لازم قرار دیا ہے کہ تالیفِ قلب کی مد پر ہر حال میں صدقات میں سے کچھ نہ کچھ ضرور خرچ کیا جائے۔

دراصل بات کچھ بھی نہیں منکرین حدیث کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس کے پیچھے دلیل و برہان کی قوت موجود ہے یا نہیں وہ بلا سوچے سمجھے ایک دعویٰ کر بیٹھتے ہیں اور پھر اس کو نبھانے کے لیے کبھی قرآن و حدیث میں دور از کار تاویلات سے کام لیتے نظر آتے ہیں اور کبھی حالات و واقعات کو توڑتے مروڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں بھی وہ یہ دعویٰ تو کر بیٹھے کہ صحابہ کرام تغیرِ حالات کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں رد و بدل کرنا جائز سمجھتے تھے مگر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اس کو ثابت نہ کر سکے۔ جتنی مثالیں وہ اس سلسلے میں دیتے ہیں وہ سب کی سب ان کے حق میں جانے کے بجائے الٹا انہی کے خلاف ثبوت فراہم کرتی نظر آتی

ہیں اور یہ حقیقت اور زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے کہ صحابۂ کرام بالاتفاق حدیثِ رسول کی تشریعی حیثیت کے قائل تھے۔

حدیث کی تشریعی حیثیت کے ثبوت میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کو سامنے رکھ کر آدمی سوچے صحابۂ کرام کی جماعت جو وحی الہٰی کی اولین مخاطب ہے وہ حدیث کی تشریعی حیثیت کی قائل ہے خود صاحب وحی یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات حدیث کی اتباع کو اپنے امتیوں پر واجب قرار دیتی ہے اور اس پر مزید خود وحی الہٰی حدیث رسول کی اطاعت کو قرآن کی اطاعت کے مترادف ٹھہراتی ہے پھر اس کے بعد جو شخص حدیث کی تشریعی حیثیت کا انکار کرتا ہے وہ بلا شبہ صحابہ کی جماعت سے علیحدہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقۂ اطاعت سے باہر اور قرآن کی پیروی سے منحرف ہے یا نہیں؟

خبرِ واحد کی حجیّت

حدیث کی تشریعی حیثیت کو مشکوک بنانے اور اسے کمزور کرنے کی خاطر منکرین حدیث خبرِ متواتر اور خبرِ واحد کی بحث بھی چھیڑا کرتے ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خبرِ واحد کی حجیت پر بھی تفصیل سے کلام کیا جائے۔

جو باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک پہونچی ہیں ان کو دو حصّوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ حصّہ جو تواتر کے ساتھ آیا ہے اور اس سے حاصل شدہ علم قطعی اور یقینی ہوتا ہے اور دُوسرا وہ حصّہ جو تواتر کے ساتھ نہیں آیا اور اس سے حاصل شدہ علم ظنِ غالب کے درجے میں ہے۔ اُصولِ حدیث کی اصطلاح میں ہم اسی بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ حدیث کی دو قسمیں ہیں : ایک خبرِ متواتر اور دُوسری خبرِ واحد۔ خبرِ متواتر اس خبر کو کہتے ہیں کہ جس کے بیان کرنے والے اس قدر مختلف اور بے شمار ہوں کہ عقلِ سلیم اتنے مختلف طبقوں کے آدمیوں کا مل کر ایک جھوٹ گھڑ لینے کو محال سمجھے اور خبرِ واحد وہ خبر ہے جس کے بیان کرنے والے اس قدر کثیر اور بے شمار نہ ہوں جس قدر متواتر میں ہوتے ہیں خواہ وہ ایک یا دو ہوں یا تین اور چار ہوں۔ اس طرح پر ہر وہ خبر جو متواتر نہ ہو اصطلاحی طور پر خبرِ واحد ہی کہلاتی ہے۔

تمام امت کا اس پر تو اتفاق ہے کہ خبرِ متواتر سے علم قطعی اور یقینی حاصل ہوتا ہے اور خبرِ واحد سے علم ظنی حاصل ہوتا ہے، خبرِ واحد کو مفید علم یقین کوئی بھی نہیں کہتا مگر اختلاف جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اس امر میں ہے کہ ظنیت کی بنا پر خبرِ واحد کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ جمہور کے نزدیک خبرِ واحد اگر سچے اور ثقہ راوی سے مروی ہو تو معتبر قابلِ قبول اور واجب العمل ہے جبکہ منکرینِ حدیث کا کہنا یہ ہے کہ خبرِ واحد سے چونکہ علم ظنی حاصل ہوتا ہے اور ظنیت میں خطا و نسیان کا احتمال ہر وقت باقی رہتا ہے

خواہ وہ سچے اور ثقہ راوی ہی سے مروی کیوں نہ ہو اس لیے اس سے استدلال درست نہیں پھر اسی بنیاد پر منکرین حدیث یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ احادیث کا تمام مجموعہ ظنی ہے اس لیے بالکلیہ رد کر دینے کے لائق ہے کیونکہ جو چیز ظنی ہوتی ہے وہ ثابت شدہ نہیں ہوتی اور جو ثابت شدہ نہ ہو وہ لائق اتباع نہیں ۔

اُصولی غلطی اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جو چیز ظنی ہوتی ہے وہ ثابت شدہ نہیں ہوتی مگر منکرین حدیث کا یہ کہنا اصولی طور پر غلط ہے کہ جو چیز ثابت شدہ نہ ہو وہ قابل اتباع نہیں ۔ انسان اکثر و بیشتر معاملات میں صرف اُس تحقیق پر اعتماد کرنے کے لیے مجبور ہے جس سے ظن غالب حاصل ہوتا ہے اگر وہ اس تحقیق میں شک کرے اور علم یقین کے بغیر ہر بات ماننے سے انکار کر دے تو وہ دنیا کے کام کا نہ رہے ۔ ہماری زندگی کے بیشتر معاملات ایسے ہیں جن میں ہم اخبار آحاد یعنی ایک دو راویوں کی دی ہوئی خبروں کو تسلیم کرتے ہیں اور انہی پر اپنے فیصلوں اور اپنے علم و عمل کا مدار رکھتے ہیں ۔ جہاں تک اخبار آحاد میں خطا و نسیان کے احتمال کا تعلق ہے تو بات دراصل یہ ہے کہ محض خبر ہونے کی حیثیت سے تو ہر خبر میں سچ اور جھوٹ ہونے کا یکساں احتمال ہوتا ہے مگر ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دینے کے لیے ہم محض خبر کے ہونے ہی پر نظر نہیں رکھتے بلکہ خارجی قرائن سے مدد لیکر صدق یا کذب کے کسی ایک پہلو کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ خبر متواتر میں راویوں کی تعداد کی زیادتی وہ خارجی قرینہ ہے جس کی بنا پر ہم اسے قطعی اور یقینی سمجھتے ہیں ۔ اسی طرح ہم اخبار آحاد کی امکانی جانچ پڑتال کر کے صدق و کذب کے دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دیتے ہیں اور اگرچہ اس ترجیح سے ہمیں صرف ظن غالب حاصل ہوتا ہے لیکن اکثر و بیشتر اس ظن پر ہم اسی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح علم یقین حاصل ہونے کی صورت میں کرتے ۔

یقینیات کی شرط اور دنیوی معاملات اتباع کے لیے یقینیات کو اگر لازمی شرط قرار دے دیا جائے

تو دُنیا میں جینا محال ہو جاتے ہماری زندگی کے کتنے معاملات ایسے ہیں جن میں ہم صرف یقینیات کی پیروی کرتے ہیں اور مظنونات کو بالکلیہ رد کر دیتے ہیں؟ مظنونات کو بالکلیہ رد کر دینے کا قاعدہ زندگی میں نہ کبھی چلا ہے نہ چل سکتا ہے عقل سلیم کا تقاضا یہی ہے اور اسی کی پیروی ہم زندگی کے تمام معاملات میں کرتے ہیں کہ تمام مظنونات کو بیک قلم رد کر دینے کے بجائے ان کے درمیان تمیز کرتے ہیں ان میں سے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ جانچ کر دیکھتے ہیں اور تحقیق کے مختلف ذرائع سے کام لیکر یہ دریافت کرتے ہیں۔ کہ کونسی چیز یقین سے کس درجہ قریب یا کس درجہ بعید ہے جو چیز بعید ہو اسے رد کر دیتے ہیں، جو چیز قرب وبعد کے درمیان ہو اس میں توقف کرتے ہیں تاآنکہ کسی ایک وجہ کو ترجیح ہو جائے اور جو چیز قریب یا اقرب ہوتی ہے اس کو بہ لحاظ اس کے درجۂ قرب کے قبول کر لیتے ہیں۔ یہی اُصول ہے جس پر دُنیا کے سارے معاملات چل رہے ہیں۔

اگر ایک ثقہ اور سچے آدمی کی خبر کو محض اس وجہ سے رد کر دیا جائے کہ وہ درجہ تواتر کو نہیں پہونچی تو کارخانہ عالم درہم برہم ہو جائے۔ دُنیا کے تقریباً تمام کاروبار اخبار آحاد پر چل رہے ہیں تجارت کا سارا نظام انہی کی بنیاد پر قائم ہے بہت سی خبریں ہم کو تار اور اخبارات کے ذریعے سے ملتی ہیں جن میں عقلاً صدق وکذب دونوں پہلوؤں کا احتمال ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس شخص نے ہمیں تار دیا ہے وہ فی الواقع آیا وہی شخص ہے جس کا نام تار پر لکھا ہوا ہے؟ اس کے علاوہ جو خبر وہ دے رہا ہے ہمیں نہیں معلوم وہ اسے کس ذریعے سے معلوم ہوئی؟ نیز اس کا ذریعہ معتبر ہے یا نہیں؟ اسی قسم کے بہت سے احتمالات کی گنجائش ہر تار کی خبر میں موجود ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کا سارا کاروبار ہی ان خبروں کی بنیاد پر چل رہا ہے وہ ان احتمالات کے چکروں میں نہیں پڑتے محض ظاہری قرائن سے جانچ لیتے ہیں کہ تار انہی کے کارندے کا دیا ہوا ہے یا نہیں اور جب ایک ظن غالب اس خبر کے سچے ہونے پر ا نہیں ہو جاتا ہے تو اس پر اپنے لاکھوں روپے لگا دیتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے اگر آج اس اُصول کو مان لیا جائے کہ محض ظنِ غالب پر عمل درست نہیں تو کیا

کوئی بے چارہ تاجر تجارت کر سکتا ہے۔

اسی طرح سرکاری و غیر سرکاری دفاتر کے تمام معاملات، رسل و رسائل، نامہ و پیام، تار اور ٹیلی فون کا تمام تر مدار خبر واحد پر ہی ہے۔ دفاتر کے تمام پیغامات کا راوی ایک بے چارہ بے علم چپڑاسی ہی تو ہوتا ہے ذرا تصور کیجئے دفتر کا کوئی افسر کسی کارکن کو بلانے کے لیے چپڑاسی بھیجے اور وہ کارکن اپنے افسر کا حکم پا کر یہ کہنے لگے کہ چونکہ یہ خبر چپڑاسی ایک فرد واحد لایا ہے اس میں جھوٹ کا احتمال موجود ہے اس لیے میں اس خبر پر اعتماد نہیں کرتا اور یہ کہہ کر چپڑاسی کو واپس کر دے تو کیا ایسے کارکن کو دفتر میں رکھے جانے کے قابل سمجھا جائے گا اور اگر دفتر کے سارے کارکن اسی اصول پر عمل کرنے لگیں تو کیا دفتر کا نظام ایک دن بھی چل سکتا ہے؟

ہماری زندگی کے معاملات میں سب سے زیادہ اہم اور نازک معاملہ عدالت کا ہے۔ عدالتوں میں خالص اور ٹھوس عقلی امتحان پر احکام کی بنا رکھی جاتی ہے قاضی یا جج کے سامنے جتنے مقدمات پیش ہوتے ہیں ان کے ثبوت کے لیے بہت کم کیا شاذ و نادر ہی شہادتیں تواتر کی حد کو پہنچتی ہیں اکثر و بیشتر معاملات میں جج کے سامنے صرف اخبار آحاد ہی پیش ہوتی ہیں جنہیں وہ جرح و تعدیل، قرائن و آثار اور قیاس عقلی کی کسوٹی پر پرکھ کر سچ اور جھوٹ کے امکانی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو راجح قرار دیتا ہے اور جو پہلو راجح ہوتا ہے اسی پر اپنے فیصلے کی بنیاد رکھتا ہے اور اس طرح فیصلہ کرتا ہے جیسے اس کے نزدیک وہ مقدمہ یقین کی حد تک ثابت ہو گیا ہے۔ فرض کیجئے کوئی جج ہر شاہد کو جھوٹا اور ہر شہادت کو غلط ٹھہرا کر اپنا کام شروع کرے اور ہر واقعہ کو تسلیم کرنے کے لیے اس بات پر اصرار کرے کہ یا تو واقعہ خود اس کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے یا پھر تواتر کی حد کو پہونچی ہوئی شہادتیں اس کے سامنے پیش ہوں تو کیا ایسا جج کسی ایک مقدمے کا فیصلہ بھی کبھی کر سکے گا یا اخبار آحاد پر اسے اعتماد کرنا پڑے گا یا عدالت کی کرسی چھوڑنی پڑے گی۔

اور تو اور ہم میں سے ہر شخص کو یہ بات کہ وہ اپنے باپ کی جائز اولاد ہے صرف اپنی ماں کی روایت سے معلوم ہوتی ہے اس خبر واحد میں جس کے لیے کوئی دوسرا شاہد سرے

سے مل ہی نہیں سکتا خبریت کے لحاظ سے صدق و کذب دونوں پہلوؤں کا یکساں احتمال ہے لیکن کوئی شریف آدمی اس میں کذب کے پہلو کو ترجیح دینا تو درکنار کسی ادنیٰ درجے میں بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوگا کہ اسے اپنے باپ کی جائز اولاد ہونے میں شک ہے۔ اس خبر واحد کو ظنیت کی بنا پر اگر رد کر دیا جائے تو بتائیے ان قرابتوں اور رشتے داریوں کا کیا بنے جن کی بنیاد پر نکاح اور شادی بیاہ چل رہے ہیں اور وراثتیں تقسیم ہو رہی ہیں۔

یقینیات کی شرط اور مذہبی معاملات

دینوی معاملات ہی میں نہیں مذہبی معاملات میں بھی یہی صورت ہے

یقینیات کی شرط لگا کر اور ظنیت کی بنا پر خبر واحد کو بالکلیہ رد کر کے آپ ایک قدم آگے نہیں چل سکتے فرض کیجئے آپ نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جاتے ہیں وضو کے پانی کے بارے میں آپ پوچھتے ہیں کیا پاک ہے؟ خادم مسجد خبر دیتا ہے کہ ہاں پاک ہے آپ اس کی اطلاع کو خبر واحد قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں آگے بڑھتے ہیں صفوں کے بارے میں استفسار کرتے ہیں کہ کیا پاک ہیں پھر وہی خبر واحد آپ کو ملتی ہے کہ جی ہاں پاک ہیں، امام نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہوتا ہے خبر دیتا ہے کہ میں باوضو ہوں، میرے کپڑے پاک ہیں آپ اس کو خبر واحد کی بنا پر رد کر دیتے ہیں ذرا بتلائیے اس طرح ہر خبر کو خبر واحد ہونے کی بنا پر اگر آپ رد کرتے رہے تو کیا ایک وقت کی نماز بھی آپ پڑھ سکتے ہیں؟

مذہبی معاملات میں سب سے بڑی چیز جس پر ہمارے ایمان کا دارومدار ہے قرآن حکیم ہے اس کتاب کا کلام الٰہی ہونا ہمیں خبر واحد ہی کے ذریعے سے معلوم ہوا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی واحد ذات ہے جس نے ہمیں یہ خبر دی کہ قرآن حکیم کلام الٰہی ہے، نفس خبر ہونے کے لحاظ سے تو اس خبر میں بھی صدق و کذب دونوں پہلوؤں کا احتمال ہے۔ خبر واحد اگر بالکلیہ رد کر دینے کے قابل ہے تو کیا قرآن حکیم کا کلام الٰہی ہونا بھی معاذ اللہ مشکوک و ناقابل قبول ٹھہریگا؟ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم کہ قرآن کلام الٰہی ہے خبر واحد ہی کے ذریعے ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی آتی تھی وہ تن تنہا حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی لے کر آتے تھے۔ قرآن خود کہتا ہے اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ (یہ (قرآن) قول ہے

ایک رسولِ کریم (جبرئیل) کا۔ الحاقۃ ۔ ۴۰) تو کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل کی لائی ہوئی وحی کو قبول کرنے سے معاذ اللہ انکار کر دینا چاہیئے تھا؟

کون نہیں جانتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی ہر امت کی طرف ایک ہی ہادی ونذیر آیا، ایک ہی پیغمبر نے لوگوں کو خدائے بزرگ و برتر کا پیغام پہونچایا۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام تنہا تنہا ہی اپنی اپنی امتوں کی طرف مبعوث ہوئے اور ہر ایک نے اکیلے اکیلے ہی خدائی دین کی نقل و روایت امت کے سامنے پیش کی، یہ خبرِ واحد نہیں تو اور کیا تھی؟ کیا خدا سے معاذ اللہ بھول ہو گئی کہ اس نے دین کی روایت خبرِ واحد کے ذریعے کرا دی جس سے صرف علمِ ظنی حاصل ہوتا ہے؟ اور ظن موجبِ عمل نہیں۔ اب جن لوگوں نے پیغمبر کا انکار کیا تو کیا معاذ اللہ بالکل درست کیا کہ خبرِ واحد ہوتی ہی رد کر دینے کیلئے ہے؟ خدارا کچھ تو عقل سے کام لیجئے۔ خبرِ واحد کو بالکلیہ رد کر کے سوچئے تو سہی کہ بات کہاں سے کہاں جا پہونچتی ہے۔

اخبارِ آحاد کو بالکلیہ رد کر دینے سے دین کے معاملے میں عملاً جو خرابی واقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جزئیات میں انسان رسالت کی رہنمائی سے محروم ہو جاتا ہے اور دین پر عمل کرنے کی تفصیلی صورتوں میں قیاس و رائے کا دخل اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس سے خود اصولی احکام کی اصل رُوح کے بھی ضائع ہو جانے کا خوف ہے۔ علاوہ ازیں جب تفصیلات میں سرے سے کوئی سند ہی نہ ہو گی تو ہر شخص اپنی رائے اور اپنے رجحان کے مطابق جو صورت چاہے گا اختیار کرے گا نتیجتاً تفرقہ، انتشار اور اختلاف کو راہ ملے گی ہر شخص جزئیات کو اپنی رائے سے مقرر کرے گا اور کسی رائے کو بھی کوئی ایسی قوت حاصل نہ ہو گی جس کی بنا پر اسے دوسری رائے کے مقابلے میں ترجیح دی جا سکے اور مسلمانوں کی کسی بڑی جماعت پر اس کی پیروی لازم ہو جائے۔ ہر کوئی بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس سے جزئیات میں کس قدر افراتفری برپا ہو گی، نظامِ جماعت کو کتنا نقصان پہونچے گا اور کس طرح بعض صورتوں میں مقاصدِ شریعت تک فوت ہو جائیں گے۔ اسلام کے نظامِ شریعت میں غور کریں، وہ چیز جو اس نظام کو ایک مستقل عملی ڈھانچہ مہیا کرتی ہے اور وہ چیز جو مسلمانوں کی تہذیب

تمدّن، معاشرت، معیشت اور سیاست غرض ان کی پوری اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ کو ایک مستقل تفصیلی شکل میں ڈھالتی ہے وہ وہی علم تو ہے جو اخبارِ آحاد سے ہم کو حاصل ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسی و نجی زندگی، آپؐ کی عادات، آپؐ کے اطوار آپؐ کے اخلاق، آپؐ کی تعلیم و تبلیغ کا طریقہ، آپؐ کا طرزِ معاشرت، زندگی کے مختلف شعبوں میں آپؐ کی ہدایات اور آپؐ کا طرزِ عمل، پھر آپؐ کے خلفاء و دیگر صحابہ و اہلِ بیت کے آثار ہی وہ چیزیں ہیں جن سے مل کر اسلام کا پورا نظامِ شرعی تیار ہوتا ہے اور جو اسلام کی عملی زندگی کا پورا نقشہ پیش کرتی ہیں مگر کون نہیں جانتا کہ ان چیزوں کے حصول کا ذریعہ صرف اخبارِ آحاد ہی ہیں جن کو اگر کلیۃً رد کر دینے کا اصول اپنا لیا جائے تو اسلام محض ایک ایسا ڈھانچہ رہ جاتا ہے جس پر گوشت پوست کچھ نہ ہو۔

خبرِ واحد کی حجیت اور قرآنِ کریم

خبرِ واحد کی حجیت پر اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ خالصتاً عقلی حیثیت سے تھا، آئیے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا اس بارے میں کیا فیصلہ ہے:

اس کے لیے ہم اپنے قارئین کی توجہ سب سے پہلے ان بیسیوں آیاتِ قرآنی کی طرف دلاتے ہیں جن میں قرآن نے مختلف پیغمبروں کی دعوت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن جگہ جگہ کہتا ہے إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ اور إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ یہ مختلف انبیاء کا اپنے اپنے زمانے میں اپنی قوم کو دعوت دینا اور پھر قوم کے جھٹلانے پر قرآن کا بار بار یہ کہنا کہ فَكَذَّبُوهُ فَأَهْلَكْنَاهُمْ اور فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ اور ثُمَّ أَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبَاقِينَ اور ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ یہ سب کیا ہے؟ یہ خبرِ واحد کی حجیت کا منہ بولتا ثبوت ہی تو ہے۔ ایک نبی تن تنہا اپنی قوم کو ایک خبر دیتا ہے قوم اسے جھٹلاتی ہے اور اس کی پاداش میں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو جاتی ہے اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ خبرِ واحد کا جھٹلانا سبب ہوا عذابِ الٰہی کا۔ اگر قرآن کی نظر میں خبرِ واحد حجت نہ ہوتی تو قوم کے عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ قرآن کریم کی یہ بیسیوں آیات گویا خبرِ واحد کی حجیت اور اس کے واجب التسلیم

ہونے کا زبردست ثبوت ہیں۔

ان آیات کے بارے میں ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ رسول اور نبی کی شخصیت ایک غیر معمولی شخصیت ہے ان کی دی ہوئی خبر کا ماننا درحقیقت رسالت اور نبوت کے قدرتی دباؤ کا اثر ہے نہ کہ اصول فن کا تقاضہ۔ یعنی رسول کی دی ہوئی خبر واحد کوئی فنی یا اصولی خبر واحد نہیں کہ مذکرہ بالا آیات کی نظروں سے اسے قرآن سے ثابت شدہ مانا جائے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ اس کی قرآن سے ناواقفیت کی دلیل ہے، قرآن نے کہیں بھی کسی پیغمبر کی دی ہوئی خبر کو پیغمبری یا رسالت و نبوت کے دباؤ سے منوانے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف اصولِ روایت اور فنی قواعد کے لحاظ سے ہی اس کے ماننے اور واجب الاعتبار سمجھنے پر زور دیا ہے۔ چنانچہ قرآن ایک مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر واحد کی توثیق کرتا ہے تو صفت رسالت کو اس کی بنیاد نہیں بناتا بلکہ اصول روایت کو بالتصریح اس کا مدار معیار ٹھہراتا ہے۔ ارشاد ہے:

والنجم اذا هوىٰ ۝ ما ضل صاحبكم وما غوىٰ ۝ وما ينطق عن الهوىٰ ۝ إن هو إلا وحي يوحىٰ (النجم: ۱-۴)	قسم ہے تارے کی جب وہ ڈوبنے لگے کہ یہ تمہارے ساتھ کے رہنے والے نہ بھٹکے اور نہ غلط راستے پر ہو لیے اور نہ وہ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں ان کا کلام تو تمام تر وحی ہی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

اس آیت کے الفاظ میں غور کیجئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے پہونچی ہوئی اس خبر واحد کو قرآن واجب الاعتبار ٹھہرا رہا ہے تو یہ کہہ کر نہیں کہ آپؐ نبی اور رسول ہیں بلکہ بطور خاص صاحبکم تمہارا ساتھ کا رہنے والا کہہ رہا ہے گویا خبر واحد کے منواتے میں قرآن رسالت کا دباؤ دلوں پر نہیں ڈالنا چاہتا پھر اس کے ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے قرآن جن صفات قبیحہ کی نفی کر رہا ہے وہ سب وہی ہیں جو اصول روایت میں مطاعن کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی بنا پر روایت مخدوش ہو جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کہنا یہ چاہتا ہے کہ اس خبر واحد کو اس لیے مان لو کہ اس کے راوی میں مطاعن

روایت میں سے کوئی طعن موجود نہیں ہے۔ دیکھ لیجئے قرآن سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ضلالت کی نفی کرتا ہے کیونکہ بے راہ رو اور ناواقف کی بات ہرگز قابل اعتبار نہیں ہوتی پھر آپؐ کی ذات سے غوایت کی نفی کرتا ہے ظاہر ہے راہ سے بھٹکا ہوا اور غلط راستے پر چلنے والا الٹی ہی سمجھ رکھتا ہے اور الٹی ہی بات کہتا ہے جس کی بنا پر اس کی روایت بھی قابل التفات نہیں ہوتی۔ پھر اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ آپؐ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بنانے والے بھی نہیں ہیں کیونکہ ایسا شخص خود غرض ہوتا ہے اور خود غرض کی بات بھی لائق اعتبار نہیں ہوتی۔ یہ بے راہ روی، ناواقفیت، کج راہی اور خود غرضی سب مطاعن روایت ہی تو ہیں جن کی نفی کر کے قرآن یہ بتلانا چاہتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر واحد کو اس لیے تسلیم کر لو کہ آپؐ میں کوئی تہمت اور کوئی طعن موجود نہیں ہے۔ آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ان مطاعن روایت کے موجود نہ ہونے کی علت بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ ان مطاعن کی غیر موجودگی راوی کے صاحب وحی ہونے کی بنا پر ہے جو پیغمبر کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا اور نبوت و رسالت ایک ایسا اعلیٰ مقام ہے کہ اس کے ساتھ بے راہ روی، ناواقفیت اور خود غرضی جیسے مطاعن کبھی جمع نہیں ہو سکتے گویا نبوت کے وصف کو اوّل تو قرآن نے صراحتاً ذکر ہی نہیں کیا پھر اشارۃً ذکر بھی کیا تو منصب کی حیثیت سے نہیں بلکہ مطاعن روایت کی غیر موجودگی ثابت کرنے کے لیے بطور علت کے ذکر کیا۔ یہ اسلوب کلام صاف بتلا رہا ہے کہ خبر واحد کی حجیت کو رسالت کے دباؤ سے نہیں منوایا جا رہا ہے بلکہ اس کو معیار روایت پر پورا پورا اترنے اور مطاعن روایت سے پاک ہونے کی وجہ سے واجب التسلیم قرار دیا جا رہا ہے۔

غرض وہ بیسیوں آیات قرآنی جن میں انبیاء کی طرف سے اپنی اپنی قوم کو فرداً فرداً دعوت دینے کا ذکر ہے وہ سب کی سب، اس بات کا زبردست ثبوت ہیں کہ قرآن کے نزدیک خبر واحد حجت ہے۔ تاہم ان آیات قرآنی کے علاوہ ایسی آیات بھی متعدد پیش کی جا سکتی ہیں جن سے غیر رسول اشخاص کے حوالے سے دی گئی خبر واحد کی حجیت کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ مثال

کے طور پر۔

(۲)، قرآن اصحاب قریہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

وجاءَ مِنْ اقصی المدینة رجُلٌ یسعیٰ قال یقوم اتبعوا المرسلین (یٰسٓ - ۲۰)	اور ایک شخص اس شہر کے کسی دُور مقام سے دوڑتا ہُوا آیا اور کہنے لگا کہ اے میری قوم والو رسولوں کی راہ پر چلو۔

اور پھر جب قوم کے لوگوں نے اس شخص کی بات نہ مانی تو ان پر عذاب الٰہی آنے کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

ان کانت الا صیحة واحدة فاذا ھم خٰمدون (یٰسٓ - ۲۹)	وہ (سزا) تو بس ایک چیخ تھی کہ سب اسی دم بجھ کر رہ گئے۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس شخص کی دی ہوئی خبر واحد اس کی قوم کے لوگوں پر حجت نہ ہوتی تو اس کی بات نہ ماننے پر اس کی قوم کے لوگ عذاب کے مستحق نہ ہوتے اور عذاب کی ایک ہی چنگھاڑ میں وہ جل بجھ کر راکھ نہ ہو جاتے۔ یہ عذاب کا بالتصریح ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ اس شخص کی دی ہوئی خبر واحد قرآن کی نظر میں اس کی قوم کے لوگوں پر حجت تھی۔

(۳) اسی طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ایک قبطی مارا جاتا ہے تو ایک شخص آپ کو آ کر اطلاع دیتا ہے کہ فرعون آپ کے قتل کے درپے ہے اس لیے آپ اپنی جان بچا کر نکل جائیے۔ اس واقعے کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

وجاء رجل من اقصی المدینة یسعیٰ قال یموسیٰ ان الملا یاتمرون بك لیقتلوك فاخرج انی لك من النٰصحین ہ فخرج منھا خائفًا یترقب (القصص - ۲۰-۲۱)	اور ایک شخص شہر کے کنارے سے دوڑا ہوا آیا کہنے لگا اے موسیٰ اہل دربار آپ کے متعلق مشورہ کر رہے ہیں کہ آپ کو قتل کر دیں سو آپ چلے جائیں میں آپ کا بڑا خیر خواہ ہوں سو موسیٰ وہاں سے خوف اندیشے کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔

ظاہر ہے اس شخص کی لائی ہوئی خبر۔ خبر واحد ہی تھی کیونکہ بلاشبہ وہ ایک فرد واحد کی خبر تھی کسی جماعت کی نہ تھی لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس کی خبر مان لی اور اس کا اتنا اثر لیا کہ آپ کے دل پر خوف طاری ہو گیا بلکہ صرف اثر ہی نہیں لیا اس خبر کی بنیاد پر آپ شہر سے نکل بھی کھڑے ہوئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خبر واحد حجت نہ تھی تو حضرت موسیٰ نے اس کو قبول کیوں کیا۔ اس آیت میں إِنِّي لَكَ مِنَ النَّاصِحِينَ کے الفاظ قابل غور ہیں خبر دینے والا خود اپنی خبر کی توثیق یہ کہہ کر کر رہا ہے کہ میں یہ خبر اپنی ہوائے نفس یا کسی دوسرے کے بہکائے سکھائے سے غلط نہیں دے رہا ہوں محض آپ کی خیر خواہی کی خاطر آپ کو مطلع کرتے آیا ہوں گویا یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ میری روایت ہر قسم کے مطاعن سے پاک ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اوصاف راوی کے سلسلے میں سب سے بڑا وصف یہ ہوتی ہے جس سے خبر کی پوزیشن صاف ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو حضرت موسیٰ نے اس خبر کو قبول بھی اسی لیے کیا کہ روایت اُصولِ روایت کے عین مطابق تھی راوی متہم نہ تھا، مجروح نہ تھا اور ہوائے نفسانی سے خبر نہیں دے رہا تھا۔

بہرحال دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایک ایسے فرد واحد نے جو پیغمبر نہیں ہے ایک عام آدمی ہے ایک خبر روایت کی اور ایک پیغمبر نے اس روایت کو قبول کر کے نہ صرف اثر لیا بلکہ اس کی بنیاد پر عمل بھی کیا اس سے بڑھ کر خبر واحد کی حجیت کے معتبر ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

(۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس موقعے پر بھی خبر واحد کو قبول کیا جب آپ مصر سے نکل کر مدین میں پہونچے اور حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی اپنے والد کی طرف سے آپ کو بلانے آئیں انہوں نے اپنے والد کا پیغام ان الفاظ میں دیا:

إِنَّ أَبِي يَدْعُوكَ لِيَجْزِيَكَ أَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا۔ (القصص - ۲۵)	میرے والد تمہیں بلاتے ہیں تاکہ تم کو اس کا صلہ دیں کہ تم نے ہماری خاطر (ہمارے جانوروں کو) پانی پلا دیا تھا۔

حضرت موسیٰ یہ پیغام سنتے ہی حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی کے ساتھ چل پڑے۔

ایک عورت کی دی ہوئی خبر اگر حضرت موسیٰ کے نزدیک قابلِ قبول نہ ہوتی تو آپ کبھی اس کے ساتھ نہ جاتے ۔

(۵) پھر اسی واقعے میں آگے چل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جب فرعون کے متعلق سارا واقعہ سنایا تو حضرت شعیب نے اس پر یقین کر کے حضرت موسیٰ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا :

لا تخف نجوت من القوم الظلمین ۵ (قصص - ۲۵)	خوف مت کر تو ظالم لوگوں سے بچ نکلا ۔

خیال رہے کہ حضرت موسیٰ ابھی نبی نہیں ہوئے تھے اگر خبرِ واحد قابلِ قبول نہ ہوتی تو ایک غیر نبی کی دی ہوئی خبر کی ایک نبی کبھی تصدیق نہ کرتا ۔

(۶) سورۂ مومن میں قرآن ایک ایسے شخص کا ذکر کرتا ہے جو آل فرعون سے تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر آپ پر ایمان لے آیا تھا مگر فرعون کے خوف سے اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا ایک موقع پر وہ اپنی قوم کے لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے :

وقال الذی آمن یقوم اتبعون اھدکم سبیل الرشاد ۔ (المومن - ۳۸)	اور وہ جو ایمان لا چکا تھا بولا اے میرے بھائیو میری پیروی کرو میں تمہیں سیدھا راستہ بتلا رہا ہوں ۔

اس ایک شخص کا اپنی قوم کے لوگوں کو اپنی اتباع کی دعوت دینا ظاہر ہے خبرِ واحد ہے لیکن قرآن اس دعوتِ اتباع کو ہدایت سے تعبیر کر رہا ہے اگر قرآن کے نزدیک خبرِ واحد حجت نہ ہوتی تو فردِ واحد کی دعوت کو "سیدھے راستے کی ہدایت" سے ہرگز تعبیر نہ کیا جاتا ۔

(۷) پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے وہ شخص اپنی قوم سے کہتا ہے :

فستذکرون ما اقول لکم ۔ (المومن - ۴۴)	سو عنقریب تم میری بات کو یاد کرو گے ۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس شخص کا قول خبرِ واحد ہونے کی بنا پر حجت نہ ہو تو قرآن کا یہ کہنا بے کار ہو جائے کہ تم اس قول کو یاد کرو گے اور ظاہر ہے قرآن کا ایک لفظ اور ایک

حرف تک بے کار نہیں لہٰذا معلوم ہُوا کہ اس شخص کا قول خبر واحد ہونے کے باوجود قرآن کی نظر میں حجت تھا۔

(۸) پھر جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس شخص کی بات نہ مانی تو اللہ کے عذاب نے انہیں آپکڑا قرآن اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

فوقٰہُ اللّٰہ سیأٰتِ مَامکروا وحاق بآل فرعون سوٓءُ العذاب (المومن۔ ۴۵)	پھر اللہ نے اس (مومن) کو ان لوگوں کے مکر سے محفوظ رکھا اور اہل فرعون کو موذی عذاب نے آگھیرا۔

اگر اس فرد واحد کا قول حجت نہ ہوتا تو اس کے قبول نہ کرنے پر قوم کے عذاب میں گرفتار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس شخص کی نافرمانی پر عذاب الٰہی کا ترتب دلیل ہے اس بات کی کہ قرآن کی رو سے خبر واحد قابل قبول اور حجت ہے۔

(۹) قرآن کی رو سے عادل شخص کی دی ہوئی خبر واحد تو قابل قبول ہے ہی جیسا کہ اُوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے قرآن کی ایک آیت ایسی بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی فاسق شخص کی دی ہوئی خبر بھی بالکلیہ رد کر دینے کے قابل نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کی دی ہوئی خبر کی تحقیق کر لی جائے۔ قرآن کہتا ہے:

یاآیھا الذین آمنوا اِن جاءکم فاسق بنباءٍ فتبینوا اَن تصیبوا قومًا بجھالۃٍ فتصبحوا علٰی مافعلتم ندمین۔ (حجرات۔ ٦)	اے ایمان والو اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانستگی میں کسی قوم پر تم مصیبت ڈھاؤ اور پھر اپنے کیے پر پچھتاؤ۔

معلوم ہُوا کہ فرد واحد کی خبر اس کے فاسق ہونے کے باوجود بھی قرآن کے نزدیک معتبر اور حجت ہونے کی شان رکھتی ہے بشرطیکہ تحقیق میں آجائے اور حجت بھی ایسے معاملات میں جن کے بگڑ جانے کی صورت میں ندامت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر فرد واحد کی خبر مطلقاً قابل رد ہوتی تو یوں کہا جاتا کہ فاسق اگر کوئی خبر لائے تو ہرگز اس کی بات کا اعتبار مت کرو لیکن ایسا نہیں کہا گیا بلکہ یہ کہا گیا کہ تحقیق کے بعد اسے مان لو اور معتبر سمجھو تحقیق کی شرط اس لیے لگائی گئی کہ راوی کے فسق و فجور سے اس کی خبریں جو بے اعتباری کی گنجائش پیدا

ہوگئی تھی وہ ختم ہو جائے اور خبر قابل اعتبار بن جائے مگر بہر حال تحقیق کے بعد بھی وہ رہے گی خبر واحد ہی اس لیے ثابت ہُوا کہ خبر واحد قرآن کے نزدیک بڑے سے بڑے معاملات تک میں معتبر اور قابل حجت ہے۔

(۱۰) ارشاد ربانی ہے:

وما کان المومنون لینفروا کافۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (التوبۃ - ۱۲۲)۔	اور مومنوں کو نہ چاہیئے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں یہ کیوں نہ ہو کہ ہر گروہ میں سے ایک حصّہ نکل کھڑا ہوا کرے تاکہ یہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور جب اپنی قوم میں واپس آئیں تو انہیں ڈراتے رہیں عجیب کیا کہ وہ محتاط رہیں۔

اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ مومنوں کے ہر گروہ میں سے ایک طائفے کو چاہیئے کہ تفقہ فی الدین کے لیے کوچ کرے پھر تفقہ حاصل کر کے جب اپنے وطن لوٹے تو اپنی قوم کو ڈرائے یعنی خبر دے اور خبردار کرے کہ اے قوم رسول کی نافرمانی اور مخالفت سے بچو۔ اس طائفے کے ڈرانے پر اس کی قوم پر واجب ہے کہ اس کا کہا مانے اور اس کے کہے پر عمل کرے۔ اب اس آیت کے مفہوم میں غور کرنے والی بات یہ ہے کہ طائفے کا لفظ لغت کے لحاظ سے ایک شخص یا دو اشخاص پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ایک یا دو آدمیوں کے ڈرانے کی خبر پر جو ظاہر ہے کہ خبر واحد ہے قرآن نے عمل کو واجب قرار دیا ہے۔ اگر خبر واحد قرآن کی رو سے حجت نہ ہوتی تو طائفے کا ڈرانا قوم کے لیے حجت نہ قرار دیا جاتا۔

رہا اس بات کا ثبوت کہ طائفے کا لفظ ایک شخص یا دو اشخاص پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے اس کے لیے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں خود اسی آیت میں دلیل موجود ہے۔ اتنی بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ فِرقۃٌ کے معنی ہیں گروہ یا جماعت اور اس بات کے لیے بھی کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ جماعت کے لفظ کا اطلاق کم سے کم تین آدمیوں پر ہوتا ہے اب اس آیت کے الفاظ میں غور کیجئے قرآن کہہ یہ رہا ہے کہ ہر جماعت میں سے ایک طائفہ نکل آیا کرے، ظاہر ہے تین میں سے جو لوگ نکلیں گے وہ زیادہ سے زیادہ دو اشخاص ہو سکتے ہیں

اور کم سے کم ایک شخص ۔ معلوم ہوا کہ طائفے کا اطلاق ایک یا دو آدمیوں پر بالکل درست ہو گا ۔

خبر واحد کی حجیت کے ثبوت میں اگرچہ قرآن سے اور بھی بہت سی آیات پیش کی جا سکتی ہیں مگر ہم سمجھتے ہیں کہ جویائے حق کے لیے یہ دس نظائر بھی کافی ہیں ۔ اس کے بعد بھی کوئی شخص اگر خبر واحد کی حجیت سے انکار کرتا ہے تو یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہو گا کہ وہ قرآن کا انکاری ہے ۔

خبر واحد کی حجیت اور عہد رسالت

ان قرآنی نظائر کی موجودگی میں خبر واحد کی حجیت کے ثبوت کے لیے اگرچہ کسی مزید دلیل کی حاجت نہیں رہتی تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کا بھی جائزہ لے لیا جائے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں خبر واحد کے رد و قبول کے بارے میں صورت حال کیا تھی ۔ اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے بے شمار ایسے واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں جن سے خبر واحد کی حجیت ثابت ہوتی ہے لیکن یہاں صرف حوالے کے طور پر چند چیدہ چیدہ واقعات[1] پیش کیے جاتے ہیں ۔

(۱) ایک شخص نے روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لیا مگر بعد میں اسے شدید ندامت کا احساس ہوا ۔ اس نے اپنی بیوی کو مسئلہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا وہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حقیقت حال بیان کی حضرت ام سلمہ رض نے جواب دیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی روزے کی حالت میں ایسا کر لیا کرتے ہیں ۔ عورت نے واپس جا کر اپنے خاوند کو بتایا وہ ناراض ہو کر کہنے لگا "ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نہیں ہیں، اللہ تعالےٰ اپنے رسول کے لیے جو چاہے حلال کر دے" وہ عورت پھر حضرت ام سلمہ رض کی خدمت میں حاضر ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں موجود پایا آپؐ نے پوچھا "یہ عورت کس لیے آئی ہے" وجہ بتلانے پر آپؐ نے فرمایا کیا تم نے اسے بتایا نہیں کہ

---

[1] یہ تمام واقعات امام شافعی کی تصنیف "الرسالۃ" کے مقالہ بعنوان "حجیت خبر واحد کے دلائل" سے لیے گئے ہیں ۔

روزے کی حالت میں بھی اس طرح کر لیا کرتا ہوں حضرت ام سلمہؓ نے تمام ماجرا کہہ سنایا اور اس عورت کے خاوند کی ناراضگی کا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس کے قول کا بھی ذکر کیا۔ آپؐ نے یہ سن کر اپنی ناگواری کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا میں تم میں سب سے زیادہ متقی اور خدا کی حدود کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہوں"۔

اس واقعے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ کیا تم نے اسے بتایا نہیں کہ میں بھی روزے میں اس طرح کر لیا کرتا ہوں اس امر کی دلیل ہے کہ آپؐ کی ذات سے متعلق ایک عمل کی خبر جو حضرت ام سلمہؓ نے اس عورت کو دی تھی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں خبر واحد ہونے کے باوجود معتبر اور قابل قبول تھی اگر آپؐ کی نظر میں حضرت ام سلمہؓ کا بیان حجت نہ ہوتا تو آپؐ ان سے اس بیان کے بارے میں اس طرح استفسار نہ فرماتے۔ اسی طرح اس شخص کی بیوی کی خبر اپنے خاوند کے قول کے بارے میں اگر آپؐ کی نظر میں قابل تسلیم نہ ہوتی تو آپؐ اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار نہ فرماتے۔

(۲) لوگ مسجد قبا میں نماز فجر ادا کر رہے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد تحویل قبلہ کی خبر لے کر ان کے پاس پہونچا۔ سب نے اس کا کلام سنتے ہی نماز ہی کے اندر اپنا رُخ بیت المقدس کی طرف سے ہٹا کر بیت اللہ کی طرف کر لیا۔

اہل قبا انصار میں سے سابق الاسلام تھے وہ نماز جیسے فریضے کو صرف اسی صورت میں ترک کر سکتے تھے جب ان پر کوئی شرعی حجت قائم ہو جاتی۔ تحویل قبلہ کی خبر نہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بذات خود سُنی نہ کسی جماعت نے آکر انہیں یہ خبر سنائی بلکہ صرف ایک شخص سے یہ خبر سن کر وہ کعبۃ اللہ کی جانب پھر گئے معلوم ہوا ان کے نزدیک دینی مسائل میں خبر واحد حجت تھی۔ بالفرض ان کا یہ اقدام اگر غلط ہوتا تو یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تنبیہ فرماتے کہ جب تم ایک قطعی قبلے پر قائم تھے تو تم نے صرف ایک شخص کے کہنے پر ایک فرض قطعی کو کیسے چھوڑ دیا اور براہ راست میری ہدایت یا خبر متواتر کا انتظار کیوں نہ کیا مگر یہاں تنبیہ یا اعتراض تو درکنار اپنی جانب سے فرد واحد کا بھیجنا خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بھی دین

کے بارے میں ایک ثقہ اور صادق شخص کی دی ہوئی خبر معتبر اور حجت تھی۔

یہ واقعہ تو بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خبرِ واحد کا قبول کرنا صرف جائز ہی نہیں فرض ہے، اگر خبرِ واحد کو قبول کرنا صرف جائز ہوتا تو سابق الاسلام صحابہ ایک یقینی اور قطعی فریضے یعنی (بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے) کو حالتِ نماز میں ترک کر کے ایک غیر یقینی خبر کی بنا پر دوسرے قبلے کی جانب متوجہ نہ ہوتے اس لیے کہ ایک یقینی امر کو دوسرے یقینی امر ہی کی بنا پر ترک کیا جا سکتا ہے۔

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ابو عبیدہؓ، ابو طلحہؓ اور ابی بن کعبؓ کو شراب پلا رہا تھا کہ دفعتہً ایک شخص آیا اور اس نے خبر دی کہ شراب حرام ہو گئی یہ سن کر فوراً ابو طلحہؓ نے کہا "انس اٹھو اور شراب کے مٹکے توڑ ڈالو" میں نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر ان پر دے مارا جس سے وہ ٹوٹ گئے۔

ان صحابہ کا جو علمی مقام تھا اور تقدم صحبتِ نبوی کے لحاظ سے یہ جس مرتبہ پر فائز تھے کوئی صاحبِ علم اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے شراب پہلے شرعاً حلال ہی تھی اور عام لوگ ان دنوں شراب پیتے تھے لیکن اچانک ایک شخص آ کر حرمتِ شراب کی خبر دیتا ہے اور شراب کے مٹکوں کے مالک ابو طلحہ فوری طور پر ان کو توڑنے کا حکم دے دیتے ہیں ان میں سے کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ آئیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیں یا عام لوگوں سے پوچھ لیں۔ نہ کسی نے یہ اعتراض کیا کہ قبل از تحقیق یہ اضاعتِ مال اور اسراف بے جا قرین عقل نہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ سب ایک شخص کی خبر پر پورا پورا اعتماد کرتے تھے۔

(۴) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زنا کے ایک مقدمے میں زانی کے اقرار پر اس کو کوڑے لگانے کا حکم دیا اور جس عورت کے متعلق اس شخص نے زنا کا اقرار کیا تھا اس کے پاس حضرت انیسؓ رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور فرمایا کہ اس سے دریافت کرنا اگر وہ بھی اقرار کر لے تو اس کو رجم کر دو ورنہ اس شخص کو حدِ قذف بھی لگاؤ کہ اس نے بلا ثبوت کے ایک عورت پر زنا کی تہمت کیسے رکھی۔ حضرت انیسؓ پہنچے اس عورت نے زنا کا اقرار کیا اور وہ بھی رجم کر دی گئی۔

اس واقعے سے بھی خبر واحد کا حجت ہونا واضح ہوتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرد واحد کو رجم کا حکم دے کر بھیجنا اور ایک فرد واحد کے ذریعے سے پہونچے ہوئے حکم نبوی کے سامنے اس عورت کا اپنے آپ کو سنگساری کے لیے پیش کر دینا دونوں اپنی اپنی جگہ پر خبر واحد کی حجیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

(۵) عمرو بن سلیم الزُّرَقی اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم مقام منیٰ میں مقیم تھے کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اُونٹ پر سوار چلا چلا کر یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یہ کھانے پینے کے دن ہیں کوئی شخص روزہ نہ رکھے۔

ظاہر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسی صورت میں ایک فرد واحد کو یہ پیغام پہونچانے کے لیے بھیج سکتے تھے جب اس کا قول واجب التسلیم حجت ہو ورنہ آپؐ اس پیغام رسانی کے لیے چند آدمیوں کو بھی مامور فرما سکتے تھے۔

(۶) یزید ابن شیبان کہتے ہیں کہ ہم عرفات میں ایک ایسی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ سے کافی دُور تھی، اسی اثنا میں ہمارے پاس حضرت مربع انصاری آئے اور کہا کہ میں آپ لوگوں کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد بن کر آیا ہوں آپ نے حکم دیا ہے کہ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو وہاں سے منتقل ہونے کی ضرورت نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ میدان عرفات میں جہاں بھی قیام ہو جائے فریضہ وقوف ادا ہو جاتا ہے۔

اس واقعے سے بھی ظاہر ہے اگر خبر واحد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک حجت نہ ہوتی تو ایک آدمی کے بجائے ایک جماعت کو اس پیغام رسانی کے لیے مامور فرماتے۔

(۷) ۹ سنہ ہجری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو امیر حج بنا کر بھیجا، مختلف دیار و امصار کے حاجی جمع تھے آپ نے ان کو احکام حج بتلائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی سے ان کو مطلع کیا۔

احکام حج سنانے اور مناسک حج ادا کرانے کے لیے تنہا حضرت ابوبکرؓ کا مامور

کیا جانا خبرِ واحد کی حجیت کی کھلی دلیل ہے۔

(۸) اسی طرح سنہ ۹ ہجری میں ہی اسی حج کے موقعے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا گیا تاکہ وہ کفار کو سورۂ برات کی تازہ نازل شدہ آیات سُنا کر ہشیار کر دیں کہ اُنھوں نے خود بدعہدی کی ہے اب اللہ کا بھی ان سے کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک فردِ واحد کو احکام قرآنی پہونچانے کے لیے روانہ فرمانا صرف اسی صورت میں کارآمد اور مفید ہو سکتا تھا جب اس کا قول لوگوں پر حجت ہوتا۔

(۹) حجۃ الوداع کے موقعے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے حق میں باوازِ بلند تعریفی کلمات ارشاد فرمائے جو آپؐ کی بات یاد رکھ کر دوسروں تک پہونچائے۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

نضر الله عبدًا سمع مقالتي فوعاها ثم اداها الى من لم يسمعها۔ (صحاح)۔	ترو تازہ رکھے اللہ اس بندے کو جس نے میری بات سُنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سُنا اس تک اس کو پہونچایا۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایک شخص کے لیے اپنی بات کو محفوظ کر کے دُوسرے شخص تک پہونچانے پر خوشی کا اظہار فرمایا ہے۔ حدیث میں واحد کا صیغہ عبدًا استعمال کیا گیا ہے جو فردِ واحد پر دلالت کرتا ہے معلوم ہُوا فردِ واحد کی اطلاع دُوسرے کے لیے قابلِ حجت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کی اطلاع پر خوشی کا اظہار نہ فرماتے اور نہ خبر دینے والے کے حق میں آپؐ کی زبان مبارک سے دُعائیہ کلمات صادر ہوتے:

(۱۰) یہی حجۃ الوداع کا موقعہ ہے اور یہی منیٰ کا میدان ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبے کا اختتام اس مشہور متواتر فقرے پر ختم فرماتے ہیں کہ اَلا فلیبلغ الشاهد الغائب (چاہیئے کہ جو حاضر ہے وہ غائب تک پہونچاتا جائے) یہاں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاداتِ نبوی روایت کرنے والے کے لیے واحد کا صیغہ شاہد استعمال کیا ہے جو ظاہر ہے فردِ واحد پر دلالت

کرتا ہے اگر فرد واحد کی اطلاع دوسرے کے لیے قابلِ حجت نہ ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم واحد کے بجائے بالالتزام جمع کا صیغہ استعمال فرماتے۔

یہ چند واقعات ہم نے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کر دیے ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے ایسی بے شمار نظیریں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے خبر واحد کا حجت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس قسم کے واقعات کے علاوہ ایسے نظائر بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اطراف و اکناف میں اپنے عمال روانہ فرمائے مگر کہیں بھی ان میں عدد کا کوئی لحاظ نہیں کیا اکثر و بیشتر آپ نے ایک ایک ہی عامل روانہ فرمایا چنانچہ حضرت قیس بن عاصمؓ، حضرت زبرقان بن بدرؓ اور حضرت ابن نویرہؓ کو فرداً فرداً ہی اپنے قبائل کی طرف بھیجا۔ اسی طرح وفد بحرین کے ساتھ حضرت سعید بن العاص کو اور یمن کے بالمقابل حضرت معاذ بن جبل کو روانہ کیا۔ آپؐ نے جتنے عمال بھی بھیجے ہیں تاریخ کے اوراق میں ان کے نام بھی محفوظ ہیں اور وہ مقامات بھی درج ہیں جہاں انہیں بھیجا گیا لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ کبھی آپؐ نے بطورِ خاص ان میں عدد کا لحاظ کیا ہو۔ آپؐ نے اگر اہتمام کیا تو صرف اس بات کا کہ ایسے لوگ بھیجے جائیں جو معروف ہوں اور لوگ ان کی صداقت و امانت سے آشنا ہوں۔ تاریخ میں کہیں منقول نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاملوں کے ساتھ کسی نے یہ مناقشہ کیا ہو کہ چونکہ یہ ایک ہی فرد ہے اس لیے اس کو صدقات و عشر نہیں دئیے جائیں گے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مختلف دیار و امصار کی طرف فوجی دستے روانہ کرتے تو ایک ایک صحابی کو ہی دستے کا امیر مقرر فرماتے چنانچہ جب مقام موتہ کی طرف فوج روانہ کی تو حضرت زید بن حارثہؓ کو سالار لشکر مقرر فرمایا، ان کے شہید ہونے پر حضرت جعفرؓ کو اور پھر ان کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ کو امیرِ لشکر مقرر کیے جانے کی تاکید فرمائی۔

اس کے علاوہ ایک زمانے میں آپؐ نے دعوت اسلام کے لیے مختلف بلاد میں بارہ قاصد روانہ فرمائے اور صرف اس بات کا خیال رکھا کہ ہر علاقے میں ایسا شخص بھیجا

جائے جو ان اطراف میں متعارف ہوتا کہ اس کے جھوٹے ہونے کا شبہ نہ رہے اور لوگوں کو اس کا اطمینان ہو جائے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہے چنانچہ حضرت دحیہ کلبی کو اس علاقے کی طرف ایلچی بنا کر بھیجا گیا جہاں وہ لوگوں میں جانے پہچانے تھے اسی طرح اپنے عمال کی طرف خطوط بھیجنے کے لیے آپؐ نے انہی لوگوں کو سفارت پر مامور فرمایا جو مرسل الیہ کے لیے متعارف اور قابل اعتماد ہوتا تھا کبھی آپؐ نے یہ اہتمام نہیں فرمایا کہ ایک شخص کے بجائے ایک جماعت کو سفارت کے لیے روانہ کیا جائے نہ ہی کسی عامل یا قاضی نے ایک فرد واحد کے ذریعے موصول شدہ خطوط پر کبھی کسی شک و شبہ کا اظہار کیا جب بھی کسی عامل کے پاس آپؐ کا کوئی خط پہونچا ہمیشہ فوراً اس نے اس کو نافذ کیا۔

غرض عہد رسالت کے یہ تمام واقعات اور حیات نبوی علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام کے یہ تمام نظائر اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ خبر واحد کی حجیت کو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سند قبول حاصل ہے۔

خبر واحد کی حجیت اور عہد صحابہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد عہد صحابہ میں بھی ایسی واضح شہادتیں موجود ہیں جو اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ صحابہ کے درمیان خبر واحد کی حجیت کو ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت حاصل تھی۔ اس ضمن میں بھی چند نظائر کا پیش کرنا مناسب رہے گا۔

(۱) ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ آپؐ کی تدفین کس جگہ عمل میں لائی جائے تو کون نہیں جانتا کہ اس کا فیصلہ ایک خبر واحد ہی کی بنیاد پر کیا گیا حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ الانبیاء یدفنون حیث یموتون (انبیاء جہاں فوت ہوتے ہیں وہیں دفن کیے جاتے ہیں) اس خبر کو سننے کے بعد کسی ایک زبان کو بھی یہ کہتے نہیں سنا گیا کہ اس خبر پر کوئی شاہد لاؤ کسی نے بھی اس پر عمل کرنے کے لیے تواتر کی شرط نہیں لگائی دنیا جانتی ہے کہ اسی خبر واحد کی تعمیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین حضرت عائشہؓ کے حجرۂ مبارکہ ہی میں عمل میں آئی جہاں آپؐ کی وفات ہوئی تھی اسی طرح سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعے میں ایسے موقعے پر جبکہ خلافت کے مسئلے پر

صحابہ کے اختلاف نے نزاع کی شکل اختیار کرلی تھی اور عقل پر جذباتیت کے غالب آنے کا خدشہ پیدا ہو چکا تھا ایک خبر واحد ہی تھی جس نے آناً فاناً صحابہ کے باہمی اختلاف کا خاتمہ کر دیا اور سب کے سر تسلیم و رضا کے اظہار میں جھکے نظر آنے لگے اس وقت بھی صرف تن تنہا حضرت ابوبکر ہی تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد روایت کرتے ہوئے سنے گئے کہ الائمۃ من القریش (خلفا قریش میں سے ہوں گے) حضرت ابوبکر کی زبان سے ان الفاظ کے نکلنے کی دیر تھی سارے اختلافات مٹ گئے اور قریش میں سے خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کا معاملہ پیش آیا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے باغ فدک کا مطالبہ ہوا اور آپؐ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے سہم خیبر پر اپنا حق جتایا تو اس کا فیصلہ بھی خبر واحد ہی کی بنیاد پر کیا گیا حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں سے فرمایا:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا نورث ما ترکنا صدقۃ (بخاری)	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم (گروہ انبیاء) کا کوئی وارث نہیں ہوتا ہم جو چھوڑ جاتے ہیں وہ سب صدقہ ہے۔

اور پھر اسی حدیث پر آپ نے عمل فرمایا حضرت فاطمہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے سامنے (فنی طور پر خبر واحد ہونے کے باوجود) سر تسلیم خم کر دیا نیز تمام صحابہؓ کرام نے حضرت ابوبکرؓ کے اس فیصلے سے اتفاق کیا۔

اگر صحابہ کے درمیان خبر واحد حجت نہ ہوتی تو نہ حضرت ابوبکر محض اپنی معلومات پر اکتفا کر کے کوئی فیصلہ دیتے اور نہ دیگر صحابہ ہی حضرت ابوبکر کے اس فیصلے کو قبول کرتے معلوم ہوا خبر واحد کی حجیت صحابہ کے درمیان مسلّمہ تھی۔

بلکہ اوپر کے ان دو واقعات سے تو خبر واحد کی حجیت پر صحابہؓ کرام کا اجماع ثابت ہوتا ہے کیونکہ ان محولہ بالا تمام اخبار آحاد کو تمام صحابہ نے بالاجماع قبول کیا ہے اور اس

لحاظ سے کہ صحابہ کرام کا یہ اجماع ہم تک بالتواتر منقول ہے اگر ہم یہ کہیں تو قطعاً غلط نہ ہوگا کہ خبر واحد کی حجیت کو تواتر کی سند حاصل ہے۔

(۳) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کہ کیا کسی شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ سنا ہے کہ اگر جھگڑے میں کسی عورت کا حمل ساقط ہو جائے تو اس کی جزا کیا دینی چاہیئے؟ یہ سن کر حضرت حمل بن مالک کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ ایک مرتبہ میری دو لونڈیوں کے درمیان لڑائی ہو گئی ایک نے دوسری کے خیمے کی چوب دے ماری جس کے صدمہ سے اس کا حمل ساقط ہو گیا مقدمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا آپؐ نے قاتلہ پر پانچ سو درہم بطور دیت لازم فرمائے۔ حضرت حمل سے یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا اگر ہم یہ حدیث نہ سنتے اور اپنی رائے سے فیصلہ کرتے تو شاید اس کے خلاف فیصلہ کرتے۔

حضرت حمل بن مالکؓ کی یہ روایت ظاہر ہے خبر واحد تھی اگر حضرت عمرؓ کے نزدیک خبر واحد حجت نہ ہوتی تو یقیناً حضرت حمل سے شاہد طلب کرتے یا بصورت دیگر اس کو رد کر کے اپنے عقل کے مطابق فیصلہ دیتے مگر ایسا نہیں ہوا حضرت حمل کی روایت کردہ حدیث سن کر حضرت عمر جو فیصلہ صادر کرنا چاہتے تھے اس سے باز رہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق فیصلہ دے دیا۔

(۴) جب حضرت عمرؓ ملک شام کے سفر پر تھے تو راستے میں آپ کو پتہ چلا کہ وہاں طاعون پھیلا ہوا ہے اس موقعے پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد نقل کیا جس میں ذکر ہے کہ ایسے علاقے میں جانا ممنوع ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کے سنتے ہی جو ظاہر ہے خبر واحد تھی آگے سفر جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور مدینہ منورہ لوٹ آئے۔

(۵) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مجوس سے جزیہ لینے کے بارے میں تردد تھا مگر جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ہی کی زبانی ان تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پہونچا کہ مجوس سے اہل کتاب کا سا برتاؤ کیا جائے نیز یہ کہ آپؐ نے مقام ہجر کے

مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا تو اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا سابقہ خیال ترک کر دیا اور مجوس سے جزیہ لینا شروع کر دیا۔ اس ارشاد نبوی کی روایت میں بھی حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اکیلے ہی تھے اور اس لیے فنی طور پر یہ روایت بھی خبر واحد ہی کا درجہ رکھتی تھی مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خبر واحد کو بغیر کسی پس و پیش کے قبول کر لیا اور اپنے خیال سے رجوع کر کے مجوس کے ساتھ اہل کتاب کا سا برتاؤ کرنے لگے۔

(۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیت کے مسئلے میں اس رائے کے حامل تھے کہ بیوی کو اپنے شوہر کی دیت سے وراثت نہ ملنی چاہیئے حضرت ضحاک بن سفیان کو معلوم ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے لکھا تھا کہ اشیم ضبابی کی بیوی کو اس کی دیت سے حصہ دیا جائے یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خیال سے رجوع فرمالیا۔

(۷) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اپنے عہد خلافت میں ایک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ایسے قول یا فعل کی تلاش تھی جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہو کہ شوہر کی وفات کے بعد بیوی کے لیے اپنی عدت کی مدت شوہر ہی کے گھر میں پوری کرنی ضروری ہے یا یہ مدت وہ اپنے والدین یا اور کسی عزیز رشتے دار کے گھر میں رہ کر بھی پوری کر سکتی ہے۔ حضرت فریعہ بنت مالک بن سنان کو جن کے ساتھ یہ صورت حال پیش آچکی تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس بارے میں ایک ارشاد معلوم تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کیا حکم دیا تھا انہوں نے بتلایا کہ آپؐ نے انہیں شوہر ہی کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت عثمان نے یہ سنا تو اسی کے مطابق مقدمات فیصل کرنے لگے۔

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایسی خبر واحد بھی قبول کر لی جو صرف ایک عورت کی روایت کردہ تھی۔

(۸) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سن رکھا تھا کہ کوئی حاجی آخری طواف یعنی

طواف وداع کیے بغیر وطن واپس نہیں جا سکتا، ان کے نزدیک حائضہ عورت بھی اس ممانعت میں شامل تھی چنانچہ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر حائضہ عورت یوم النحر میں طواف کر چکی ہو تو آخری طواف سے قبل واپس جا سکتی ہے تو انہیں بہت تعجب ہوا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں استفسار کیا انہوں نے ایک انصاری عورت کا حوالہ دیا کہ ان سے مجھے یہ حدیث پہونچی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس امر کی اجازت دی تھی اسی کی بنیاد پر میں ایسا فتویٰ دیتا ہوں۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ ان انصاری صحابیہ کے پاس پہونچے انہوں نے تصدیق کی حضرت زید مطمئن ہو گئے اور اپنے موقف سے رجوع فرمالیا۔

یہ واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما جیسے فقیہ صحابہ نے بھی محض ایک عورت کی روایت کردہ خبر واحد کو بھی بلا تردد قبول فرمالیا۔

(۹) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ابتداء میں مخابرہ کے قائل تھے یعنی بٹائی پر زمین دیا کرتے تھے اور اس میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے، حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے یہ سُنا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے مخابرہ ترک کر دیا۔

(۱۰) حضرت عبداللہ ابن عباس کے سامنے کسی شخص کا یہ قول بیان کیا گیا کہ قرآن کریم میں حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس میں حضرت خضر کے ساتھی جس موسیٰ کا ذکر ہے وہ وہ موسیٰ نہ تھے جن کو بنی اسرائیل کی جانب نبی بنا کر مبعوث کیا گیا تھا بلکہ کوئی اور شخصیت تھے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ سُن کر کہا "دشمن خدا جھوٹ کہتا ہے۔ مجھے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار خطبہ دیتے ہوئے ہمیں حضرت خضر و حضرت موسیٰ علیہما السلام کا واقعہ سنایا جس سے ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت خضر کے ساتھی حضرت موسیٰ وہی تھے جو بنی اسرائیل کی جانب نبی ہو کر آئے تھے۔"

یہ واقعہ بھی اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس جیسے فقیہ صحابی نے ایک فرد واحد کی روایت کردہ حدیث کو تاکید کے ساتھ دلیل کے طور پر پیش فرمایا جو بلاشبہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے نزدیک خبر واحد حجت تھی۔

یہ دس شہادتیں[1] ہم نے عہد صحابہ سے بھی پیش کر دی ہیں یہ تمام اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ عہد رسالت کی طرح عہد صحابہ میں بھی خبر واحد کو معتبر قابل قبول اور حجت تسلیم کیا جاتا تھا۔

عہد صحابہ کے ان واقعات کی جو توجیہ منکرین حدیث کی جانب سے پیش کی جاتی ہے وہ اگرچہ اس قابل تو نہیں کہ اسے اہمیت دی جائے اور یہاں زیر بحث لایا جائے لیکن احقاق حق اور اتمام حجت کی خاطر اس کی اصل حقیقت اگر واضح کر دی جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ خبر واحد کو قبول کرنے میں صحابہ کا طرز عمل تو حق بجانب تھا کیونکہ عہد صحابہ میں شاہد کا ملنا ممکن تھا لیکن زمانۂ مابعد میں راوی کی حیثیت شاہد کی نہیں رہی بلکہ مدعی کی ہو گئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امت کے جملہ افراد پر ایک عقیدے یا عمل کی پابندی عائد کرنا چاہتا ہے اور اس کا بیان بھی واسطر در واسطہ ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے دعوے پر دو شاہد عادل پیش کرے جو گواہی دیں کہ اس نے فلاں سے ہمارے سامنے سنا ہے پھر اسی طرح سلسلہ کے آخر تک منکرین حدیث کے نزدیک ہر راوی کی سماعت کے دو گواہ ہونے ضروری ہیں۔

اس سلسلے میں اولاً تو قابل غور بات یہ ہے کہ منکرین حدیث جس طرح زمانۂ مابعد کے راوی پر یہ لازم ٹھہراتے ہیں کہ وہ دو شاہد عادل پیش کرے اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر تو اس ذمہ داری کا بار اس صحابی کی گردن پر ہونا چاہیئے جس نے کوئی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی ہے اس لیے کہ سب سے پہلا مدعی تو وہ ہے امت کے جملہ افراد پر کسی

---

[1] یہ تمام شہادتیں جامع بیان العلم جلد ا صد ۱۹۳ سے ماخوذ ہیں۔

عقیدے یا عمل کی پابندی عائد کرنے کی بنیاد تو سب سے پہلے اسی نے رکھی ہے سب سے پہلے اس کے ذمے ہے کہ وہ اپنے اس دعوے کے لیے دو گواہ لائے کہ اس نے یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے اگر وہ گواہ نہیں لاتا یا دوسرا شخص اس سے گواہوں کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ بغیر گواہوں کے اس کا دعویٰ قبول کر لیا جاتا ہے تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ راوی کے لیے دراصل عدد کی شرط ہی غلط ہے۔

دوسرے غور طلب امر یہ ہے کہ خلاف واقعہ یہ بات کیونکر فرض کر لی گئی کہ صحابہ نے تمام روائیتیں براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر بیان کی ہیں اس لیے ان کی حیثیت مدعی کی نہیں رہی ۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ صحابہ کی روایتوں میں ایسی روائتیں بھی شامل ہیں جو انہوں نے خود نہیں بلکہ کسی دوسرے صحابی سے سُن کر بیان کی ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

ما کل ما نحدّث به سمعناه من رسولِ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ولٰکن کان یحدّث بعضنا بعضاً۔
(مستدرک للحاکم)

جو حدیث ہم بیان کرتے ہیں وہ تمام ہم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنیں بلکہ (ان میں وہ حدیثیں بھی ہیں جو) ہم میں سے بعض بعض سے روایت کرتا تھا ۔

ایسی روایتوں کے لحاظ سے جو صحابہ نے براہِ راست صاحب نبوت سے نہیں سنیں ایک صحابی راوی کی حیثیت بھی ٹھیک وہی حیثیت ہو جاتی ہے جو زمانہ مابعد کے راوی کی بنتی ہے اس کے علاوہ یہ بات بھی تو اصولی طور پر مسلّم نہیں کہ جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست حدیث سنی ہے اس کی حیثیت مدعی کی نہیں رہتی ۔ جب یہ بات ہے تو آخر اس کو بارِ ثبوت سے سبکدوش کس بنا پر سمجھ لیا جائے ۔ رہی یہ بات کہ عہد صحابہ میں شاہد کا ملنا ممکن تھا تو اوّل تو یہ ایک عذرِ لنگ سے زیادہ کچھ نہیں دوسرے یہ کونسا عقلی یا شرعی قاعدہ ہے کہ کسی مدعی کے حق میں دعوے کی ڈگری صرف اس بنا پر دے دی جائے کہ وہ گواہ پیش کر سکتا ہے ۔ کیا یہ کوئی معقول بات ہو گی کہ شاہد مل جانے کے محض امکان کی بنیاد پر مدعی سے شہادت کا مطالبہ ہی نہ کیا جائے ۔ غرض ایک صحابی راوی اور زمانۂ مابعد کے راوی کی حیثیتوں کے

درمیان شاہد اور مدعی ہونے کی کوئی تفریق قائم کرنا اور اس کو خبرِ واحد کی حجیت و عدم حجیت کے لیے معیار قرار دینا کسی طرح بھی معقول اور مناسب نہیں۔

بہرحال اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک طرف قرآنی تائیدات ہیں، عہدِ رسالت کے نظائر ہیں اور عہدِ صحابہ کی شہادتیں ہیں جو خبرِ واحد کی حجیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں اور دُوسری طرف منکرینِ حدیث کا بلادلیل یہ دعویٰ ہے کہ خبرِ واحد حجت نہیں۔ اب ہر صاحبِ عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کونسی بات حق ہے اور قابلِ قبول ہے اور کونسی بات محض باطل ہے اور قابلِ رد ہے۔

خبرِ واحد کی حجیت عہدِ صحابہ کے بعد

بات صرف عہدِ صحابہ تک ہی محدود نہیں عہدِ صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین کے دَور میں بھی خبرِ واحد کی حجیت کو ایک مسلّمہ حقیقت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الرسالۃ" میں اخبارِ آحاد کی حجیت کے اثبات میں جو ایک طویل مقالہ تحریر فرمایا ہے اس میں انہوں نے مدینہ و مکہ، کوفہ و بصرہ اور یمن و شام کے متعدد اصحاب کے نام گنوائے ہیں۔ جو اخبارِ آحاد کو باہم نقل و روایت کرتے ان کو قبول کرتے ان کی روشنی میں فتویٰ دیتے اور ان کو دین میں بلا نزاع و جدال حجت قرار دیتے تھے امام شافعیؒ نے اس ضمن میں سلف سے لیکر خلف تک بکثرت ائمہ محققین کے اسماءِ گرامی ذکر کیے ہیں ان میں سے چند کے نام اگر ہم یہاں شمار کرا دیں تو فائدے سے خالی نہ ہو گا۔

اہلِ مدینہ

(۱) محمد بن جبیر	(۲) نافع ابن جبیر	(۳) یزید بن طلحۃ
(۴) محمد بن طلحۃ	(۵) نافع ابن عجیر	(۶) ابو سلمۃ بن عبد الرحمٰن
(۷) حمید بن عبد الرحمٰن	(۸) خارجۃ بن زید	(۹) عبد الرحمٰن بن کعب
(۱۰) عبد اللہ بن ابی قتادۃ	(۱۱) سلیمان بن یسار	(۱۲) عطاء بن یسار

اہلِ مکہ

(۱) عطاء (۲) طاؤس (۳) مجاہد
(۴) بن ابی ملیکہ (۵) عکرمہ بن خالد (۶) عبیداللہ بن ابی یزید
(۷) عبداللہ بن باباہ (۸) بن ابی عمارہ (۹) محمد بن المنکدر

اہلِ کوفہ

(۱) اسود (۲) علقمہ (۳) شعبی

اہلِ بصرہ

(۱) عبدالرحمٰن بن غنم (۲) حسن (۳) محمد بن سیرین

اسی طرح یمن میں وہب بن منبہؒ اور شام سے مکحولؒ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں یہ تمام اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ایک صحابی سے روایت کرتے تھے اور اس ایک صحابی کی حدیث کی بنیاد پر فتوے صادر کرتے تھے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ اگر بالفرض کسی خاص مسئلے کے متعلق کسی کے لیے یہ کہنا جائز ہوتا کہ اس پر مسلمانوں کا ہمیشہ اجماع رہا ہے تو خبر واحد کی حجیت کے متعلق بھی میں یہ بات کہہ دیتا مگر اسے احتیاط کے خلاف سمجھ کر اتنا پھر بھی کہتا ہوں کہ اہلِ اسلام کے فقہاء میں سے مجھے ایک نام بھی ایسا معلوم نہیں جس کے بارے میں کہا جاسکے کہ وہ خبر واحد کو حجت تصوّر نہیں کرتا تھا ان کے مابین یہ مسئلہ سرے سے متنازعہ تھا ہی نہیں۔

غرض خبر واحد کی حجیت عقل سے ثابت ہے قرآن سے ثابت ہے حدیث سے ثابت ہے صحابۂ کرام کے آثار سے ثابت ہے اور تمام محدثین و مجتہدین و ائمہ محققین سے ثابت ہے جبکہ اس کے بالعکس خبر واحد کی عدم حجیت ان میں سے کسی ایک ذریعے سے بھی ثابت نہیں ہوتی ہے ان لوگوں کی کم عقلی پر جو اُس بات سے تو انکاری ہیں جو ہر ذریعے سے ثابت متحقق ہے اور اس بات کو منوانے پر بضد ہیں جو ہر قسم کے ثبوت سے عاری ہے۔

بہر حال حقائق کے انکار سے حقائق کے وجود پر کوئی زد نہیں پڑا کرتی منکرین حدیث انکار کرتے ہیں تو کرتے رہیں خبر واحد ہمیشہ سے دین میں حجت تھی، حجت ہے اور ہمیشہ حجت رہے گی کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خبر واحد کو صرف اس لیے موجب عمل نہ سمجھے کہ وہ تواتر کی حد کو نہیں پہونچی۔ خبر واحد پر عمل نہ کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ خبر حد صحت کو نہ پہونچی ہو یا اس کے معارض اس سے زیادہ کوئی صحیح حدیث موجود ہو لیکن اگر خبر واحد کا بیان کرنے والا سچا اور ثقہ ہو مطاعن روایت میں سے کوئی طعن اس میں موجود نہ ہو نیز کوئی صحیح حدیث اس خبر واحد کے معارض نہ ہو تو کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خبر واحد کو موجب عمل نہ سمجھے اور اسے ترک کر دے۔

منکرین حدیث کے دلائل

خبر واحد کی حجیت پر عقلی و نقلی حیثیت سے اس تفصیلی گفتگو کے بعد ہم ان دلائل کا تجزیہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو حدیث کی تشریعی حیثیت کو مشکوک بنانے کے لیے خبر واحد کی عدم حجیت پر منکرین حدیث کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی طرف سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا لب لباب درج ذیل چار نکات میں منحصر ہے:

(۱) خبر واحد جس طریق سے مروی و منقول ہوتی ہے وہ ظنّی ہے کیونکہ راوی سے خطا و نسیان سرزد ہونے کا احتمال باقی رہتا ہے اور جس میں خطا و نسیان کا احتمال ہو وہ قطعی و حتمی نہیں ہو سکتی لہٰذا اس سے استدلال کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

(۲) اگر فروعات میں خبر واحد موجب عمل ہے تو اصول و عقائد میں بھی اسے موجب عمل ہونا چاہیئے حالانکہ اس پر فریقین کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ عقائد میں خبر واحد پر عمل نہیں کیا جا سکتا بنا بریں جب عقائد میں خبر واحد پر عمل درست نہیں تو فروعات میں بھی جائز نہیں۔

(۳) حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول کر نماز عصر کے چار فرضوں کے بجائے دو فرض ادا کیے ذوالیدین نامی صحابی نے جب آپ کو اس سے آگاہ کیا تو ان کی بات تسلیم کرنے میں آپ کو تامّل ہوا جب حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما

اور دیگر شرکاءِ نماز نے اس کی تائید کی تو آپ نے باقی ماندہ دو رکعتیں ادا کیں اور دو سجدہ ہائے سہو کیے اگر خبرِ واحد حجت ہوتی تو آپ صرف ذوالیدین کے کہنے پر نماز مکمل کر لیتے اور اس میں توقف نہ فرماتے۔

(۴) متعدد صحابہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ خبرِ واحد پر عمل نہیں کرتے تھے مثلاً حضرت ابوبکرؓ نے دادی کی میراث سے متعلق مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت کو اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک محمد بن مسلمہؓ نے اس کی تائید نہ کر دی اسی طرح حضرت عمرؓ نے طلب اذن کے بارے میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت پر شاہد مانگا اور جب ابوسعید نے ان کے حق میں شہادت دی تب ان کی روایت کو قبول کیا

ان چاروں نکات پر ہم فرداً فرداً گفتگو کریں گے مگر ان چاروں میں سے منکرینِ حدیث سب سے زیادہ زور چونکہ اس نکتہ پر دیتے ہیں جو خبرِ واحد کی ظنی حیثیت سے متعلق ہے اور جو سب سے پہلے بیان ہوا ہے اس لیے اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

خبرِ واحد کی حجیت کے خلاف منکرینِ حدیث کی اس دلیل کی تمام تر بنیاد چونکہ اس پر ہے کہ وہ مفید ظن ہوتی ہے اور دین کی بناء ظنیات پر قائم نہیں کی جا سکتی اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے ظن کے صحیح مفہوم کی تحقیق کر لی جائے۔

ظن کے صحیح مفہوم کی تحقیق

لفظ ظن کلامِ عرب میں دو معنی میں مستعمل ہے ایک گمانِ غالب جو کسی دلیل عقلی یا نقلی کی بنا پر پیدا ہو مگر قطعی نہ ہو دوسرے تخمین و اندازہ اور اٹکل جس کا مطلب ہے محض اپنے خیال اور نفسانی خواہش سے بے دلیل اور بے تحقیق بات کا پیدا ہونا۔ خبرِ واحد جس ظن کو مفید ہوتی ہے وہ پہلی قسم کا ہے جو تمام عقلاء کے نزدیک حجت ہے۔ قابلِ رد جو ظن ہے وہ وہ ہے جو دوسری قسم کو شامل ہے۔ منکرینِ حدیث کی بنیادی غلطی یہی ہے کہ انہوں نے خبرِ واحد سے پیدا ہونے والے ظن کو دوسری قسم پر محمول کیا اور اسے رد کر دیا۔

قرآنِ کریم میں جہاں جہاں ظن کی مذمت وارد ہوئی ہے یہ وہ ظن ہرگز نہیں ہے جو ادلہ شرعیہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کا مصداق وہ ظن ہے جو محض اپنی

جانب سے پکائے ہوئے بے بنیاد خیالات پر مشتمل ہو۔ وہ ظن جو ادلۂ شرعیہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے قرآن نے اس کی مذمت میں کہیں ایک حرف بھی نہیں کہا۔ منکرین حدیث ظن کی مذمت میں قرآنی آیات کے حوالے تو دیتے چلے جاتے ہیں مگر یہ غور کرنے کی تکلیف گوارہ نہیں کرتے کہ اس سے کونسا ظن مراد ہے۔ مثال کے طور پر اُسی آیت کو لے لیجئے جو ظن کی رد میں بڑی شد و مد سے پیش کی جاتی ہے یعنی

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (النجم - ۲۸)	اور اٹکل حق کے مقابلے میں ذرا بھی کام نہیں دیتی۔

یہ سورۂ نجم کی آیت ہے اس آیت کے سیاق و سباق کو دیکھ لیجئے کہا یہ جا رہا ہے کہ جو لوگ[1] آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو مؤنث ناموں سے پکارتے ہیں حالانکہ اس کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں یہ لوگ محض اٹکل پر چل رہے ہیں" اور اٹکل حق کے مقابلے میں ذرا بھی کام نہیں دیتی"۔ اب ظاہر ہے فرشتوں کو مؤنث قرار دینے کے لیے منکرین آخرت کے پاس نہ کوئی عقلی دلیل تھی نہ نقلی۔ بلا دلیل محض اپنے دماغ میں انہوں نے یہ پکا لیا تھا کہ فرشتے مؤنث ہیں اور اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ تو قرآن نے یہاں جس ظن کی مذمت کی ہے وہ وہی ہے جو خود تراشیدہ خام خیالی پر مبنی ہو۔ اسی طرح ظن کی مذمت میں قرآن کی ایک اور آیت ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ قرآن جس ظن کی مذمت کرتا ہے وہ کونسا ظن ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ہے۔

یَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِیَّةِ۔ (آل عمران - ۱۵۴)	یہ لوگ اللہ کے بارے میں خلاف حقیقت خیالات جاہلیت کے خیالات قائم کر رہے تھے۔

اس آیت میں ظن الجاہلیۃ اور غیر الحق کے الفاظ سے واقعی ظن کی مذمت ثابت ہوتی ہے مگر کونسے ظن کی؟ اس ظن کی جو اس پوری آیت میں بیان ہوا ہے یعنی منافقین کی یہ بدگمانی کہ مسلمانوں کو اللہ کی نصرت نصیب نہ ہوگی۔ یہ پوری آیت ذرا پڑھ کر دیکھئے ثُمَّ اَنْزَلَ

---

[1] حوالہ کے لیے دیکھئے سورۂ نجم کی ستائیسویں اور اٹھائیسویں آیت۔

عليكم من بعد الغم امنة نعاسا يغشىٰ طائفة منكم و طائفة قد اهمتهم انفسهم يظنون بالله غير الحق ظن الجاهلية (پھر اس نے اس غم کے بعد تمہارے اوپر راحت نازل کی (یعنی) غنودگی کہ اس کا تم میں سے ایک جماعت پر غلبہ ہو رہا تھا اور ایک جماعت وہ تھی کہ اسے اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی۔ یہ لوگ اللہ کے بارے میں خلاف حقیقت جہالت کے سے خیالا قائم کر رہے تھے) یہ مضمون جنگ اُحد سے متعلق ہے اس وقت جب میدان اُحد میں مسلمانوں کو ایک عارضی شکست کا سامنا کرنا پڑا تو منافقین جو مسلمانوں ہی کی صفوں میں ملے جلے تھے گھبرا اُٹھے انہیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے وہ مسلمانوں سے حجت و تکرار کرنے لگے کہ تم سے جو وعدۂ نصرت تھا وہ کیا ہوا۔ اب اللہ سے متعلق منافقین کی یہ بدگمانیاں بلا شبہ خلاف واقعیت و خلاف حقیقت تھیں کسی دلیل کی بنیاد پر ہرگز نہ تھیں اور قرآن ان کی انہی بدگمانیوں کو ظن الجاهلية سے تعبیر کر رہا تھا۔

قرآن نے ایک اور موقعہ پر ظن کو خواہشات نفسانی کے متوازی ذکر کر کے اس کی مذمت کی ہے مگر وہاں بھی اگر غور سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ظن قرآن کی نظر میں وہ مذموم ہے جو محض بے بنیاد خیالات پر مبنی ہو۔ سورۂ نجم ہی کی ایک آیت ہے:

ان يتبعون الا الظن وما تهوى الانفس ولقد جاءهم من ربهم الهدىٰ (نجم - ۲۳)۔	یہ لوگ نری اٹکل اور اپنے نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت آ چکی ہے۔

غور کیجئے اس آیت میں ظن کے متوازی نفسانی خواہشات کے ذکر سے جہاں ظن کی مذمت ہوتی ہے وہاں ظن کے متقابل ہدایت کے ذکر سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ظن وہی مذموم ہے جو ہدایت پر مبنی نہ ہو محض بے بنیاد تخمینات کی پیداوار ہو۔ اس آیت کا سیاق بھی یہی بتلا رہا ہے کہ وہ ظن جس کو وما تهوى الانفس کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا وہ کسی عقلی یا نقلی دلیل پر مبنی نہ تھا بلکہ اپنے دماغ سے گھڑ کر ایک غلط خیال قائم کر لیا گیا تھا اس آیت سے پہلی آیتوں کے مضمون میں غور کیجئے ذکر یہ ہو رہا ہے کہ مشرکین

مکہ نے بعض بتوں کو جن کو وہ دیویاں تصور کرتے تھے اللہ کی بیٹیاں جو سمجھ رکھا ہے تو یہ سب نام ہی نام ہیں جو انہوں نے اور ان کے باپ دادوں نے اپنی طرف سے ٹھہرا لیے ہیں اللہ نے تو ان کے اس عمل پر کوئی دلیل نہیں اتاری ما انزل اللہ بھا من سلطٰن (اللہ نے تو اس پر کوئی دلیل اتاری نہیں ہے۔ نجم - ۲۲) پھر اس کے بعد یہ متذکرہ بالا آیت ہے کہ یہ لوگ صرف اٹکل اور اپنے نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے" معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس ظن کی مذمت ہے وہ وہی ہے جو بلا دلیل ہو۔

قرآن نے بعض آیات میں تو یہ بات بالکل ہی واضح کر دی ہے کہ قرآن کی نظر میں ظنّ مذموم وہ ظن ہے جو شک اور وہم کے ہم معنی ہے جس کی بنیاد محض غلط قیاسات اور باطل اندازے ہوا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے :

و ان الذین اختلفوا فیہ لفی شک منہ مالھم بہ من علم الا اتباع الظنّ۔ (نساء - ۱۵۷)	اور یہ لوگ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں یہ ان کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس کوئی علم تو ہے نہیں ہاں بس گمان کی پیروی ہے۔

جن لوگوں کے متعلق اس آیت میں شک کی حالت میں ہونا بیان کیا گیا ہے انہی کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ ظن کی اتباع کرتے ہیں اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ قرآن کہنا یہ چاہتا ہے کہ ان کے ظن کی بنیاد شک ہے اگر یہاں اصطلاحی ظن مراد ہوتا تو شک کے ساتھ اس کا ذکر بے معنی ہوتا کیونکہ اصطلاحی لحاظ سے تو شک اور ظن دو متقابل چیزیں ہیں مترادف نہیں ہیں اسی طرح ایک اور مقام پر قرآن نے ظن اور خرص (یعنی باطل تخمینے) کو باہم مترادف اور ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ سورۂ یونس کی ایک آیت ہے:

وما یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکاء ان یتبعون الا الظن و ان ھم الا یخرصون (سورہ یونس - ۶۶)	اور وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ شرکاء کو پکارتے ہیں یہ صرف خیال کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور محض (باطل) تخمینے لگاتے ہیں۔

اس آیت کا اندازِ بیان بھی صاف بتلا رہا ہے کہ ظن کا خرص کے مترادف ہونا ہی ظن کے مذموم ہونے کا سبب ہے۔

غرض قرآن میں جہاں کہیں ظن کی مذمت بیان ہوئی ہے وہاں وہی ظن مراد ہے جو خود اپنے دماغ سے تراش لیا جائے۔ محولہ بالا آیات میں قارئین نے دیکھ ہی لیا ان جملہ مواقع پر جتنے ظنون ہیں وہ سب سُنی سنائی باتوں اور غلط قیاسات کا نتیجہ ہیں یہ سب وہ ظنون ہیں جو شریعت کے خلاف یعنی اللہ اور اس کے رسول کے بیان کردہ عقائد کے خلاف قائم کر لیے گئے ہیں۔ ان کا تو مذموم ہونا ظاہر ہے جب اللہ کی جانب سے حق بات پہونچا دی جائے تو پھر تو اس کے خلاف نہ ظن معتبر ہوتا ہے نہ یقین۔ منکرین حدیث نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ظن کی مذمت اس لیے کی گئی ہے کہ وہ ظن ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اُنہوں نے اتنا نہ سوچا کہ وہ ظن جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے وہ اگر یقین کے مرتبہ میں داخل ہو جائے تو اور زیادہ قابل مذمت ہو جاتا ہے جبکہ خبر واحد سے پیدا ہونے والا ظن اگر یقین کے مرتبے پر پہونچ جائے تو منکرین حدیث کے نزدیک بھی مستحسن اور قابل اعتماد بن جاتا ہے۔ غور کا مقام ہے فرض کیجئے کسی خبر واحد کے بارے میں تحقیق کے بعد پتہ لگے کہ وہ خبر متواتر کی تمام صفات سے متصف ہے تو ظاہر ہے یہی کہا جائے گا کہ اس خبر میں جو ظنیت تھی وہ قطعیت میں تبدیل ہو گئی یعنی ظن ترقی کر کے یقین میں پہونچ گیا پھر خود منکرین حدیث کے نزدیک بھی اسی خبر پر عمل واجب ہو گا اس کا مطلب یہ ہوا کہ خبر واحد سے پیدا ہونے والا ظن یقین میں بدل جائے تو اور زیادہ وقیع ہو جاتا ہے اس کے مقابلے میں وہ ظن جو محض اپنی دماغی ایجاد اور خواہش نفس کی بنا پر ہو اس کی حقیقت میں ذرا غور کیجئے وہ یقین کی حد میں داخل ہو گا تو اور زیادہ مذموم سمجھا جائے گا۔ بھلا وہ ظن جو محولہ بالا پہلی آیت میں کفار مکّہ کو فرشتوں کے متعلق تھا یا وہ ظن جو دوسری آیت میں منافقوں کو اللہ کی نصرت کے بارے میں تھا یا اسی طرح وہ ظن جو مشرکین مکّہ نے اپنی دیویوں کے بارے میں قائم کر لیا تھا یہ تمام ظنون جو قرآن نے بیان کیے ہیں بھلا یہ اگر یقین کے مرتبہ پر پہونچ جائیں تو کیا وقیع اور قابلِ اعتماد ہو جائیں گے؟ یقیناً نہیں! یہ تمام ظنون یقین میں

تبدیل ہو کر تو اور زیادہ مذموم بن جائیں گے۔ معلوم ہوا قرآن جس ظن کا ذکر کرتا ہے وہ مذموم ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ محض ظن ہے یقین کی حد کو نہیں پہونچا بلکہ اس لیے ہے کہ اس کی حقیقت بے تحقیق بات اور باطل قیاس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ ظنی احکام جو ظنی احادیث سے ثابت ہوں قرآن نے ان کے خلاف کہیں بھی کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔

دراصل قرآن کی اصطلاح میں ظن، یقین اور شک کے بالمقابل کسی حالت کا نام نہیں ہے بلکہ انسان کے اپنے ہی ایک تخمینے کا نام ہے جو واقعات کی نوعیت کے لحاظ سے یقین اور وہم دونوں حالتوں کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن ایک مقام پر نماز کا ذکر کرتے ہوئے خاشعین کے متعلق کہتا ہے:

وانها لكبيرة الا على الخاشعين
الذين يظنون انهم ملاقوا ربهم
(البقرة: ۴۵-۴۶)

وہ بہت گراں ہے مگر خاشعین پر نہیں جنہیں یہ خیال رہتا ہے کہ انہیں اپنے پروردگار سے ملنا بھی ہے۔

اس آیت میں ظن یقین کے ساتھ جمع ہے اس لیے کہ نماز پڑھنے والے خاشعین کو قیامت کا ظن نہیں بلکہ کامل یقین حاصل تھا جیسا کہ قرآن خود اس بات کی گواہی دیتا ہے:

وبالآخرة هم يوقنون (البقرة - ۴)

اور آخرت پر وہ پورا یقین رکھتے ہیں۔

جب کہ دوسری مثال میں دیکھئے ظن وہم کے ساتھ بھی جمع ہے قرآن کفار کے متعلق کہتا ہے:

الا يظن اولئك انهم مبعوثون
ليوم عظيم. يوم يقوم الناس
لرب العلمين (المطففين: ۴-۶)

کیا انہیں ان کا خیال نہیں کہ انہیں ایک بڑے سخت دن میں زندہ اٹھایا جانا ہے یہ وہ دن ہے جس میں سب لوگ پروردگار کے روبرو کھڑے ہونگے۔

ظاہر ہے کفار کو قیامت کا یقین کب تھا صرف وہم کے درجے میں ایک موہوم سا خیال ضرور تھا جیسا کہ قرآن نے ان کا قول نقل کرتے ہوئے کہا ہے:

ما ندري ما الساعة ان نظن الا ظنا
وما نحن بمستيقنين (جاثیہ: ۳۲)۔

ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے ہمیں قیامت کا یونہی خیال سا ہے ہم ہرگز اس پر یقین لانے والے نہیں۔

چونکہ ظن یقین کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا تھا اس لیے وما نحن بمستیقنین کے الفاظ اس بات کی تصریح کر رہے ہیں کہ کفار کا یہ ظن وہ ظن نہیں جس کے بعد یقین پیدا ہو سکے بلکہ یہ ان اوہام کے قبیلے کی چیز ہے جو جانب مخالف کے بارے میں یقین رکھتے ہوئے بھی دماغ میں اپنا گذر رکھ سکتی ہے۔

یہ دونوں مثالیں اس بات کی دلیل ہیں کہ قرآن کی نظر میں ظن یقین کے بالمقابل کسی چیز کا نام نہیں بلکہ اس خیال آرائی کا نام ہے جو انسانی فطرت کی سلامتی اور کجی کے اعتبار سے یقین اور وہم دونوں حالتوں کو اپنی ذات میں سموئے ہوئے ہے سلیم الفطرت انسان اکثر واقع کے مطابق ہی ظن کیا کرتا ہے جیسا کہ خاشعین کا لقاءِ رب کے بارے میں ظن کرنا اور کج فطرت انسان ہمیشہ اٹکل کے تیر چلاتا ہے اور وہم کی بھول بھلیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے جیسا کہ کفار کا قیامت کے بارے میں موہوم سا خیال رکھنا۔

غرض اب تک کی بحث سے معلوم ہوا کہ وہ ظن جو قابلِ مذمت ہے وہ علم کی کسی کیفیت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ محض خیال آفرینی اور قیاس آرائی ہے جبکہ اس کے بالعکس خبر واحد سے پیدا ہونے والا ظن علم ہی کی ایک قسم ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن وحدیث نے بتائی یا صحابہ سے منقول ہوئی وہ علم ہے خواہ وہ قطعیت کے درجے میں ہو یا ظنیت کے درجے میں۔

صحابہ کے آثار میں غور کرنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ بات جو ان تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہونچی ان کے لیے علم کی حیثیت کی حامل تھی ظن کے لفظ کا استعمال ان کے درمیان صرف اس رائے کے لیے کیا جاتا تھا جو محض اپنی عقل سے کسی شرعی بنیاد کے بغیر قائم کی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن اپنے خطبے میں فرمایا:

ایھا الناس اِن الرأی انما کان من رسولِ اللّٰہ مصیبًا لأنّ اللّٰہ کان یریہٗ وانّما ھو منّا الظنّ والتکلّف۔

(جامع بیان العلم)۔

اے لوگو جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کا تعلق ہے سو وہ درست تھی کیونکہ اللہ آپؐ کی رہنمائی کرتا تھا ہماری رائے تو صرف ظن اور تکلف ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جو رائے اللہ کی ارادۃ اور اصابت کے ساتھ ہو حقیقی معنی میں صرف اسی کا نام رائے ہے اور صرف وہی درست اور ٹھیک ہے یعنی علم کی حیثیت صرف اسی کو حاصل ہے اس کے علاوہ جو رائے محض اپنی جانب سے ہو اللہ کی ارادۃ اس میں شامل نہ ہو یعنی جس کی بنیاد قرآن اور حدیث پر نہ ہو وہ رائے کہلائے جانے کی مستحق ہی نہیں اس کو صرف ظن اور تکلف ہی کہا جا سکتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی معاملے کے متعلق انہیں کتاب و سنت میں کوئی فیصلہ نہ ملتا تو توقف فرماتے اور فیصلہ نہ دیتے پھر فرماتے اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنے ظن اور الکل سے بتلا دوںؓ گویا یہ جتلا دیتے کہ ہر وہ بات جو کتاب و سنت کے علاوہ ہے وہ ظن اور الکل سے زیادہ کچھ نہیں۔

اپنی جانب سے تخمینہ اور خیال آرائی کے لیے صحابہ کبھی ظن اور تکلف کے الفاظ ساتھ ساتھ استعمال کرتے جیسا کہ حضرت عمرؓ کے قول سے ظاہر ہے اور کبھی صرف ظن کا لفظ استعمال میں لاتے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے کلام سے واضح ہے جبکہ کبھی اپنے تخمینوں کو صرف تکلف کے لفظ سے تعبیر فرماتے چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے ان الفاظ پر غور کیجیے:

من کان عندہٗ علم فلیعلمہ الناسَ وإن لم یعلم فلا یقولنّ ما لیس لہٗ بہ علم فیکون من المتکلفین (اعلام الموقعین ج ۱ صـ)	اگر کسی کے پاس کوئی علم ہو تو وہ لوگوں کو سکھلا دے اور اگر علم نہیں رکھتا تو وہ بات منہ سے نہ نکالے جس کا اس کو علم نہیں تاکہ متکلفین میں اس کا شمار نہ ہو جائے۔

حضرت ابوموسیٰ کے ان الفاظ سے معلوم یہ ہوا کہ جب کبھی بات کا علم نہ ہو تو اپنی بے علمی چھپانے کے لیے اپنی جانب سے جو بات گھڑ لی جائے وہ تکلف ہے۔ آپ غور کریں تو

لہ اعلام الموقعین ج ۱ صـ ۴۹

ظن کی حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ محض اس خیال کا نام ہے جو خود اپنے دماغ سے تراش لیا جائے۔

ظن اور تکلف کے علاوہ اپنی طرف سے تخمین اور خیال آرائی کے لیے کبھی کبھی صحابہ مطلقاً رائے کا لفظ بھی استعمال کرتے تھے جیسا کہ حضرت ابوبکر رضہ کا ایک قول ہے آپ فرمایا کرتے تھے کہ "میں کس زمین کے اوپر اور کس آسمان کے نیچے رہ سکتا ہوں اگر قرآن کی کسی آیت میں صرف اپنی رائے سے کوئی بات کہوں یا ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں ہے[1]" مگر ایسی صورت میں وہ رائے جو کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ کے تحت ہوتی تھی اس کو مطلقاً رائے نہیں کہا جاتا تھا بلکہ کتاب وسنت کی قید لگا کر اس کو ممیز کر دیا جاتا تھا چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس کے ایک قول میں اس تقسیم کی طرف اشارہ موجود ہے آپ فرمایا کرتے

من أحدث رأيا ليس في كتاب الله ولم تمض به سنة من رسول الله لم يدر على ما هو منه اذا لقى الله عز وجل	جس نے کوئی ایسی رائے ایجاد کی جو قرآن میں نہیں اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق ہے وہ نہیں جانتا کہ کل قیامت میں اس کا کیا حشر ہوگا۔

(اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۲)

غرض صحابہ کے یہ تمام اقوال اس بات پر شاہد ہیں کہ ظن جسے صحابہ تکلف اور رائے سے بھی تعبیر کرتے تھے وہ علم کی کسی قسم کا نام نہیں تھا بلکہ صرف تخمینی باتوں کو ظن کہا جاتا تھا اس کے مقابلے میں ہر وہ بات جو کلام اللہ یا سنت رسول اللہ کے ذریعے ان تک پہونچتی صحابہ کے نزدیک اسے علم کا درجہ حاصل تھا متذکرہ بالا اقوال صحابہ میں ظن اور تکلف کے بالمقابل علم کا بطور خاص ذکر بھی اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ ظن اور علم ان کے یہاں دو متقابل چیزوں کا نام تھا۔

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۲

جس طرح اپنی رائے اور اپنے تخمینوں کے لیے ظن کے لفظ کا استعمال صحابہ کے یہاں رائج تھا اسی طرح ہر وہ بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو خواہ وہ خبر واحد ہی کے درجے میں کیوں نہ ہو اس کے لیے صحابہ کے یہاں علم کی اصطلاح کا رواج تھا۔ اس کے لیے بہترین شہادت وہ واقعہ ہے جو ملک شام کی طرف حضرت عمرؓ کے تاریخی سفر میں پیش آیا اور جس کا ذکر ہم اوپر بھی کہیں کر چکے ہیں طاعون زدہ علاقوں میں رہنے نہ رہنے کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کی تو نقل کرنے سے پہلے فرمایا "میرے پاس اس مسئلے کے متعلق ایک علم [1] ہے"۔ ظاہر ہے یہ حدیث خبر واحد تھی کہ اس کے راوی اکیلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ہی تھے اس خبر واحد کو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے علم سے موسوم کیا اور اسی علم کی بنیاد پر حضرت عمرؓ آگے سفر جاری رکھنے کے بجائے واپس مدینہ لوٹ آئے۔

صحابہ کے بعد تابعین اور ائمہ مجتہدین و محدثین کے درمیان بھی ظن اور علم یا رائے اور علم دو متقابل چیزوں کے طور پر مسلم رہے ابن سعد نے طبقات میں حضرت عطاء بن ابی رباح کے حال میں لکھا ہے کہ ابن جریج کہا کرتے تھے:

کان عطاءٌ إذا حدّث بشیءٍ قلتُ علمٌ أو رأیٌ فإن کان أثرًا قال علم وإن کان رأیًا قال رأیٌ (طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۳۲۵)	عطاء جب کوئی روایت بیان کرتے تو میں پوچھتا کہ علم ہے یا رائے اگر حدیث ہوتی تو کہتے علم ہے اور اگر رائے ہوتی تو کہتے کہ رائے ہے۔

امام اوزاعی فرمایا کرتے تھے کہ علم صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے منقول ہو اور جو ان سے منقول نہیں وہ علم ہی نہیں [2]۔

---

[1] ازالۃ الخفاء ۲ ص ۱۳۵ [2] جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۲۹

ظن کی حجیت

ظن کے صحیح مفہوم کی اس تحقیق کے بعد کیا اس امر میں کسی شبہ کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ ظن صرف وہ مذموم اور قابل رد ہے جو محض تکلف اور خود ساختہ رائے پر مبنی ہو۔ رہا وہ ظن جو خبر واحد سے حاصل ہوتا ہے اس کے قابل مذمت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ علم ہی کی ایک قسم ہے اسے قبول کیے بغیر چارہ ہی نہیں۔ دیکھا جائے تو انسان کے تمام دلائل کی پرواز صرف ظن ہی کی حد تک محدود ہوتی ہے اس کے بعد یقین کا حاصل ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی بخشش پر منحصر ہے۔ انسان تو جس حد تک مکلف ہے وہ صرف تحصیل ظن ہے یقین کی وہ منزل جس میں جانب مخالف کا گذر تک نہ ہو بہت نادر ہے۔ اگر تمام شریعت کی بنیاد ایسے ہی یقین پر قائم مانی جائے تو فروعات تو درکنار اصول کے بہت سے مسائل بھی دلائل کی روشنی میں اس قسم کے یقین کی حد تک ثابت ہونا مشکل ہیں۔ اسی لیے تحصیل یقین کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے اعتماد پر ان کی تمام باتوں کو بے دلیل مان لیا جائے۔ احکام الٰہیہ میں غور کیجئے جہاں ہمیں بلا تردد یقین رکھنے کا مکلف بنایا گیا ہے وہاں دلائل کی تحصیل کا حکم نہیں دیا گیا اور جہاں اجتہاد و استدلال کا حکم دیا گیا ہے وہاں یقین کے آخری مراتب کا مکلف نہیں بنایا گیا بلکہ ظن ہی کو یقین کا حکم دے دیا گیا ہے اس لیے کہ انسان کے دلائل کی پرواز محدود ہی صرف تحصیل ظن تک ہے۔

اگر ہر ہر قدم پر یقین کا حاصل کرنا فرض کر دیا جاتا تو دین و دنیا دونوں کے نظام معطل ہو کر رہ جاتے جیسا کہ اس مضمون کی ابتدا میں ہم نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ دراصل شہادت اور خارجی دلائل کی روشنی میں جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اس کا نام ظن ہے ہی نہیں وہ یقین ہی ہے خواہ عقلی طور پر اس میں کتنے ہی شبہات باقی رہیں مثلاً اگر ایک کنوئیں میں نجاست کا گرنا ثابت نہیں ہو سکا تو اس کو پاک ماننا یقینی ہو گا حالانکہ یہ احتمال ہر وقت ممکن ہے کہ اس میں نجاست گر گئی ہو اور اس کا ہمیں علم نہ ہو لیکن جب اس احتمال کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں تو اس کا اعتبار

بھی نہیں۔ بہرحال اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی کسی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ مسائل فروعیہ میں ہرگز اس یقین کا اعتبار نہیں ہے جو تواتر سے حاصل ہوتا ہے بلکہ ہر وہ یقین جو دلائل کی رہبری و رہنمائی میں حاصل ہو جائے وہ بھی بلا تردد معتبر ہے اب خواہ آپ اس کا نام یقین رکھ لیں خواہ اسے ظن سے تعبیر کریں۔

دراصل منکرین حدیث کو غلط فہمی محدثین کے اس بیان سے لگ گئی کہ خبر متواتر علم یقین کو مفید ہوتی ہے اور خبر واحد علم یقین کو مفید نہیں ہوتی وہ محدثین کے اس بیان کو پوری طرح سمجھ نہیں سکے انہوں نے سوچا کہ جب خبر واحد مفید علم یقین نہ ہوئی تو یقیناً مفید علم ظن ہوئی نتیجتاً خبر متواتر کے علاوہ جتنی حدیثیں ہیں وہ سب ظنیات کا مجموعہ ہیں اور ظن ہی کو مفید ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ محدثین نے جس علم کو خبر متواتر کے ساتھ مخصوص کیا ہے وہ صرف علم بدیہی ہے یعنی وہ علم جو کسی دلیل و برہان کے بغیر حاصل ہوتا ہے جیسا کہ آفتاب کے وجود کا علم کہ ہر مسلم و کافر، ہر جوان اور بوڑھا اور ہر احمق و عاقل شخص اس کے وجود کا علم رکھتا ہے اور اس کے لیے کسی دلیل کا محتاج نہیں لیکن ظاہر ہے ایسا علم صرف اپنے مشاہدات پر ہی حاصل ہو سکتا ہے اس کے سوا اگر ہزاروں افراد بھی کسی بات کو نقل کریں تو اس قسم کا علم حاصل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر دیکھئے لاکھوں کروڑوں انسان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ کا عقیدہ رکھتے ہیں یا لاکھوں کروڑوں انسان ایسے ہیں جو آواگون کے قائل ہیں مگر ان کروڑہا کروڑ انسانوں کی خبر کے بعد بھی یقین تو درکنار اس کا ظن بھی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ یہاں خبر متواتر کی اور شرطوں کے علاوہ سب سے بڑی یہ شرط مفقود ہے کہ اس کا مبنیٰ امر محسوس نہیں بلکہ امر معقول ہے اور اتنی بات تو منکرین حدیث بھی مانتے ہیں کہ خبر متواتر کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کا مبنیٰ امر محسوس ہو۔ نیز اس خبر کو سنتے ہی سامع کو یقین حاصل ہو جائے اور وہ کسی دلیل کا محتاج نہ رہے۔

معلوم ہوا محدثین نے خبر واحد سے جس علم کی نفی کی تھی وہ علم بدیہی تھا منکرین حدیث اپنی ناسمجھی کی بنا پر خبر واحد سے مطلق علم ہی کی نفی کر بیٹھے۔ محدثین کے مذکرہ بالا

قول کا مطلب یہ تھا کہ خبرِ واحد سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ خبرِ متواترہ کی طرح علم بدیہی نہیں ہوتا بلکہ کبھی ظنی ہوتا ہے اور کبھی نظری۔ یہی وجہ ہے کہ خبرِ متواترہ سے علم حاصل ہونے میں سب لوگ یکساں ہوتے ہیں خواہ ان میں غور و فکر کی صلاحیت ہو یا نہ ہو لیکن خبرِ واحد سے علم حاصل کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جن میں نظر و فکر کی اہلیت موجود ہو خبرِ واحد سے ہر شخص کو یکساں علم حاصل نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ خبرِ متواترہ میں سند سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی جبکہ خبرِ واحد میں یہ ضرورت باقی رہتی ہے[1]۔

اب خبرِ متواترہ کے ساتھ علم بدیہی کی شرط رکھ کر غور کیجئے اگر تمام دین کی بنیاد علم بدیہی ہی پر قائم کی جائے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلے گا کہ تمام دین کو قطعی طور پر حاصل کرنے کے بجائے پورے دین سے ہی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ عقائد اصول شرائع، مغیبات اور دین کے تمام نظری مسائل سب ظنی ہو جائیں گے اور منکرین حدیث کی دلیل کے مطابق قابلِ اعتبار نہ رہیں گے۔

منکرین حدیث ذرا یہ تو بتلائیں کہ اگر ظن ان کی نظر میں ایسا ہی قابلِ رد ہے تو ان احکام کے متعلق ان کی کیا رائے ہے جو قرآن کریم سے ظنی طور پر ثابت ہیں کیا وہ بھی خبرِ واحد کی طرح ان کے نزدیک معاذ اللہ قابلِ رد ٹھہریں گے؟ قرآن کا ایک ایک حرف اگرچہ متواتر ہے لیکن اس کے باوجود اس کے جو مسائل فروعیہ اس سے مستنبط ہوتے ہیں ان کے متواتر ہونے کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ ضروری نہیں کہ جبکا ثبوت قطعی ہو اس کی دلالت بھی قطعی ہو آیات قرآنیہ یقیناً تمام کی تمام قطعی الثبوت ہیں انکے ثبوت میں ذرہ برابر کسی قسم کا شبہ نہیں لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہر آیت قطعی الدلالۃ بھی ہے۔ ظاہر ہے نہیں، آیاتِ قرآنی دلالت علی المعنیٰ میں باہم مختلف ہیں بعض آیات کی دلالت کسی معنیٰ اور مفہوم پر قطعی ہے جبکہ بعض آیات کی دلالت کسی خاص مفہوم اور خاص معنیٰ پر ظنی ہے مثال کے طور پر قرآن کا کوئی لفظ ہے کہ اس کے معنی میں ائمۂ لغت کا اختلاف

---

[1] شرح نخبۃ الفکر

ہے یا کوئی اعرابی مسئلہ ہے کہ ائمہ نحو اس میں مختلف رائے رکھتے ہیں یا اسی طرح کوئی کوئی بلاغی مسئلہ ہے کہ ائمہ بلاغت کے اس میں مختلف اقوال ہیں تو ایسی صورت میں وہ لفظِ قرآنی متعدد معانی کو محتمل ہوگا چنانچہ اس کی دلالت اپنے معنی پر قطعی نہ ہوگی بلکہ ظنی ہوگی اور جو احکام اس قسم کے الفاظ پر مشتمل آیات سے ثابت ہوں گے ظاہر ہے وہ بھی ظنی ہوں گے قطعی نہ ہوں گے، لہٰذا اگر اخبارِ آحاد ظنی ہونے کی وجہ سے قابلِ رَد ہیں تو منکرین حدیث ذرا بتلائیں کہ وہ احکام جو قرآن کریم سے ظنی طور پر ثابت ہیں کیا وہ بھی آپ کے نزدیک معاذ اللہ قابلِ رَد ہیں۔

اسی طرح منکرین حدیث کی ان احکام قرآنی کے متعلق کیا رائے ہے جن کا مبنیٰ کوئی امرِ غیر محسوس ہے کیا وہ سب متواتر کی تعریف پر پورے اترتے ہیں؟ مبنیٰ غیر محسوس ہونے کی بنا پر متواتر کی فہرست سے تو وہ نکل گئے کیا ان احکام کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے گا؟ سوچنے کی بات ہے قرآن کو متواتر کہنے کا کیا مطلب ہے؟ یہی نا کہ یہ وہی قرآن ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اس کے علاوہ جتنے اس کے غیر محسوس احکام ہیں جتنے عالم غیب کے اسرار و حقائق ہیں کیا وہ سب بھی متواتر ہیں؟ کیا تواتر کی ساری شرائط ان میں موجود ہیں؟ کیا سامع کو سننے کے ساتھ ہی فوراً ان تمام غیر محسوس احکام پر عالمِ غیب کے ان تمام اسرار و حقائق پر بلا دلیل یقین حاصل ہو جاتا ہے؟ ظاہر ہے ایسا نہیں ہے قرآن اگر متواتر ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کے الفاظ تواتر کے ساتھ سنے گئے ہیں جب احکام کا مرحلہ آئے گا تو اکثر آیات کا مفہوم غیر محسوس ہونے کی بنا پر متواتر نہ رہے گا اور جو متواتر نہ ہو وہ مفید یقین نہیں ہوتا تو کیا منکرین حدیث ان تمام احکام کا انکار کر دیں گے؟

غرض دین کے تمام احکام کو اگر تواتر کی شرط کے ساتھ مشروط کر دیں گے تو فروعی مسائل تو درکنار بہت سے اصولی احکام کو بھی ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا لہٰذا یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ خبر واحد سے حاصل ہونے والا علم ظنی ہونے کے باوجود قابلِ قبول اور موجب عمل ہے بشرطیکہ وہ خبر کسی سچے اور ثقہ راوی سے مروی ہو نیز کوئی دلیل قطعی اس

کے معارض نہ ہو۔

شریعت نے کسی خبر کی تصدیق کا معیار تواتر رکھا ہی نہیں جہاں بھی زور دیا ہے راوی کی عدالت پر اور اس کے صدق پر زور دیا ہے۔ شریعت نے جان تک کے معاملے میں دو شخصوں کے بیان کا اعتبار کر لیا ہے اور ایک جگہ بھی خبر کی تصدیق کے لیے تواتر کی شرط نہیں لگائی اگر دو شخصوں کے بیان پر ایک مسلمان کو قصاصاً قتل کیا جا سکتا ہے یا ایک چور کا ہاتھ کاٹا جا سکتا ہے یا ایک شخص پر حد قذف لگائی جا سکتی ہے یا لاکھوں کروڑوں کی مالیت تقسیم کی جا سکتی ہے تو کیا یہ اس بات کا بدیہی ثبوت نہیں ہے کہ شریعت نے یقین کا معیار تواتر نہیں رکھا کیا یہ سمجھنا کسی طرح بھی درست ہوگا کہ شریعت نے ایک مسلمان کا قتل، ایک معصوم ہاتھ کا قطع ایک بے گناہ پر حد قذف اور لاکھوں کروڑوں کی مالیت کی تقسیم جیسے معاملات کو یقین حاصل ہوئے بغیر محض ظن کی بنا پر جائز قرار دے دیا ہے۔ دینی ثبوت کے لیے یقین کا مطالبہ تو معقول ہو سکتا ہے مگر تواتر کی شرط لگانا بالکل بے معنی بات ہے۔ منکرین حدیث یا تو یہ ثابت کر کے دکھائیں کہ شریعت نے تواتر کے علاوہ یقین کو یقین ہی نہیں کہا یا پھر یہ ثابت کریں کہ خبر واحد کسی صورت بھی مفید یقین ہوتی ہی نہیں اگر خارجی قرائن ملا کر کبھی خبر واحد بھی یقین کا فائدہ دے سکتی ہے اور شریعت کے نزدیک یہ یقین معتبر بھی ہے تو پھر یہ تفریق کہ اس قسم کا یقین دین میں معتبر ہے اور اس قسم کا نہیں بالکل غیر معقول اور لایعنی بحث ہے۔ حق یہ ہے کہ یقین کا افادہ صرف تواتر میں منحصر نہیں بلکہ جب متفرق دلائل اور خارجی و داخلی قرائن کسی ایک امر کی شہادت دیتے چلے جائیں تو اس میں لفظی تواتر نہ سہی مگر ایک قسم کا معنوی تواتر ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور اس مجموعے سے یقین حاصل ہو جاتا ہے۔

خبر واحد کی ظنیت پر اب تک جو گفتگو ہوئی ہے اس سے یہ بات اگرچہ ثابت ہو چکی ہے کہ خبر واحد مفید علم ظنی ہونے کے باوجود قابل استناد اور موجب عمل ہے تاہم اس ضمن میں ایک آخری بات کہہ کر ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور منکرین حدیث کی دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

علامہ ابن حزم نے الاحکام[۱] میں خبر واحد کی حجیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اخبار آحاد کی حجیت کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ ظنی نہیں بلکہ قطعی ہے اس لیے کہ عصر صحابہ سے لے کر آج تک اس بات پر علماء کا اجماع منعقد ہوتا چلا آیا ہے کہ خبر واحد حجت ہے اب اس پر کسی کا اختلاف بھی ہو تو وہ ظاہر ہے اجماع پر اثر انداز نہیں ہو سکتا اس لیے ثابت ہوا کہ خبر واحد کی حجیت کی تعمیل ایک ظنی دلیل کی پیروی نہیں بلکہ ایک قطعی دلیل یعنی اجماع کا اتباع ہے۔

اُصول و فروع کا فرق

اب آئیے منکرین حدیث کی دوسری دلیل کی طرف، خبر واحد کی عدم حجیت کے بارے میں ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جب اُصول وعقائد میں خبر واحد پر عمل درست نہیں تو فروعات میں بھی درست نہیں ان کے خیال کے مطابق خبر واحد اگر موجب عمل وقابل استناد ہے تو اصول و فروع دونوں میں ہونا چاہیئے اور اگر اُصولیات میں وہ قابل استناد نہیں تو پھر فروعات میں بھی اس کا قابل استناد ہونا جائز نہیں۔

منکرین حدیث کی اس دلیل کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ یا تو قطعی دلائل کے وجوب کے سلسلے میں فروع کو بھی اصول وعقائد پر قیاس کیا جائے یا پھر ظنی دلائل کے موجب عمل ہونے کے لیے اصول وعقائد کو بھی فروع پر محمول کیا جائے اور یہ دونوں باتیں محالات کی فہرست میں آتی ہیں نہ فروع کو اصول پر قیاس کیا جا سکتا ہے اور نہ اصول کو فروع پر۔ یہ اس قدر بدیہی بات ہے کہ اس سے اختلاف و نزاع صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کا مقصود مناظرہ بازی سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ کیا یہ بات بھی کسی دلیل کی محتاج ہے کہ اصول دین' دین کی بنیاد ہوتے ہیں اگر وہ ظنی ہوں گے تو دین کی بنیاد ہی کا ظنی امور پر قائم ہونا لازم آئے گا جبکہ فروع پر دین کی بنیاد قائم نہیں ہوتی وہ اصول دین کے ماتحت ہوتے ہیں اگر فروعات میں ظنیت ہو تو کوئی نقصان لازم نہیں آتا اس لیے

---

[۱] الاحکام لابن حزم جلد ۱ صفحہ ۱۱۴

کہ اُصول جن کی درا صل وہ حفاظت میں ہیں وہ خود اپنی جگہ قطعیت لیے ہوئے ہیں اس کی مثال بالکل قانونی دفعات کی سمجھئے قانون کے الفاظ اپنے اجمال کے ساتھ قطعی ہوتے ہیں اور اس کی ضمنی دفعات و تشریحات لبا اوقات ظنی ہوتی ہیں - فروع کے لیے قطعیت کا مطالبہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ مطالبہ کرنے لگے کہ کسی ملک کے آئین اساسی کو تمام جزئی قوانین کا احاطہ کیے ہوئے ہونا چاہیئے جس طرح اس مطالبے کو ہر کوئی غیر معقول اور ناقابلِ عمل کہے گا اسی طرح یہ مطالبہ بھی غیر معقول اور ناقابل عمل ہی کہلائے گا کہ فروع کے لیے بھی دلیل قطعی کا ہونا لازمی ہے -

فروعات میں جن ظنیات کا اعتبار ہے وہ سب وہ ظنیات ہیں جو کسی نہ کسی قطعی اصل کے ماتحت درج ہیں - ایسی ظنیات کا دین میں کوئی اعتبار نہیں جن کے لیے کسی قطعی اصل کی شہادت موجود نہ ہو بلکہ امام شاطبی کی تحقیق کے مطابق تو ایسی ظنیات کا دین میں وجود ہی کوئی نہیں امام شاطبی نے الموافقات میں دلائل شرعیہ کی چار قسمیں بیان کی ہیں اول دلیل قطعی دوم وہ دلیل ظنی جو کسی قطعی اصل کے ماتحت ہے سوم وہ دلیل ظنی جو کسی قطعی کے معارض ہے اور دوسری کوئی قطعی دلیل اس کے لیے شاہد بھی نہیں ایسی ظنی دلیل یقیناً قابل قبول نہیں اور چہارم وہ دلیل ظنی کہ نہ اس کی موافقت میں کوئی دلیل قطعی ہاتھ آئے نہ مخالفت میں - اس چوتھی قسم کے متعلق امام شاطبی فرماتے ہیں :

والاستقراء یدل علی انہ غیر موجود (الموافقات جلد ۳ صفحہ ۲۶)	تلاش و جستجو کہتی ہے کہ ایسی دلیل کا وجود ہی نہیں -

بہر حال جب یہ ثابت ہے کہ تمام فروعات کسی نہ کسی قطعی اصل کے ماتحت مندرج و مندمج ہیں تو ان کے ظنیات پر قائم ہونے سے کوئی نقصان لازم نہیں آتا بخلاف اصولیات کے کہ ان کا قیام بھی اگر ظنیت پر ہو تو دین کی بنیاد ہی محل نظر بن کر رہ جائے بنا بریں اُصول و فروع کو اپنے اپنے ثبوت میں ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا -

ذوالیدین کی بات تسلیم کرنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تامل

خبر واحد کی عدم حجیت کے سلسلے میں منکرین حدیث کی تیسری دلیل ذوالیدین نامی صحابی کی بات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تامل سے متعلق ہے۔ ذوالیدین ایک صحابی کا لقب تھا ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے اسی لیے ان کا یہ لقب پڑ گیا تھا یہ واقعہ اس طرح پر ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عصر پڑھائی اور بھول کر بجائے چار فرضوں کے دو رکعت پر ہی سلام پھیر دیا مقتدیوں میں حضرت ابوبکر و عمرؓ بھی تھے، اور کسی کو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی ذوالیدین نامی صحابی نے سوال کیا "یا رسول اللہ کیا نماز کم ہو گئی یا آپ بھول گئے" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہ میں بھولا اور نہ نماز کم ہوئی" پھر آپ نے دوسرے صحابہ سے استفسار کیا کہ کیا ذوالیدین کی بات صحیح ہے حضرت ابوبکر و عمرؓ اور دوسرے شرکار نماز نے اس کی تائید کی تو آپ نے نماز کو درست کر لیا۔ یہ واقعہ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔

اس واقعے سے منکرین حدیث کا استدلال یہ ہے کہ اگر خبر واحد حجت ہوتی تو آپ صرف ذوالیدین کے کہنے پر نماز درست فرما لیتے ذوالیدین کی بات سن کر دوسروں سے آپؐ کا اس بارے میں استفسار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک خبر واحد موجب عمل نہ تھی۔

اس سلسلے میں ہمیں منکرین حدیث سے سب سے پہلے تو یہ پوچھنا ہے کہ جس مجموعہ احادیث سے آپ یہ محولہ بالا حدیث اپنے موقف کی تائید میں لائے ہیں اسی مجموعے میں وہ احادیث بھی تو ہیں جن سے آپ کے موقف کی کھلی تردید ہوتی ہے۔ اپنی تائید میں تو آپ کو صرف ایک حدیث ہی مل سکی ہے جبکہ آپ کی تردید کرنے والی احادیث بے شمار ہیں۔ صرف اس ایک حدیث کو قبول کرنے اور دوسری تمام احادیث کو رد کر دینے کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے۔ تو دس احادیث تو ہم نے ہی اس

زیر نظر تحریر میں آپ کے موقف کے رد میں پیش کی ہیں اس قسم کی احادیث آخر آپ کی توجہ کا مرکز کیوں نہ بنیں ؟

علاوہ ازیں اس محولہ بالا حدیث سے بھی منکرین حدیث کا استدلال اسی وقت درست ہوتا جبکہ یہ کہا جا رہا ہوتا کہ خبر واحد ہر حالت میں قابل قبول اور معتبر ہے یہ دعویٰ تو کسی کا بھی نہیں کہ خبر واحد کو بغیر کسی چھان بین کے قبول کر لو راوی کی عدالت و ثقاہت کی کوئی پرواہ نہ کرو روایت میں وہم و غلطی کی کوئی علامت ہو تو اس پر بھی کوئی دھیان نہ دو بس خبر واحد سنتے ہی اس کو موجب عمل جان لو۔ خبر واحد کے بارے میں ایسی بات تو کوئی بھی نہیں کہتا۔ قابل قبول معتبر اور موجب عمل تو وہی خبر واحد ہے جو کسی سچے اور ثقہ راوی سے مروی ہو راوی میں مطاعن روایت میں سے کوئی طعن نہ ہو اور کوئی دلیل قطعی اس کے معارض نہ ہو۔

اب ذوالیدین والی روایت میں غور کیجئے۔ ذوالیدین کی بات تسلیم کرنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لیے تامل ہوا کہ مبادا انہیں وہم ہو گیا ہو باقی شرکاء نماز کے بارے میں بہ صراحت یہ بات آئی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ پوچھتے ہوئے ڈر رہے تھے جب باقی نمازیوں نے یہ بات نہیں کی تھی تو آپؐ کو اکیلے ذوالیدین کی بات پر وہم کا گمان ہوا اور اس میں کسی کو بھی کلام نہیں کہ خبر واحد میں اگر وہم کی کوئی علامت پائی جاتی ہو تو اس میں توقف واجب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی لیے توقف فرمایا کہ وہم کی علامت موجود تھی جب دیگر حاضرین نے تائید کر دی تو ذوالیدین کی خبر واحد سے وہم کا احتمال جاتا رہا چنانچہ آپؐ نے اسے قبول کر لیا ؛

بعض صحابہ کے طرزِ عمل سے غلط استدلال

خبر واحد کی عدم حجیت پر منکرین حدیث کی چوتھی دلیل کا تعلق بعض صحابہ کے ایسے طرز عمل سے ہے جو بظاہر خبر واحد کی حجیت کے خلاف نظر آتا ہے۔

وہ لوگ مختلف صحابہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے

کہ وہ خبر واحد پر عمل نہیں کرتے تھے مثلاً حضرت ابوبکرؓ نے دادی کی میراث سے متعلق حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت کو اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک حضرت محمد بن مسلمہؓ نے اس کی تائید نہ کر دی اسی طرح حضرت عمرؓ نے طلب اذن کے بارے میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت پر شہادت طلب کی اور جب حضرت ابوسعید خدریؓ نے شہادت دی تب آپ نے اسے قبول کیا۔ علیٰ ہذا القیاس حضرت علیؓ کا حوالہ دیتے ہوئے منکرین حدیث کہتے ہیں کہ آپ کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ آپ حلف لیے بغیر کسی کی روایت قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ نیز حضرت عائشہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اس روایت کو قبول نہیں کیا تھا کہ گھر والوں کے رونے سے میت کو سزا دی جاتی ہے۔

منکرین حدیث کی یہ دلیل بھی باقی دوسری دلیلوں کی طرح بالکل بے بنیاد ہے یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جس میں کسی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ صحابہ اخبار آحاد پر عمل کرتے تھے۔ ابھی ہم "خبر واحد کی حجیت اور عہد صحابہ" کے ذیلی عنوان کے تحت متعدد حوالوں سے یہ بات ثابت کر آئے ہیں، منکرین حدیث کی جانب سے پیش کردہ ان متذکرہ بالا خاص خاص حوالوں کے بارے میں بھی اس کتاب کے پہلے حصے میں ہم نے "حفاظت حدیث اور خلفائے راشدینؓ" کے عنوان کے تحت بڑی سیر حاصل بحث کی ہے ناظرین براہ کرم ذرا پھر اس پوری بحث پر نظر ڈال لیں۔

منکرین حدیث نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا میراث جدہ کے متعلق جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے خبر واحد کی عدم حجیت کسی طرح ثابت نہیں ہوتی حضرت ابوبکرؓ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت قبول کرنے سے یہ تو کہا ہی نہیں جا سکتا کہ انکار کیا تھا زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ توقف کیا تھا توقف بھی اس لیے نہیں کیا تھا کہ آپ خبر واحد کو قبول نہ کرتے تھے بلکہ صرف اس لیے کیا تھا کہ آپ اصولی طور پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کوئی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف محض منسوب کر دینے سے ہی قابل قبول نہیں ہو جاتی بلکہ چھان بین اور تحقیق و تفتیش کے بعد بہ یقین حاصل

کرنا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس بات کو منسوب کرنے میں کسی غلط بیانی یا سہو کا دخل تو نہیں ۔ اسلام میں دادی کے لیے ترکہ کا چھٹا حصہ مقرر ہے چونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر قرآن نے صراحۃً روشنی نہیں ڈالی اس لیے اس کی تعمیل کرنے میں زیادہ حزم و احتیاط کی ضرورت تھی حضرت مغیرہؓ کی روایت پر حضرت ابوبکر کا گواہی مانگنا اعتماد کی شرط کے طور پر نہ تھا بلکہ محض مزید اطمینان کی ایک تدبیر تھی ۔ آپ اپنے طرزِ عمل سے یہ سبق سکھلانا چاہتے تھے کہ دین کا وہی حصہ کیوں نہ ہو جس کی بنیاد اخبار آحاد پر ہے اس کے رد کرنے یا قبول کر لینے میں لاپروائی سے کام نہیں لینا چاہیئے ۔

بالکل یہی بات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حضرت ابوموسیٰؓ کی روایت پر شہادت طلب کرنے کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے ۔ یہ مطالبہ اس لیے ہرگز نہ تھا کہ تنہا حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی روایت پر حضرت عمرؓ کو اعتماد نہ تھا کیونکہ اسی نوعیت کی تنہا راویوں کی روایت کردہ نہ جانے کتنی حدیثوں پر حضرت عمرؓ سے بارہا اعتماد کرنا ثابت ہے بلکہ تائید کا یہ مطالبہ صرف اس لیے تھا کہ تحقیق حدیث کے لیے جن اصول کی بنیاد حضرت ابوبکر رکھ گئے تھے حضرت عمرؓ اس کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنا چاہتے تھے حضرت عمرؓ چاہتے یہ تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یونہی لاپروائی سے کوئی بات منسوب نہ کی جائے بلکہ اعتماد میں قوت پیدا کرنے کے لیے جو تائید بھی مل سکتی ہو اس کو حاصل کیا جائے چنانچہ اس سلسلے میں حضرت ابی بن کعبؓ کے ایک استفسار پر حضرت عمرؓ نے اس حقیقت کا صراحتاً اظہار بھی فرمایا کہ حضرت ابوموسیٰؓ کی روایت پر تائید کا یہ مطالبہ محض تحقیق حدیث کے لیے تھا ۔ آپ نے فرمایا :

سبحان اللہ سبحان اللہ انما سمعت شیئا فاحببت ان اثبت ۔ (جمع الفوائد)	سبحان اللہ سبحان اللہ میں نے ایک بات سنی میں نے چاہا کہ اسے پایۂ ثبوت تک پہونچایا جائے ۔

اسی پر حضرت علی کے طرزِ عمل کو قیاس کر لیجئے ۔ حلف لیے بغیر کسی کی روایت کو قبول

نہ کرنے کا جو طریقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اختیار کر لیا تھا اس کا سارا پس منظر ہم اس کتاب کے پہلے حصے میں "حفاظت حدیث اور خلفائے راشدین" کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان کر آئے ہیں۔ اس پس منظر میں حضرت علی کے طرز عمل کا جو شخص بھی انصاف سے جائزہ لے گا وہ اسی نتیجہ پر پہونچے گا کہ آپ کا یہ طریقہ احادیث نبویہ پر اعتماد میں قوت پیدا کرنے کے لیے تھا۔ فرقہ سبائیہ نے جس انداز سے جھوٹ گھڑ گھڑ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کا دیدہ و دانستہ سلسلہ شروع کر رکھا تھا اس کی موجودگی میں حضرت علی رضہ کے پاس اسکے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا تھا کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کوئی بات حلف لیے بغیر قبول نہ کریں خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ کوفے میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دولت سے تو سرفراز ہوئے تھے لیکن شرف صحابیت سے محروم تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو اپنے کانوں سے سننے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت انہیں حاصل نہ تھی۔

رہی بات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کو قبول نہ کرنے کی جس کو حضرت عبداللہ ابن عمر نے نقل کیا تھا کہ گھر والوں کے رونے سے میت کو سزا دی جاتی ہے تو اس بارے میں منکرین حدیث کی ذرا علمی دیانت ملاحظہ ہو جنہوں نے اپنے مطلب کے لیے یہ تو نقل کر دیا کہ حضرت عائشہ رضہ نے اس روایت کو قبول نہ کیا تھا مگر اس روایت کو قبول نہ کرنے کی جو وجہ حضرت عائشہ رضہ نے بیان کی تھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ حضرت عائشہ نے اس روایت کو رد کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ قرآن تو کہتا ہے کہ لاتزر وازرۃ وزر اخریٰ (اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائیگا۔ فاطر ۱۸) اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عائشہ رضہ نے خبر واحد کے مقابلے میں ایک دلیل قطعی پیش کی تھی جو حضرت عائشہ رضہ کی نظر میں اس کے معارض تھی اور ایسی خبر واحد جس کے معارض کوئی دلیل قطعی ہو کسی کے نزدیک بھی قابل قبول نہیں۔ لہذا حضرت عائشہ رضہ کا قبول روایت سے انکار اس بنا پر نہ تھا کہ وہ خبر واحد تھی بلکہ صرف اس بنا پر تھا کہ حضرت عائشہ رضہ کی

نظر میں ایک دلیل قطعی اس خبر واحد کے معارض تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ نے جن کی نظر میں یہاں قطعی اور ظنی کا معارضہ ہے ہی نہیں اس خبر واحد کو قبول کیا ہے ان صحابہ کا کہنا ہے کہ قرآن کریم کی محولہ بالا آیت اور حضرت ابن عمرؓ کی متذکرہ روایت کے درمیان معارضہ اس بنا پر نہیں ہے کہ حدیث نبوی کے مطابق زندوں کے نوحہ کرنے سے میت کو عذاب اس وقت ہوتا ہے جبکہ نوحہ ان کے گھر کا دستور ہو اور میت نے اپنی حیات میں اس سے روکا بھی نہ ہو ظاہر ہے کہ اب یہ فعل میت ہی کا بن جائے گا اور اس لیے جو عذاب اس کو ہوگا وہ اپنے ہی فعل کا نتیجہ کہلائے گا نہ کہ دوسرے کے افعال کا۔

غرض اس قبیل کی جتنی احادیث ہیں جن کے بارے میں لبظاہر صحابہ کی طرف عدم قبول کی نسبت کی گئی ہے ان کے متعلق جب بھی تحقیق و تفتیش سے کام لیا جائے گا یہی نتیجہ سامنے آئے گا کہ صحابہ نے جن احادیث کو بھی مسترد کیا یا جن روایات کو بھی قبول کرنے میں توقف سے کام لیا ان میں کوئی نہ کوئی شرط شرائط قبولیت میں سے مفقود تھی جو اس کے عدم قبول کی وجہ بنی یا راوی میں مطاعن روایت میں سے کوئی طعن موجود ہوگا یا کوئی قطعی دلیل ان کے معارض ہوگی اور دوسری کسی قطعی دلیل سے شہادت بھی میسر نہ ہوگی اور یا پھر وہم وسہو کے احتمال سے بچنے کے لیے تحقیق و تفتیش کے مقصود کے پیش نظر توقف سے کام لیا گیا ہوگا جیسا کہ اوپر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں ابھی منقول ہوا ہے کہ تائید و شہادت کے بغیر انہوں نے بعض اخبار آحاد کو قبول کرنے میں توقف سے کام لیا اس قسم کی مثالوں میں تو یوں بھی کسی طرح یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اخبار آحاد سے عدم احتجاج کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اس لیے کہ ایک صحابی کے ساتھ دوسرے صحابی کے منضم ہو جانے سے وہ روایت خبر واحد کے درجے سے نکل کر خبر متواتر تو نہیں بن جاتی کوئی روایت ایک یا دو یا تین صحابیوں سے مروی ہونے کے باوجود بھی اصطلاحی طور پر رہتی تو خبر واحد ہی ہے۔

بہر کیف حدیث کی تشریعی حیثیت کو مشکوک بنانے کی خاطر خبر واحد کی عدم حجیت

پر منکرین حدیث کی جانب سے جو دلائل دیئے گئے تھے قارئین نے دیکھ لیا کہ ان میں کوئی وزن نہیں. کوئی معقولیت نہیں حتیٰ کہ بعض بعض جگہ وہ علمی دیانت تک سے تہی دامن ہیں اس کے مقابلے میں خبر واحد کی حجیت کے ثبوت میں عقلی و نقلی حیثیت سے جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ بھی قارئین کے سامنے ہے ایک طرف بلا کسی معقول و متوازن دلیل کے یہ دعویٰ ہے کہ خبر واحد حجت نہیں اور دوسری طرف اس کی حجیت کے ثبوت میں ٹھوس عقلی دلائل کے ساتھ ساتھ قرآنی تائیدات ہیں، عہد رسالت کے نظائر ہیں، عہد صحابہ کے شواہد ہیں اور ائمہ محققین و مجتہدین کی محققانہ آراء ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ حق کس کے ساتھ ہے اور باطل پر کون بلا جواز بضد ہے ؂

"منصبِ رسالت" اور "مرکزِ ملت" کا تصور

دراصل حدیث کی تشریعی حیثیت سے انکار کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ منکرین حدیث منصب رسالت کے سمجھنے میں ٹھوکر کھا گئے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ رسول کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اللہ کے بندوں تک پہونچا دے۔ تبلیغ کتاب کے بعد ان کے نزدیک رسول کی حیثیت رسالت ختم ہو جاتی ہے پھر وہ بھی ایسا ہی ایک انسان ہے جیسے اور دوسرے انسان۔ منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ رسالت کا حق صرف یہ ہے کہ جو کتاب رسولوں نے پڑھ کر سنائی ہے اس کو ان کے اعتماد پر اللہ کا کلام سمجھ لیا جائے اس کے بعد رسول اور ہم برابر ہیں جس طرح ان کے پاس عقل ہے ہمارے پاس بھی ہے جس طرح وہ اللہ کی کتاب کو سمجھتے ہیں اسی طرح ہم بھی سمجھ سکتے ہیں چنانچہ ان کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پہونچا دینے کے علاوہ جو کچھ کیا شخصی حیثیت سے کیا۔ قرآن کے مطابق امت کا نظم ونسق، اس کی شیرازہ بندی ان کی تعلیم و تربیت، ان کا تزکیۂ نفس، انکے باہمی قضایا کے فیصلے، تدبیر مہمات اور جنگ و صلح جیسے اجتماعی امور میں ان کی قیادت غرض تبلیغ قرآن کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بھی کیا وہ منکرین حدیث کے نزدیک اگرچہ آپؐ نے قرآن ہی کی روشنی میں کیا مگر رسول اور پیغمبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت میں مسلمانوں کے ایک امیر ہونے کے لحاظ سے کیا اور اسی بنا پر ان تمام امور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اس بنا پر نہیں کہ آپ اللہ کے رسول تھے بلکہ اس لیے ہے کہ آپ اپنے زمانے کے صاحب امر تھے اور اسی بنا پر آپؐ کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک آپؐ حیات ہیں اور اولوالامر کے عہدے پر فائز ہیں آپ کے بعد جو بھی اولوالامر بنے گا یہ اطاعت کا حق اس کی طرف منتقل ہوتا جائے گا۔ اس طرح پر منکرین حدیث کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں اطاعتِ رسول کے جو احکام ہیں وہ آپؐ کی ذات تک محدود نہیں ہیں

بلکہ اس میں آپ کے بعد آنے والے تمام خلفاء داخل ہیں کیونکہ اطاعت کے یہ احکام منصب امامت کے لیے ہیں اس لیے آپ کے بعد جو بھی اس منصب پر فائز ہوگا وہ اس اطاعت کا مستحق ہوگا اور یہ چونکہ امامت کا یہ منصب جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نبی نوع انسان کی صلاح و فلاح کے لیے قائم ہوا ہے قیامت تک مستمر ہے اور آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ سے ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اس لیے قرآن میں جہاں کہیں بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت کی اطاعت ہے۔ اس امام وقت کو منکرین حدیث نے "مرکز ملت" کا نام دیا ہے۔ یہ مرکز ملت ان کے نزدیک چونکہ خود "اللہ و رسول" ہے اس لیے قرآن کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جو معنی وہ پہنائے ان کو درست ماننا اور ان پر عمل کرنا اسی طرح ضروری ہوگا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امامت کے زمانے میں اپنے حالات کے مطابق قرآن کی جو تشریح و تعبیر کی اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری تھا مرکز ملت کے تمام فیصلے منکرین حدیث کی نظر میں واجب الاتباع ہیں مرکز ملت کو اختیار ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلوں میں سے جس کو چاہے باقی رکھے اور جسے چاہے رد کر دے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ احکام و مسائل کا پابند نہیں ہے اس کے لیے ان کی حیثیت صرف نظائر کی ہے اور نظائر بھی ایسے کہ ان سے وہ اپنی صوابدید کے مطابق استفادہ کرنے اور نہ کرنے میں پوری طرح آزاد ہے۔

غرض منصب رسالت کے مفہوم اور مرکز ملت کے تصور سے متعلق منکرین حدیث کی ساری بحث درج ذیل تین مرکزی نقطوں کے گرد گھومتی ہے۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری صرف اتنی تھی کہ وہ اللہ کی کتاب اللہ کے بندوں تک پہونچا دیں اس کے بعد آپ کی حیثیت رسالت ختم ہو جاتی ہے۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رسالت اور امامت دو حیثیتوں کے حامل تھے رسالت کی حیثیت سے آپ پر صرف ایمان لانا ضروری تھا جہاں تک آپ کی اطاعت کا تعلق

ہے آپؐ کے امتیوں پر اس کا وجوب آپ کی امامت کی حیثیت سے تھا رسالت کی حیثیت سے نہیں۔

(۳) رسالت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی مگر امامت کا منصب آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعے ہمیشہ باقی رہنے والا ہے چنانچہ قرآن میں جہاں کہیں اطاعت رسول کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ملت کی اطاعت ہے جب تک نبی کریم صلی اللہ حیات تھے یہ اطاعت امام وقت ہونے کی وجہ سے آپؐ کا حق تھی آپؐ کے بعد جو بھی اس منصب پر فائز ہوتا رہے گا یہ اطاعت اس کا حق ٹھہرے گی۔

آیئے منکرین حدیث کے ان تینوں دعووں کا بہ نظر غور جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس سلسلے میں منکرین حدیث نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔

کیا منصب رسالت صرف قرآن پہونچانے تک محدود ہے

جہاں تک منکرین حدیث کے پہلے دعویٰ کا تعلق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف اللہ کی کتاب پہونچا دینا تھا اور بس تو یہ دعویٰ منکرین حدیث کے اپنے دماغ کی اختراع ہو تو ہو قرآن کی کسی آیت سے اس دعوے کی تائید نہیں ہوتی۔ قرآن کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض پیغام پہونچا دینے والے کی نہیں ہے قرآن تو کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبلغ کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے امتیوں کے لیے معلم و مربی بھی ہیں اور پیشوا و نمونۂ تقلید بھی، حاکم و فرمانروا بھی ہیں اور قاضی و جج بھی۔ ان کا کام صرف اتنا ہی نہ تھا کہ وہ اللہ کی کتاب پڑھ کر سنا دیں بلکہ یہ بھی ان کی ذمہ داری تھی کہ قرآنی آیات کی صحیح صحیح مرادات نہ صرف زبانی کھول کھول کر بیان کر دیں بلکہ ان کا عملی نمونہ بھی مہیا کر دیں۔ قرآن ہمیں بتلاتا ہے کہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام یہ ہے کہ وہ مبلغ کتاب ہونے کی حیثیت سے آیات قرآنی کو پڑھ کر سنا دیں وہاں آپؐ کا کام یہ بھی ہے کہ معلم کی حیثیت سے احکام قرآنی کی تعلیم اور اس کے قوانین کی تشریح و

توضیح بھی کریں نیز مربی ہونے کی حیثیت سے قرآنی تعلیمات وقوانین کے مطابق اپنے امتیوں کی تربیت بھی کریں۔ اسی طرح پیشوا ونمونۂ تقلید ہونے کی حیثیت سے آپؐ کا کام یہ بھی ہے کہ خود قرآنی تعلیم کا عملی مجسّمہ بن کر دکھلائیں۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے حاکم وفرمانروا بھی ہیں لیکن ایسے حاکم وفرمانروا نہیں جن سے نزاع کی جاسکے بلکہ ایسے حاکم اور ایسے فرمانروا جن کے حکم کو بے چون وچرا ماننا ویسا ہی فرض ہے جیسا قرآن کی آیات کو ماننا فرض ہے یہ حاکم وفرمانروا جس بارے میں جو فیصلہ کردے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قول ناطق بن جائے گویا ایسا قاضی اور ایسا جج جس سے اوپر کوئی اپیل نہیں۔ اس قاضی اور اس جج کے دئیے ہوئے فیصلے پر جو شخص اپنے دل میں ذرا سی بھی تنگی محسوس کرے اس کا ایمان سلب ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تمام ذمہ داریاں یہ تمام حیثیتیں قرآنی تصریحات ہیں۔ منکرین حدیث جو چاہے دعوی کرتے رہیں منصب رسالت کا اپنی طرف سے جو چاہے مفہوم متعین کرتے پھریں۔ قرآن ان کے ہر دعوے سے بری ہے۔ قرآن اٹھا کر دیکھ لیجئے منصب رسالت کی جو تفصیل قرآن نے دی ہے وہ وہی ہے جو اوپر مختصراً بیان ہوئی۔ اس سلسلے میں قرآن کی شہادتیں ملاحظہ کیجئے:

تبلیغ کتاب اور تعلیم وتربیت افراد

قرآن نے متعدد جگہ اس بات کو بار بتاکید دہرایا ہے کہ اللہ تعالے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین بنیادی ذمہ داریوں کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اوّل یہ کہ آپ آیات قرآنی پڑھ کر سنائیں دوسرے یہ کہ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں اور تیسرے یہ کہ آپ اپنی تربیت سے ان کی انفرادی واجتماعی خرابیوں کو دور کریں۔ ارشاد ربانی ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (الجمعۃ۔۲)	وہی تو ہے جس نے امّی لوگوں میں خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

سورۂ آل عمران میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ذمہ داریوں کا ذکر احسان کے انداز میں کیا گیا ہے شاید یہ تبلانا مقصود ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ذمہ داریاں سونپی جاتیں تو انسانی صلاح و فلاح کا کام نامکمل رہتا۔ ارشاد ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔ (آل عمران - ۱۶۴)	اللہ نے ایمان لانے والوں پر احسان فرمایا جبکہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ ذمہ داریاں اللہ کے نزدیک اتنی اہم تھیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ کے وقت جب بنی اسماعیل میں سے ایک عظیم نبی کے مبعوث کیے جانے کی دعا کی تو اس دعا کے لیے جو الفاظ اللہ کی طرف سے القا کیے گئے ان میں بھی ان ذمہ داریوں کا ذکر بطور خاص شامل رکھا گیا چنانچہ حضرت ابراہیم کی دعا کے الفاظ ہیں:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۔ (البقرۃ - ۱۲۹)	اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

سورۂ بقرۃ ہی میں ایک اور مقام پر ان ذمہ داریوں کا ذکر اس انداز میں کیا گیا:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ - ۱۵۱)	جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

ایسے تبلائیے قرآن تو بار بار یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف قرآن سنا دینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ لوگوں کا تزکیۂ نفس کرنا اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینا بھی آپ کے فرائض میں داخل ہے مگر منکرین حدیث کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام قرآن

پہونچا دینا تھا اور بس۔ سوچئے کس کی بات مانی جائے اور کس کی رد کی جائے
ان آیات کے بارے میں یہ کہے چلے جانا کہ ان تمام ذمہ داریوں سے مراد قرآن ہی کا پہونچا دینا ہے بالکل ہی بلا دلیل ہے جس کو اللہ نے ذرا سی بھی عقل دی ہے وہ خود سمجھ سکتا ہے کہ کتاب۔ اور حکمت کی تعلیم قرآن کے الفاظ سنا دینے سے زائد ہی کوئی چیز ہو سکتی ہے ورنہ اس کا تلاوتِ آیاتِ قرآنی کے بعد علیحدہ ذکر کرنا بے معنی تھا اسی طرح افراد اور معاشرے کی تربیت کے لیے آپ جو تدابیر بھی اختیار فرماتے تھے وہ بھی لازمی طور پر قرآن کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے زائد ہی کوئی چیز تھی تبھی تو اسکا ذکر ایک علیحدہ ذمہ داری کے طور پر کیا گیا۔ یوں بھی کسی ہدایت نامے میں مندرج احکام و مسائل کی تعلیم اور ان پر عمل پیرا ہونے کی تربیت محض ان احکام و مسائل کے الفاظ بار بار دوہراتے رہنے کا نام نہیں ہے الفاظ دوہراتے رہنے سے تعلیم و تربیت کا تصور وہی کر سکتا ہے جو عقل کی نعمت سے محروم ہو۔

توضیح و تشریح کتاب

تعلیم کتاب کی جس ذمہ داری کا ان محولہ بالا آیات میں ذکر آیا ہے اس کو اور زیادہ واضح انداز میں توضیح و تشریح کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب ہم نے تم پر اس لیے نازل کی ہے کہ تم لوگوں کے سامنے اسے کھول کھول کر بیان کر دو۔ سورۂ نحل میں اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے :

وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۔ (نحل - ۴۴) ۔	(اے نبی) یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کر دو اس تعلیم کو جو انکی طرف اتاری گئی ہے۔

ایک موٹی سی عقل کا آدمی بھی کم از کم اتنی بات تو سمجھ ہی سکتا ہے کہ کسی کتاب کو کھول کھول کر بیان کرنا محض اس کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے پورا نہیں ہو جاتا بلکہ بیان کرنے والا اس کے الفاظ سے زائد ہی کچھ کہتا ہے تاکہ سننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے۔ اب بتلائیے یہ توضیح و تشریح اور یہ بیانِ کتاب کی ذمہ داری تبلیغ کتاب کی ذمہ داری کے علاوہ ہے یا نہیں۔

عملی نمونہ اس کے علاوہ یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ قرآن صرف ایک علمی کتاب نہیں جس کا مقصد صرف علمی طور پر حل کر لینا ہو۔ اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام شاید قرآن پہونچا کر ہی ختم ہو جاتا لیکن یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ قرآن افراد و اقوام کا وہ دستور العمل ہے جسے زندگی کے ایک ایک شعبے میں نافذ ہونا ہے اس لیے تبلیغ کتاب کے بعد بلکہ اس کی تعلیم اور اس کی توضیح و تشریح کے بعد بھی ایک اہم ضرورت اور باقی رہتی ہے اور وہ ہے اس کا نقشۂ عمل۔ دنیوی علوم میں بھی بہت سے علوم ایسے ہیں جو عملی مظاہرے کے بغیر اولاً تو سمجھ ہی میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جائیں تو اس وقت تک صحیح طور پر روبہ عمل نہیں لائے جا سکتے جب تک ان کا کوئی نقشۂ عمل سامنے نہ ہو جب معمولی دنیوی علوم کا یہ حال ہے تو ربانی علوم کی دقیقیں اور معاملات و عبادات کی نزاکتیں اپنے انواع و اقسام کے اختلافات کے ساتھ کسی ربانی معلّم کی جانب سے مہیا شدہ کسی نقشۂ عمل کے بغیر کیسے سمجھ میں آسکتی ہیں چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی کہ قرآنی احکام و ہدایات کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائیں۔ قرآن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ پر ایمان لانے والوں کے لیے ایک نمونۂ تقلید کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے کہا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ (احزاب - ۲۱)	تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک نمونۂ تقلید ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے صاف فرما دیا ہے کہ اگر اس نمونے کی پیروی نہ کروگے تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھو۔ اب بتلایئے اگر آپؐ کا کام صرف قرآن کا پہونچا دینا تھا تو آپ کو نمونۂ تقلید قرار دینے کے کیا معنیٰ۔ نمونۂ تقلید قرار دینے کا تو مقصد ہی یہی ہے کہ مگر قرآن کی جو باتیں عملی مسائل سے متعلق ہیں ان کا عملی مظاہرہ کر کے بتایا جائے کہ منشائے خداوندی یہ اس طرح عمل کرنا ہے قرآن کے عملی احکام و مسائل کے متعلق سوال کرنے والوں کو پھر کتاب کے الفاظ ہی سنا دینا کسی طفل مکتب کے نزدیک بھی سوال کرنے والوں کی تشفی کا موجب نہیں سمجھا جا سکتا اس

کے لیے تو ایک ایسے ہی نقشۂ عمل کی ضرورت ہے جس کو دیکھ دیکھ کر انسانی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی امور کو درست طریقے پر استوار رکھا جا سکے۔ چنانچہ اللہ تعالٰی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجسم نقشۂ عمل بنا دیا اور حکم دے دیا کہ اس نقشۂ عمل کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالتے چلے جاؤ ساتھ ہی صاف صاف فرما دیا کہ جس کسی کو اخروی نجات کی فکر ہے اور جو کوئی مجھ سے کوئی امید لگائے ہوئے ہے اسے چاہیئے کہ وہ اس نقشۂ عمل اور اس نمونۂ تقلید کی پیروی کرے گویا جو شخص پیروی نہیں کرتا وہ اللہ سے کوئی امید نہ رکھے۔ ایک اور مقام پر تو یہاں تک فرما دیا گیا کہ اس نمونۂ تقلید کی پیروی سے منہ موڑنا کفر ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ

(آل عمران - ۳۱ : ۳۲)

(اے نبی) آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اللہ بڑا بخشنے والا ہے بڑا مہربان ہے آپ کہہ دیجیے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منہ موڑیں تو اللہ کافروں سے ذرا محبت نہیں رکھتا۔

اس آیت کے بارے میں یہ کہنا کہ اس سے مراد قرآن کی پیروی ہے سراسر لغو ہے فَاتَّبِعُوْنِيْ (تو میری پیروی کرو) کے لفظ سے کسی طرح قرآن کی پیروی مراد نہیں لی جا سکتی اگر یہ مراد ہوتی تو سیدھا سادا فَاتَّبِعُوا الْقُرْآنَ فرمایا جاتا۔

حاکم و فرمانروا

قرآن جگہ جگہ بڑی صراحت کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالٰی نے مسلمانوں کا حاکم و فرمانروا مقرر کیا ہے۔ ہر وہ شخص جو آپ کو اللہ کا رسول جانتا اور مانتا ہے اس پر واجب ہے کہ وہ آپ کی اطاعت کرے اس لیے کہ رسول بھیجا ہی اسی لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء ۶۴)۔	ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حاکمیت و فرمانروائی چونکہ آپؐ کے منصب رسالت ہی کا ایک حصہ تھی اس لیے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا گیا کہ آپؐ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (نساء - ۸۰)۔	جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اسی طرح آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرنا دراصل اللہ سے بیعت کرنا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (فتح - ۱۰)۔	جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

نیز آپؐ کی اطاعت نہ کرنا ایسا ہے جیسے اللہ کی اطاعت نہ کی جائے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے تمام اعمال غارت جاتے ہیں کوئی عمل بھی اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہوتا۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ (محمد - ۳۳)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو باطل نہ کر لو۔

رسول کی یہ اطاعت و فرمانبرداری کسی عام دنیوی حاکم کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرح نہیں ہے کہ اس سے نزاع بھی کی جا سکتی ہو بلکہ رسول کی اطاعت بالکل غیر مشروط اطاعت ہے رسول جس بات کا حکم کر دے یا جس بات سے روک دے وہ اٹل ہے اس کے بعد مومن کو کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب - ۳۶)	اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب کسی معاملے کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کر دے تو پھر انکے لیے اپنے اس معاملے میں خود کوئی فیصلہ کر لینے کا کوئی اختیار باقی رہ جائے۔

ان تمام آیات میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مشروط اطاعت کا ذکر صاف یہ تبلا رہا ہے کہ آپؐ کا کام صرف قرآن کا پہونچا دینا نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو آپؐ کی اطاعت کو علیحدہ حیثیت دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی صرف قرآن کی اطاعت کا حکم دے دینا کافی ہوتا لیکن یہاں تو صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف اطیعوا اللہ کہہ کر قرآن کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے تو دوسری طرف اطیعوا الرسول کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی مستقل حیثیت واضح کی جا رہی ہے اگر آپؐ کا منصب رسالت صرف قرآن پہونچا دینے تک محدود تھا تو پھر آپ کی اطاعت آخر کس حیثیت سے ؟

حکم اور فیصل اسی طرح قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاکم اور فیصل مقرر کیا ہے ۔ ارشاد ربانی ہے :

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَىٰكَ اللَّهُ (النساء - ۱۰۵)

(اے نبی) ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ کرو ۔

یہ اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں تحکیم بین الناس کا کام تبلیغ کتاب کے علاوہ اور اس سے زائد ہے یا نہیں ؟ سوچنے کی بات ہے ۔ اگر اللہ کی کتاب پہونچا کر آپؐ کا کام ختم ہوجاتا تھا تو تنزیل کتاب کا ذکر کرنے کے بعد بطور خاص تحکیم بین الناس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی ۔ معلوم ہوا تبلیغ کتاب کے ساتھ ساتھ تحکیم بین الناس بھی آپؐ کی ذمہ داری تھی اور ذمہ داری بھی ایسی کہ آپؐ کے منصب رسالت کا ایک حصہ تھی تحکیم کے کام کو اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی کے ساتھ خاص کرنا اس کی مزید دلیل ہے ۔ نیز سورۂ نور میں کہا گیا ہے کہ اللہ کا رسول جب کوئی فیصلہ کردے تو مومنین کی نشان یہ ہے کہ وہ فوراً سر تسلیم خم کردیں اور کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا ۔ مومنین سے اس انداز کی تسلیم و رضا کا مطالبہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ تحکیم بین الناس کا کام منصب رسالت کا ایک حصہ تھا ۔ سورۂ نور کی آیت ہے :

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (النور - ۵۱)	ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ وہ جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلاتے جائیں تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کردے تو وہ کہیں ہم نے سُنا اور مان لیا۔

بلکہ صرف زبان سے ہی سمعنا و اطعنا کہنا کافی نہیں دل میں بھی مومن کوئی تنگی تک محسوس نہ کرے۔ رسول کی تحکیم کو برضا و رغبت قبول کرے۔ قرآن نے ایک مقام پر بالکل بے لاگ انداز میں کہہ دیا ہے کہ رسول کی تحکیم کو جو شخص اس طرح برضا و رغبت تسلیم نہیں کرتا وہ مومن ہی نہیں ہے ارشاد ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء - ۶۵)	پس (اے نبی) تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک وہ اپنے جھگڑوں میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو فیصلہ تو کرے اس کی طرف سے اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں بلکہ اسے بسروچشم قبول کرلیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے فیصلے پر دل میں تنگی محسوس ہو تو ایمان کا سلب ہو جانا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپؐ کی یہ تحکیم بین الناس کی ذمہ داری بھی منصب رسالت ہی کا ایک حصہ تھی۔

غرض منکرین حدیث کا یہ دعویٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب رسالت صرف قرآن پہونچا دینے تک محدود تھا قرآنی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ محولہ بالا آیاتِ قرآنی اس بات کا ثبوت ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ قرآن کے ساتھ ساتھ تعلیم احکام قرآنی، توضیح و تشریح مراداتِ قرآنی اور تربیت افراد و اجتماع کے کام پر بھی مامور تھے نیز آپؐ مبلغ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ماننے والوں کے لیے قرآن کا عملی نمونہ غیر مشروط اطاعت کے حامل حاکم و فرمانروا اور ہر قسم کی تنقید سے بالاتر حکم اور فیصل بھی تھے۔

شخصی اور پیغمبرانہ حیثیت کا فرق

اس موقعے پر اپنی طرف سے یہ ضد کیے چلے جانا کہ آپؐ نے یہ کام اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت میں کیے اور اس پر کوئی دلیل قائم نہ کرنا کوئی معقول بات نہیں ہے۔ اگر آپؐ نے یہ تمام کام اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت سے انجام دئے تھے تو آپؐ کو ان کاموں کو انجام دینے کا اختیار کس نے دیا تھا آپ معلّم تھے تو کس کے حکم سے آپ نے افراد و معاشرہ کی تربیت کا کام انجام دیا تو کس کے کہنے پر آپؐ مسلمانوں کے حاکم و فرمانروا تھے تو کس اختیار کے تحت آپ تحکیم بین الناس کا کام انجام دیتے تھے تو کس قانون کی رو سے؟

اگر آپؐ نے یہ تمام کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیے' اگر آپؐ نے یہ تمام خدمات قرآن کے تحت انجام دیں اور اگر آپؐ کو یہ تمام ذمہ داریاں بذریعہ وحی سونپی گئی تھیں جیسا کہ محولہ بالا آیات اس پر شاہد ہیں تو پھر یہی تو اس بات کا ثبوت ہیں کہ آپؐ کے یہ تمام کام آپؐ کی یہ تمام خدمات اور آپؐ کی یہ تمام ذمہ داریاں آپؐ کے منصب رسالت ہی کا حصہ تھیں آپؐ نے یہ سب کچھ شخصی حیثیت سے نہیں بلکہ پیغمبرانہ حیثیت سے کیا تھا۔

اس کے برعکس اگر کوئی کہتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معلم و مفسر قرآن تو تھے مگر خدا کے مقرر کردہ نہیں بلکہ جیسے دُنیا میں اور علوم کے اُستاد ہوتے ہیں ویسے ہی ایک آپؐ بھی تھے اسی طرح آپؐ مربی و مزکی اور عملی نمونہ تو تھے مگر مامور من اللہ ہونے کی حیثیت سے نہیں' نیز اسی طرح آپؐ حاکم و فرمانروا اور قاضی و فیصل تو تھے مگر اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو اپنی طرف سے قاضی یا فیصل و حَکَم مقرر نہیں کیا تھا بلکہ دُنیا کے عام قاضیوں اور عام فیصل و حَکَم کی طرح آپؐ بھی ایک قاضی یا فیصل تھے اگر کوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس قسم کی صورتِ حال کا دعویدار ہے تو یہ بارِ ثبوت اس پر ہے کہ وہ بتلائے کہ پھر یہ تمام مناصب آپؐ کو کیسے حاصل ہوئے؟ کیا مکّے میں اسلام قبول کرنے والوں نے اپنے اختیار سے آپؐ کو اپنا معلّم و مربیؐ اپنا حاکم و فرمانروا اور اپنا قاضی و فیصل منتخب کیا تھا۔ یا کیا مدینہ پہونچ کر انصار و مہاجرین نے باہمی مشورے سے یہ طے کیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آج سے ہمارے رہنما اور ہمارے قائد ہوں گے اور یہ یہ

مناصب آپؐ کے سپرد ہوں گے؟ کیا کبھی کسی مرحلے پر ایسا کوئی انتخاب عمل میں آیا؟ اگر ایسا نہیں ہُوا اور یقیناً نہیں ہُوا تو پھر بتلایا جائے آخر یہ تمام مناصب آپؐ کو کیسے حاصل ہوئے؟ اگر ان تمام مناصب پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مامور من اللہ بھی نہیں تھے اور منتخب شدہ بھی نہیں تھے تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان تمام مناصب پر معاذ اللہ آپؐ خود ہی فائز ہو بیٹھے تھے؟ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم از خود ہی مسلمانوں کے رہنما، فرمانروا، قاضی اور معلّم و مربی بن بیٹھے تھے۔

بہرحال یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ آپ کو یہ مناصب شخصی حیثیت سے نہیں بلکہ پیغمبرانہ حیثیت سے حاصل تھے آپؐ کو یہ تمام ذمہ داریاں بذریعہ وحی سونپی گئی تھیں۔ آپ نے یہ تمام کام اللہ کے حکم سے کیے تھے اور آپؐ نے یہ تمام خدمات قرآن کے تحت انجام دی تھیں۔ اور بنا بریں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف قرآن پہونچا کر ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ اس کے بعد وہ تمام کام بھی آپ کی ذمہ داریوں میں شامل تھے جن کا ابھی تفصیل سے قرآنی آیات کے حوالے سے ذکر ہُوا ہے۔

منکرین حدیث کے موقف کا جائزہ

اس ضمن میں منکرین حدیث اپنے موقف کے ثبوت میں جو آیات قرآنی پیش کیا کرتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بھی مختصراً جائزہ لے لیا جائے۔ ان کے موقف کا مدار یہ آیات ہیں:

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ (المائدہ - ۶۶)	رسول کے ذمے بجز اسکے کچھ نہیں کہ وہ پیغام پہونچا دے۔
وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (یٰسٓ - ۱۰)	ہمارے ذمے سوائے واضح تبلیغ کے اور کچھ نہیں
اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (شوریٰ - ۴۸)	آپکے ذمے صرف تبلیغ ہے۔
فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (التغابن - ۱۲)	اگر تم نے منہ پھیر لیا تو ہمارے رسول پر صرف واضح تبلیغ ہے اور بس
فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (رعد - ۴۰)۔	تیرے ذمے پہونچانا ہے اور ہم پر حساب لینا ہے۔

یہ آیات پیش کر کے منکرین حدیث دعویٰ کیا کرتے ہیں کہ قرآن کی نظر میں رسول کا فریضہ بحیثیت منصب رسالت صرف پیغام الٰہی کی تبلیغ ہے اور ان آیات کو پیش کرتے وقت اپنی عادت کے مطابق چالاکی یہ کرتے ہیں کہ ان آیات کے سیاق و سباق اور فحوائے کلام کو قطعاً نظر انداز کر جاتے ہیں حالانکہ جو کوئی بھی ان آیات کو ان کے سیاق و سباق کے ساتھ ملا کر پڑھیگا وہ فوراً اس حقیقت کو پالے گا کہ دراصل ان آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں سے نہیں بلکہ آپؐ کا انکار کرنے والوں سے متعلق ہے جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے اور بار بار آپؐ کو جھٹلاتے تھے ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ رسول کا کام صرف ان تک ہمارا یہ پیغام پہونچا دینا تھا سو اس نے پہونچا دیا اب وہ لوگ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے پاس کوئی رہنما نہیں بھیجا گیا جیسا کہ اللہ نے قرآن میں ان کا یہ قول نقل بھی کیا ہے :

اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۡ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ (مائدۃ — ۱۹)	کہیں تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی بھی نہ بشارت دینے والا آیا نہ تنبیہ کرنے والا (لو اب تو) آگیا تمہارے پاس بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنیوالا

دراصل ان محولہ بالا تمام آیات میں یا اسی مضمون و مفہوم کی اور دیگر آیات میں انکار کرنے والوں کے انکار کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان کافروں کی روگردانی سے دل گرفتہ کیوں ہوتے ہو تم ان پر داروغہ نہیں بنائے گئے تمہارے سپرد جو خدمت کی گئی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ ان کے سامنے سیدھا راستہ پیش کردو سووہ تم نے کر دیا اب اگر وہ تمہاری تعلیم و تبلیغ سے منہ موڑ کر ٹیڑھے راستوں پر چلتے ہیں تو ان کے اس فعل کی کوئی باز پرس تم سے نہ ہوگی ذرا غور کیجئے سورۂ شوریٰ میں اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ کے جن الفاظ کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے ان کا ذکر اس سیاق کے ساتھ ہوا ہے فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (یہ لوگ اگر پھر بھی منہ موڑے رہیں تو ہم نے آپ کو ان پر کوئی نگران بنا کر نہیں بھیجا ہے آپ کے ذمے صرف پہونچا

دینا ہے)۔ اسی طرح اگر ایک طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی تو دوسری طرف انکار کرنے والوں سے بھی کہا گیا ہے کہ تمہارے مُنہ موڑنے سے اللہ کا یا اس کے رسول کا کوئی نقصان نہیں نقصان تو تمہارا ہے ہم نے رسول کے ذمے صرف اتنا ہی کام لگایا ہے کہ وہ تم تک ہماری بات پہونچا دے تمہیں کھینچ کھینچ کر ہمارے راستے کی طرف لانا یہ اس کا کام ہی نہیں۔ سورۂ تغابن کی محولہ بالا آیت اسی مضمون کی حامل ہے۔

غرض ان تمام آیات کا رُخ کفار کی طرف ہے۔ ان آیات کے وہ لوگ مخاطب ہی نہیں جو ایمان لے آئیں اور اسلام قبول کرلیں۔ ان لوگوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض پیغام پہونچا دینے والے کی نہیں ہے بلکہ آپؐ ان کے لیے معلّم بھی ہیں۔ مربّی بھی ہیں، مفسر و شارح قرآن بھی ہیں، قرآنی احکام کا عملی نمونہ بھی ہیں، حاکم و فرمانروا بھی ہیں اور حکم و فیصل اور قاضی بھی ہیں جیسا کہ ہم ابھی آیات قرآنی سے آپؐ کی یہ تمام حیثیات بطور رسول ثابت کر آئے ہیں۔

منکرین حدیث نے بنیادی ٹھوکر یہی کھائی ہے کہ بعض آیاتِ قرآنی کا مفہوم غلط سمجھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کو صرف تبلیغ قرآن تک محدود کردیا حالانکہ ان آیات کی رو سے آپؐ کی مبلغانہ حیثیت صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل نہوئے ہوں اور صرف ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے آپؐ کی تعلیم کو ابھی قبول نہ کیا ہو رہے وہ لوگ جو اسلام قبول کرلیں اور امت مسلمہ میں داخل ہو جائیں تو ان کے لیے آپؐ کی حیثیت صرف مبلغ کی نہیں رہ جاتی۔ ان کے لیے آپ وہ سب کچھ ہیں جس کی تفصیل ابھی گزر چکی ہے۔

رسالت و امامت کی تفریق

پھر اسی پہلی ٹھوکر کے نتیجے میں منکرین حدیث کو دوسری ٹھوکر لگی یہی پہلی غلطی ان کی دوسری غلطی کا موجب بنی جب اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مُسلم و غیر مُسلم سب کے لیے محض مبلغ قرار دے لیا تو ان کو مشکل یہ پیش آئی کہ قرآن میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے لیے معلّم و مربّی اور عملی نمونہ وغیرہ قرار دیا گیا ہے اس کا کیا مفہوم

متعین کیا جائے۔ اس مشکل کا حل اُنھوں نے یہ نکالا کہ آپؐ کی شخصیت کو دو حیثیتوں میں تقسیم کر دیا ایک حیثیت رسالت کی اور دوسری حیثیت امامت کی۔ آپؐ کی حیثیت رسالت کو صرف تبلیغ قرآن تک محدود کر دیا اور اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ مبلغانہ حیثیت کے ماسوا آپؐ کی جو حیثیت بھی ہے اس کا آپؐ کے منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں تبلیغ قرآن کے سوا آپؐ نے جو کچھ کیا وہ اپنی ذاتی و شخصی حیثیت سے کیا اور مسلمانوں کے امام ہونے کی حیثیت سے کیا پھر یہیں سے وہ اس غلط نتیجے پر پہونچ گئے کہ رسالت کی حیثیت سے صرف آپ پر ایمان لانا ضروری تھا لیکن جہاں تک اطاعت کا تعلق ہے آپؐ کے امتیوں پر اس کا وجوب آپؐ کے امام وقت اور مرکز ملت ہونے کی حیثیت سے تھا رسالت کی حیثیت سے نہیں۔

رسالت و امامت کی اس تقسیم سے نیز اطاعت کو امامت کے ساتھ خاص کرنے سے منکرین حدیث کا مدعا دراصل یہ ہے کہ آپؐ کی ذات بحیثیت رسول اور آپ کی ذات بحیثیت انسان کے درمیان فرق کر دیں رسول ہونے کی حیثیت سے آپؐ نے قرآن ہم تک پہونچایا اس کو سمع و طاعت کا مستحق سمجھیں مگر بہ حیثیت انسان چونکہ آپؐ کے اقوال و افعال ایسے ہی ہیں جیسے کسی دوسرے انسان کے ہوتے ہیں اس لیے ان کا خدا کی طرف سے ہونا اور ضلالت و گمراہی سے پاک ہونا مسلّم نہ سمجھا جائے ان کی اطاعت اسی طور پر کی جائے جس طور پر ایک عام انسان کی امام وقت اور مرکز ملت ہونے کے طور پر کی جاتی ہے۔

یوں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں ذہنی اعتبار سے دو حیثیتیں کیا بہت سی حیثیتیں قائم کی جا سکتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا آپؐ کی ان دو حیثیتوں کو جن کو منکرین حدیث نے اپنے ذہن سے اختراع کر لیا ہے قرآن نے کہیں بھی جُدا جُدا اعتبار کیا ہے یعنی قرآن نے کہیں بھی کبھی بہ حیثیت رسول اور کبھی بہ حیثیت امام آپؐ کے دو قسم کے حقوق بتلائے ہیں۔ پھر کیا صحابۂ کرام نے ان دو حیثیتوں کے لحاظ سے کبھی آپؐ کے ساتھ دو قسم کے معاملات کیے ہیں پھر امتِ مسلمہ نے آپؐ کی ذات کو کبھی ان دو حیثیتوں کا حامل سمجھا ہے اگر ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں رسالت اور امامت کی دو حیثیتیں قائم کرنا محض منکرین حدیث کے ذہن کی ایسی اپج ہے خارج میں جس کا کوئی وجود نہیں۔

رسالت و امامت کی یہ تفریق قرآن کریم سے ہرگز ثابت نہیں ہے قرآن کریم نے ہمیشہ آپؐ کی صرف ایک ہی حیثیت بیان کی ہے اور وہ رسول ہونے کی حیثیت ہے جس وقت اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو منصب رسالت پر سرفراز فرمایا اس وقت سے لے کر حیات جسمانی کے آخری سانس تک آپؐ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا اسی حیثیت میں آپ مبلّغ قرآن بھی تھے اور معلّم قرآن بھی، مربی افراد بھی تھے اور مزکی معاشرہ بھی حاکم و فرمانروا بھی تھے اور قاضی و امام بھی۔ حیرت کی بات ہے منکرین حدیث کس طرح یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تبلیغ قرآن کے علاوہ باقی تمام کام آپؐ نے اپنی ذاتی و شخصی حیثیت میں کیے تھے جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن آپؐ کے ان تمام کاموں کا ذکر کرتے وقت آپؐ کو رسول کہہ کر پکارتا ہے۔ ابھی قارئین کی نظر سے وہ تمام آیتیں گزر چکی ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام کاموں کا ذکر ہوا ہے ان آیتوں پر دوبارہ نظر ڈال لی جائے قرآن آپ کو معلّم کہہ کر پکارتا ہے تو رسول کہہ کر ہی آپؐ کی تعلیم کتاب و حکمت کا ذکر کرتا ہے، قرآن آپ کو مربی و مزکی افراد و معاشرہ کہتا ہے تو رسول ہی کی حیثیت سے کہتا ہے۔ توضیح و تشریح کی ذمہ داری کا ذکر آتا ہے تو آپؐ کو مہبط وحی ہی کی حیثیت سے خطاب کیا جاتا ہے، قرآن آپؐ کو امتِ مسلمہ کے لیے عملی نمونہ قرار دیتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ محمدؐ ابن عبد اللہ کی ذات میں تمہارے لیے عملی نمونہ ہے بلکہ واضح طور سے اعلان کرتا ہے کہ اللہ کے رسول میں تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ حاکم و فرمانروا کی حیثیت سے آپؐ کی غیر مشروط اطاعت کے مطالبے کی بات آتی ہے تو محمد بن عبد اللہ کی حیثیت سے نہیں محمد رسول اللہ کی حیثیت سے اطاعت کو خاص کرنے پر زور دیا جاتا ہے تحکیم بین الناس کا موقع ہے تو قرآن مومنین کو رسول ہی کے لیے سمع و طاعت کا حکم دیتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام کاموں اور آپؐ کی ان تمام ذمہ داریوں کا ذکر کرتے وقت قرآن بالکل اسی طرح رسول کا لفظ استعمال کرتا ہے جس طرح تبلیغ کی ذمہ داری کا

ذکر کرتے وقت آپ کو رسول کہہ کر پکارتا ہے :

يَآ اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (اے رسول جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا جاتا ہے اس کو دوسروں تک پہونچا دیجیے۔ المائدہ : ۶۷)

معلوم ہوا جس حیثیت میں آپ مبلغ ہیں بالکل اسی حیثیت میں آپ معلم بھی ہیں مربی و مزکی بھی ہیں مفسر قرآن بھی ہیں قرآنی احکام کا عملی نمونہ بھی ہیں اور مسلمانوں کے حاکم و فرمانروا اور قاضی و جج بھی ہیں مگر حیرت ہے قرآن کی ان تمام تصریحات کے علی الرغم منکرین حدیث آپ کی ذات کو دو حیثیتوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک حیثیت میں آپ کو رسول مانتے ہیں اور دوسری حیثیت میں آپ کو ایک عام انسان۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت رسالت اور حیثیت انسانی اگرچہ اعتباری لحاظ سے دو جداگانہ حیثیتیں شمار کی جاسکتی ہیں مگر وجود میں فی الحقیقت دونوں ایک ہی ہیں اور ان کے درمیان عملاً کوئی فرق کرنا ممکن نہیں۔ منکرین حدیث نے منصب رسالت کو بھی دنیوی عہدوں کی طرح سمجھ لیا ہے کہ عہدے دار جب تک اپنے عہدے کی کرسی پر بیٹھا ہے عہدہ دار ہے اور جب اس سے اترا تو ایک عام انسان ہے۔ اللہ کا رسول ہر وقت اللہ کا رسول ہے وہ جس وقت منصب رسالت پر سرفراز ہوتا ہے اس وقت سے مرتے دم تک وہ ہر وقت اور ہر آن مامور من اللہ ہوتا ہے وہ زندگی کے کسی لمحے بھی منصب رسالت کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی زندگی کے تمام معاملات خواہ وہ ایک امام کی حیثیت سے ہوں یا امیر کی حیثیت سے، قاضی کی حیثیت سے ہوں یا معلم اخلاق کی حیثیت سے اور خواہ اس کی ذات کے ساتھ ان معاملات کا تعلق ایک شہری اور معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے ہو یا ایک شوہر، باپ بھائی، رشتہ دار اور دوست کی حیثیت سے سب پر اس کی حیثیت رسالت اس طرح حاوی ہوتی ہے کہ اس کی ذمہ داریاں کسی حال میں ایک لمحے کے لیے بھی اس سے منفک نہیں ہوتیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کی ہدایت کے تحت کرتا ہے اس پر ہر آن اللہ کی طرف سے سخت نگرانی قائم رہتی ہے جس کے

ماتحت وہ اپنی حدود کے اندر چلنے پر مجبور ہوتا ہے جو اللہ نے مقرر کر دی ہیں۔ اللہ کا رسول اپنے ہر ہر قول اور ہر ہر فعل سے بلکہ زندگی کے ہر ہر لمحے کے طرزِ عمل سے دُنیا کے سامنے ان اُصولوں کا تعین کرتا ہے جن پر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے نظام کا قیام فطری طور پر متقاضی ہے وہ اپنی زندگی کے پورے رویئے سے دُنیا کے سامنے ان حدود کی نشاندہی کرتا ہے جن کے دائرے میں مشیت ایزدی انسان کی آزادیِ عمل کو محدود دیکھنا چاہتی ہے۔ ان اُصولوں کی تعیین اور ان حدود کی نشاندہی کا یہ کام اللہ کا رسول اپنی شخصی و ذاتی زندگی میں بھی اسی طرح انجام دیتا رہتا ہے جس طرح اپنی سرکاری حیثیت میں، اور کسی معاملہ میں بھی اگر اس کے قدم کو ذرا سی لغزش ہو جاتی ہے تو اس کو فوراً اللہ کی طرف سے تنبیہ کی جاتی ہے کیونکہ وہ ایک ایسے منصب پر متمکن ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی خطا صرف اسی کی خطا نہیں رہ جاتی بلکہ ایک پوری امت کی خطا بن جاتی ہے اس کو بھیجنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان زندگی بسر کر کے ان کے سامنے ایک ایسی زندگی کا مکمل نمونہ پیش کر دے جو اللہ کی منشا و رضا کے عین مطابق ہو اور صرف یہی نہیں کہ انفرادی معاملات میں ان کی رہنمائی کر کے ان کو فرداً فرداً مسلمان بنائے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان کا تمدنی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظام بھی ان خطوط پر استوار کر دے جو خالق کائنات نے بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے متعین کیے ہیں ظاہر ہے اس کام کے لیے اللہ کے رسول کا ہر قسم کی خطا اور ہر نوع کی غلطی سے محفوظ ہونا لازم ہے تاکہ کامل اعتماد کے ساتھ اس کی پیروی کی جا سکے اور اس کے قول و فعل کو منشائے الٰہیہ معلوم کرنے کے لیے بلا خوف و خطر ایک معیار قرار دیا جا سکے۔

بہرحال قرآن کریم میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف بھی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس کی بنا پر یہ خیال کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت رسالت اور حیثیت انسانی یا حیثیت امامت میں کوئی فرق کیا گیا ہے اور فرق کیا بھی کیسے جا سکتا ہے جب آپؐ اللہ کے رسول تھے تو لازم تھا کہ آپؐ کی پوری زندگی اللہ کی شریعت کے ماتحت ہو اور اس شریعت کی نمائندہ ہو اور آپ سے کوئی ایسا فعل اور کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جو اللہ کی رضا کے خلاف ہو چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت جس حالت میں جو

کچھ بھی کرتے تھے رسول اللہ کی حیثیت سے کرتے تھے اور یہ سب کچھ ضلالت و غوایت اور ہوائے نفس سے پاک ہوتا تھا کیونکہ یہ سب کچھ وحی الٰہی کی روشنی میں ہوتا تھا۔ یہی بات ہے جس کی طرف سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے :

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى ۝ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوٰى ۝
(النجم - ۲ : ۵)

تمہارے صاحب (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) نہ بھٹکے اور نہ گمراہ ہوئے وہ جو کچھ کہتے ہیں ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتے ان کی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو ان پر نازل کی جاتی ہے ان کو ایسے (فرشتے) نے تعلیم دی ہے جس کی قوتیں بڑی زبردست ہیں ۔

منکرین حدیث ان آیات کو بھی اپنے مطلب کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان آیات میں محض قرآن کے وحی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کفار انکار کرتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں کوئی خفیف سا اشارہ بھی قرآن کی طرف نظر نہیں آتا اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰی میں ھُوَ کی ضمیر نطق رسول کی طرف پھرتی ہے جس کا ذکر وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى میں کیا گیا ہے ۔ ان آیات میں کونسی چیز آخر ایسی ہے جس کی بنا پر نطق رسول کو صرف قرآن کی تلاوت کے ساتھ مخصوص کیا جا سکتا ہو۔ جو شخص بھی ذرا انصاف کی نظر سے دیکھے گا برملا کہہ اٹھے گا کہ ہر وہ بات جس پر نطق رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے آیات محولہ بالا کی بنا پر وحی ہے اور ہوائے نفس سے پاک ہے کفار دراصل اسی چیز کے منکر تھے ان کا کہنا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نعوذ باللہ جنون ہے وہ اپنے دل سے باتیں بنا بنا کر کہتا ہے یا کوئی آدمی اس کو پڑھاتا ہے ان آیات میں کفار کے اسی غلط خیال کی تردید کی گئی ہے اور صاف الفاظ میں فرما دیا گیا ہے کہ تمہارا صاحب نہ بدراہ ہے نہ گمراہ اور نہ وہ اپنی خواہش نفس کی بنا پر کچھ کہتا ہے اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے جو خاص ہماری جانب سے ہے اور اس کو کوئی انسان یا جن یا شیطان نہیں پڑھاتا بلکہ وہ معلّم فرشتہ سبق دیتا ہے جو شدید القویٰ ہے ۔ یہی بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمائی ہے کہ

فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ مَا یَخْرُجُ مِنْہُ اِلَّا حَقًّا۔ (سنن دارمی)	اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس (زبان) سے جو کچھ نکلتا ہے حق ہی نکلتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے اگر اللہ کے رسول کی کسی ایک بات میں بھی یہ شبہ ہو جائے کہ وہ خواہش نفس پر مبنی ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہے تو اس کی رسالت پر سے اعتماد اٹھ جائے۔ قرآن میں یہ تصریح کہ رسول جو کچھ کہتا ہے وحی الٰہی کی بنا پر کہتا ہے کی ہی اسی لیے گئی ہے کہ جن لوگوں کے پاس رسول کو بھیجا گیا ہے ان کو رسول کے بارے میں بدراہی و گمراہی اور ہوائے نفس سے محفوظ ہونے کا کامل اطمینان ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت سے جو فرائض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد کیے گئے ہیں اور جو خدمات آپ کے سپرد کی گئی ہیں ان کی انجام دہی میں آپؐ اپنے ذاتی خیالات و خواہشات کے مطابق کام کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دئے گئے بلکہ آپ وحی کی رہنمائی کے پابند ہیں۔ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بار بار کہلواتا ہے:

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (الانعام – ۵۰)	میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔
قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ۔ (الاعراف – ۲۰۳)	آپ کہہ دیجیے میں تو بس اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی ہوا ہے۔

یوں بھی یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا رسول مقرر کرے دنیا بھر کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دے اس کی بے چون و چرا اطاعت اور اور اس کے اتباع کا بار بار تاکید حکم دے اسے اپنی طرف سے نمونے کا آدمی ٹھہرائے اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد اسے آزاد چھوڑ دے کہ اپنے ذاتی خیالات و رجحانات کے مطابق جس طرح چاہے رسالت کی خدمت انجام دے۔

غرض قرآنی آیات اس باب میں بالکل صریح ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو قدم اٹھتا تھا وحی کی رہنمائی میں اٹھتا تھا، جو قول اور جو فعل آپ کی ذات سے صادر ہوتا تھا وحی

کی رہنمائی میں صادر ہوتا تھا جس کا مطلب یہ ہُوا کہ آپؐ نے اپنی تیئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں جتنے کام سرانجام دئے اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے انجام دئے۔

اجتہادی لغزشوں سے غلط استدلال

اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان اجتہادی لغزشوں کو استدلال کے طور پہ پیش کرنا جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے اور ان کی بنیاد پہ یہ کہنا کہ آپؐ کی ذات سے لغزشوں کا صدور اس بات کی دلیل ہے کہ تبلیغ قرآن کے بعد آپؐ کے جتنے کام تھے ایک عام انسان کی حیثیت سے تھے بالکل ہی بے اصل ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ مان لیا جائے تو اس کا تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالٰے نے اپنی طرف سے پہلے ایک رسول بھیجا اور پھر خود ہی اس کا اعتبار کھونے کے لیے وہ آیات بھی نازل کریں جو اس کو معاذ اللہ غلط کار ثابت کرتی ہیں تاکہ لوگ کہیں اطمینان کے ساتھ اس کی پیروی نہ کرنے لگیں کتنی مضحکہ خیز بات ہے یہ! قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لغزشوں اور ان پہ اللہ کی تنبیہوں کا جو ذکر آیا ہے اس کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں سے آپؐ کا اعتماد اٹھ جائے اور لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ جب اللہ کا رسول بھی نعوذ باللہ ہماری ہی طرح غلطیوں کا ارتکاب کرسکتا ہے تو اس کے احکام کی اطاعت اور اس کی روش کی پیروی کامل اطمینان کے ساتھ کیسے کی جاسکتی ہے بلکہ ان لغزشوں اور تنبیہوں کے ذکر سے بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ تعالٰے اپنے رسول کو چونکہ اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے مامور کرتا ہے اس لیے ہمیشہ اس پر خاص نظر رکھتا ہے غلطیوں سے اس کی حفاظت کرتا ہے گمراہیوں سے اس کو بچاتا ہے حتیٰ کہ اگر بمقتضائے بشریت کبھی وہ اپنے اجتہاد میں بھی غلطی کرتا ہے تو اللہ تعالٰے فوراً اس کی اصلاح کردیتا ہے۔ قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جن پانچ یا چھ لغزشوں کا ذکر ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپؐ نے اپنے فیصلوں میں معاذ اللہ بہت سی غلطیاں کی تھیں جن میں سے اللہ نے بطور نمونہ یہ چند غلطیاں پکڑ کر بتادیں تاکہ لوگ ہوشیار ہوجائیں منکرین حدیث کا موقف تسلیم کرلیا جائے تو پھر یہی مطلب نکلتا ہے حالانکہ دراصل ان لغزشوں کا ذکر اسکے

بالکل ہی برعکس مفہوم کا حامل ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں بس یہی چند لغزشیں صادر ہوئیں جن کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح فرما دی اور اب ہم پورے اطمینان کے ساتھ اس پوری سنت کی پیروی کر سکتے ہیں جو آپ سے ثابت ہے کیونکہ اس میں اگر کوئی اور لغزش ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی برقرار نہ رہنے دیتا جس طرح ان لغزشوں کو اس نے برقرار نہیں رہنے دیا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے صرف پانچ مواقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کی کسی غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے۔

ایک سورۂ انفال میں بدر کے قیدیوں کو فدیہ کے عوض رہا کر دینے کے موقعے پر اس بات پر تنبیہ کی گئی کہ آپؐ نے اس وقت تک قتل و قتال کیوں جاری نہ رکھا جب تک فساد کی بالکلیہ بیخ کنی نہ ہو گئی فرمایا گیا :

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ (انفال : ۶۷)	نبی کی شان کے لائق نہیں ہے کہ اس کے قیدی (باقی) رہیں جب تک وہ زمین میں اچھی طرح خوں ریزی نہ کر لے۔

دوسرے جنگِ تبوک کے موقعے پر جب بعض منافقین نے بہانے بنا بنا کر جنگ میں شریک نہ ہونے اور وطن میں رہ جانے کی اجازت مانگی اور آپؐ نے کمال عفو اور مہربانی سے کام لیتے ہوئے ان کو اجازت دے دی تو اس بات پر تنبیہ کی گئی کہ اگر آپؐ اجازت نہ دیتے تو شریک تو یہ منافقین پھر بھی نہ ہوتے مگر اس وقت بغیر اجازت رہ جانے پر ان کی قلعی کھل جاتی ۔ ارشاد فرمایا گیا :

عَفَا اللَّهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ ۔ (التوبۃ-۴۳)	اللہ نے آپ کو معاف کر دیا لیکن آپؐ نے ان کو اجازت کیوں دے دی تھی جب تک کہ آپ پر سچے لوگ ظاہر نہ ہو جاتے اور آپؐ جھوٹوں کو جان نہ لیتے۔

تیسرے اس موقع پر آپؐ کے لیے اللہ کی جانب سے تنبیہ نازل ہوئی جب آپؐ حضرت زید کی

مطلقہ بیوی حضرت زینب سے نکاح کرنے کے بارے میں صرف اس لیے متردد تھے کہ قوم عرب جو منہ بولے بیٹے کی بہو سے نکاح کو انتہائی معیوب سمجھتی ہے طرح طرح سے بدنام کرے گی۔ آپ کے اسی فکر و تردد پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ۔ (الاحزاب : ۳۷)	اور آپ اپنے دل میں وہ چھپاتے رہے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور آپ لوگوں کی طرف سے اندیشہ کر رہے تھے حالانکہ اللہ ہی اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

چوتھا موقعہ وہ ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی زوجہ مطہرہ کی دل جوئی کے لیے عہد کر لیا تھا کہ آئندہ آپ کبھی شہد نہ پئیں گے۔ یہ عمل اگرچہ بجائے خود بالکل جائز تھا لیکن ایک پیغمبر کے شایاں شان نہ تھا کہ ایک داعی ضعیف کی بنا پر ایک حلال چیز کو چھوڑ دیں اس لیے اس پر اللہ کی جانب سے آپ کو عتاب کے رنگ میں خطاب فرمایا گیا۔ آپ اگرچہ کسی حلال چیز کو حرام نہیں فرما رہے تھے لیکن آپ کے عہد کے بعد چونکہ صرف وجوب امتناع میں وہ چیز مثل حرام کے ٹھہر رہی تھی اس لیے اللہ تعالےٰ نے اسے تنبیہاً تحریم سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ (التحریم : ۱)	اے نبی جس چیز کو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے اسے آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیوں حرام کر رہے ہیں۔

اور پانچواں موقعہ وہ ہے جس کا ذکر سورۂ عبس کی ابتدائی آیات میں ہوا ہے جب آپؐ کے پاس سرداران قریش بیٹھے ہوئے تھے اور تبلیغ و اشاعتِ دین کی دُھن میں آپؐ ان کی طرف اس قدر متوجہ تھے کہ ایک نابینا صحابی عبداللہ بن مکتوم کے آنے پر اور کوئی مسئلہ پوچھنے پر ان کی طرف توجہ نہ فرما سکے جس سے کچھ بے اعتنائی کا سا مظاہرہ ہو گیا تو اللہ کی طرف سے تنبیہ ہوئی کہ سائل پہلے سے مشرف باسلام ہونے کی بنا پر آپؐ کی توجہ کا زیادہ مستحق تھا۔ اس تنبیہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے:

عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی ۙ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ..... الخ (عبس: ۱-۱۰)	(پیغمبر) چیں بجبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا اس بات پر کہ ان کے پاس نابینا آیا۔

پس ان پانچ مواقع پر قرآن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ کی جانب سے تنبیہ نازل ہوئی ہے۔ البتہ ایک اور مقام جہاں گمان کیا جا سکتا ہے کہ شاید یہاں کسی غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے وہ سورۂ توبہ کی اس آیت میں ہے جس میں منافقین کی نماز جنازہ پڑھانے سے منع کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ؕ (التوبۃ: ۸۴)	اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس پر کبھی بھی نماز نہ پڑھئے اور نہ اس کی قبر پہ کھڑے ہوجیے۔

اگر اس کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل چھ مواقع بن جاتے ہیں۔ پورے تئیس سال کے زمانہ نبوت میں ان پانچ یا چھ مواقع کے سوا قرآن کریم میں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی غلطی کا ذکر آیا ہے نہ کسی قسم کی اس پر تنبیہ یا اس کی اصلاح کا۔ اس سے جو بات فی الحقیقت ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس پورے زمانے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم براہِ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں فرائض نبوت انجام دیتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بطورِ خاص اس بات کی حفاظت فرما رہا ہے کہ اس کا نمائندہ مجاز کہیں اس کی نمائندگی اور لوگوں کی رہنمائی کے کام میں کوئی غلطی نہ کر بیٹھے چنانچہ ان پانچ یا چھ مواقع پر جو ذرا سی چوک آپؐ سے ہوئی جس کو صحیح معنوں میں غلطی بھی نہیں کہا جا سکتا بلکہ زیادہ سے زیادہ اجتہادی لغزش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اس کی بھی فوراً اصلاح کر دی اور لغزش اور اصلاح دونوں کا ذکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قرآن کریم میں ثبت کر دیا تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ کارِ نبوت سارا کا سارا ہر قسم کی غلطی کی آمیزش سے پاک ہے اور یہ معلوم ہو جائے کہ ان مواقع کے سوا اگر کوئی اور غلطی آپ سے ہوئی ہوتی تو اس کی بھی اسی طرح فوراً اصلاح کر دی جاتی اور قرآن میں اس کا بھی ذکر اسی طرح موجود ہوتا۔ یہ چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی رہنمائی پر سے ہمارا اطمینان رخصت کر دینے کے بجائے اس کو اور زیادہ پختہ اور مضبوط بنانے والی ہے۔ ہم اب پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپؐ کی تیئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی کا پورا کارنامہ ہر قسم کی خطا اور ہر طرح کی لغزش سے بالکل پاک ہے اور اس کو اللہ تعالےٰ کی سند حاصل ہے۔

کاش منکرین حدیث نے کبھی اس بات پر غور کیا ہوتا کہ ان معمولی معمولی لغزشوں کو اللہ کے یہاں اتنی اہمیت کیوں دی گئی کہ فوراً وحی جلی کے ذریعہ سے ان کی اصلاح کرنا ضروری سمجھا گیا اگر تبلیغ قرآن کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک عام انسان کی سی ہوتی اور ایک عام امیر کی طرح آپؐ مسلمانوں کے امیر ہوتے تو کیا اس وقت بھی ان معمولی معمولی باتوں کی اسی قدر اہمیت ہوتی کیا اس وقت بھی باقاعدہ ایک فرشتہ وحی الٰہی لے کر ان باتوں کی اصلاح کے لیے آسمان سے اترتا۔ سوچنے کی بات ہے کسی انسان کا شہد کھانا نہ کھانا یا کسی اندھے کی طرف توجہ نہ کرنا یا کسی کے مرنے پر اس کے لیے دعائے مغفرت کر دینا کیا ایک عام انسان کی زندگی کے ایسے ہی اہم واقعات ہیں کہ ان کے لیے آسمان سے وحی اترے اسی طرح جنگ کی شرکت سے کسی کو مستثنیٰ کر دینا یا بعض قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا کیا ایک عام امیر یا حاکم کی زندگی کے ایسے ہی اہم معاملات ہیں کہ ان پر تنبیہ کے لیے آسمان سے فرشتے نازل ہوں۔ کونسا امیر یا حاکم دنیا کا ایسا ہے جس کی زندگی میں بارہا اس طرح کے بلکہ اس سے کہیں زیادہ بڑے اور اہم معاملات پیش نہ آتے ہوں کیا کبھی کسی امیر کے لیے کسی بھی موقعہ پر آسمان سے فرشتہ اترتا سنا یا دیکھا ہے آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی معمولی لغزشیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوئیں اور فوراً ان کی اصلاح کے لیے آسمان سے وحی اتر آئی۔ منکرین حدیث نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا ہوتا تو ان کی سمجھ میں آگیا ہوتا کہ انھوں نے اللہ کے رسول کو ایک عام انسان کا درجہ دے کر کس قدر زبردست ٹھوکر کھائی ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا کا کوئی امیر کوئی حاکم کوئی فرمانروا یا کوئی رہنما یا منکرین حدیث کی اصطلاح میں کوئی مرکز ملت اللہ تعالیٰ کا نمائندہ نہیں ہوتا اس کا مقرر کیا ہوا شارع اور اس

کی طرف سے مامور نمونۂ تقلید نہیں ہوتا اس لیے اس کی کسی بڑی سے بڑی غلطی کے بارے میں بھی یہ خدشہ نہیں ہوتا کہ وہ قانون کی حیثیت اختیار کرے گی یا اس سے خدا کی شریعت کا کوئی اصول اثر انداز ہو گا اس لیے اس پر کسی قسم کی تنبیہ کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی اس کی اصلاح کا بطور خاص کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے اپنے اعلانات کی رو سے دُنیا کے سامنے مرضاتِ الٰہی کی نمائندگی کرتے تھے آپؐ کی اطاعت اور آپؐ کی اتباع کو جزو ایمان بنایا گیا تھا آپ کے بارے میں صاف طور سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ جو کچھ آپ حلال کیں اسے حلال جانو اور جسے آپ حرام قرار دے دیں اسے حرام مان لو آپؐ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو اسوۂ حسنہ قرار دے دیا گیا تھا اس لیے آپؐ کی یہ معمولی لغزشیں بھی بہت بڑی تھیں کیونکہ وہ کسی عام انسان کی لغزشیں نہ تھیں بلکہ اللہ کے اس رسول کی لغزشیں تھیں جس کی ایک ایک حرکت اور سکون سے قانونِ الٰہی تشکیل پا رہا تھا اس لیے آپؐ کے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل کی بطور خاص حفاظت کی گئی جہاں کہیں ذرا سی چوک ہوئی فوراً وحی جلی کے ذریعے سے اس کی اصلاح کر دی گئی۔ اگر قرآن پہونچا دینے کے بعد آپؐ کی حیثیت ایک عام انسان کی سی ہوتی تو آپؐ کے قول و عمل کی اس طرح کی حفاظت کا ہرگز اتنا اہتمام نہ کیا جاتا ۔

فرائض نبوت کی انجام دہی اور غلطیوں کا صدور

اس ضمن میں منکرین حدیث کی جانب سے درج ذیل آیت بھی پیش کی جاتی ہے :

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِىْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِىٓ اِلَىَّ رَبِّىْ (سبا : ۵۰)

آپ کہہ دیجیے کہ اگر میں گمراہ ہو گیا تو میری گمراہی کا وبال مجھ ہی پر رہے گا۔ اور اگر میں ہدایت پر رہوں تو یہ اس وحی کی بدولت ہے جو میرا پروردگار مجھے کرتا رہتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ آپ سے فرائض نبوت کی انجام دہی میں کبھی کبھی غلطیاں بھی سرزد ہو جاتی تھیں نیز قرآن کے علاوہ جس کو اس آیت میں فَبِمَا يُوْحِىٓ

اِلَیَّ رَبِّیْ" سے تعبیر کیا گیا ہے آپؐ کے اقوال و افعال کے بارے میں یہ آیت بتاتی ہے کہ وہ خطا و قصور سے محفوظ نہ تھے اور یہی بات منکرین حدیث کے نزدیک اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن پہونچانے کے علاوہ آپ کے جتنے کام تھے ایک عام انسان کی حیثیت سے تھے۔

کتنی عجیب بات ہے منکرین حدیث دعویٰ کرتے وقت شاید عقل کو بالکل ہی کام میں نہیں لاتے اگر اس آیت سے یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے جو ان لوگوں نے سمجھا ہے تو اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس معاذ اللہ ضلالت و ہدایت کا مجموعہ تھی کتنی مضحکہ خیز ہے یہ بات! کیا یہ تصور کر لیا جائے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف سے ایک رسول بھی بھیجا اور پھر خود ہی اس کا اعتبار کھونے اور اسے نعوذ باللہ غلط کار و گمراہ ثابت کرنے کے لیے یہ آیت بھی نازل کر دی اور خود اسی کے منہ سے کہلوا دیا کہ میں کبھی کبھی گمراہ بھی ہو جاتا ہوں ؟ کیا اس لیے کہ کہیں لوگ اطمینان کے ساتھ اس کی پیروی نہ کرنے لگیں ؟

منکرین حدیث نے استدلال کرتے وقت اتنا بھی نہ دیکھا کہ یہ آیت کس سیاق و سباق میں آئی ہے دیکھا تو ضرور ہو گا مگر کیا کیا جائے ان کا نوفن ہی یہ ہے کہ آیات قرآنی کو ان کے سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اپنے من مانے معانی ان کو پہناتے ہیں۔ یہ آیت سورۂ سبا کی ہے اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے پہلے ہی رکوع میں کفار مکہ کا یہ الزام نقل فرمایا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہتان گھڑنے والا یا مجنون قرار دیتے تھے۔

أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَم بِهِ جِنَّةٌ (سبا : ۸)	اس نے یا تو خدا پر جھوٹ بہتان باندھا ہے یا اسے جنون ہے۔

پھر کفار مکہ کے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے اوّل اللہ تعالےٰ نے نصیحت کے انداز میں فرمایا کہ دیکھو تم انفرادی طور پر اور سب مل کر بھی ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر خلوص دل کے ساتھ ذرا غور تو کرو تمہارا دل خود گواہی دے گا کہ یہ شخص جو تمہیں عذاب الٰہی سے ڈرا

رہا ہے ہرگز مجنون نہیں ہے :

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِكُم مِّن جِنَّةٍ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُم بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ

(سبا - ۴۶)

آپ یہ کہیئے کہ میں تمہیں ایک بات سمجھاتا ہوں وہ یہ کہ تم اللہ کے واسطے دو دو اور ایک ایک کر کے کھڑے ہو جاؤ پھر سوچو - تمہارے ان ساتھی کو جنون نہیں ہے یہ تو بس عذاب شدید کی آمد سے پہلے تم کو ڈرانے والے ہیں -

یہ تو جواب تھا اس بات کا کہ معاذ اللہ آپؐ کو جنون ہو گیا ہے اس کے بعد اس الزام کے جواب میں کہ یہ شخص اللہ پر جان بوجھ کر بہتان گھڑتا ہے اللہ تعالےٰ اپنے نبی سے فرماتا ہے کہ اے نبی ان سے کہہ دیجئے کہ درحقیقت یہ سچا کلام میرا رب القا فرما رہا ہے :
قُلْ إِنَّ رَبِّي يَقْذِفُ بِالْحَقِّ (آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب سچا دین ڈالتا ہے۔ سبا : ۴۸) اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں جیسا کہ تم الزام لگا رہے ہو تو میری اس گواہی کا وبال مجھ پر ہے إِن ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي اور اگر میں راہ راست پر ہوں تو اس وحی کی بناپر ہوں جو میرا رب مجھ پر نازل کرتا ہے وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِي إِلَيَّ رَبِّي وہ سب کچھ سننے والا اور قریب ہے إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ یعنی اس سے پوشیدہ نہیں ہے کہ میں گمراہ ہوں یا ہدایت یافتہ -

یہ ہے منکرین حدیث کی طرف سے پیش کردہ آیت کا سیاق وسباق - قارئین خود اندازہ لگائیں کہ کس سیاق وسباق میں کہی ہوئی بات کو کہاں لے جا کر چسپاں کیا گیا۔ جو بات کفار مکہ کے الزامات کا منہ توڑ جواب تھی اس کو ان خوفِ خدا سے عاری لوگوں نے کفار مکہ کے الزامات کا ثبوت بنا کر رکھ دیا گویا اللہ تعالےٰ نے کفارِ مکہ کے سامنے اپنے رسول سے یہ اعتراف کروا دیا کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ درست ہے میں واقعی کبھی کبھی گمراہ بھی ہو جاتا ہوں اعاذنا اللہ منہ -

حضورؐ کی بشریت سے غلط استدلال

اپنے اسی فن کا کرشمہ ان لوگوں نے اس آیت میں بھی دکھایا ہے جو اپنے اسی دعوے کے ثبوت میں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تبلیغ قرآن تک محدود تھی اور اس کے بعد آپؐ ایک عام انسان کی حیثیت میں مسلمانوں کے امام تھے ان کی طرف سے بار بار پیش کی جاتی ہے۔ وہ آیت ہے:

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ (الکہف - ۱۱۰)	آپ کہہ دیجئے کہ میں تو بس تمہارا ہی جیسا ایک بشر ہوں۔

قرآنی آیت کا یہ ٹکڑا پیش کر کے منکرین حدیث اپنے زعم میں دلائل کی ایک بہت بلند عمارت تعمیر کرتے ہیں اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ فرائض رسالت کی انجام دہی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کر کے دکھایا ایک عام بشر کی حیثیت سے کر کے دکھایا۔ ان کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرانا کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اس بات کی دلیل ہے کہ خود قرآن کی نظر میں بھی آپؐ کی حیثیت ایک عام انسان کی تھی۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا اس آیت کو بھی سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اپنے موعومہ معنی پہنائے گئے ہیں بلکہ اس آیت کو پیش کرتے وقت تو کمال یہ کیا گیا ہے کہ پوری آیت بھی پیش نہیں کی گئی تھی۔ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کے فوراً بعد جو الفاظ ہیں جان بوجھ کر حوالہ دیتے وقت ان کو حذف کر دیا گیا اس لیے کہ ان الفاظ کی موجودگی میں اس آیت کو وہ معنی نہیں پہنائے جا سکتے جو منکرین حدیث کا مطمح نظر ہیں۔ پوری آیت اس طرح ہے:

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ۔ (الکہف: ۱۱۰)	آپ کہہ دیجئے میں تو تمہارا ہی جیسا ایک بشر ہوں (البتہ) مجھ پر وحی آتی ہے۔

گویا پوری بات جو قرآن نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے بشر ہیں جن پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہے ایک اور مقام پر قرآن نے اس سے بھی زیادہ واضح انداز میں یہ کہا ہے کہ آپؐ ایک ایسے بشر ہیں جنھیں رسول بنایا گیا ہے سورۂ بنی اسرائیل میں آپ ہی کی زبان سے اعلان کرایا گیا ہے:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل - ۹۳)	آپ کہہ دیجئے پاک ہے میرا پروردگار، میں بجز ایک آدمی کے جو رسول ہے اور کیا ہوں۔

ظاہر ہے ایک عام بشر میں اور اس بشر میں جس پر وحی آتی ہو اور جس کو منصب رسالت پر سرفراز فرمایا گیا ہو زمین آسمان کا فرق ہے وہ بشر جو خدا کا رسول ہے وہ لامحالہ خدا کا نمائندہ ہے اور وہ بشر جس کے پاس وحی آتی ہے وہ بلا شبہ خدا کی براہِ راست ہدایت کے تحت کام کرتا ہے اس کی حیثیت اور ایک عام بشر کی حیثیت یکساں کیسے ہو سکتی ہے۔

اس قسم کی آیات میں دراصل تبلایا یہ گیا ہے کہ اللہ کا رسول باوجود اس حقیقت کے کہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کی براہِ راست رہنمائی میں گزارتا ہے یہاں تک کہ اسکے منہ سے وہی کچھ نکلتا ہے جو اس پر وحی کی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ انسان ہی ہوتا ہے خدا نہیں ہوتا۔ اس قسم کی آیات سے فی الحقیقت نصاریٰ کا رد مقصود ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بلکہ خود خدا کا ایک اقنوم قرار دے لیا تھا۔ دیکھا جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے لغزشوں کا صدور اور اس پر اللہ کی طرف سے تنبیہات کا ذکر بھی قرآن میں اسی لیے کیا گیا ہے کہ آپؐ کی طرف الوہیت کے تصور کا امکان ہی باقی نہ رہے۔ حیرت ہوتی ہے منکرین حدیث کی کج فہمی پر، جو آیات اس بات کا ثبوت تھیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں انسانی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت دونوں اس طور پر جمع ہیں کہ ایک حیثیت کو دوسری حیثیت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا انہی آیات کو توڑ مروڑ کر ان لوگوں نے آپؐ کی دونوں حیثیتوں میں تفریق من کل الوجوہ کے لیے دلیل بنا لیا۔ اس قسم کی تمام آیات سے فی الحقیقت جتلانا یہ مقصود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح انسان ہو کر رسول ہیں اسی طرح رسول ہو کر بھی انسان ہی ہیں خدا نہیں۔

فرق دراصل یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن جب بشر کہتا ہے تو رسول ہونے اور مہبط وحی ہونے کی قید لگا کر یہ واضح کر دیتا ہے کہ آپؐ ہیں تو بشر مگر ایسے بشر جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی براہِ راست حفاظت و ہدایت کے تحت گزرتا ہے اس کے برعکس جب منکرین حدیث آپؐ کی بشریت کو زیر بحث لاتے ہیں تو اس حیثیت سے

کہ آپؐ ایک عام غیر معصوم انسان ہیں۔ جس طرح دوسرے عام انسانوں کے اقوال وافعال خطا و قصور سے مبرا نہیں اسی طرح آپؐ سے بھی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں اور ہوتی رہی ہیں۔

قیام دین سے متعلق اشکالات اور ان کا تجزیہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کی قرآنی تعبیر کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو منکرین حدیث کی جانب سے پیش کردہ وہ اشکالات بھی خود بخود ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر آن اور ہر حال میں رسول ماننے کی صورت پر بڑے شد و مد سے وارد کیا کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن پہونچانے کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے کام بھی کیے رسول کی حیثیت سے کیے تو اس سے لازماً دو نتیجے پیدا ہوں گے اولاً یہ کہ آپؐ کے علاوہ دین پر عمل کرنا عام انسانوں کے لیے ناممکن تصور کیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ جو نظام زندگی اللہ کے رسول نے قائم کر کے چلا دیا اسے آپؐ کے بعد قائم کرنا اور چلانا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں دوسرے یہ کہ اس نظام کو قائم رکھنے اور چلانے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا دروازہ کھلا رکھا جائے تاکہ ہر زمانے میں اللہ کا رسول ہی آکر وہ کام انجام دیتا رہے جو عام انسان نہیں کر سکتے۔ ان دونوں اشکالات کا قرآن نے یہ کہہ کر وجود ہی ختم کر دیا کہ آپؐ رسول ہو کر بھی انسان ہی ہیں فرشتے یا خدا نہیں ہیں کہ ان کی ذات سے صادر ہونے والے کاموں کی انجام دہی کو عام انسانوں کی قدرت سے باہر سمجھا جائے۔

بلکہ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو یہ دونوں اشکالات تو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب منصب رسالت کے بارے میں منکرین حدیث کا یہ نقطہ نظر درست تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن پہونچانے کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے کام تھے انہیں وحی الٰہی کی سند حاصل نہ تھی کیونکہ اس صورت میں ہمارے پاس قرآن تو موجود ہوگا مگر قرآنی احکام پر عمل کرنے کا کوئی ایسا نمونہ ہمارے سامنے نہ ہوگا جس کی پیروی ہم اس اطمینان کے ساتھ کر سکیں کہ وہ قرآن کا ایک ایسا نقشہ عمل ہے جو قرآن اتارنے والے کی منشا و مراد

کے عین مطابق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے بعد کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ جس دین کو قائم کرنے کے لیے جدوجہد کے پہلے قدم سے لے کر کامیابی کی آخری منزل تک ہر ضرورت اور ہر نازک موقعے پر اللہ کی آیات اترتی رہی ہوں اسے اب کیسے قائم کیا جا سکتا ہے۔ قرآن ظاہر ہے پورا کا پورا ایک ہی وقت میں بطور ایک مرتب کتاب کے تو نازل نہیں ہو گیا تھا قرآن آخرانی وحیوں کا تو مجموعہ ہے جو تیئیس سال کے عرصہ پر محیط زمانۂ نبوت کے دوران مختلف اوقات میں اور دین قائم کرنے کے مختلف مرحلوں میں آسمانی ہدایات لے کر نازل ہوتی رہی ہیں قرآن پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ایک برگزیدہ انسان اس کائنات میں اللہ کا بھیجا ہوا دین قائم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے اور قدم قدم پر اللہ کی وحی قرآنی آیات کی صورت میں اس کی رہنمائی کے لیے آسمان سے اتر رہی ہے۔ مخالفین اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں اور ان اعتراضات کا جواب آسمان سے آتا ہے۔ قیام دین کی جدوجہد میں طرح طرح کی مزاحمتیں حائل ہیں قسم قسم کی مخالفتوں کا سامنا ہے دین پر چلنے والوں کو گوناگوں مشکلات سے واسطہ ہے اور ان سب کے لیے تدابیر قرآنی آیات کی صورت میں جبرئیل علیہ السلام لے کر آ رہے ہیں کہ فلاں مزاحمت اس طرح دور کرو فلاں مخالفت کے مقابلے کے لیے یہ رخ اختیار کرو اور فلاں فلاں مشکلات کا یہ حل ہے۔ جدید معاشرے کی تشکیل کا مسئلہ درپیش ہے اسلامی ریاست کی تعمیر کے مسائل سلجھانے ہیں منافقین، یہود اور کفار عرب کے ساتھ کشمکش سے پیدا ہونے والے پیچ در پیچ معاملات نبٹانے ہیں۔ ان سب میں قدم قدم پر وحی آسمانی چھوٹی بڑی آیتوں اور سورتوں کی شکل میں اللہ کے اس برگزیدہ بندے کی رہنمائی کر رہی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ جدید معاشرے کی تشکیل اور اسلامی ریاست کی تعمیر جیسے اہم مسائل کو سلجھانے کے لیے ہی آسمان سے ہدایات آتی ہیں بلکہ وہاں تو حال یہ ہے کہ کوئی جنگ پیش آ گئی ہے تو اس معاشرے کے معمار اور اس ریاست کے فرمانروا کو جو جنگ کے وقت فوجوں کا سپہ سالار بھی ہے جنگ پر لوگوں کو ابھارنے کے لیے خطبہ آسمان سے ملتا ہے۔ تشکیل و تعمیر کے

کام پر مامور کوئی کارکن کہیں کوئی ذرا سی کمزوری دکھاتا ہے تو اس کی فہمائش کے لیے تعزیراً آسمان سے اترتی ہے۔ کچھ لوگ ایک موقع پر جنگ پر جانے سے جی چراتے ہیں تو ان کے معاملے کا فیصلہ براہِ راست اللہ میاں کر کے بھیجتے ہیں کوئی شخص دشمن کو جاسوسی کا خط لکھ بھیجتا ہے تو اس کا قضیہ نمٹانے کے لیے آسمان سے وحی اترتی ہے۔ منافقین مسجد ضرار بناتے ہیں تو اس کو توڑنے کا حکم بذریعہ وحی دیا جاتا ہے۔ نبی کی بیوی پر دشمن اتہام طرازی کرتے ہیں تو اس کی صفائی آسمان سے آتی ہے۔

یہ سب قرآنی حقائق ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ اگر منکرین حدیث کے نزدیک واقعی یہ بات مایوس کن ہے کہ دین کو قائم کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا اس کے بارے میں یہ یقین کر لیا جائے کہ وہ سب کچھ آپؐ نے وحی الٰہی کی رہنمائی میں کیا تو یہ مایوسی کا سبب تو خود قرآن میں بھی موجود ہے۔ اگر وحی غیر قرآنی کا وجود تسلیم کر لینے میں یہ اشکال ہے کہ آپؐ کے بعد دین کا قائم کرنا اور چلانا عام آدمی کے بس کی بات متصور نہ ہو سکے تو بالکل یہی اشکال وحی قرآنی کا وجود تسلیم کر لینے میں بھی موجود ہے۔ قرآنی وحی بھی تو انہی ہدایات پر مشتمل ہے جو قیام دین کی جدوجہد میں از ابتدا تا آخر ہر ضرورت، ہر مرحلے اور ہر نازک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے لیے آسمان سے اترتی رہی ہیں۔ کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ جس دین کے قیام میں قدم قدم پر قرآنی آیات کی رہنمائی میسر رہی ہو اس دین کو وحی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد کیونکر قائم کیا جا سکتا ہے۔ اگر وحی غیر قرآنی کا وجود تسلیم کر لینے پر منکرین حدیث کو نبوت کا دروازہ کھلا رکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے تو وحی قرآنی کے معاملے میں بھی تو یہی مشکل درپیش ہے۔ جب دین کے قیام کی ساری جدوجہد قرآنی آیات کی رہنمائی ہی کی مرہونِ منت ہے تو اب بھی دین کا قیام اس وقت تک کیسے ممکن ہو گا جب تک اس کے لیے جدوجہد کرنے والے پر بھی یعنی منکرین حدیث کے "مرکز ملت" پر بھی آیات الٰہی نازل ہونے کا سلسلہ شروع نہ ہو۔

معلوم ہوا منکرین حدیث کا استدلال ہی غلط ہے اگر دین کے قیام میں وحی الٰہی کی

رہنمائی آئندہ دین کی ترقی کی راہیں مسدود کر دینے کے مترادف ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ راہیں اللہ نے معاذ اللہ خود مسدود کر دی ہیں۔ وحی قرآنی ہو یا غیر قرآنی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رہنمائی تو بہر حال وحی کی ہی رہی اس نقطۂ نظر کی صورت میں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ آیات قرآنی کے ذریعے سے قدم قدم پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کر کے اللہ تعالےٰ نے معاذ اللہ خود ایسا نامناسب طریقہ اختیار کیا جو مستقبل میں قیام دین کے احکامات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مایوس کر دینے والا تھا۔ اس نقطۂ نظر سے تو دراصل ہونا یہ چاہیئے تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے پہلے ہی دن ایک مکمل کتاب دے دی جاتی جس میں انسانی زندگی کے مسائل سے متعلق تمام ہدایات مندرج ہوتیں پھر ختم نبوت کا اعلان کر کے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی نبوت بھی ختم کر دی جاتی اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک نبی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت سے اس کتاب کو لے کر جدوجہد کرتے اور اس کی ہدایات کے مطابق ایک اسلامی معاشرہ اور ایک اسلامی ریاست قائم کرتے۔ صرف اسی صورت میں منکرین حدیث کا اشکال دُور ہو سکتا تھا اور دین کے قیام و ترقی کی راہیں ان کو کھلی نظر آ سکتی تھیں بلکہ دیکھا جائے تو اس صورت میں تو ایک نبی کے مبعوث کرنے کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے لیے تو یہ طریقہ بھی بالکل درست ہوتا کہ ایک کتاب لکھی لکھائی اللہ تعالےٰ براہِ راست انسانوں کے ہاتھوں میں تھما دیتے اور دیباچے میں یہ لکھ دیتے کہ اس کتاب میں لکھی ہوئی ہدایات کے مطابق اپنی انفرادی و اجتماعی زندگیوں کو درست کر لو۔

مگر اللہ نے یہ طریقہ پسند نہیں کیا اس کے بجائے اللہ تعالےٰ نے جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ ایک انسان کو رسول بنا کر مبعوث کیا اس پر مختلف اوقات میں ضرور و حالات کے موافق تھوڑی تھوڑی کر کے ایک کتاب نازل کی اور پھر اس رسول کو اس کتاب کا عملی نمونہ بنا کر پیش کیا اور اس کے ذریعے سے بالتدریج نظامِ حق قائم فرما دیا۔ نظامِ حق کے اس نفاذ میں اصل عامل کتاب نہیں تھی بلکہ وہ زندہ انسان تھا جسے اس عظیم کام

کی انجام دہی پر مامور کیا گیا تھا اس انسان کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی حفاظت نگرانی میں ایک مکمل نظام حیات بنوا کر اور چلوا کر دکھلا دیا اور ہمیشہ کے لیے دُنیا کے سامنے ایک نمونہ قائم کروا دیا تاکہ آئندہ آنے والے اس نمونے کو دیکھ کر اس کے مطابق اپنا نظام حیات درست کرتے چلے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے نمونہ کی اس عمارت کو براہِ راست اپنی ہدایات کے تحت بنوایا کیونکہ اس نمونے کا ناقص رہ جانا لازماً ہدایتِ الٰہیہ کے نقص کو مستلزم ہوتا۔ اس عمارت کے معمار کو نقشۂ تعمیر بھی خود دیا اور خود ہی اس کا مطلب بھی سمجھایا صرف یہی نہیں بلکہ معمار کو اس عمارت کی تعمیر کی حکمت بھی سکھائی اور عمارت کا ایک ایک گوشہ بناتے وقت اس کی نگرانی بھی کی، کہیں کوئی اینٹ رکھنے میں اس سے ذرا سی بھی اگر چوک ہو گئی تو فوراً ٹوک کر اس کی اصلاح کر دی تاکہ جس عمارت کو قیامت تک کے لیے نمونہ بننا ہے اس میں کوئی ادنیٰ سی خامی بھی نہ رہ جائے تعمیر کے دَوران مسلسل کبھی وحی جلی کے ذریعے سے اور کبھی وحی خفی کے ذریعے سے اس معمار کی رہنمائی ہوتی رہی اور پھر جب اس نے اپنے آقا کی ٹھیک ٹھیک مرضی کے مطابق اس عمارت کی تعمیر مکمل کر لی تو دُنیا میں اعلان کر دیا گیا "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" (آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت اتمام کو پہنچا دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا)۔

تاریخ گواہ ہے کہ اس طریق کار سے امت مسلمہ حقیقتاً کسی مایوسی کا شکار نہیں ہوئی۔ وحی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد دین کے قیام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے بعد جب وحی الٰہی کا دروازہ بند ہو گیا تو خلفائے راشدین نے یکے بعد دیگرے وحی کے بغیر اس نمونے کی عمارت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ آئندہ اسی نمونے پر دینِ حق کی عمارت کو اور وسعت دی۔ خلفائے راشدین کے بعد بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز اور ان کے بعد وقتاً فوقتاً مختلف صالح فرماں روا اور دیگر مصلحین امت وحی کے بغیر ہی اسی نمونے کی پیروی کرتے ہوئے دینِ حق کی

عمارت کو مضبوط سے مضبوط تر بناتے رہے۔ ان میں سے کسی کی زبان پر یہ نہیں آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو وحی کی رہنمائی میں یہ کام کر گئے اب یہ ہمارے جیسے عام انسانوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔

حق یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہم ہی میں سے ایک انسان کو اپنا رسول بنا کر ہمارے پاس بھیجا اس پر ایک کتاب اتاری اور پھر اس رسول کے ہاتھوں خاص اپنی نگرانی و ہدایت میں ہمارے لیے ایک مکمل نظامِ فکر و اخلاق، ایک مکمل نظام تہذیب و تمدن، ایک مکمل نظام عدل و قانون اور ایک مکمل نظامِ معیشت و سیاست مضبوط بنیادوں پر استوار کرا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے سامنے ایک روشن نمونہ قائم کر دیا۔ اب قیامت تک جو انسان بھی اپنی فلاح کے خواہش مند ہوں گے وہ اس نمونے کو دیکھ کر بآسانی اپنا نظامِ حیات صحیح بنیادوں پر استوار کر سکیں گے۔

لیکن یہ احسان صرف اسی وقت تک احسان رہتا ہے جب تک ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی میں کوئی تفریق نہیں کرتے اور یہ مانتے ہیں کہ آپؐ انسان ہوتے ہوئے بھی ہمہ وقت رسول تھے اس کے برعکس اگر منکرین حدیث کا نقطۂ نظر تسلیم کر لیا جائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت نبوی کو حیثیت شخصی سے جُدا کر کے یہ کہا جائے کہ آپ کی حیثیت نبوی صرف قرآن پہونچانے تک محدود تھی اس کے بعد آپؐ کی حیثیت ایک عام انسان کی تھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن پہونچانے کے علاوہ آپ کے جتنے کام تھے انہیں وحی الٰہی کی سند حاصل نہ تھی اگر یہ نقطۂ نظر درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ احسان مبدل بہ نقصان ہوتا نظر آتا ہے کیونکہ اس صورت میں ہمارے پاس قرآن تو موجود ہوگا مگر اس کے احکام کو روبہ عمل لانے کا کوئی ایسا نمونہ ہمارے سامنے نہ ہوگا جس کی پیروی ہم اس اطمینان کے ساتھ کر سکیں کہ وہ قرآن کا ایک ایسا نقشۂ عمل ہے جو قرآن اتارنے والے کی منشا و مراد کے عین مطابق ہے۔

رسالت و نبوت کی حقیقت

غرض یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی

دونوں اس طور پر جمع ہیں کہ ایک حیثیت کو دوسری حیثیت سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل منکرینِ حدیث نے منصب رسالت و نبوت کو صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں ہے۔ رسالت و نبوت کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ ایک انسان جو ہر حیثیت سے دوسرے انسانوں جیسا ایک انسان ہو ایک عمر کو پہونچنے کے بعد یکایک اللہ کی طرف سے منصب رسالت و نبوت کے لیے چُن لیا جاتا ہو اور اس پر وحی اترنا شروع ہو جاتی ہو ایسا کبھی نہیں ہُوا کہ اللہ تعالیٰ نے یکایک کسی راہ چلتے کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی کتاب پہونچانے کے لیے مامور کر دیا ہو یا کسی شخص کو اس طور پر اپنی پیغام بری کے لیے مقرر کیا ہو کہ وہ منجملہ اپنی زندگی کی دوسری مصروفیات کے ایک پیغمبری کا کام بھی انجام دے دیا کرے گویا وہ ایک جزوقتی کارکن ہے کہ مقررہ اوقات میں ایک مقررہ کام کیا اور اس کام کو ختم کرنے کے بعد وہ آزاد ہے جو چاہے کرے۔ حامل منصب رسالت کے بارے میں یہ خیال بھی قطعاً غلط ہے کہ بجز اس کتاب کے جو اس پر نازل کی گئی ہے اور کسی بات میں بھی اس کی رائے، اس کے خیالات، اس کے کام، اس کے احکام اور اس کے فیصلے عام انسانوں سے ممتاز نہ ہوں یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس میں اور عام انسانوں میں صرف اتنا ہی فرق ہو کہ تنزیل کتاب کے ساتھ ساتھ اس کو احکام کتاب کی عملی تفصیلات بھی بتا دی گئی ہوں اور اس خاص امتیازی حیثیت سے قطع نظر کر کے وہ محض عام اماموں جیسا ایک امام، عام امیروں جیسا ایک امیر، عام فرمانرواؤں جیسا ایک فرمانروا اور عام قاضیوں جیسا ایک قاضی ہو۔ اسی طرح حامل منصب رسالت کے بارے میں یہ تصوّر بھی درست نہیں کہ رسول کی ذات بشریہ پر رسالت عارض ہوتی ہو اور اس کے عروض کے بعد بھی رسول کی بشریت اور اس کی رسالت دونوں علیحدہ علیحدہ رہتی ہوں حتیٰ کہ ہم اس کی زندگی کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہوں۔

قرآن کریم سے رسالت و نبوت کی حقیقت پر جو روشنی پڑتی ہے وہ ان تمام تصورات و خیالات کے بالکل برعکس ہے۔ آیئے ہم قرآن کریم کی روشنی میں رسالت و نبوت کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نبی کی پیدائش سے پہلے ہی نبوت کے لیے اسکا انتخاب

قرآن کریم ہمیں بتلاتا ہے کہ نبی اپنی پیدائش اور پرورش کے مراحل سے گزرنے کے بعد نبوت کے لیے منتخب نہیں کیا جاتا بلکہ وہ کارِ نبوت ہی کے لیے پیدا کیا جاتا ہے

اللہ تعالےٰ جب کسی قوم میں نبی بھیجنا چاہتا ہے تو خاص طور پر ایک شخص کو اسی لیے پیدا کرتا ہے کہ وہ نبوت کی خدمت انجام دے۔ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے جو حالات بیان ہوئے ہیں ان میں غور کیجئے۔ انبیاء علیہم السلام پیدائش سے پہلے ہی نبوت کے لیے نامزد کر دئے جاتے تھے اور ان کو خاص طور پر اسی منصب کے لیے پیدا کیا جاتا تھا۔

مثلاً حضرت اسحٰق کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی پیدائش اور نبوت کی خوشخبری دے دی جاتی ہے قرآن کہتا ہے :

وَبَشَّرۡنٰهُ بِاِسۡحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝ وَبٰرَكۡنَا عَلَيۡهِ وَعَلٰٓى اِسۡحٰقَ ؕ (الصّٰفّٰت - ۱۱۲ : ۱۱۳)	اور ہم نے اسے اسحٰق کی بشارت دی جو نبی اور نیک بندوں میں ہوں گے اور ہم نے ابراہیم پر اور اسحٰق پر برکتیں نازل کیں ۔

حضرت زکریا بیٹے کے لیے دُعا کرتے ہیں تو ان کو حضرت یحیٰی کی خوشخبری ان الفاظ میں دی جاتی ہے :

اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحۡيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوۡرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۔ (آل عمران : ۳۹)	اللہ آپ کو یحیٰی کی خوشخبری دیتا ہے جو کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور مقتدا ہوں گے اور بڑے ضبط نفس کرنے والے ہوں گے اور نبی ہوں گے صالحین میں سے ۔

حضرت مریم کے پاس خاص طور پر فرشتہ بھیجا جاتا ہے کہ ان کو ایک پاک طینت لڑکے کی خوشخبری دے فرشتہ آکر کہتا ہے :

قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ (مریم : ۱۹)	فرشتے نے کہا میں تو بس تمہارے پروردگار کا ایک ایلچی ہوں تاکہ تمیں ایک پاکیزہ لڑکا دوں ۔

پھر پیدا ہوتے ہی اس پاکیزہ لڑکے کے مُنہ سے اعلان کرایا جاتا ہے کہ

آتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا۔ (مریم ۔ ۳۰)	اس نے مجھے کتاب دی اور اس نے مجھے نبی بنایا۔

اسی طرح حضرت موسیٰ کی پیدائش جس ماحول میں ہوئی اور ان کی پرورش جس انداز سے ہوئی اس میں غور کیجئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خاص طور پر مصری فرعونیت کو تباہ کرنے اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ فرعون کے ہاتھوں قتل سے بچانے کے لیے ایک تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈلوانا خاص اسی فرعون کے گھر میں پہنچانا جس کو ان کے ہاتھوں تباہ کروانا مقصود تھا ان کو ایسی پیاری صورت دینا کہ فرعون کے گھر والوں کے دل میں دیکھتے ہی محبت کے جذبات بیدار ہو جائیں ان کے مُنہ کو تمام عورتوں کے دُودھ سے روک دینا تاکہ وہ پھر اپنی ماں کے آغوش میں پہونچ جائیں، حضرت موسیٰ کی پیدائش اور پرورش میں یہ تمام اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو ان کی پیدائش سے بھی پہلے منصب رسالت و نبوت کے لیے منتخب کر لیا تھا۔

غرض حاملین منصب رسالت و نبوت کے بارے میں پہلی بات جو قرآن سے ہمیں معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ ان حضرات کو ان کی پیدائش سے پہلے ہی اس منصب کے لیے منتخب کر لیا جاتا ہے۔

جبلّی اور وہبی علوم

دوسری بات جو اس سلسلے میں قرآن ہی سے ہمیں معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالےٰ ابتداہی سے ان کے اندر بلا کسی واسطے کے اعلیٰ درجے کی ذہنی و روحانی قوتیں ودیعت کرتا ہے ان کے علوم کسبی نہیں ہوتے بلکہ جبلّی اور وہبی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے حضرت نوح علیہ السلام اسی ودیعت خداوندی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی قوم سے کہتے ہیں:

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (اعراف : ۶۲)	میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکوت السمٰوات والارض کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے

وَكَذٰلِكَ نُرِيْ إِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی حکومت دکھا دی۔ الانعام : ۷۵) اور جب وہ اس مشاہدے سے علم یقین لے کر پلٹتے ہیں تو اپنے باپ سے کہتے ہیں :

يٰٓأَبَتِ إِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (مریم : ۴۳)	اے ابا جان میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں ہے لہٰذا میری پیروی کریں تجھے سیدھا راستہ بتاؤں گا۔

حضرت یعقوب کے متعلق اللہ تعالےٰ خود گواہی دیتے ہوئے فرماتا ہے :

وَإِنَّهُ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (یوسف : ۶۸)۔	اور وہ یقیناً علم رکھتا تھا جو ہم نے اس کو تعلیم کیا تھا مگر اکثر لوگ (یہ بات) نہیں جانتے ۔

اسی طرح حضرت یوسف کے حق میں ارشاد فرمایا :

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا۔ (یوسف : ۲۲)	اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکمت اور علم عطا کیا۔

بالکل یہی بات حضرت موسیٰ کے حق میں بھی فرمائی :

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا۔ (القصص : ۱۴)	اور جب وہ اپنی جوانی کو پہونچا اور درست ہو گیا تو ہم نے اسے حکمت اور علم عطا کیا۔

یہی حکمت اور یہی علم حضرت لوط کو بھی عطا کیا گیا چنانچہ ارشاد ہوا :

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (الانبیاء : ۷۴)	اور لوط کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا ۔

اور حکمت و علم کی اسی نعمت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سرفراز فرمایا گیا چنانچہ ارشادِ ربانی ہے :

وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (النساء : ۱۱۳)

اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھے وہ علم دیا جو پہلے تو نہ جانتا تھا۔

یہ علم و حکمت ایک روشنی ہے جو انبیاء علیہم السلام کو وہبی طور پر ودیعت کی جاتی ہے وہ اس روشنی سے حقائق کا عینی مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی روشنی کی بدولت انہیں غلط اور صحیح میں امتیاز کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی روشنی معاملات کا فیصلہ کرنے اور ان کے سامنے پیش ہونے والے امور مختلفہ میں نظر کرنے میں انبیاء کی رہنمائی کرتی ہے۔ یہ روشنی انبیاء کو ہمہ وقت حاصل رہتی ہے اور وہ اس سے ہر موقع پر کام لیتے ہیں دوسرے لوگ غور و فکر کے بعد بھی جن باتوں کو نہیں سمجھ سکتے اور حق و صواب معلوم نہیں کر سکتے انبیاء علیہم السلام اللہ کی دی ہوئی اس روشنی کی مدد سے آن واحد میں ان باتوں کی تہہ تک پہونچ جاتے ہیں اس روشنی کی بنا پر نبی اور عام انسانوں کے درمیان اتنا عظیم تفاوت واقع ہو جاتا ہے جتنا ایک آنکھوں والے اور ایک نابینا کے درمیان ہوتا ہے اس تفاوت کی نشاندہی کرتے ہوئے قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلواتا ہے :

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ (الانعام)

میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے (اے محمدؐ) آپ کہہ دیجئے کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں۔

بلند ترین اخلاقی صفات

تیسری چیز جو ماہیت منصب رسالت و نبوت کے بارے میں قرآن ہمیں بتاتا ہے یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اعلیٰ درجے کے علم اور حکمت سے نوازتا ہے اسی طرح ان کو انسانیت کی بلند ترین اخلاقی صفات سے بھی مزین کرتا ہے۔ مثلاً حضرت یحییٰ کے بارے میں قرآن ہمیں بتلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکمت کے ساتھ ساتھ رحم دلی اور پاک طینتی بھی عطا فرمائی تھی ارشاد ربانی ہے :

وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً (مریم : ۱۲، ۱۳)

ہم نے بچپن ہی میں اس کو قوت فیصلہ اور رحم دلی اور پاک طینتی عطا فرمائی تھی۔

اسی طرح قرآن حضرت عیسیٰ کی زبان سے کہلواتا ہے کہ

وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا۔ (مریم : ۳۱-۳۲)	اور اللہ نے مجھے برکت والا بنایا جہاں بھی میں رہوں اور اس نے مجھ کو وصیت کی کہ جب تک جیوں نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دوں اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمتگزار بنایا اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلند ترین اخلاقی صفات کا حامل قرار دیتے ہوئے فرمایا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم : ۴)	اور آپ اخلاق کے بڑے مرتبے پر فائز ہیں۔

معلوم ہوا کہ انبیاء کی فطرت نہایت پاکیزہ ہوتی ہے وہ فطرتاً صحیح سوچتے ہیں صحیح بولتے ہیں اور صحیح عمل کرتے ہیں غلط اندیشی اور کج بینی کی استعداد ہی ان میں نہیں ہوتی اور اس طرح ان کی نفسی و روحانی قوتیں انتہائی غیر معمولی ہوتی ہیں۔

غلطیوں اور لغزشوں سے حفاظت

اس کے علاوہ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو نہ صرف یہ کہ علم و حکمت عطا کرتا ہے اور بلند ترین اخلاقی صفات سے نوازتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ ان پر خاص نظر رکھتا ہے۔ غلطیوں اور لغزشوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے، ہر قسم کی گمراہیوں سے ان کو بچاتا ہے حتیٰ کہ اگر بہ مقتضائے بشریت کبھی وہ اپنے اجتہاد میں بھی غلطی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ چنانچہ انبیاء کی زندگیوں میں اس کی واضح مثالیں موجود ہیں۔

مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں غور فرمائیے عین اس وقت جبکہ عزیز مصر کی بیوی نے آپ کو اپنے جال میں پھنسانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی اللہ تعالیٰ نے اپنی "برہان" دکھلا کر حضرت یوسف علیہ السلام کو بدکاری سے محفوظ کر دیا۔ قرآن اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (یوسف : ۲۴)	اور اس (عورت) کے دل میں تو اس کا خیال جم ہی رہا تھا اور اسے بھی اس (عورت) کا خیال ہو چلا تھا اگر اس نے اپنے پروردگار کی دلیل کو نہ دیکھ لیا ہوتا انھی طرح (ہم نے اسے بچا دیا) تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں وہ بیشک ہمارے ان بندوں میں سے تھا جن کو ہم نے اپنے لیے حاصل کر لیا ہے۔

اسی طرح حضرت موسٰی اور حضرت ہارون علیہما السلام کے واقعات پر نظر ڈالیے کس کس طرح فرعون سے ان کی حفاظت کی گئی۔ جب فرعون کے پاس جانے کا حکم پاکر دونوں خوف زدہ ہو جاتے ہیں کہ کہیں فرعون ہمارے ساتھ ظلم کا سلوک نہ کرے تو اللہ تعالےٰ ان الفاظ میں ان کو اپنی حفاظت کا یقین یاد دلاتا ہے :

لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى (طٰہٰ - ۴۶)	تم نہ ڈرو تم دونوں کے ساتھ میں ہوں میں (سب) سنتا اور دیکھتا ہوں۔

پھر جب جادوگر سرداروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو دیکھ کر حضرت موسٰی بہ تقاضائے بشری ڈر جاتے ہیں تو اللہ تعالےٰ اس بشری کمزوری کو اپنی وحی کے ذریعے سے دور فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (طٰہٰ - ۶۸)	ڈرو نہیں۔ غالب تو یقیناً تم ہی رہو گے۔

حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کو ڈوبتے دیکھ کر چیخ اُٹھتے ہیں یا اللہ یہ تو میرا بیٹا ہے :

رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ (ہود - ۴۵)	اے میرے رب میرا بیٹا تو میرے گھر والوں ہی میں سے ہے۔

اور آپ نے میرے گھر والوں کو کشتی میں سوار کرنے کا حکم دیا تھا قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ (ہم نے کہا اس کشتی میں ہر قسم کے جوڑوں میں سے دو دو کو

بچا لو اور اپنے گھر والوں کو بھی۔ ھود : ۴۰) محبت پدری کے جوش میں حضرت نوحؑ کو یہ خیال ہی نہ رہا کہ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ (بجز ان کے جن پر حکم نافذ ہو چکا ہے) کی شرط بھی ساتھ ہی لگائی گئی تھی۔ محبت پدری کی بشری کمزوری نے ذرا سی دیر کے لیے نبی کی نظر سے اس حقیقت کو چھپا دیا کہ حق کے معاملے میں باپ، بیٹا اور بھائی کوئی چیز نہیں۔ اللہ تعالٰی نے وحی کے ذریعے سے اسی وقت اپنے نبی کی آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا اور ان پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ آپ کا بیٹا آپ کے نطفے سے ضرور ہے مگر چونکہ اس کا عمل غیر صالح ہے اس لیے وہ آپ کے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔

يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۚ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود: ۴۶)	اے نوح یہ تمہارے گھر والوں ہی میں سے نہیں ہے اس کے عمل خراب ہیں۔

اس طرح اللہ تعالٰی نے اپنے نبی کی اس غلط فہمی سے بھی حفاظت فرمائی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی متعدد مرتبہ ایسے واقعات پیش آئے کہ جب کبھی بھی اقتضائے بشریت کی بنا پر آپؐ سے کوئی اجتہادی لغزش ہوئی اللہ تعالٰی نے وحی جلی سے فوراً اس کی اصلاح فرما دی قرآن کریم نے اس قسم کی تمام لغزشوں کا اور اللہ کی جانب سے ان کی جو اصلاح کی گئی ان کا بہ تمام و کمال ذکر کر دیا ہے ان آیات کی نشاندہی ہم اوپر کر آئے ہیں۔ یہ تمام آیات اس بات کا ثبوت ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غلطیوں سے بچانے اور آپؐ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو معیار حق پر قائم رکھنے کی ذمہ داری اللہ تعالٰی نے براہِ راست اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ نیز ان آیات سے صریح طور پر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ ان لغزشوں کے علاوہ جن کا قرآن کریم نے ذکر کر دیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی کا پورا کارنامہ ہر قسم کی خطا اور ہر طرح کی لغزش سے بالکل پاک ہے اور اس کو اللہ تعالٰی کی سند حاصل ہے کیونکہ ان متذکرہ لغزشوں کے علاوہ دیگر کسی بھی قول و فعل پر اللہ تعالٰی کا گرفت نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے صادر ہونے

والے تمام اقوال وافعال اللہ کے معیارِ مطلوب پر اترتے ہیں گویا ان پر اللہ کی طرف سے مہرِ تصدیق وتوثیق ثبت ہے۔

منصب رسالت اور حیاتِ طیبہ

غرض عالمین منصب رسالت ونبوت کے بارے میں قرآنی استشہاد کے ساتھ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اسے پیشِ نظر رکھیے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں غور کیجیے، صورتِ حال یہ نہیں ہوئی کہ آپؐ اپنی پیدائش اور پرورش کے مراحل سے گذرنے کے بعد نبوت کے لیے منتخب ہوئے ہوں بلکہ صاف نظر آتا ہے کہ آپؐ کو ابتدا ہی سے پیدائش سے بھی پہلے کارِ نبوت کے لیے چُن لیا گیا تھا۔ پھر پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی نگرانی میں آپؐ کی پرورش اور تربیت کرائی نبوت عطا کرنے سے پہلے ہی آپؐ کو ہر طرح کے اخلاقی عیوب اور ہر قسم کی گمراہیوں اور غلط کاریوں سے محفوظ رکھا اور ایسے حالات میں آپؐ کی پرورش کی جن میں آپؐ کی استعداد نبوت جو پیدائش سے پہلے ہی آپؐ میں ودیعت کر دی گئی تھی رفتہ رفتہ فعلیت کی طرف بڑھتی رہی تاآنکہ جب یہ استعداد اپنے کمال کو پہونچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو خاص اپنے پاس سے علم، قوتِ فیصلہ اور نورِ ہدایت عطا کر کے آپؐ کو منصب نبوت پر مامور کر دیا اور پھر آپؐ سے اس طرح کام لیا کہ اس منصب پر آنے کے بعد سے اس حیاتِ ظاہری کے آخری سانس تک آپؐ کی پوری زندگی اسی کارِ نبوت کے لیے وقف رہی۔ تلاوتِ آیات، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ نفوس کے سوا آپؐ کا اور کوئی مشغلہ نہ رہا۔ رات دن اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے آپؐ کو یہی دھن رہی کہ گمراہوں کو راہِ راست پر لائیں اور راہِ راست پر آجانے والوں کو ترقی کی اعلیٰ منزلوں پر پہونچنے کے قابل بنائیں اس تمام کام میں اللہ کی طرف سے ہمہ وقت نگرانی آپؐ کے شاملِ حال رہی۔ ہوائے نفس کے اتباع اور شیطانی وساوس سے آپؐ کی پوری طرح حفاظت کی گئی معاملات کو بالکل آپؐ کی بشری عقل اور آپؐ کے بشری اجتہاد پر نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ جہاں کہیں بھی آپؐ کی خواہش یا آپؐ کے اجتہاد نے اللہ کے مقرر کیے ہوئے خطِ مستقیم سے بال برابر بھی جنبش کی وہیں آپؐ کو اس پر متنبہ کر کے آپؐ کا رُخ

بیدھا کر دیا گیا۔

نبوت کے منصب پر فائز ہو جانے کے بعد بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ بشر ہی رہے اور ان تمام حدود سے محدود رہے جو اللہ تعالیٰ نے فطرت بشریہ کے لیے مقرر فرمائی ہیں لیکن ان حدود کے اندر آپؐ کی بشریت آخری اور انتہا درجے کی کامل و اکمل بشریت تھی جس میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں جو زیادہ سے زیادہ ایک انسان کو حاصل ہونی ممکن ہیں دراصل آپؐ کے جسمانی، نفسانی اور عقلی و روحانی قویٰ کو ابتدا ہی سے عدل و تسویہ کے انتہائی مقام پر رکھا گیا۔ آپؐ کو قلب کی سلامت اور فطرت کی صحت اس درجے کی عطا کی گئی کہ آپؐ بچپن ہی سے خود بخود کسی خارجی انسانی تعلیم و تربیت کے بغیر ان راستوں سے دور رہیں جو رضائے الٰہی کے خلاف ہیں اور ان راستوں کو اختیار کریں جو مرضات الٰہی کے عین مطابق ہیں آپؐ کی یہی کامل و اکمل بشریت تھی جو اپنی پختگی اور اپنے کمال کو پہنچ جانے کے بعد ہدایت عامہ کے منصب پر سرفراز ہوئی، اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم کی مزید روشنی پاکر سراج منیر بنی اور مصالح عامۂ بشریہ کے لیے تعلیمات و احکام کا مہبط قرار پاکر نبوت و رسالت سے موسوم ہوئی گویا امر واقعہ یہ نہیں ہے کہ نبوت ایک عرض کی حیثیت رکھتی تھی جو ایک خاص وقت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوہر انسانیت پر عارض ہُوا ہو بلکہ حقیقتِ نفس الامر یہ ہے کہ اس کی حیثیت انسانیتِ کاملہ کے ایک ایسے جوہر کی تھی جو نبوت کی استعداد کے ساتھ پیدا ہُوا اور فعلیت کی طرف ترقی کرتے کرتے آخر کار نبوت بنا دیا گیا۔ اس لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطہر میں نبوت ایک پیدائشی چیز تھی اور آپؐ کی حیثیت ذاتی ہی دراصل آپؐ کی حیثیت نبوی کو متضمن تھی فرق اگر تھا تو صرف اتنا کہ بعثت سے قبل آپؐ کی حیثیت نبوی بالقوہ تھی اور بعثت کے بعد بالفعل۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ آپؐ کی ذات میں حیثیت ذاتی اور حیثیت نبوی دونوں اس طور پر جمع تھیں کہ ایک حیثیت کو دوسری حیثیت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس وضاحت کے بعد کوئی عقل سے عاری ہی ہوگا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطہر کو رسالت اور امامت دو حیثیتوں میں تقسیم کر کے یہ کہے گا کہ رسالت کی

حیثیت سے صرف آپؐ پر ایمان لانا ہی کافی ہے۔ اطاعت ضروری نہیں، اطاعت کا تعلق صرف آپ کی حیثیتِ امامت سے ہے۔

اطاعت رسول اور حیثیت امامت

اطاعتِ رسول کے وجوب کی مستقل حیثیت پر بنیادی بحث تو ہم قرآنی تصریحات کی روشنی میں گذشتہ مضمون میں "حدیث کی تشریعی حیثیت" کے عنوان کے تحت بڑی تفصیل کے ساتھ کر آئے ہیں قارئین اس پر دوبارہ نظر ڈال لیں۔ اس کے بعد مزید کسی گفتگو کی گنجائش نہیں رہتی مگر اس ضمن میں ہم رسالت و امامت کی تقسیم کرنے والوں اور اطاعت کو امامت کے ساتھ خاص کرنے والوں سے تاریخی حیثیت سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ سیرتِ نبوی میں سے کیا کسی ایک بھی ایسے واقعہ کی نشان دہی کی جاسکتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کا سلوک کبھی بہ حیثیت رسول ہوتا تھا اور کبھی بہ حیثیت امام۔ اگر منبر، مصلیٰ، جلوت و خلوت، سفر و حضر، گھر کے اندر اور گھر کے باہر، میدانِ جنگ اور دورانِ امن، محفل میں اور بستر خواب پر آپؐ کی صرف ایک ہی حیثیت یعنی حیثیت رسالت ہی سمجھی گئی ہے تو امامت کی ایک اور نئی حیثیت از خود کہاں سے پیدا ہوگئی۔ پھر رسالت و امامت کے حقوق بھی متضاد حقوق ہیں۔ تقسیم حیثیات کا دعویٰ کرنے والوں کے نزدیک رسول پر صرف ایمان لانا واجب ہے اور امام پر ایمان نہ لانا ضروری ہے، غور کا مقام ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیک وقت لوگوں کو ایمان کی دعوت بھی دیتے تھے اور اپنی اطاعت کا امر بھی فرماتے تھے مگر کبھی یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ آپؐ نے ان متضاد حقوق کو اپنے دو مختلف منصوبوں سے خود متعلق سمجھا ہو یا دوسروں کو اس پر کبھی تنبیہ کی ہو۔ مزید برآں اس دور میں ان امّی مخاطبین کے لیے جو منطق کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے یہ تقسیم کرنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا کہ وہ ان متضاد حقوق کو ہمیشہ دو مختلف حیثیتوں کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ملحوظ رکھیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہ حیثیت رسول ظاہر ہوں تو ان پر فوراً ایمان لے آئیں اور جب بہ حیثیت امام سامنے آئیں تو ان کا انکار کر دیں اور کہہ دیں کہ یہ انکار بہ حیثیت امامت ہے نہ کہ بہ حیثیت رسالت یا اسی طرح اطاعت کے بارے میں وضاحت کریں کہ یہ اطاعت بہ حیثیت

امامت ہے نہ کہ بحیثیتِ رسالت۔

اس تمام گورکھ دھندے سے نجات کی ایک ہی صورت ہے کہ حق کو تسلیم کر لیا جائے اور حق یہی ہے کہ آپؐ کی ذات میں ذہنی لحاظ سے خواہ کتنی بھی حیثیات پیدا کر دی جائیں مگر اصل یہ ہے کہ آپؐ نبوت سے سرفرازی کے بعد سے یوم وصال تک کسی ایک لمحے بھی حیثیت رسالت سے علیحدہ نہیں ہوئے۔ ہمیشہ آپؐ پر ایمان آپؐ کی اطاعت اور آپؐ کی عظمت اسی منصب کے ماتحت ہوئی اور آج بھی آپؐ پر ایمان، آپؐ کی اطاعت اور آپؐ کی عظمت اسی منصب رسالت کے اعتبار سے ہے اور تا قیامت اسی منصب کی حیثیت سے یہ سب کچھ کیا جاتا رہے گا اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ سب حق کے خلاف ہے۔

ایمان کی حقیقت سمجھنے میں غلطی

دراصل رسالت و امامت کی متذکرہ بالا تقسیم اور ایمان و اطاعت کے درمیان یہ تفریق نتیجہ ہے اس شدید غلطی کا جو ایمان کے معنی سمجھنے میں ان منکرین حدیث کو پیش آگئی ہے۔ اگر یہ لوگ ایمان کی حقیقت کا صحیح علم حاصل کر لیتے تو اطاعت کو ایمان سے علیحدہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایمان صرف زبان سے تصدیق کر لینے کا نام ہے اس لیے ان کے نزدیک رسول کا حق صرف تصدیق کر کے ادا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اطاعت کی کوئی ضرورت نہیں رہتی حالانکہ ایمان کی حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے اولاً تو اطاعت کے بغیر ایمان ہی حاصل نہیں ہو سکتا دوم قلبی تصدیق حاصل ہو جانے کے بعد یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اطاعت کا عہد دل میں پیدا نہ ہو جس دل میں رسول کی اطاعت کا عہد نہیں وہ دل یقیناً تصدیق رسول سے بھی خالی ہے۔ ایمان اور اطاعت باہم لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہرقل شاہِ روم کو مسلمان نہیں کہا گیا حالانکہ اس نے بر سرِ دربارِ عام محفل میں آپؐ کی تصدیق کر لی تھی اگرچہ اپنے درباریوں کی برہمی دیکھ کر بعد میں اس نے بات بنا دی اگر ایمان کے لیے صرف تصدیق ہی کافی ہوتی تو ہرقل

کو مسلمان کہا جانا چاہیئے تھا اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب نے بار ہا آپؐ کی تصدیق کی لیکن اس کے باوجود کیونکہ ان کے دل نے معمولی انسانوں کی عار کی خاطر آپؐ کی اطاعت کرنا قبول نہیں کیا اس لیئے جمہور امت نے ان کا ایمان تسلیم نہیں کیا۔

وفد نجران کے قصہ میں ایک کاہن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حافظ ابن قیم زاد المعاد میں تحریر فرماتے ہیں:

وَفِیھا اِنَّ اقرارَ الکاھِنِ الکتابیّ لرسولِ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم بأنہٗ نبیؐ لا یدخلہٗ فی الاسلام مالم یلتزم طاعتہٗ ومتا بعتہٗ (زاد المعاد جلد ۳)

اس واقعے سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی کتابی کاہن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تصدیق کرے کہ آپؐ نبی ہیں تو صرف اس اقرار سے وہ اسلام میں داخل نہیں مانا جا سکتا جب تک وہ آپؐ کی اطاعت اور اتباع کا بھی پورا پورا عہد نہ کرے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ان دو یہودی علماء کا ہے جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے امتحاناً تین سوالات کیے تھے اور ان کے بالکل ٹھیک ٹھیک اور درست جواب پا کر بے اختیار گواہی دے اُٹھے تھے کہ آپ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں مگر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ پھر اب تمہیں میری اتباع سے کونسی چیز مانع ہے تو بہانہ کرنے لگے کہ ہمیں یہ ڈر ہے کہ کہیں ہماری قوم ہمیں مار نہ ڈالے۔ یہ واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک آپؐ کی اطاعت کا عہد نہ کیا جائے محض آپؐ کی نبوت کا اقرار کر لینے سے اسلام کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اسی قسم کے واقعات کا حوالہ دینے کے بعد حافظ ابن قیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

وَمَنْ تأَمَّلَ فی السِّیَرِ وَالأَخْبَارِ الثَّابِتَۃِ مِنْ شَھادۃِ کثیرٍ مِنْ أَھلِ الکتٰبِ والمشرکینَ

جو شخص کتب سیرت کا مطالعہ کرے گا اور ان میں بہت سے اہل کتاب اور مشرکین کی تصدیق کے واقعات پڑھے گا تو اس پر

لہ، صلی اللہ علیہ وسلم بالرسالۃ وَ اَنَّہ، صادق فلمّ تدخلھم ھذہ الشھادۃ فی الاسلام علم اَنَّ الاسلام اَمرٌ وراءَ ذالک وانّہ، لیس ھو المعرفۃ فقط ولا المعرفۃ والاقرار فقط بل المعرفۃ والاقرار والانقیاد والتزام طاعتہٖ ودینہٖ ظاھراً و باطناً۔

(زاد المعاد جلد ۳ ص ۵۵)

یہ بخوبی روشن ہو جائے گا کہ اسلام صرف آپؐ کی رسالت کی تصدیق کا نام نہیں بلکہ اسلام اس سے ماورا کوئی چیز ہے نہ وہ صرف معرفت ہے اور نہ صرف معرفت و اقرار کا نام ہے بلکہ جب تک آپؐ کی معرفت اور اقرار کے علاوہ ظاہری و باطنی طور پر آپؐ کی فرماں برداری اور آپؐ کی پوری پوری اطاعت کا عہد نہ کرے اس وقت تک کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا آپ کی اطاعت کے بغیر ایمان ہی نہیں ہے کوئی شخص صرف آپؐ کی نبوت کا اقرار کر کے اسلام کے زمرے میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ آپؐ کی اطاعت کا عہد بھی نہ کر لے۔

منکرین حدیث لاکھ کہتے رہیں کہ منصبِ رسالت کو اطاعت سے کوئی تعلق نہیں حقیقت نفس الامر اس کے بالکل خلاف ہے۔ اس موقعہ پر قارئین کو ہم سورۂ نسا کی وہ آیت پھر یاد دلاتے ہیں جس کا حوالہ ہم "حدیث کی تشریعی حیثیت" کے عنوان کے تحت اطاعتِ رسول کے وجوب پر گفتگو کرتے ہوئے دے آئے ہیں اور جو اس باب میں فیصل ناطق ہے کہ رسول پر ایمان لانا اس کی اطاعت کے بغیر ایمان ہی نہیں ہے ارشاد ربانی ہے:

فلا و ربّک لا یؤمنون حتّٰی یحکّموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجًا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔

(النساء: ۶۵)

آپ کے پروردگار کی قسم یہ ایمان دار نہ ہوں گے جب تک کہ آپس کے اختلافات میں آپؐ ہی کو حکم نہ ٹھہرائیں اس کے بعد آپؐ کے فیصلے سے اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور پوری طرح جب تک اس کے سامنے سر نہ جھکائیں۔

غور کا مقام ہے منکرین حدیث کے نزدیک تو منصب رسالت کو اطاعت سے کوئی تعلق ہی نہیں اور قرآن کہتا ہے کہ اطاعت کے بغیر رسول پر ایمان ہی کامل نہیں ہوتا بلکہ صرف ادھورا اور نا تمام ایمان ہوتا ہے یہ آیت کس قدر صراحت سے اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ کوئی انسان اس وقت تک مومن کہلانے کا حق دار نہیں جب تک کہ ہر معاملے میں وہ رسول کو اپنا حکم نہ بنائے باہمی جو اختلاف بھی ہو اس میں اسی کا فیصلہ ناطق نہ سمجھے یہی نہیں بلکہ تکمیل ایمان کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اگر رسول کا فیصلہ اپنے مخالف ہو تو بھی اپنے دل میں اس کے بارے میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کرے پھر اس پر بھی بس نہیں آگے ارشاد ہے ویسلموا تسلیما یعنی صرف تنگی محسوس نہ کرنا ہی کافی نہیں اس منفی پہلو کے ساتھ ساتھ اثباتی پہلو میں انقیاد و تسلیم کا ہونا بھی ضروری ہے اس کے بغیر بھی ایمان کامل نہیں۔

یہ تو رسول کی اطاعت کا پہلو تھا اس کے خلاف کا پہلو بھی سنئے۔ جو لوگ رسول کی اطاعت کو ضروری نہیں سمجھتے وہ ذرا کان کھول کر سنیں ان کے لیے دردناک عذاب کی وعید ہے:

فلیحذر الذین یخالفون عن أمرہ أن تصیبھم فتنۃ أو یصیبھم عذاب ألیم۔ (الفرقان - ۶۳)	تو جو لوگ اس کے حکم کا خلاف کرتے ہیں انہیں ذرا ڈرتے رہنا چاہیے کہیں کوئی فتنہ یا دردناک عذاب نہ آپکڑے۔

بہر حال رسول کے مطاع ہونے کا قانون اللہ تعالے کا مستمر قانون ہے قرآن کے الفاظ میں رسول بنایا ہی اس لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

وما أرسلنا من رسولٍ الا لیطاع باذن اللہ (النساء - ۶۴)۔	ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم کے ماتحت اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے۔

رسول کا مطاع ہونا گویا قرآن کے نزدیک حق رسالت ہے اور ایک ایسا عام قانون ہے جس سے کبھی کوئی رسول مستثنیٰ نہیں رہا۔

قرآنی صداقتوں کا انکار

مختصر یہ ہے کہ بات رسالت و امامت کی تقسیم کی ہو یا ایمان و اطاعت کے درمیان تفریق کی منکرین حدیث اپنی طرف سے جو چاہیں کہتے رہیں قرآن ان کے ہر دعوے سے بری الذمہ ہے اصل بات یہ ہے کہ قرآن صداقتوں کا ایک مجموعہ ہے اس کی ایک صداقت کا انکار کیا جائے تو دوسری صداقت کا انکار خود بخود سر پڑ جاتا ہے۔ منکرین حدیث نے اوّلاً جب قرآن کے خلاف یہ دعویٰ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب رسالت صرف تبلیغ قرآن تک محدود ہے تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر انہیں یہ بھی ماننا پڑا کہ مبلغانہ حیثیت کے علاوہ آپؐ کی جو حیثیت بھی قرآن نے ذکر کی ہے اس کا منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں پہونچ کر انہیں یہ مشکل پیش آئی کہ پھر آخر ان حیثیات کا تعلق ہے کس سے؟ اس کے لیے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو دو حیثیتوں میں تقسیم کرنا پڑا ایک حیثیت رسالت کی اور ایک حیثیت امامت کی اور یہ دعویٰ کرنا پڑا کہ تبلیغ قرآن کے سوا آپ کی جو حیثیت بھی قرآن نے بیان کی اس کا تعلق امامت سے ہے رسالت سے نہیں۔ پھر اس رسالت و امامت کی تفریق کو نبھانے کے لیے انہیں ایک اور خلاف قرآن دعویٰ کرنا پڑا کہ منصب رسالت کے لیے اطاعت ضروری نہیں قرآن میں جہاں کہیں اطاعتِ رسول کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا تعلق منصب امامت سے ہے منصب رسالت سے نہیں اسی طرح قرآن کی ایک صداقت کا انکار منکرین حدیث کو دوسری صداقت کے انکار پر مجبور کرتا رہا اور وہ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کے مرتکب ہوتے چلے گئے۔

اطاعتِ رسول کا قرآنی حکم اور امامِ وقت یا مرکز ملت

منکرین حدیث نے جب یہ دعویٰ کیا کہ اطاعت کا منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں ہے تو انہیں پھر ایک مشکل پیش آئی وہ یہ کہ قرآن نے تو جگہ جگہ اطاعتِ رسول کا حکم دیا ہے بلکہ قرآن کے نزدیک تو رسول بنایا ہی اس لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے تو اب ایسی کونسی توجیہ اختیار کی جائے کہ منصب رسالت کے لیے اطاعت بھی ضروری نہ رہے اور منکرین حدیث پر خلافِ قرآن کوئی دعویٰ کرنے کا

الزام بھی سر نہ آئے۔ اس کے لیے انہیں پھر مزید ایک غلطی کا مرتکب ہونا پڑا انہوں نے کہا کہ قرآن میں جہاں کہیں اطاعتِ رسول کا حکم دیا گیا ہے اس سے مُراد امامِ وقت کی اطاعت ہے جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حیات تھے یہ اطاعت امامِ وقت ہونے کی وجہ سے آپؐ کا حق تھا آپؐ کے بعد جو بھی اس منصب پر فائز ہوگا۔ یہ اطاعت اس کا حق ٹھہرے گی۔ امام وقت کے لیے منکرین حدیث نے ایک نئی اصطلاح ایجاد کی اور اسے مرکز ملت کا نام دیا۔ یہ مرکز ملت کا منصب جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی زیر نظر تحریر میں کہیں واضح کر آئے ہیں منکرین حدیث کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے شروع ہو کر آپؐ کے زندہ جانشینوں کے ذریعے چونکہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اس لیے حامل وحی ہونیکے علاوہ باقی جتنی حیثیات بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھیں وہ سب کی سب آپؐ کے بعد آنے والے خلیفہ یعنی مرکز ملت کو منتقل ہو گئیں حتیٰ کہ قرآنی آیات کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جو معنی بھی آپؐ کے بعد آنے والا امامِ وقت یعنی مرکزِ ملّت پہنائے ان کو درست ماننا اور ان پر عمل کرنا منکرین حدیث کے نزدیک اسی طرح ضروری ہوگا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امامت کے زمانے میں اپنے حالات کے مطابق قرآنی آیات کی جو تشریح و تعبیر کی اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری تھا۔

حیرت کی بات ہے ایک طرف منکرین حدیث رسالت کے لیے اطاعت کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں وہ رسالت جس کا حامل صاحب وحی ہوتا ہے اس پر ایمان نہ لانے والا کافر کہلاتا ہے اس کی ذات ہر قسم کی خطا و لغزش سے معصوم ہوتی ہے دوسری طرف امامت کے لیے اطاعت کو لازمی قرار دیتے ہیں وہ امامت جس کا حامل نہ صاحب وحی ہوتا ہے نہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور نہ وہ خطا و قصور سے مبّرا ہے۔ آیئے منکرین حدیث کے اس دعوے کا بھی پوری حقیقت پسندی سے جائزہ لیں:

اطاعت کے لیے حیاتِ جسمانی کی قید

جہاں تک اطاعت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات جسمانی تک محدود کرنے کا تعلق ہے تو منکرین حدیث کا یہ دعویٰ خلافِ عقل بھی ہے اور خلافِ نقل بھی۔

خلافِ عقل اس طرح پر کہ ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں کہ جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے منصب رسالت پر سرافراز فرمایا اس وقت سے لے کر اپنی حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپؐ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے اسی حیثیت میں آپؐ مبلغ قرآن بھی تھے اور معلم قرآن بھی، مربیِ افراد بھی تھے اور مزکیِ معاشرہ بھی، حاکم و فرماں روا بھی تھے اور قاضی و امام وقت بھی ۔ آپؐ کی ذات اطہر کو رسالت و امامت کی حیثیتوں میں تقسیم کرنا سراسر لغو ہے آپؐ کی ذات میں حیثیت رسالت اور حیثیت شخصی و انسانی دونوں اس طور پر جمع ہیں کہ ایک حیثیت کو دوسری حیثیت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ بات پوری طرح ثابت ہو جانے کے بعد ذرا غور کیجئے کہ منکرین حدیث کا یہ دعویٰ کس قدر خلافِ عقل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ کے احکام کی اطاعت اور آپؐ کے ارشادات کی پیروی صرف آپؐ کی حیات جسمانی تک محدود تھی ۔ اس کے تو معنی یہ ہوئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ صرف اسی عہد کے لیے تھی جس میں آپؐ اپنے جسم اطہر کے ساتھ زندہ تھے ۔ آپؐ کے وصال فرماتے ہی گویا آپؐ کی رسالت کا تعلق عملاً دنیا سے منقطع ہو گیا اس لیے کہ آپؐ کی اطاعت کا مطلب ہے آپؐ کے اس اسوۂ حسنہ کی اطاعت اور آپؐ کے ان اقوال و افعال کی اطاعت جو اپنی ذات میں قرآن کا مجسم عملی نمونہ ہیں لہٰذا قرآن کا جو عملی نمونہ آپؐ نے پیش کیا تھا وہ تو منکرین حدیث کے نزدیک آپؐ کی حیات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اب تو آئندہ قرآن کا وہ عملی نمونہ نافذ العمل اور قابل تسلیم سمجھا جائے گا جو آپؐ کے بعد آنے والا امام وقت اپنے احکام سے اور اپنے اعمال سے قائم کرے گا اس صورت میں تو رسالت کا منصب ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے سوچنے کی بات ہے جب قرآن کا عملی نمونہ قائم کرنے کا ہر شخص اہل ہو خواہ وہ نبی ہو یا نہ ہو خواہ اس پر وحی اترتی ہو یا نہ اترتی ہو تو پھر سرے سے کسی رسول کے مبعوث کرنے ہی کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے ۔ قرآن بغیر کسی رسول کے اتار دیا جاتا اور ماننے والوں سے کہا جاتا کہ اپنے میں سے کسی شخص کو امام وقت منتخب کر لو جو تمہارے لیے اس قرآن کا ایک عملی نمونہ قائم کر دے پھر یہ نمونہ جو وحی الٰہی کی رہنمائی سے محروم ہوتا کیسا کچھ مختلف فیہ اور متنازع ہوتا ہر صاحب عقل خود تصور کر سکتا ہے ۔ ایسی صورت میں

بنی نوع انسان کی ہدایت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا - اگر اللہ نے یہ طریقہ پسند نہیں کیا اور قرآن کے ساتھ ایک رسول مبعوث کر کے قرآن کا ایک عملی نمونہ وحی ہی کی رہنمائی میں تیار کرانا ضروری سمجھا تو کیسے مان لیا جائے کہ یہ سب کچھ صرف تیئیس ۲۳ چوبیس ۲۴ سال کے لیے کیا گیا۔ وہ چیز جس کے لیے اللہ تعالیٰ بطور خاص ایک رسول مبعوث کرتا ہے اور رسالت کا اتنا بڑا منصب قائم کرتا ہے وہ چیز جس کو قرآن انتہائی شد و مد کے ساتھ ذریعۂ ہدایت قرار دیتا ہے اس کے بارے میں کیونکر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ رسول اللہ کے جسم و جان کا تعلق منقطع ہوتے ہی دُنیا کے لیے غیر ضروری قرار دی جا سکتی ہے۔ عقل کسی طرح اس صورتِ حال کو تسلیم نہیں کرتی - اسی لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اطاعتِ رسول کو محض حیاتِ نبوی تک محدود کرنے کا دعویٰ سراسر لغو اور خلافِ عقل ہے۔

رہا اس دعوے کا خلاف نقل ہونا تو اس میں تو کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں اگر قرآن آپؐ کو خاتم النبیین کہتا ہے اگر قرآن کے نزدیک آپ کی رسالت قیامت تک قائم رہنے والی ہے اگر قرآن کے الفاظ میں آپؐ تمام عالمین کے لیے رحمت ہیں اور اگر قرآن آپؐ کی بعثت کو پوری کائناتِ انسانی کی طرف بعثت عامہ قرار دیتا ہے تو پھر آپؐ کی اطاعت بھی قرآن کے نزدیک قیامت تک تمام عالم انسانی کے لیے باقی رہنے والی ہے کیونکہ یہ بات ہم بدلائل قطعیہ ثابت کر چکے ہیں کہ رسالت کے لیے اطاعت ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس بات سے تو منکرین حدیث کو بھی اتفاق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطہر پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا قرآن نے بڑی صراحت کے ساتھ اعلان کیا۔

ما کان محمدٌ أبا أحدٍ من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبین (احزاب : ۴۰)

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں البتہ اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں۔

جب آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا ہی نہیں تو لازم ہے کہ آپؐ کی نبوت و رسالت تا قیامت قائم رہے اور جب تک نبوت و رسالت قائم و دائم ہے اس کا لازمی جزو اطاعت بھی قائم و دائم ہے۔

قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عالمین کے لیے رحمت کہہ کر پکارتا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء - ۱۰۷)	اور ہم نے آپؐ کو تمام عالمین پر رحمت ہی کے لیے بھیجا ہے۔

آپؐ کا رحمۃ للعالمین ہونا مستلزم ہے اس بات کو کہ آپؐ کا فیضان رسالت صرف آپؐ کے اپنے زمانے تک محدود نہ ہو قیامت تک جاری و ساری رہنے والا ہو۔ اگر کہا جائے کہ آپؐ قرآن لائے جو ہمیشہ رہنے والا ہے اور اسی نسبت سے آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ رحمت نہ تھے بلکہ رحمت تو قرآن تھا آپؐ کو رحمت خواہ مخواہ کہہ دیا گیا۔ معاذ اللہ حالانکہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے الگ رحمت فرمایا ہے اور اس کے لانے والے کو الگ۔

اسی طرح قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو پوری نوعِ انسانی کے لیے بعثت عام قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا۔ (السبا: ۲۸)	ہم نے تو آپؐ کو سارے ہی انسانوں کے لیے (پیغمبر بنا کر) بھیجا ہے بطور خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے کے۔

قرآن کا ارشاد اپنے مفہوم میں کس قدر واضح ہے۔ الناس کا لفظ اپنے معنی میں عام ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لیکر قیامت تک جس قدر بھی انسان ہیں سب کے لیے آپؐ اللہ کے رسول ہیں گویا آپؐ کی رسالت کسی خاص زمانے تک محدود نہیں بلکہ جب تک بھی زمین پر "الناس" بستے ہیں اس وقت تک آپؐ کی رسالت قائم ہے۔ اور جب تک آپؐ کی رسالت قائم ہے آپؐ کی اطاعت بھی باقی ہے۔

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں منکرین حدیث کی جانب سے کبھی کبھی سورۂ انفال کی ایک آیت پیش کی جایا کرتی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے ان کے استدلال کی اصل حقیقت بھی واضح کردی جائے۔ سورۂ انفال کی آیت ہے:

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و رسولہٗ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون (انفال : ۲۰)	اے ایمان والو اطاعت کرتے رہو اللہ اور اس کے رسول کی اور اس سے روگردانی نہ کرو درآں حالیکہ تم سُن رہے ہو۔

منکرین حدیث اس آیت کے الفاظ وَ اَنتم تسمعون سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اطاعت رسول کا حکم صرف ان لوگوں کو دیا گیا تھا جو اس وقت اس حکم کو سُن رہے تھے بعد کے آنے والے لوگوں کے لیے نہ تھا یہ استدلال سراسر بدنیتی اور فریب پر مبنی ہے کیونکہ اس آیت کو اس کے سیاق و سباق سے کاٹ کر اپنی خواہش کے مطابق اس کا مفہوم نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سورۂ انفال کو ابتدا سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں و انتم تسمعون کہنے سے مقصود ہی کچھ اور ہے۔ اس سورت کی ابتدا میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے واطیعوا اللہ و رسولہٗ ان کنتم مؤمنین (اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ انفال - ۱) پھر ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے دی گئی دعوت جہاد پر دل تنگ ہوتے تھے و ان فریقاً من المؤمنین لکٰرھون (اور مومنوں کا ایک گروہ (اس کو) گراں سمجھ رہا تھا۔ انفال - ۵) پھر آگے چل کر فرمایا گیا ہے ومن یشاقق اللہ و رسولہٗ فان اللہ شدید العقاب (اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے سو اللہ سزا دینے میں سخت ہے۔ انفال - ۱۳) اس کے بعد اس محولہ بالا آیت کا مضمون وارد ہوا ہے۔ اب ذرا غور کیجئے اس محولہ بالا آیت میں اور اس سے پچھلی تمام آیات میں رسول کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا ذکر بار بار کیا گیا ہے جس سے یہ جتلانا مقصود ہے کہ رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے پھر ہر جگہ لفظ رسول آیا ہے امیر کا لفظ کسی جگہ بھی استعمال نہیں کیا گیا کہ یہ کہا جا سکے کہ اس اطاعت کا تعلق آپؐ کے منصب امامت سے ہے۔ ایسا کوئی اشارہ بھی موجود نہیں جو یہ ظاہر کرتا ہو کہ ان آیات میں رسول سے مراد رسول کی ایسی امیرانہ حیثیت ہے جو منصب رسالت سے مختلف ہو

پھر اطاعت کے اثباتی پہلو کے بعد اس کا منفی پہلو بیان کرتے ہوئے رسول کے حکم سے مُنہ موڑنے سے منع کیا گیا ہے اور اس پر سخت عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اس سب کے بعد وَأَنتمْ تسمعون کہا گیا ہے جس کا منشا صاف یہ ہے کہ تم ہمارے ان تاکیدی احکام کو سنتے ہوئے ہمارے رسول کی اطاعت سے کبھی مُنہ نہ موڑو۔ اس وأنتم تسمعون کے مخاطب صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس وقت موجود تھے جس وقت یہ آیت نازل ہو رہی تھی یا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات تک زندہ تھے بلکہ ان الفاظ کے مخاطب وہ سب لوگ ہیں جو قیامت تک ایمان کے ساتھ قرآن کو سننے والے ہیں۔ یہ آیت ان سب پر لازم قرار دے رہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم بھی ان تک پہونچے اس کے آگے وہ بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دیں۔

غرض اطاعت رسول کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات جسمانی تک محدود کرنے کا دعویٰ نہ عقل ہی کی میزان پر پورا اترتا ہے اور نہ قرآن ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے اس لیے منکرین حدیث کا یہ دعویٰ قطعاً بلا دلیل ہے۔

مرکز ملت کی طرف حق اطاعت کی منتقلی

اسی طرح اس ضمن میں منکرین حدیث کا یہ دعویٰ بھی دلیل کی حمایت سے قطعاً محروم ہے کہ حامل وحی ہونے کے علاوہ باقی جتنی حیثیات بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھیں وہ سب آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشین یا مرکز ملت کو منتقل ہو گئیں اور اس طرح اطاعت کا وہ حق جو امام وقت ہونے کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا وہ آپؐ کے بعد آئندہ آنے والے امام وقت یا مرکز ملت کو منتقل ہو گیا اپنی طرف سے کوئی دعویٰ کر لینا بہت آسان ہے ثابت ہو جائے تو بات ہے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں منکرین حدیث کے پاس کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ وہ قرآن کی کوئی آیت ایسی پیش نہیں کر سکتے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان حیثیات کی منتقلی اور حق اطاعت کے انتقال کا ذکر ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایسا ارشاد اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ نہیں دکھا سکتے جس میں اس انتقال حیثیات و حق اطاعت

سکے بارے میں کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ اشارہ تک کیا گیا ہو آثار صحابہ میں سے کوئی ایسی روایت ایسی اپنی تائید میں نہیں مل سکتی جس میں خلفائے راشدین میں سے کسی نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں فلاں حیثیات ہماری طرف منتقل ہو گئی ہیں اور مطاع ہونے کے لحاظ سے ہم اب اسی مقام پر فائز ہیں جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات تک فائز تھے۔ خلافت راشدہ کے بعد بھی آج تک کے ادوار میں سے کسی دور میں بھی ایسی نظیر موجود نہیں ہے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ علمائے امت میں سے کسی قابل ذکر آدمی کا کبھی یہ مسلک رہا ہو۔

کیا اللہ و رسول کی اطاعت سے امام وقت کی اطاعت مراد ہے

اس سلسلے میں منکرین حدیث کی جانب سے دے کر بار بار بس ایک ہی بات کہی جاتی ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت کی اطاعت ہے مگر اوّل تو یہی بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ یہ مراد آخر متعین ہوئی کس طرح؟ اس مراد کا تعین ہی اوّل تو محتاج دلیل ہے دوسرے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ منکرین حدیث ان متعدد آیاتِ قرآنی کا کیا کریں گے جن میں اللہ و رسولؐ کی اطاعت کا ذکر کسی طرح بھی امام وقت کی اطاعت مراد نہیں لیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر وہی آیت لے لیجئے جو اس باب میں بنیادی آیت تصور کی جاتی ہے یعنی

یا أیها الذین آمنوا اطیعو اللّٰه و أطیعوا الرسول واولی الأمر منکم فإن تنازعتم فی شیءٍ فردّوه إلی اللّٰه والرسول (النساء - ۵۹)	اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولوالامر ہوں پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو جائے تو اس کو پھیر دو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف۔

اس آیت میں اگر اللہ و رسول کی اطاعت سے امام وقت کی اطاعت مراد لی جائے تو اولوالامر یعنی امام کی اطاعت کا دوبارہ حکم دینا بے معنی

تکرار بن کرده جاتا ہے۔ علاوہ ازیں فان تنازعتم میں مرجع نزاع "اللہ و رسول" کو ٹھہرایا گیا ہے جو بقول منکرین حدیث خود امام وقت ہے اس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ جس سے کسی معاملے میں اختلاف ہو اسی کو رفع اختلاف کے لیے ثالث تسلیم کر لیا جائے۔ کس قدر غیر معقول ہے یہ بات۔ اگر یہ کہا جائے کہ فان تنازعتم میں آپس کا اختلاف مُراد ہے اور مرجع نزاع امام وقت ہے تو پھر "فردوه إلى الله والرسول" کے الفاظ بالکل بے محل نظر آتے ہیں کیونکہ اُوپر اولی الامر منکم کا ذکر آ جانے کے بعد فصاحت و بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ "فردوه الى الله والرسول" کے بجائے "فردوه الیهم" یا صاف "فردوه الیٰ اولی الامر" کہا جائے۔ غرض اس آیت میں کسی طرح بھی "اللہ و رسول" کو امام وقت کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا، اسی طرح اور بھی متعدد نظیریں قرآن سے پیش کی جا سکتی ہیں۔

اللہ، رسول اور امام یہ تینوں عربی زبان کے الفاظ ہیں کیا منکرین حدیث بتا سکتے ہیں کہ "اللہ و رسول" کے الفاظ سے امام وقت یا مرکز ملت کے معانی مراد لینا کونسا محاورہ اور کونسی لغت ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے مقصود امام وقت کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت کے مترادف قرار دینا ہے کیونکہ اس خیال کی ہی اگر کوئی حقیقت ہوتی تو قرآن میں کہیں تو اس مضمون کی بھی کوئی ایک آیت ضرور آتی کہ من یطع الامام فقد اطاع اللہ و الرسول (جس نے امام کی اطاعت کی اس نے اللہ و رسول کی اطاعت کی) جیسا کہ یہ واضح کرنے کے لیے کہ رسول کی اطاعت بعینہ اللہ کی اطاعت کے مرادف ہے قرآن نے بڑے ہی صریح الفاظ میں اعلان کیا من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی نساء – ۸۰)۔

رسول کی اطاعت اور امام کی اطاعت میں بنیادی فرق

رسول کی اطاعت کو تو بعینہ اللہ کی اطاعت کہا جا سکتا ہے مگر امام کی اطاعت کو بعینہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ رسول کی اطاعت اور امام کی اطاعت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ کے بیان، اس کی اراءة اور اس کی وحی کے ماتحت ہونے کی بنا پر فی الحقیقت اللہ ہی کی اطاعت

ہوتی ہے مگر امام پر نہ وحی آتی ہے نہ اللہ کی طرف سے اس کی صواب رسی کی کوئی ضمانت دی گئی ہے وہ جو حکم دے گا اپنی صوابدید، اپنی فہم اور اپنے علم کے مطابق دے گا ظاہر ہے اس صورت میں اس کی اطاعت کو کسی طرح بھی اللہ و رسول کی اطاعت نہیں کہا جاسکے گا۔ اس حقیقت کو ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے برسر منبر بڑے واشگاف الفاظ میں واضح کرتے ہوئے فرمایا:

ایھا الناس إن الرأی إنما کان من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبا إن اللہ کان یریہ وإنما ھو منا الظن والتکلف (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۵)	لوگو! دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے (دین کے بارے میں) اس لیے صواب ہوتی تھی کہ وہ اللہ کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔ رہی ہماری رائے تو وہ تو محض ایک اٹکل ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک موقعے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کاتب نے حضرت عمرؓ کے فیصلے پر یہ الفاظ لکھ دیئے ھذا ما أری اللہ أمیر المومنین عمر (یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے امیر المومنین عمرؓ کے خیال میں ڈالا ہے) حضرت عمرؓ نے دیکھا تو سختی سے منع فرمایا اور کہا کہ یوں مت لکھو بلکہ یوں لکھو کہ ھذا ما أری أمیر المومنین عمر (یہ وہ فیصلہ ہے جو امیر المومنین عمرؓ نے خود اپنے خیال کے مطابق صادر فرمایا) جتلانا یہی مقصود تھا کہ ہم پر نہ وحی آتی ہے نہ ہم معصوم عن الخطا ہیں اور نہ ہماری رائے کو حفاظت ربانی کی ضمانت حاصل ہے اس لیے ہماری رائے کو صواب رسی میں رسول کی رائے کا مقام نصیب نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے جس کی رائے کا صواب اور درست ہونا یقینی نہ ہو اس کی اطاعت کو اس ہستی کی اطاعت کے ہم پلہ کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے جس کی اصابت رائے پر وحی الٰہی ضامن ہو۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ امام وقت یا مرکزِ ملت کی اطاعت کو اطاعتِ رسول کے قائم مقام قرار دینے کا لازمی طور پر یہ مطلب ہوگا کہ وہ خصوصیات جو اطاعتِ رسول کے لیے قرآن سے ثابت ہیں وہ سب کی سب امام وقت یا مرکز ملت کے لیے بھی مختص تصور کی جائیں حالانکہ ان میں سے کوئی ایک خصوصیت بھی امام وقت یا مرکز ملت پر صادق نہیں آتی۔

اطاعتِ رسُول کے خصائص مرکزِ ملّت کی اطاعت پر صادق نہیں آتے

اطاعتِ رسول کے جو خصائص قرآن سے ثابت ہیں وہ ہم ایک ایک کر کے گناتے ہیں منکرین حدیث ان میں غور کر کے بتائیں ان میں سے کسی ایک کو بھی امامِ وقت یا مرکزِ ملت کے حق میں مختص قرار دینا کسی طرح بھی معقول نظر آتا ہے؟ قرآن کا ارشاد ہے:

فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما۔ (النساء: ۶۵)

سو آپ کے پروردگار کی قسم کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ لوگ آپس کے جھگڑے میں آپ کو حکم نہ بنالیں اور پھر جو فیصلہ آپ کریں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پُورا پُورا تسلیم کرلیں۔

اس آیت سے اطاعتِ رسول کی دو خصوصیتیں معلوم ہوئیں:

(۱) اوّل یہ کہ رسول کے فیصلے پر رضامندی شرطِ ایمان ہے جو شخص کسی معاملے میں رسول کے کیے ہوئے فیصلے سے اتفاق نہیں کرتا وہ مومن نہیں رہتا۔

(۲) دوسری یہ کہ رسول کی اطاعت کا حق تب ادا ہوتا ہے جب اپنے ہر معاملے کو رسول کے سپرد کر دیا جائے پھر جو فیصلہ وہ کردے اس کو ہر طرح حق اور درست مانا جائے نیز اس فیصلے پر اس طرح بخوشی راضی رہا جائے کہ اپنے خلاف ہونے کی صورت میں دل کے اندر بھی کوئی تنگی تک محسوس نہ ہو۔

اب امامِ وقت یا مرکزِ ملت کی اطاعت کو بعینہٖ رسول کی اطاعت قرار دینے والے ذرا سوچیں کیا مرکزِ ملت کی اطاعت بھی اسی درجے کی ہوگی کہ اس سے اتفاق نہ رکھنے والا ایمان کے دائرے سے خارج سمجھا جائے گا؟ کیا مرکزِ ملت کی ایسی اطاعت ممکن بھی ہے کہ اس کے ہر فیصلے کو حق اور درست مانا جائے اور اپنے خلاف دئے گئے کسی فیصلے پر دل میں ناگواری تک کا احساس نہ ہو؟

(۳) اطاعتِ رسول کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ رسول کا کیا ہوا ہر فیصلہ ناطق

ہوتا ہے اس کے فیصلے کے سامنے کسی مومن کو کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اس کے فیصلے سے انکار کرنے والا کھلی گمراہی کا مرتکب قرار پاتا ہے اطاعتِ رسول کی اس خصوصیت کے لیے سورۂ احزاب کی چھتیسویں آیت ملاحظہ کیجئے :

وما کان لمومن ولا مومنۃٍ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبینًا (الاحزاب : ۳۶)	اور کسی مومن یا مومنہ کے لیے یہ درست نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو اپنے (اس) امر میں کوئی اختیار باقی رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں جا پڑا ۔

ظاہر ہے مرکزِ ملت کے فیصلے کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی کہ اس کے بعد کسی کو کوئی اختیار ہی باقی نہ رہے ۔ نہ مرکزِ ملت کے فیصلے سے انکار کرنے والے کو گمراہ کہا جا سکتا ہے اس لیے کہ گمراہی یا ہدایت کا دارومدار وحی الٰہی کے ردوقبول پر ہے اور مرکزِ ملت وحی الٰہی کی رہنمائی سے محروم ہے ۔

(۴) اطاعتِ رسول کی ایک خصوصیت قرآن کریم ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ رسول کے کیے ہوئے فیصلے کی کہیں کوئی اپیل نہیں رسول جو حکم بھی دے دے اس کو سنتے ہی سرِ تسلیم خم کر دینا ضروری ہے ۔ ارشاد ربانی ہے :

انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا و اولئک ھم المفلحون ۔ (النور : ۵۱)	ایمان والوں کا قول تو یہ ہے جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف کہ (رسول) ان کے درمیان فیصلہ کر دیں تو وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا تو ایسے ہی لوگ تو فلاح یاب ہیں ۔

اس آیت میں تو سمع وطاعت کا اثباتی پہلو بیان کیا گیا ہے کہ حکمِ رسول کے معاملے میں جو لوگ سمع و طاعت کا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ فلاح یاب ہیں اس کے منفی پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ اطاعتِ رسول کا اقرار کر کے اس سے سرتابی کر جاتے ہیں

وہ مومن ہی نہیں ہیں ۔ سورۂ نور ہی کی آیت ہے :

ویقولون آمنا باللہ و بالرسول و اطعنا ثم یتولی فریق منھم من بعد ذلک و ما اولئک بالمومنین (النور : ۴۷)	اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لے آئے اور ان کا حکم مانا پھر ان میں کا ایک گروہ اس کے بعد سرتابی کر جاتا ہے اور یہ لوگ ہرگز ایمان والے نہیں

سمع وطاعت کے اثباتی اور منفی دونوں پہلوؤں کو یکجا کرکے دیکھئے معلوم ہوتا ہے حکم رسول پر اطلاع پانے کے بعد مومن کے لیے اور کوئی راستہ نہیں سوائے اس کے کہ سر اطاعت جھکا دے رسول سے اوپر کوئی ہستی ہی نہیں کہ اس کے سامنے اپیل کا سوال پیدا ہو خود رسول کے سامنے بھی چون وچرا کی گنجائش نہیں بس حکم رسو نے بطور اُ بجالائے ایمان کا تقاضا یہی ہے ۔

اطاعت رسول کی یہ خصوصیت بھی کسی طرح مرکز ملت پر صادق نہیں آتی تاریخ اسلام گواہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے کسی جانشین یعنی منکرین حدیث کی اصطلاح میں کسی مرکزِ ملت کی اطاعت کو اس کا مستحق نہیں سمجھا گیا کہ اس کے حکم کو ہر قسم کی تنقید سے بالاتر تصور کیا جائے حضرت عمر فاروق رضی جیسے رعب دیدبے کے حامل خلیفہ کے احکام کو ایک عام آدمی تنقید کا نشانہ بنا لیتا تھا اور جب تک قرآن وحدیث کی سند کے ساتھ اس کو مطمئن نہ کر دیا جاتا وہ تعمیل حکم سے صاف انکار کر دیتا تھا کوئی ایک نظیر بھی ایسی نہیں دی جا سکتی جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ کسی بھی جانشین رسول نے یا دوسرے لفظوں میں کسی بھی مرکزِ ملت نے یہ کہا ہو کہ ہمارے احکام کے سامنے سمع وطاعت کا ایسا ہی مظاہرہ کرو جیسا رسول اللہ کے سامنے لازم تھا کیونکہ مرکز ملت کی اطاعت، اطاعت رسول کے قائم مقام ہے ۔

(۵) اطاعتِ رسول کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ قرآن کے نزدیک رسول کی اطاعت بعینہٖ اللہ کی اطاعت ہے :

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (النساء ۔ ۸۰)	جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی ۔

گویا اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت دو جُدا جُدا حیثیتوں کی حامل نہیں ہیں بلکہ فی الحقیقت ایک ہی ہیں رسول کی اطاعت کی صورت میں بھی اطاعت دراصل اللہ ہی کی ہوتی ہے اس لیے کہ رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ وہی کچھ کہتا ہے جو اس پر وحی کی جاتی ہے ۔

اس کے بالعکس مرکز ملت صاحب وحی نہیں ہوتا اُس پر اللہ کی وحی نازل نہیں ہوتی وہ جو کچھ کہتا ہے اور جو فیصلہ دیتا ہے اپنی سمجھ بوجھ کے بھروسے پر دیتا ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے منکرین حدیث کو بھی انکار نہیں تو پھر ذرا بتلایئے اس خصوصیت کی موجودگی میں مرکز ملت کی اطاعت کو کس طرح اطاعتِ رسول کے قائم مقام قرار دیا جا سکتا ہے ۔

(۶) اطاعتِ رسول کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں یقینی طور پر اللہ کی محبت حاصل ہوتی ہے نیز وہ گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ بنتی ہے ۔ قرآن کا ارشاد ہے :

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفرلکم ذنوبکم (آل عمران : ۳۱)	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تا اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا ۔

کیا مرکز ملت کی اطاعت کے بارے میں بھی یہ ضمانت دی جا سکتی ہے کہ وہ اللہ کی محبت حاصل کرنے کا ایک سبب اور گناہوں کی مغفرت کا ایک ذریعہ ہے ظاہر ہے ایسی کوئی ضمانت قطعاً نہیں دی جا سکتی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرکز ملت کی اطاعت کو اللہ کے رسول کی اطاعت کے مرادف قرار نہیں دیا جا سکتا ۔

(۷) اطاعت رسول کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں ہدایت منحصر ہے جو شخص اللہ کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ ہدایت پا لیتا ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے :

وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا۔ (النور : ۵۴)	اگر تم اس (رسول) کی اطاعت کروگے تو ہدایت پالوگے۔

کیا منکرین حدیث کے مرکز ملت کو بھی یہ مقام دیا جا سکتا ہے کہ جو اس کی اطاعت کرے بس وہی ہدایت یافتہ سمجھا جائے اور اس کی اطاعت سے انکار کرنے والا گمراہ ٹھہرے۔ یہی نہیں بلکہ جو عمل اس نے اس انکار سے پہلے کیے ہوں وہ بھی ضائع ہو جائیں کیونکہ

(۸) قرآن ہی میں اطاعت رسول کی ایک یہ خصوصیت بھی بتائی گئی ہے کہ اس سے انکار کرنے کا نتیجہ حبط اعمال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ۔ (محمد : ۳۳)	اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو رائیگاں مت کرو۔

(۹) تعمیل حکم سے انکار کی صورت ہی میں حبط اعمال نہیں ہوتا اطاعت رسول کو تو قرآن نے وہ مقام دیا ہے کہ رسول کے سامنے اونچی آواز سے بولنے والا تک اپنے اعمال گنوا بیٹھتا ہے۔ سورۂ حجرات کی یہ آیت اس پر شاہد ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (حجرات : ۲)	اے ایمان والو اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز سے بلند نہ کیا کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں کھل کر بولا کرتے ہو کہ کہیں تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر تک نہ ہو۔

غور کرنے کی بات ہے کسی مرکز ملت کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے سامنے محض اونچی آواز سے بولنا یا کھل کر حفظ مراتب کا خیال کیے بغیر لاپروائی سے کلام کرنا حبط اعمال کا موجب بن سکتا ہے۔

(۱۰) اسی طرح اطاعت رسول کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اندر

معمولی معمولی اطاعت کو بھی سموئے ہوئے ہے حتیٰ کہ کسی خاص مجلس سے باہر نکلنا ہو تو اس کے لیے بھی رسول کی اجازت لینی ضروری ہے اس اجازت کو قرآن کمال ایمان کا معیار قرار دیتا ہے۔ سورۂ نور میں ہے :

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (النور : ۶۲)	جو لوگ آپ سے اجازت لے کر جاتے ہیں یہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔

یہ دس خصوصیات ہم نے گنائی ہیں جو قرآن کریم سے صرف اطاعتِ رسول کے لیے ثابت ہوئی ہیں ان میں سے کوئی ایک خصوصیت بھی ایسی نہیں جو امامِ وقت یا مرکزِ ملت پر صادق آسکے ایسی صورت میں ہر صاحب عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن کریم میں ہر جگہ اللہ و رسول کی اطاعت سے امام کی اطاعت مُراد لینا کہاں تک درست ہے۔

اطاعت رسول سے امامِ وقت یا مرکزِ ملّت کی اطاعت مراد لینے کے لازمی نتائجُ

ان خصوصیات میں ایک ایک کر کے غور کرتے چلے جائیے۔ ان میں سے کسی ایک خصوصیت کو بھی اگر امام کے لیے درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کے نتیجے میں ہمیں لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ امام اپنی اطاعت کے لحاظ سے نبی کے مقام پر فائز ہے العیاذ باللہ امام کی اطاعت کو رسول کی اطاعت قرار دے کر منکرین حدیث کیا نبوت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہتے ہیں؟

اس کے علاوہ اس سلسلے میں ایک اور بات بھی بہت اہم ہے۔ منکرین حدیث نے اللہ و رسولؐ سے امامِ وقت یا مرکزِ ملت تو مُراد لے لیا مگر یہ نہیں بتلایا کہ اس سے امام صالح مراد ہے یا امامِ فاسق اگر اس سے مطلق امام مُراد ہے خواہ وہ صالح ہو یا فاسق تو براہِ کرم یہ بھی بتلایا جائے کہ کیا امام فاسق کی اطاعت کو بھی ٹھیک ٹھیک اللہ رسولؐ کی اطاعت سمجھا جا سکے گا اور اگر اس سے مُراد خاص امام صالح ہے تو پھر تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ

خلافت راشدہ کے بعد تیرہ سو سال تک اللہ و رسول کی اطاعت کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہی اور اتنے طویل عرصے تک اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کا نظام بالکلیہ معطل پڑا رہا کیونکہ خلفائے راشدین کے بعد تو کوئی شاذونادر ہی امام صالح ہوا ہے۔ "اللہ و رسول" سے مرکز ملت مراد لے لینے کے بعد اس مشکل کا پیش آنا لازمی ہے اس کا منکرین حدیث کے پاس کیا حل ہے۔ سوچنے کی بات ہے قرآن نے بے شمار مقامات پر بصراحت اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ہدایت اور نجات کا راستہ صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں منحصر ہے۔ اب اگر ہر جگہ "اللہ و رسول" کی اطاعت سے مراد امام وقت یا مرکزِ ملت کی اطاعت ہو تو یقیناً گذشتہ تیرہ سو سالوں میں اماموں کی اکثریت ایسی ہی ہے جن کی اطاعت کو "اللہ و رسول" کی اطاعت نہیں کیا جا سکتا تو کیا یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس پورے عرصے میں مسلمانوں کے لیے راہِ نجات و ہدایت مسدود رہی کیا یہ مان لیا جائے کہ اس تمام دور میں مسلمانوں کے پاس اپنے باہمی نزاعات رفع کرنے کی کوئی صورت ہی موجود نہیں رہی کیا یہ تصور کر لیا جائے کہ دین اسلام ایک ایسا آئین ہے جس پر عمل کرنا دنیا کی طاقت سے باہر ہے اگر آپ "اللہ و رسول" کی اطاعت سے مرکز ملت کی اطاعت مراد لیتے ہیں تو آپ کو یہ سب کچھ جو قطعاً خلاف عقل و نقل اور سراسر خلاف واقعہ ہے ماننا پڑے گا۔

کبھی منکرین حدیث نے اس پر بھی غور کیا کہ وہ تمام خصائص جو قرآن سے اطاعتِ رسول کے لیے ثابت ہوتے ہیں اگر وہ امام وقت یا مرکز ملت کی ذات میں مجتمع ہو گئے تو عملی طور پر اس کا نتیجہ کیا نکلے گا وہ تمام آیات جو اس ضمن میں ہم نے ابھی پیش کی ہیں ذرا ان میں غور کیجیے مرکز ملت کی ذات میں یہ تمام خصائص مجتمع ہو جانے کی صورت میں ایسی بد ترین آمریت قائم ہو گی کہ فرعون کی فرعونیت اور ہٹلر و مسولینی کی بدنام زمانہ ڈکٹیٹرشپ بھی اس کے سامنے ماند پڑ جائے گی ذرا خیال تو کیجیے جب حال یہ ہو کہ مرکز ملت مسلمانوں کا دین و ایمان قرار پائے اس کے ہر حکم پر سر تسلیم کرنے والا تو مسلمان رہے مگر جو بھی کسی معاملے میں اس سے اتفاق نہ کرے وہ ایمان کے دائرے سے خارج سمجھا جائے اس کو راضی کرنا ہر مسلمان کے لیے شرطِ ایمان قرار پائے اور جو شخص بھی اس کی اطاعت سے ذرا منہ موڑے اس کی نماز، اس کا روزہ، اس کی زکوٰۃ غرض اس کی ساری نیکیاں برباد ہو جائیں، اس کے سامنے آواز بلند

کرنے والا حتیٰ کہ اس کی مرضی کے بغیر اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر ہو جانے والا تک اللہ کا مجرم گردانا جائے تو ایسا مرکزِ ملّت کس قدر زبردست آمر اور ڈکٹیٹر ثابت ہوگا اس کی آمریت کو تاریخ انسانی کی کسی آمریت سے بھلا کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

پھر کبھی منکرین حدیث نے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ بنو امیہ کے بعد سے آج تک سارا عالمِ اسلام کبھی ایک دن کے لیے بھی ایک مرکزِ ملت کے تحت جمع نہیں ہوا اس زمانے میں بھی مسلمانوں کی حکومتیں متعدد ہیں جو مختلف سربراہوں کے تحت اپنا نظامِ حکومت چلا رہی ہیں تو اب کیا انڈونیشیا، ملایا، ایران، ترکی، پاکستان، عرب، مصر، لیبیا، اُردن، شام، عراق، تونس اور مراکش وغیرہ میں سے ہر ایک کے "اللہ و رسول" الگ الگ ہوں گے؟ یا کسی ایک ملک کے "اللہ و رسول" کیا زبردستی اپنی آمریت دوسرے ملکوں کے "اللہ و رسول" پر مسلّط کریں گے؟ یا کیا اسلام کا سارا نظام اسوقت تک پورا کا پورا معطل رہے گا جب تک پورا عالم اسلام متفق ہو کر ایک "اللہ و رسول" کا انتخاب نہ کرلے؟ کاش منکرین حدیث نے ان عواقب پر غور کیا ہوتا جو "اللہ و رسول" سے امامِ وقت یا مرکزِ ملت مراد لینے کی صورت میں لازمی طور پر پیش آتے ہیں سچی بات یہ ہے کہ اگر انہوں نے صرف ان عواقب ہی پر غور کر لیا ہوتا تو منصب رسالت اور مرکزِ ملت کے تصور کو یوں گڈمڈ کر کے دینِ اسلام کا اس طرح حلیہ نہ بگاڑتے۔

چند بے بنیاد اعتراضات اور ان کا تجزیہ

اب تک ہماری گفتگو کا محور زیادہ تر وہ اعتراضات رہے ہیں جن کو منکرین حدیث اپنی دانست میں علمی مسائل کا رنگ دے کر پیش کرتے ہیں اور جن سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ احادیث نبوی کی عدم حجیت اگر ثابت نہ ہو سکے تو کم از کم ان کی حجیت مشکوک ضرور ہو جائے۔ لیکن جب علمی بساط پر ان کی یہ کوشش کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی تو پھر وہ اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آتے ہیں پھر وہ سارا زور اس پر صرف کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ کسی طرح عام سادہ لوح مسلمانوں کی نظر میں احادیث کے موجودہ ذخیرے کو بے وقعت اور ناقابل اعتماد ثابت کر دیا جائے۔ اسی ضمن میں جتنے اعتراضات ان کی طرف سے کیے جاتے ہیں وہ اگرچہ اس قابل تو نہیں کہ انہیں کوئی وزن دیا جائے لیکن چونکہ زیر نظر تحریر سے ہمارا مقصود ہی منکرین حدیث کی ان شاطرانہ چالوں کو واشگاف کرنا ہے جو وہ ناواقف حال عام مسلمانوں کے اذہان کو مسموم کرنے کے لیے چلتے ہیں اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اعتراضات کی بھی اصل حقیقت واضح کر دی جائے تاکہ وہ لوگ جو بے چارے دین سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی بنا پر منکرین حدیث کی چالوں کو سمجھ نہیں پاتے ان کے فریب کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔

بے بنیاد اعتراضات

اس سلسلے میں ہم اپنی گفتگو صرف ان اعتراضات کے تجزیے تک محدود رکھیں گے جن کو منکرین حدیث کے یہاں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ایسے اعتراضات مختصراً حسب ذیل ہیں:

(۱) احادیث نبوی کا موجودہ ذخیرہ ناقابل اعتبار ہے اس لیے کہ اس ذخیرے میں موضوع احادیث بہت کثرت سے شامل ہیں اور یہ صحیح و غیر صحیح اس طرح مخلوط ہیں کہ ان میں امتیاز دشوار ہے۔ جھوٹی احادیث کا سلسلہ عہد رسالت ہی میں شروع ہو گیا تھا پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا جعلی اور جھوٹی حدیثوں کا انبار لگتا چلا گیا۔ موضوع احادیث کی کثرت کا اندازہ اسی

بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امام بخاری کے زمانے میں چھ لاکھ حدیثیں رائج تھیں جن میں سے امام صاحب نے صرف نو ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا۔

(۲) بعض احادیث خلاف عقل و درایت ہیں لیکن اس کے باوجود محدثین کے یہاں انہیں صحت کا درجہ حاصل ہے۔

(۳) بعض صحیح احادیث عریاں مضامین پر مشتمل ہیں۔

(۴) بعض صحیح احادیث علم اور تجربے کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔

(۵) اکثر احادیث باہم متعارض ہیں اور متعارض اشیاء ساقط الاعتبار ہوتی ہیں لہٰذا احادیث بھی تعارض کی وجہ سے ساقط الاعتبار ہوئیں۔

(۶) اکثر احادیث کی روایت بالمعنیٰ ہے یعنی راوی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہی محفوظ نہیں تو مفہوم کے بارے میں کیسے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ محفوظ ہے۔

(۷) سب سے زیادہ احادیث حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہیں اور ابو ہریرہ کا حال یہ ہے کہ خود صحابہ کے درمیان ان کو نا قابل اعتماد تصور کیا جاتا تھا۔

(۸) امام ابو حنیفہ نے مسائل فقہی کے استنباط کے لیے صرف ۱۷ یا ۱۸ حدیثوں پر اعتماد کیا ہے ورنہ جتنے احکام و مسائل کا بھی انہوں نے استنباط کیا ہے ان سب کی بنیاد قرآن کی مکتوب ہدایات پر رکھی ہے اگر امام ابو حنیفہ یہ حق رکھتے تھے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کی تعبیر اس وقت کے حالات کی روشنی میں کریں تو بعد میں آنے والوں کو یہ حق کیوں نہیں کہ وہ قرآن کی تعبیر اپنے وقت کے حالات کو مدنظر رکھ کر حدیث کی مدد کے بغیر کر سکیں۔

یہ ہے خلاصہ ان اعتراضات کا جو حدیث کی وقعت کو کم کرنے اور حدیث پر عام مسلمانوں کا اعتماد مجروح کرنے کی خاطر منکرین حدیث کی جانب سے بار بار مختلف انداز بدل بدل کر بڑے شد و مد سے اچھالے جاتے ہیں۔ اب ہم ایک ایک کر کے ان تمام اعتراضات کا بے بنیاد ہونا واضح کرتے ہیں۔

۱۔ موضوع احادیث کی موجودگی سے غلط استدلال

منکرین حدیث کا پہلا اعتراض وضع حدیث سے متعلق ہے ان کا کہنا ہے کہ چونکہ موضوع احادیث بہت کثرت سے ہیں اس لیے احادیث کا سارا ذخیرہ ناقابل اعتماد ہو گیا ہے۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ موضوع احادیث کثیر تعداد میں موجود ہیں مگر منکرین حدیث کی یہ منطق کسی طرح سمجھ میں آنے والی نہیں کہ ان کی موجودگی احادیث کے تمام ذخیرے کو ساقط الاعتبار بنا دیتی ہے یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ دنیا میں جھوٹ کی موجودگی سچ کو ناقابل اعتبار بنا دینے کی موجب ہے۔ کیا کسی معاشرے میں جھوٹوں کا وجود اس معاشرے کے سچے لوگوں کو بھی جھوٹا بنا دیتا ہے۔ دنیا میں کونسا ملک یا کونسا شہر ایسا ہے جہاں جھوٹے افراد نہیں بستے تو کیا ان جھوٹوں کی وجہ سے یہ حکم لگا دینا صحیح ہے کہ اس ملک یا اس شہر کے تمام باشندے جھوٹے ہیں۔ ہر زمانے میں سچ کے ساتھ ساتھ جھوٹ کا سلسلہ برابر لگا چلا آ رہا ہے مگر آج تک جھوٹ کی وجہ سے سچ کو کسی نے نہیں چھوڑا۔ منکرین حدیث کی یہ نرالی منطق ہے کہ چونکہ جھوٹی احادیث کا وجود پایا جاتا ہے اس لیے سچی اور صحیح احادیث پر بھی اعتماد نہ کیا جائے۔ بعض احادیث کے موضوع اور مبنی بر کذب ہونے سے یہ کہاں لازم آیا کہ کل ذخیرۂ حدیث موضوع اور ناقابل اعتبار بن گیا۔ یہ بعض کا حکم کل پر لگانا کونسا اصول ہے؟

دراصل منکرین حدیث کی اس منطق کی بنیاد اس غلط مفروضے پر ہے کہ احادیث کے ذخیروں میں صحیح و غیر صحیح احادیث باہم اس طرح غلط ملط ہیں کہ ان میں امتیاز دشوار ہے۔ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت سے جعلی اور موضوع احادیث کا سلسلہ شروع ہوا اسی وقت سے محدثین اور ائمہ مجتہدین نے اپنی تمام کوششیں اس بات پر مرکوز رکھیں کہ موضوعات کا یہ ذخیرہ کسی راہ سے بھی احادیث کے معتبر اور قابل اعتماد ذخیروں میں نفوذ نہ کر پائے۔ حضرات محدثین نے صحیح اور غیر صحیح کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے باقاعدہ قواعد و ضوابط بنائے، جھوٹے اور سچے راویوں کی پہچان کے لیے علم اسماء الرجال ایجاد کیا، کھرے کھوٹے میں تمیز کے لیے علم جرح و تعدیل مدون کیا

پھر ایک ایک حدیث کو جانچا اور ایک ایک راوی کو پرکھا موضوعات کو الگ کر دیا اور معتبرات کو علیحدہ نکال لیا۔ ہر روایت کی سند متعین کی اور ہر راوی کا نام پتہ اور حال سب کچھ منضبط کر دیا۔

حضرات محدثین نے حدیث کی صحت اور تنقید کا معیار بھی بتلایا اور موضوعات پر باقاعدہ کتابیں بھی لکھیں انہوں نے ایک ایک واضع حدیث کا پتہ لگا کر اس کا نام رجال کی کتابوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت کر دیا ایک ایک جھوٹی اور موضوع حدیث کا کھوج لگا کر احادیث موضوعہ کے مجموعے مرتب کر دئے جن میں خوب واضح طور پر یہ بتلایا کہ یہ حدیثیں جعلی ہیں ان کو کوئی اصل حدیث نہ سمجھے جس حدیث پر بھی کلام کیا اولاً اس کی سند بتلائی پھر اس کے راویوں کے صدق وکذب اور ان کے ثقہ وغیر ثقہ ہونے نیز ان کے حافظے کی قوت وضعف پر بحث کر کے نتائج مرتب کیے پھر کسی حدیث پر کوئی حکم لگایا بے دلیل کوئی حکم نہیں لگایا اگر کسی حدیث کے موضوع اور غیر موضوع ہونے میں علمائے حدیث کا اختلاف ہوا تو وہ تمام اختلاف بھی من وعن بیان کر دیا تاکہ ہر کوئی خود دیکھ لے پرکھ لے اور کھرا کھوٹا الگ کر لے۔ اس قدر تنقیحات کے بعد بھی اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صحیح وغیر صحیح احادیث آپس میں غلط ملط ہیں تو اس پر اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ روز روشن میں سورج کے وجود سے انکاری ہے۔

منکرین حدیث نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو بھی عام مصلحین عالم کے اقوال کی طرح سمجھ لیا ہے کہ جس نے چاہا ان کی طرف منسوب کر کے کوئی بات کہہ دی اور لوگوں نے محض ان کے نام کی نسبت کے رعب میں آ کر اسے قبول کر لیا کسی نے ان کی صحت وعدم صحت کی تحقیق کی ضرورت ہی نہ سمجھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عام مصلحین عالم کے اقوال کی طرح نہ تھے کہ ان کا تعلق محض چند مبنی بر اخلاق نصائح سے ہو یا وہ فلسفہ حیات انسانی کے چند علمی نکات تک محدود ہوں جن کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے کہ ان کے قائل کی طرف نسبت اگر درست نہ بھی ہو تو نفس مضمون پر اور اس سے مستنبط نتائج میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور

اسی لیے ان کے بارے میں تحقیق و تفتیش کی زحمت بھی کوئی نہیں اٹھاتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا معاملہ بالکل جُدا ہے وہاں تو آپ کے ایک ایک ارشاد پر ایک ایک اسلامی قانون کی بُنیاد رکھی جا رہی تھی آپ کے ایک ایک فعل کو نظیر بنا کر شریعتِ اسلامی کی عمارت کی تعمیر میں ایک ایک اینٹ نصب کی جا رہی تھی۔ آپؐ کی سنت کو دینِ اسلام کے بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل تھی۔ آپؐ کی طرف کسی معمولی سے معمولی بات کی غلط نسبت اسلامی قوانین کے پورے ڈھانچے پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔ بھلا ایسی صورت میں یہ خیال کرنا کسی طرح بھی درست مانا جا سکتا ہے کہ واضعین حدیث جھوٹی احادیث وضع کرتے رہے اور محدثین بغیر کسی تحقیق کے انہیں اپنے مجموعوں میں شامل کرتے چلے گئے۔

محدثین نے قبول حدیث کے لیے جو اُصول ابتدا ہی سے بالاجماع مقرر کر دیے تھے ان کی موجودگی میں یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کسی جھوٹ نے مجموعہ ہائے احادیث میں اس طرح راہ پا لی ہو کہ محدثین اس کی نشان دہی کرنے سے قاصر رہ گئے ہوں۔

نقدِ رواۃ حدیث

روایانِ حدیث پر نقد و جرح فنِ حدیث کا ایک عظیم باب ہے اس کے ذریعے علمائے حدیث نے احادیث صحیحہ وسقیمہ کو باہم ممیّز و ممتاز کرنے کا ایسا عظیم الشان کام انجام دیا کہ تاریخ انسانی اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے محدثین نے اس سلسلے میں جہد و سعی کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا اُنھوں نے تمام راویانِ حدیث کو جانچا پرکھا ان کی حیات ان کی سیرت حتیٰ کہ انکی عادات تک کا مطالعہ کیا۔ اُنھوں نے ان کے تمام ظاہری و باطنی امور کا بخوبی جائزہ لیا۔ اس راہ میں انہیں نہ کسی کی ملامت کا خوف دامنگیر ہوا نہ کسی لالچ نے ان کا راستہ روکا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کیے جانے والے جھوٹ کے قبول کرنے کا تو خیر سوال ہی کیا محدثین نے تو یہاں تک کیا کہ جس راوی کو کسی ایک حدیث میں انہوں نے دروغ گوئی کا مرتکب پایا اس راوی کی باقی احادیث کو بھی اُنھوں نے مردود قرار دے دیا۔ یہی نہیں محدثین نے اس شخص کی حدیث بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کا حدیث

رسول کی روایت میں تو جھوٹ ثابت نہ ہو لیکن دیگر باتوں میں وہ جھوٹ بولنے کا عادی ہو بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر محدثین نے تو احتیاط کی انتہا کردی اس سے زیادہ احتیاط عقل تصور کرنے سے قاصر ہے اُنہوں نے ایک اُصول کی حیثیت سے یہ طے کردیا کہ جس شخص نے اپنی پوری زندگی میں ایک مرتبہ بھی دروغ گوئی کا ارتکاب کیا ہو اس کی حدیث قبول نہ کی جائے بھلا کوئی حد ہے احتیاط کی! فلسفۂ تاریخ کا ایک مسلّمہ مسئلہ ہے کہ جھوٹے کی ہر بات کا جھوٹا ہونا ضروری نہیں" عربی میں بھی ایک مقولہ ہے الکذوب قد یصدق (جھوٹا بھی کبھی سچ بول دیتا ہے) مگر محدثین کی احتیاط کا عالم ملاحظہ کیجئے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ قاعدہ مقرر کردیا کہ جس شخص کا مدت العمر میں ایک مرتبہ بھی جھوٹ ثابت ہو جائے اس کی کوئی روایت معتبر نہیں۔

اس بات سے بچنے کے لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کوئی غلط بات کہیں حدیث کا درجہ حاصل نہ کرلے محدثین نے یہاں تک اہتمام کیا کہ اس روای کی روایت بھی قبول کرنے سے انکار کردیا جس کے بارے میں یہ گمان ہی پیدا ہوگیا کہ شاید بھولے سے یا کسی غلطی کی بنا پر یا کم فہمی و بدفہمی کے نتیجے میں وہ روایت کی صحت کو برقرار نہ رکھ سکا ہو۔ چنانچہ بالاجماع سلسلۂ سند کے ہر راوی کے لیے انہوں نے یہ اصول قرار دے دیا کہ حدیث اس راوی کی قبول کی جائیگی جو:

(۱) صحیح الفہم ہو، یعنی بدعقل اور بدفہم نہ ہو یعنی جو حدیث کے سمجھنے میں غلطی نہ کرتا ہو۔

(۲) صحیح الحافظہ ہو یعنی جس پر نسیان اور وہم کا غلبہ نہ ہو۔

(۳) محتاط ہو روایت میں سہل انگاری سے کام نہ لیتا ہو۔

اور تو اور محدثین نے اس راوی کی روایت کو بھی قابل قبول نہیں سمجھا جو فاسق و فاجر اور بدکار ہو حالانکہ ہر بدکردار شخص کا جھوٹا ہونا ضروری نہیں لیکن چونکہ بدکردار شخص کے بارے میں احتمال موجود ہے کہ فسق و فجور کی بنا پر اس کی نگاہ میں حدیث رسول کی روایت میں احتیاط کی اہمیت جس قدر کہ لازم ہے نہ رہی ہو اس لیے اس کی روایت کو بھی معتبر نہیں جانا اور یہ شرط لگادی کہ روایت اس راوی کی قبول کی جائے جو ثقہ اور متقی

ہو نیز معروف ہو مجہول نہ ہو یعنی اہل علم اور اہل تقویٰ اس کے نام، نسب کردار اور اس کے علم، حفظ اور ثقاہت سے واقف ہوں اور ان کی نظر میں اس کی رفتار و گفتار اس کے حال احوال اور اس کا عام کردار قابل اعتراض نہ ہو۔

اس کے ساتھ ہی محدثین نے روافض کی مرویات کو بھی مردود قرار دے دیا اس لیے کہ روافض وضع حدیث میں پیش پیش تھے بلکہ یہ صحیح یہ ہے کہ اوّلین واضع ہی یہ لوگ تھے انہوں نے حضرت علی اور اہل بیت کے فضائل و مناقب پر مشتمل بکثرت حدیثیں وضع کی تھیں چنانچہ محدثین نے یہ اصول بنا دیا کہ روافض کی روایت قبول نہ کی جائے اگرچہ علمائے حدیث نے بعض ایسے شیعہ راویوں کی روایات قبول کی ہیں جو صدق و امانت میں معروف تھے اور تقیہ کے قائل نہ تھے لیکن محدثین کسی شیعہ راوی کی روایت اس صورت میں بالکل قبول نہیں کرتے جب وہ اپنے مخصوص مسلک کی تائید و حمایت میں کوئی حدیث روایت کر رہا ہو یا اس کا تعلق کسی ایسے گروہ سے ہو جو جھوٹ کو حلال سمجھتا ہے۔ یہی طرز عمل محدثین کا دیگر مبتدعین کے بارے میں بھی ہے کسی ایسے بدعتی کی روایت جو اپنے مسلک کا داعی ہو ان کے نزدیک قابل قبول نہیں۔

وضع حدیث کے اسباب و وجوہ میں سے ایک سبب چونکہ زندقہ بھی تھا، زندقہ سے مراد یہ ہے کہ اسلام کو ایک دین و مذہب کے اعتبار سے بہ نظر کراہت و حقارت دیکھا جائے۔ گروہ زنادقہ نے دین حنیف میں بگاڑ پیدا کرنے، عقلا اور مہذب طبقے کی نگاہ میں اس کی وقعت کو کم کرتے اور عوام کے عقائد کو انتہائی پست اور مضحکہ خیز سطح پر لانے کے لیے چونکہ بہت سی حدیثیں وضع کر ڈالی تھیں اس لیے محدثین کو اگر کسی راوی کے بارے میں یہ تحقیق ہو گیا کہ اس کا تعلق گروہ زنادقہ سے ہے تو اس کی تمام مرویات کو انہوں نے مردود قرار دے دیا۔

غرض ایک طرف اگر واضعین حدیث تھے تو دوسری طرف محدثین کی مقرر کردہ نقد رواۃ و رجال کی کسوٹی تھی جس نے کھرے اور کھوٹے کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے میں ایسا محیر العقول کارنامہ انجام دیا کہ علم سیر و سوانح کی تاریخ میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔

تنقیح متن حدیث پھر اسی پر اکتفا نہیں راویوں کی جانچ پڑتال کے ساتھ محدثین نے متن حدیث میں بھی ایسے علامات کی نشان دہی کردی جن سے صاف معلوم ہو جائے کہ کونسی حدیث موضوع ہے اور کونسی نہیں۔ چنانچہ امور ذیل میں سے کوئی امر اگر کسی حدیث میں پایا جائے تو علمائے حدیث کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ موضوع ہے۔

(۱) جو حدیث قرآن کی عبارۃ النص کے خلاف ہو اور قابل تاویل نہ ہو۔

(۲) جو حدیث کسی سنت متواترہ کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو۔

(۳) جو حدیث قرآن وسنت سے ماخوذ قواعد عامہ کے صریحاً خلاف ہو

(۴) جو حدیث اجماع قطعی یعنی اجماع صحابہ و تابعین کے خلاف ہو اور کسی طرح اس کی توجیہ و تاویل نہ کی جا سکتی ہو۔

(۵) جو حدیث عہد رسالت کے معروف تاریخی حقائق کے خلاف ہو۔

(۶) جو حدیث کسی معمولی کام کے صلے میں مبالغہ آمیز اجر و ثواب کا پتہ دیتی ہو یا اسی طرح معمولی کام کے مرتکب ہونے پر شدید عذاب کی وعید کا ذکر ہو۔

(۷) جو حدیث کسی ایسے واقعے پر مشتمل ہو جو بہت سے لوگوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا ہو اور اس بنا پر اس کا متقاضی ہو کہ بکثرت لوگ اس کو روایت کریں مگر باایں ہمہ صرف ایک ہی راوی اسے روایت کرے۔ یا اس واقعہ میں شریک ہونے والے اس کے خلاف اس قدر کثرت سے روایت کریں کہ عقلاً ان کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا ممکن ہو۔

(۸) جو حدیث کسی ایسے مضمون پر مشتمل ہو جس کو عقل بداہتہً رد کرتی ہے لیکن اس میں ہر کہ ومہ کی عقل معیار نہیں بلکہ علماء اور ماہرین فن حدیث اس کو خلاف عقل قرار دیں۔ محاورات عرب سے ناواقف اور حدیث کے علوم سے بے بہرہ افراد کی رائے اس باب میں قطعاً کوئی وزن نہیں رکھتی۔

(۹) جو حدیث ایسے علوم متعارفہ کے مخالف ہو کہ جن کے اصول مشاہدوں اور بے شمار تجربوں کے بعد قائم کیے گئے ہوں اور ان سے ہمیشہ ایک ہی جیسے ایسے نتیجے برآمد ہوتے ہوں جن میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا۔

(۱۰) جو حدیث ایسے مضمون کی حامل ہو جس کا جاننا تمام مکلفین پر فرض ہو اور نہ جاننے کے لیے کوئی عذر بھی نہ ہو مگر بایں ہمہ اس کا روایت کرنے والا سوائے اس کے اور کوئی نہ ہو۔

(۱۱) جو حدیث ایسے رکیک اور گھٹیا الفاظ پر مشتمل ہو جن کا صدور کسی عام فصیح و بلیغ شخص کی ذات سے متوقع نہ ہو چہ جائیکہ سید الفصحا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے ان کا صدور ہوا البتہ یہ وہاں ہوتا ہے جہاں اس امر کی صراحت کی گئی ہو کہ یہ الفاظ آپؐ نے فرمائے ہیں۔

(۱۲) جو حدیث فساد معنی کی حامل ہو یعنی جس میں ایسا مضمون بیان کیا گیا ہو جو عقلی بدیہیات کیخلاف ہو اور اس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو مثلاً ایسی حدیث جو حکم و اخلاق کے قواعد عامہ کے منافی ہو یا ایسی حدیث جو شہوت و فساد کی موجب ہو۔

(۱۳) جو حدیث خود اپنے راوی کے اقرار کے بموجب موضوع ہو۔

اب منکرین حدیث بتلائیں کہ ان اساسی و اصولی قواعد و ضوابط کے بعد جو محدثین نے متن حدیث کی چھان پھٹک اور جانچ پڑتال کے لیے وضع کیے کیا کوئی امکان اس بات کا رہ جاتا ہے کہ صحیح و غیر صحیح احادیث باہم اس طرح خلط ملط ہو گئی ہوں کہ ان میں باہم امتیاز کرنا دشوار ہو۔ حق یہ ہے کہ نقد رواۃ و رجال کی ان کڑی شرائط کی موجودگی میں جن کا مختصر سا خاکہ ہم ابھی اوپر پیش کر آئے ہیں اور متن حدیث سے متعلق ان متذکرہ بالا تصریحات و تنقیحات کے ہوتے ہوئے موضوع احادیث کی کثرت جتنی موجود ہے اس سے دوگنی اور چارگنی بھی ہوتی تو کسی اندیشے اور خطرے کی بات نہ ہوتی۔

خداداد صلاحیت علاوہ ازیں اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے محدثین کو ایک خاص نور فہم و فراست عطا فرمایا تھا جس کے ذریعے ان کو حدیث صحیح اور حدیث موضوع کا فرق بدیہی طور پر نظر آجاتا تھا۔ حضرات محدثین حدیث کو سنتے ہی بغیر سند کے دیکھے ہوئے سمجھ جاتے تھے کہ یہ ارشاد نبوی ہے یا نہیں، چنانچہ انہوں نے اپنی اس خداداد صلاحیت سے

بھی تحقیق و تنقیح حدیث میں خوب خوب کام لیا بسا اوقات ایسا ہوتا کہ محدثین کسی حدیث کو سنتے ہی اس لیے رد کر دیتے تھے کہ ان کی فنی مہارت و بصیرت اس کو قبول کرنے سے انکاری ہے۔ محدثین کے یہاں ہمیں اس قسم کے کلمات کی جو بہتات ملتی ہے کہ "اس حدیث پر تاریکی چھائی ہوئی ہے" یا "اُس حدیث کو دل تسلیم نہیں کرتا" یا "اُس حدیث کا متن تاریک ہے" یا "اُس حدیث سے جی مطمئن نہیں" وغیر ذلک تو اس کا سبب یہی ہے کہ کلمات نبویہ کی دن رات مذاکرت و مزاولت کی وجہ سے کلام نبوی میں غیر نبی کے کلام کی آمیزش کو پہچان لینا ان حضرات کا مزاج بن کر رہ گیا تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں عام زندگی میں ہمیں اس کی مثالیں بہت مل جاتی ہیں۔ شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھئے وہ شعر سنتے ہی بتا دیں گے کہ یہ کس اُستاد شاعر کا شعر ہے اگرچہ اُنھوں نے وہ شعر اس سے پہلے کبھی سنا بھی نہ ہو' اس پہچان کی آپ وجہ پوچھیں گے تو وہ یہی بتائیں گے کہ اس شعر پر فلاں اُستاد کا رنگ غالب ہے۔ کسی اُستاد شاعر کے کلام میں دُوسرے کسی کلام کی آمیزش کر کے ذرا کسی ایک شخص کو سُنا کر دیکھئے جو کم از کم سخندانوں کی فہرست میں آتا ہو اور صاحب ذوق ہو وہ اس آمیزش کو فوراً پہچان لے گا۔ سبب اس کا بھی وہی ہے کہ اساتذہ کا کلام لگاتار پڑھتے پڑھتے ان کے کلام کا رنگ اس کے مزاج میں رچ بس گیا ہے۔ اسی قسم کا معاملہ فقہا اور فتویٰ کا کام کرنے والوں کے ساتھ ہے کیونکہ دن رات ان کا واسطہ ائمہ مجتہدین کے اقوال سے ہی رہتا ہے اس لیے وہ طرز کلام ہی سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے یا امام شافعیؒ کا یا ائمہ میں سے کسی اور امام کا۔

یہ تو علمی جواہر پاروں کی بات ہے جو اپنے مُنہ سے خود بولتے محسوس ہوتے ہیں لوگ پتھر کے بے زبان جواہرات کو ایک نظر دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں کہ کھرا اور اصلی کونسا ہے اور کھوٹا اور نقلی کونسا۔ لہٰذا محدثین کے بارے میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ حدیث کو سنتے ہی بغیر سند دیکھے ہوئے پکار اُٹھتے تھے کہ یہ ارشاد نبوی ہے یا نہیں۔

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ جس طرح شعرا کا کلام پہچاننے کے لیے سخندان ہونا شرط ہے اور ائمہ کے اقوال میں باہم تمیز کے لیے فقیہ ہونا ضروری ہے یا جس طرح

جواہرات کی پہچان صرف جوہری ہی کر سکتا ہے اسی طرح احادیث میں کھرا کھوٹا الگ کرنے کے لیے محدث ہونا شرط لازم ہے۔ ہر کس و ناکس اپنے اوپر قیاس کر کے یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس طرح ہمیں حدیث صحیح اور حدیث موضوع میں باہم کوئی فرق نظر نہیں آتا اسی طرح محدثین کے لیے بھی یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ موضوع حدیث کو سنتے ہی پہچان لیتے تھے۔ محدثین کرام کا تو معاملہ ہی جدا ہے' ارشادات نبوی کی دن رات مذاکرت و مزاولت کے علاوہ نصرت الٰہیہ بھی ان کے شامل حال تھی۔ اللہ تعالےٰ نے ان سے اپنے دین کی حفاظت کا کام لینا تھا اس لیے ان کو اپنی موہبت خاصہ سے ایسا خاص فہم عطا فرما دیا تھا کہ وہ اس سے حق اور باطل' ہدایت و ضلالت اور جھوٹ اور سچ میں بآسانی تمیز کر لیتے تھے۔ ان کے قلوب حدیث کے لیے آئینہ کا کام دیتے تھے جس میں ارشاداتِ نبوی کے نور کا خود بخود انعکاس ہو جاتا تھا۔ حضرت ربیع بن خیثم تابعی فرمایا کرتے تھے:۔

اِنَّ لِلْحَدِیْثِ ضَوْءً کَضَوْءِ النَّھَارِ یُعْرَفُ وَظُلْمَةً کَظُلْمَةِ اللَّیْلِ تُنْکَرُ (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم و قواعد التحدیث للشیخ ابوالحسن حنبلی دمشقی ص ۱۳۵ مطبوعہ دمشق)۔	صحیح حدیث میں دن کی روشنی کی طرح ایک خاص قسم کی روشنی ہوتی ہے جو پہچانی جاتی ہے اور (موضوع حدیث میں) رات کی تاریکی کی طرح ایک خاص قسم کی تاریکی ہوتی ہے جو ناگوار محسوس ہو جاتی ہے۔

دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ایک خاص عظمت اور جلال ہوتا ہے جو کسی دوسرے کے کلام میں نہیں ہوتا' یہ عظمت و جلال محدثین کے گوشت پوست میں رچ بس جاتا ہے جس کی بنا پر حدیث صحیح کے الفاظ بلا واسطہ ان کے دل پر جا کر لگتے ہیں۔ قواعد التحدیث ہی میں شیخ ابوالحسن حنبلی دمشقی نے خود اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے فرماتے ہیں' میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ جب کوئی حدیث سنتے تو سنتے ہی بتلا دیتے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ یا موضوع' بعد میں تحقیق کرتے تو پتہ لگتا کہ محدثین نے بھی ایسا ہی لکھا ہے ان بزرگ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں حدیث صحیح ہے اور فلاں موضوع تو انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ایک خاص عظمت اور جلال ہوتا ہے جو دوسرے کے کلام میں نہیں ہوتا اور اسی طرح صحابہؓ کرام کا کلام دوسروں

کے کلام سے ممتاز ہوتا ہے۔ حافظ ابن قیم سے کسی نے سوال کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ سند دیکھے بغیر حدیث موضوع کا علم ہو جائے انھوں نے جواب دیا سند کو دیکھے بغیر وہی شخص حدیث کو پہچان سکتا ہے کہ جس کے گوشت پوست میں حدیث سرایت کر چکی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات اور اوامر و نواہی اور آپؐ کے محبوبات و مرضیات ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے ہوں صرف ایسا ہی شخص حدیث کو سنتے ہی بغیر سند کے دیکھے ہوئے سمجھ جاتا ہے کہ یہ ارشاد نبوی ہے یا نہیں۔

قرون اولیٰ کے محدثین کی تو خیر بات ہی جدا ہے ان کے تو گوشت پوست تک میں واقعی علم حدیث رچ بس گیا تھا آج بھی جو شخص بشرطیکہ عربی زبان پر اسے پورا عبور حاصل ہوا احادیث کی اکثر کتابوں کا یا کم از کم صحیحین کا گہری نظر سے مطالعہ کرے گا وہ اس قابل ہو جائے گا کہ نبی کے کلام کو غیر نبی کے کلام سے الگ پہچان لے گا دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ایک خاص زبان اور اپنا ایک مخصوص طرز بیان ہے جو آپؐ کی تمام صحیح احادیث میں بالکل یکسانیت اور یک رنگی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ آپؐ کے کلام میں آپؐ کی شخصیت بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اس میں آپؐ کا بلند منصب و مقام جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آپؐ کا انداز تکلم فقروں کی بناوٹ الفاظ کا انتخاب اور طرز بیان سب کچھ ایسی انفرادیت کا حامل ہے کہ کوئی دوسرا اس کی نقل کر ہی نہیں سکتا چنانچہ آپؐ کی احادیث سے گہرا شغف رکھنے والا صحیح حدیث کو سنتے ہی کہہ اُٹھے گا کہ یہ بات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا نہیں کہہ سکتا اسی طرح غیر صحیح حدیث کے بارے میں سند کو دیکھے بغیر فیصلہ دے دیگا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان نہیں ہے حتیٰ کہ صحیح احادیث میں روایت باللفظ اور روایت بالمعنیٰ کا فرق اسے صاف محسوس ہو جائے گا کیونکہ جہاں راوی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے وہاں آپؐ کے مخصوص طرز بیان سے واقفیت رکھنے والا فوراً پہچان لے گا کہ یہ خیال اور بیان تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ہے لیکن زبان آپؐ کی نہیں ہے۔

بہر حال اوّل تو حدیث کی سند اور اسکے متن کی جانچ پرکھ کے لیے محدثین کے

مرتب کردہ قواعد و ضوابط اس پر مستزاد محدثین کا خداداد نورِ فہم و فراست ان دونوں نے مل کر اس کا امکان ہی سرے سے باقی نہ رہنے دیا کہ احادیث میں کسی بھی طور سے صحیح و غیر صحیح اور معتبر و غیر معتبر کے درمیان کوئی اشتباہ و التباس باقی رہ جائے۔

محدثین کی مساعی کے ثمرات

اللہ تعالیٰ محدثین کرام کی ارواح طیبہ کو ہزار ہا ہزار رحمتوں سے نوازے، یہ انہی کی بدولت ہے کہ ایک ایک واضع حدیث کا نام آج ہمیں معلوم ہے، کوئی حدیث ایسی نہیں جو موضوع ہو اور ہمارے علم میں آنے سے رہ گئی ہو ہم جانتے ہیں کہ سلیمان بن عمرو النخعی، وہب العاص، حسین بن علوان، ابوالبختری، اسحٰق بن نجیح، ابوداؤد نخعی، ابولیسیر احمد بن محمد الفقیہ المروزی، وہب بن حفص، محمد بن سعید، ابوسعید مدائنی اور محمد بن قاسم الطالقانی یہ سب مشہور واضعین حدیث تھے[1]، ہم احمد جویباری، ابن عکاشہ کرمانی اور ابن تمیم فریابی جیسے وضاعین[2] حدیث کے ناموں سے بھی بخوبی واقف ہیں، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ عباسی دور کے زنادقہ[3] میں سے عبدالکریم بن ابی العوجاء، بیان بن سمعان مہدی اور محمد بن سعید مصلوب مشہور وضاع تھے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ابن یحییٰ مدنی، واقدی، مقاتل بن سلیمان خراسانی، محمد بن سعید شامی[4] ترغیب و ترہیب کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے اور واضعین حدیث کے بارے میں ہمارا یہ سارا علم رہینِ منت ہے محدثین کرام کی اس سعی و جہد کا جو انہوں نے صحیح و غیر صحیح احادیث کو باہم ملتبس ہونے سے بچانے کے لیے انجام دیں۔ محدثین کرام نے صرف وضاعین و مدلسین کے ناموں کا ہی انکشاف کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ ہمیں ان تمام موضوعات کی بھی اطلاع دے گئے جو ان لوگوں کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ تھیں چنانچہ حدیث کا کوئی طالب علم ایسا نہ ہوگا جو موضوع احادیث کے مشہور مجموعوں الموضوعات لابن جوزی،

---

[1] تجدید المسلمین۔ [2] ابن خلکان۔

[3] السنتہ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی از ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی۔

[4] فتح المغیث۔

موضوعات ابن عبدالبر، موضوعات علی قاری اور موضوعات شوکانی کے ناموں سے واقف نہ ہو۔ محدثین کرام نے اس کے علاوہ ان کتابوں کی نشاندہی بھی کر دی جو خود موضوعات سے پُر ہیں مثلاً مسند انس بصری، اربعون ودعانیہ، کتاب اقتضاعی علویات اور کتاب العروس[1] وغیرہ۔ ان تمام معلومات کی موجودگی میں کوئی عقل سے عاری ہی ہو گا جو یہ کہے گا کہ صحیح و غیر صحیح احادیث باہم اس طرح خلط ملط ہیں کہ ان میں امتیاز دشوار ہے۔

غرض موضوع احادیث کی موجودگی کی بنیاد پر منکرین حدیث کا احادیث نبوی کے پورے ذخیرے کو ناقابل اعتبار ٹھہرانا ایک ایسی نرالی منطق ہے جو عقل کے کسی بھی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ منکرین حدیث کا منشا تو یہ ہے کہ وضع حدیث کے بہانے حدیث کی حجیت کو مشکوک بنا دیا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وضع حدیث خود بڑی زبردست دلیل ہے حجیت حدیث کی، اس لیے کہ اگر حدیث حجت نہ ہوتی تو وضع حدیث کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔ وضّاعین و کذّابین اپنے دل سے گھڑی ہوئی باتوں کو حدیث کا نام اسی لیے تو دیتے تھے کہ وہ حدیث کے نام پر قبول کر لی جائیں یوں تو ان کی بات کوئی بھی قبول نہ کرتا مگر لوگوں کے درمیان حدیث کی حجیت چونکہ مسلّم تھی اس لیے وضّاعین خیال کرتے تھے کہ ہم حدیث کا نام لیں گے تو ہماری بات بھی حجت کے طور پر تسلیم کر لی جائے گی۔ نقل اسی سکّے کی گھڑی جاتی ہے جو بازار میں چلتا ہو، جس سکّے کو بازار میں کوئی قبول ہی نہ کرتا ہو بھلا اس کی نقل بنانے سے کسی کو کیا فائدہ۔ حدیث کا سکّہ بازار علم میں چلتا تھا تو موضوع احادیث کے نقلی سکّے گھڑے جا رہے تھے مگر جہاں نقلی سکّے گھڑنے والے موجود تھے وہاں ایسے ماہر صرّاف بھی موجود تھے جو جعلی اور اصلی سکّوں کی خوب پہچان رکھتے تھے انہوں نے نہ صرف جعلی سکّے بنانے والوں کے نام طشت از بام کر دیے بلکہ ان کے بنائے ہوئے تمام جعلی سکّے بھی الگ کر کے رکھ دیے اور آئندہ آنے والوں کے لیے

---

[1] تذکرۃ الموضوعات

اس سلسلے میں تمام ضروری معلومات مہیا کر گئے تاکہ کسی بھی مرحلے پر یہ جعلی اور نقلی سکے دوبارہ رواج نہ پا سکیں۔ غرض موضوع احادیث کی موجودگی ذخیرۂ احادیث کو مشکوک بنانے کے بجائے اس کے اور زیادہ محفوظ ہونے کا ثبوت مہیا کرتی ہے نیز اس کو وقیع تر بنانے کا موجب ہے۔

وضع حدیث اور عہد رسالت اس سلسلے میں یہ کہنا بھی قطعاً خلاف واقعہ ہے کہ جھوٹی احادیث کا سلسلہ عہد رسالت ہی میں شروع ہو گیا تھا اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ صحابۂ کرام کی وہ جماعت جس نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں، اپنے اموال بے دریغ نثار کیے، اپنے اعزہ واقارب کو چھوڑا اور اپنے وطن تک کو خیرباد کہہ دیا وہی جماعت اللہ اور اس کے رسول سے بے وفائی کے کام میں اس قدر آگے نکل گئی تھی کہ جھوٹ گھڑ گھڑ کر اللہ اور اس کے رسول کی طرف منسوب کرنے لگی تھی؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کی نسبت کرنا درا صل اللہ ہی پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے اور صحابۂ کرام سے زیادہ اس حقیقت سے اور کون واقف ہوگا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ صحابۂ کرام دینی احکام کے بیحد حریص، شریعت کی حفاظت میں انتہائی مستعد اور تبلیغ اسلام کے حد درجہ شائق تھے انہیں ہر تکلیف اور ہر مصیبت گوارا تھی مگر یہ گوارا نہ تھا کہ دینِ اسلام کو معمولی سا بھی کوئی نقصان پہونچے ان کے بارے میں یہ تصور تک نہیں کیا جا سکتا کہ وہ از خود دین کو اس حد تک نقصان پہونچانے پر تل گئے تھے کہ سنت نبوی میں جسے وہ خود دین کی بنیاد تصور کرتے تھے جھوٹ کی آمیزش کر کر کے اسے مشکوک اور کمزور بنانے کا کام انجام دے رہے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ صحابہ کے لیے حکم خداوندی کا درجہ رکھتا تھا جس قسم کے ایمان ویقین کی دولت سے صحابہ مالامال تھے اس کے ہوتے ہوئے بھلا یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب کر سکتے تھے خصوصاً جبکہ وہ بکثرت بار بار زبان نبوی سے

ایسے شخص کے لیے جہنم کی وعید سن چکے تھے، میرا اشارہ اس مشہور حدیث کی طرف ہے جس کے الفاظ ہیں:

من کذب علیّ متعمدًا فلیتبوأ مقعدہ من النار	جس نے مجھ پر قصدًا جھوٹ باندھا اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کرلے۔

یہ روایت جملہ کتب حدیث میں موجود ہے جتنے صحابہ سے یہ حدیث مروی ہے مشکل ہی سے چند احادیث اس قدر کثیر التعداد صحابہ سے مروی ہوں گی بعض علمائے حدیث نے اس حدیث کو متواتر قرار دیا ہے تقریبًا ستّر صحابہ نے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے بعض نے اس سے زیادہ راویوں کا دعویٰ کیا ہے[1]۔ بہرحال راویوں کی یہ کثرت اس بات کی دلیل ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو صحابہ کے اذہان میں راسخ کردینا چاہتے تھے کہ میری طرف غلط بات کی نسبت اللہ کی ناراضگی کو دعوت دینے کے مترادف ہے جس کا لازمی نتیجہ جہنم ہے۔ جہنم کی وعید شاید آج کے مسلمان کے لیے اتنی اہمیت کی حامل نہ ہو لیکن صحابہ کے لیے جہنم کی وعید کوئی معمولی بات نہ تھی یہی وجہ تھی کہ صحابہ کا عالم یہ تھا کہ حدیث سناتے وقت کانپ کانپ اٹھتے اور اس خوف سے کہ کہیں کوئی غلط بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہوجائے حدیث کے الفاظ دوہرا کر فورًا کہتے اس سے کم یا اس سے زیادہ یا اسکے مشابہ غرض یقینی طور پر یہ نہ کہتے کہ آپؐ کی کہی ہوئی حدیث کے الفاظ بعینہٖ یہی ہیں کبھی حدیث سُناکر کہتے اوکما قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم (یا جیسا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو) بعض صحابہ کا یہ دستور تھا کہ کوئی حدیث سنانے سے قبل متذکرہ بالا مَنْ کذبَ علّی والی حدیث ایک بار ضرور دوہراتے تاکہ متعلقہ وعید ذہن میں ایک بار پھر تازہ ہو جائے اور لاپرواہی سے بھی کسی غلط بات کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ ہوجائے۔ امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں راوی ہیں کہ ذخیرۂ حدیث کے سب سے بڑے راوی حضرت ابوہریرہ کا تو یہ دوامی قاعدہ بن گیا تھا کہ

---

[1] السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی

یبتدأ بحدیثه بان یقول قال رسول اللّٰه الصادق المصدوق ابوالقاسم صلی اللّٰه علیه وسلم من کذب علی متعمدًا فلیتبوأ مقعده من النار ۔	جس وقت اپنی حدیث سنانی شروع کرتے تو کہتے فرمایا رسول اللہ صادق ومصدوق ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا اسے چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنا لے ۔

حضرت علی فرمایا کرتے تھے مجھے یہ گوارا ہے کہ مجھ پر آسمان پھٹ پڑے بہ نسبت اس کے کہ میں آپؐ کی طرف اس بات کا انتساب کروں جو آپؐ نے نہیں کہی[1] ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے خاصی تعداد میں احادیث مروی ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو پھر بھی آپ سے کمی روایت کی شکایت تھی کیونکہ آپ فرمایا کرتے تھے :

اِنّیْ لَیَمنعنیْ ان اُحدّث حدیثاً کثیراً اَنَ النّبی صلی اللّٰه علیه وسلّم قال من تعمّد علَیّ کذباً الخ (طبرانی)	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو میں کثرت سے جو بیان نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مَنْ تعمّدَ والی روایت مجھ کو اس سے روکتی ہے ۔

ظاہر ہے روایت کی کثرت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اسی بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے اسی طرح حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے بیٹے حضرت عبداللہ نے ان سے پوچھا کہ جس طرح فلاں فلاں صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں کثرت سے روایت کرتے ہیں آپ کو میں نے اس طرح کبھی روایت کرتے نہیں سنا حضرت زبیر نے جواب میں فرمایا :

اَمَا اِنّی لَمْ اُفارِقْهُ ولکن سمعتُهٗ یقول من کذب عَلَیّ فلیتبوأ مقعدهٗ من النّار (بخاری کتاب العلم)	آگاہ رہو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا نہیں ہوا لیکن (بات یہ ہے کہ) میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کر لے ۔

---

[1] مسلم کتاب الزکوٰۃ باب التحریض علی قتل الخوارج

گویا وہی خوف جو ابھی حضرت انس سے روایت ہوا حضرت زبیر کو بھی کثرت روایت سے روکے ہوئے تھا بعض صحابہ نے اپنی کبرسنی کے زمانے میں صرف اس لیے روایت کرنا ترک کر دیا تھا کہ کہیں بڑھاپے کی وجہ سے کوئی سہو نہ ہو جائے لوگ ان سے روایت کی درخواست کرتے تو فرماتے :

كبرنا ونسينا والحديث عنه صلى الله عليه وسلم لشديد (ابن ماجہ)	ہم بوڑھے ہو گئے اور بھولنے لگے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیث بیان کرنا بڑا سخت معاملہ ہے ۔

غرض جن حضرات کا روایت حدیث میں احتیاط کا یہ عالم ہو ان کے بارے میں کوئی کیسے یقین کرے کہ وہ اپنی طرف سے جھوٹ گھڑ گھڑ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کے قبیح ترین کام میں مشغول تھے کوئی عقل سے عاری ہی ہو گا جو صحابہ کے بارے میں اس قسم کا گمان کرے گا ۔

عجیب استدلال

حیرت ہوتی ہے منکرین حدیث کے طرز استدلال پر انہوں نے اپنے حق میں اسی من کذب علی متعمداً والی حدیث سے دلیل پکڑی ہے یعنی جو حدیث اس بات کی دلیل تھی کہ صحابۂ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کے انتساب کی جرأت ہی نہیں کر سکتے تھے اسی حدیث کو انہوں نے اپنے اس دعوے کی دلیل بنا لیا کہ صحابہ معاذ اللہ جھوٹی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے ۔ منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ متذکرہ بالا حدیث بار بار آتی ہی اسی لیے تھی کہ آپؐ کی طرف غلط باتوں کا انتساب ہونے لگا تھا ۔ اگر آپؐ کی طرف منسوب کر کے غلط باتیں بیان نہ کی جا رہی ہوتیں تو آپؐ کو یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کہ جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کی نسبت کرے گا وہ اپنا ٹھکانہ جہنّم میں بنا لے ۔ آپؐ کو بار بار یہ وعید سنانے کی ضرورت پیش آنا منکرین حدیث کے نزدیک دلیل ہے اس بات کی کہ آپؐ کی طرف جھوٹ کا انتساب ہونے لگا تھا ۔ اپنی اس دلیل کی تائید میں وہ عہد رسالت کا ایک واقعہ بھی نقل کرتے ہیں ہم اس واقعے کی اصلیت تو بعد میں واضح کریں گے ، ہمیں اس سے

پہلے دراصل یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ من کذب علیّ والی حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کس کس سیاق و سباق کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ اگر منکرین حدیث کا استدلال درست ہے تو اس حدیث کو لازماً ایسے ہی سیاق و سباق کیساتھ روایت ہونا چاہیئے جس سے معلوم ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی ایسا جھوٹ آیا جو آپؐ کی طرف نسبت کر دیا گیا تھا اس کی تردید کرتے ہوئے آپؐ نے ایسے دروغ بافوں کے لیے جہنم کی وعید سنائی اور اگر سیاق و سباق اس سے مختلف ہو تو پھر منکرین حدیث کا استدلال یقیناً بے بنیاد ٹھہرے گا۔

مختلف مرویات کا جائزہ

جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا یوں تو یہ جھوٹ کی نسبت والی حدیث ستّر سے زیادہ صحابہؓ کرام سے مروی ہے مگر اس حدیث کے مشہور راویوں میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص حضرت ابوہریرہ حضرت ابوسعید خدری، حضرت علی بن ابی طالب حضرت انس بن مالک حضرت مغیرہ بن شعبہ حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت جابر بن عبداللہ حضرت ابوقتادہ اور حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہم اجمعین کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

آئیے ان سب حضرات کی مرویات کا جائزہ لیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں نقل کی ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

اَنَّ النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم قال بلّغوا عنّی ولو آیۃً وحدّثوا عن بنی اسرائیلَ ولا حرجَ ومن کذب علیَّ متعمّدًا فلیتبوّأ مقعدہٗ من النار۔ (بخاری کتاب الانبیاء باب ماذکر عن بنی اسرائیل)۔	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری بات دوسروں تک پہونچاؤ خواہ وہ ایک ہی آیت ہو اور بنی اسرائیل کے واقعات (اگر تم چاہو تو) بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ بولا اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

اس روایت کا سیاق صاف تبلا رہا ہے کہ زیر بحث دروغ بافی سے متعلق حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ارشاد فرمائی جب آپؐ لوگوں کو اپنی احادیث دوسروں تک پہونچانے کی تلقین فرما رہے تھے گویا آپؐ تبلیغ احادیث کی تلقین کرتے وقت مخاطب کو یہ

ذہن نشین کرانا چاہتے تھے کہ دیکھنا یہ کام بڑی ذمہ داری کا ہے اس میں اگر ذرا سی بے احتیاطی سے کسی غلط بات کی نسبت میری طرف ہو گئی تو بجائے ثواب کے اُلٹا عذاب نہ کما بیٹھنا۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت کو امام بخاری کتاب العلم میں لاتے ہیں۔ اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

تسموا باسمی ولا تکتنوا بکنیتی ومن رآنی فی المنام فقد رآنی فان الشیطٰن لا یتمثل فی صورتی ومن کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہٗ من النار (بخاری کتاب العلم باب اثم من کذب علی النبی)۔

میرے نام پر نام رکھ لو مگر میری کنیت (پر کنیت) نہ رکھو جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے یقیناً مجھے دیکھ لیا اس لیے کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا اور جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ باندھے تو اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنا لے۔

اس روایت میں بھی کوئی ایسی بات نہیں جس سے یہ گمان کیا جا سکے کہ آپؐ کی جانب کسی دروغ کی نسبت کا کوئی واقعہ پیش آیا تھا جس سے متاثر ہو کر آپ کو جہنم کی یہ حنذکرہ وعید سنانی پڑی تھی بلکہ اس حدیث کے الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ اس سے مقصود جھوٹ کی نسبت سے احتراز کو مؤکد بنانا ہے یعنی کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر اگر جھوٹی خواب تک بھی بیان کرے گا تو وہ بھی گویا اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے گا۔

اس دروغ کی نسبت والی حدیث کے تیسرے مشہور راوی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کی روایت کو ہم امام مسلم سے نقل کرتے ہیں، امام مسلم نے اسے کتاب الزہد والرقاق میں بیان کیا ہے یہ پوری روایت اس طرح پر ہے:

لا تکتبوا عنّی ومن کتب عنّی غیر القرآن فلیمحہٗ وحدثوا عنّی ولا حرج ومن کذب علیّ قال ہمام احسبہٗ قال متعمداً فلیتبوأ مقعدہٗ

میرا کلام مت لکھوا اور جس نے مجھ سے سن کر قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہے وہ اسے مٹا دے البتہ میری احادیث (حافظے سے) بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جو مجھ پر جھوٹ باندھے ہمام (درمیان کے

من النار (مسلم کتاب الزہد باب تثبت فی الحدیث)۔	ایک راوی کا کہنا ہے میرا خیال ہے آپؐ نے فرمایا قصداً (جھوٹ باندھے) وہ اپنا ٹھکانہ جہنم ہی بنائے۔

اس روایت کے بارے میں اس تصریح کی تو ضرورت نہیں کہ یہ کتابت حدیث سے ممانعت کا حکم ابتدا میں تھا بعد میں کتابت کی اجازت دے دی گئی تھی اس پر تفصیلی بحث اس کتاب کے پہلے حصے میں "کتابت حدیث اور صحابہ" کے عنوان کے تحت دے دی گئی ہے وہاں مراجعت کی جا سکتی ہے بہرحال اس وقت تو ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی اس روایت میں جھوٹ کی نسبت کا ذکر جس حوالے سے آیا ہے اس کا منشار حفظ حدیث پر زور دینا ہے اس تاکید کے ساتھ کہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور یاد کی ہوئی حدیث روایت کرتے وقت اس بات کا خیال رہے کہ کوئی غلط بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے۔ اس روایت میں بھی جھوٹے کی نسبت سے متعلق کسی واقعے کے وقوع میں آنے کا کوئی اشارہ تک موجود نہیں۔

حضرت علی بن ابی طالب کی روایت ہم ترمذی سے لیتے ہیں۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

لَاتَکْذِبُوا عَلَیَّ وَاِنَّہٗ مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ یَلِجِ النَّار (ترمذی کتاب العلم باب فی تعظیم الکذب علی رسول اللہ)۔	مجھ پر جھوٹ نہ باندھو اس لیے کہ جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔

ظاہر ہے اس روایت میں بھی کوئی ایسا اشارہ موجود نہیں جس سے منکرین حدیث کے موقف کی تائید ہو سکے۔ اسی طرح حضرت انس بن مالک، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت سمرۃ بن جندب حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت جابر بن عبداللہ کی روایات کا بھی یہی حال ہے ان حضرات کی روایات کے الفاظ بھی بالکل واضح ہیں اور ہر ایسے حوالے سے خالی ہیں جو کسی طرح بھی منکرین حدیث کے موقف کے حق میں جاتا ہو۔ حضرت انس بن مالک کی روایت یہ ہے:

من کَذَبَ عَلَیَّ حَسِبْتُ اَنَّہٗ قَالَ	جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے میرا گمان ہے آپؐ نے تعمداً (کا لفظ بھی) فرمایا

متعمدًا فلیتبوأ مقعدہٗ من النار (ترمذی کتاب العلم باب فی تعظیم الکذب)۔	وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنا لے ۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت سمرۃ بن جندب اس حدیث کی روایت میں متحد اللفظ ہیں ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :

من حدث عنی حدیثًا وھو یری انہٗ کذبٌ فھو احد الکاذبین (ترمذی کتاب العلم باب فی تعظیم الکذب)۔	جو شخص مجھ سے کوئی حدیث روایت کرے یہ جانتے بوجھتے کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا ہے ۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت جابر بن عبداللہ بھی اس حدیث کی روایت میں متحد اللفظ ہیں ان دونوں نے اسے حسب ذیل الفاظ میں روایت کیا ہے :

من کذب علیّ متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار (ترمذی کتاب العلم باب فی تعظیم الکذب)۔	جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے ۔

ان پانچوں حضرات کی روایتوں میں بھی قارئین نے دیکھ لیا کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث ایسے موقع پر ارشاد فرمائی جب آپؐ کے علم میں کوئی ایسا واقعہ لایا گیا جس میں کسی نے کسی غلط بات کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کردی تھی اور آپؐ اس کی روک تھام کے لیے یہ جہنم کی وعید لوگوں کو سنا رہے تھے ۔ اب اس حدیث کے قابل ذکر راویوں میں صرف حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت رہ گئی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو ۔ حضرت ابوقتادہ کی روایت ہے :

سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول علی ھذا المنبر إیاکم وکثرۃ الحدیث عنّی فمَن قال علیّ فلیقل حقًا	میں نے اسی منبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تم مجھ سے بہت زیادہ حدیث روایت کرنے سے پرہیز کرو مجھ سے جو شخص بھی روایت کرے اسے چاہیئے کہ حق اور

او صدقًا ومن تقوّل عليّ ما لم أقل فليتبوأ مقعدهٗ من النار (ابن ماجہ - باب التغلیظ فی تعمد الکذب علی رسول اللہ) ۔	سچ کے اور جو شخص مجھ پر وہ بات باندھے جو میں نے نہیں کہی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنّم میں بنالے ۔

یہ روایت تو اپنے مفہوم میں بالکل ہی واضح ہے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کثرت روایت سے پرہیز کرنے کی تاکید فرما رہے ہیں اور اس ممانعت کی توجیہ کے طور پر مخاطب کو یہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ کثرت روایت کی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی غلط بات میری طرف منسوب ہو جائے اور راوی کے لیے جہنّم کی آگ کا سبب بن جائے ۔

اس سلسلے کی ایک اور قابل ذکر روایت وہ ہے جس کو امام ابو جعفر طحاوی نے مشکل الآثار میں اپنی متصل سند کے ساتھ نقل کیا ہے ۔ اس روایت کا ماحصل یہ ہے کہ کسی مجلس میں ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے ایک حدیث بیان کی، حضرت مالک بن عبادہ رضی اللہ عنہ بھی اس مجلس میں موجود تھے انہوں نے سُن کر فرمایا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں سے یہ عہد لیا تھا کہ

عليكم بالقرآن وإنكم سترجعون إلى قوم يشتهون الحديث عني فمن عقل شيئًا فليحدّث به ومن افترى عليّ فليتبوأ بيتًا أو مقعدًا في جهنم ۔ (مشکل الآثار جلد ۱ ص۱۷۱) ۔	تم پر لازم ہے کہ تم قرآن کو تھامے رہو تم عنقریب ایسے لوگوں کے پاس واپس کیے جاؤ گے جو چاہیں گے کہ میری حدیث ان سے بیان کی جائے لہٰذا جس کسی نے میری بات کو سمجھ لیا ہے اور یاد کر لیا ہے اسے چاہیئے کہ حدیث بیان کرے اور (یاد رکھو) جو شخص قصداً میری طرف جھوٹ منسوب کرے گا وہ اپنا ٹھکانہ یا (فرمایا) اپنا گھر جہنّم میں بنالے ۔

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ عنقریب اسلام اطراف واکناف عالم میں پھیلے گا اور مختلف اقوام کے لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوں گے اور آپ کی صحبت کے شرف سے محروم ہونے کی بنا پر آپ کے ارشادات سننے کے بہت زیادہ شائق ہوں گے ایسی صورت

میں ممکن ہے کثرت روایت کی بنا پر احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے اس لیے صحابہ کو آپؐ نے متنبہ کر دیا کہ دیکھنا روایت حدیث میں احتیاط سے کام لینا اگر میری حدیث خوب یاد ہو تو ضرور روایت کرنا اگر کوئی شک ہو تو روایت سے احتراز ہی کرنا ایسا نہ ہو کوئی غلط بات میری طرف منسوب ہو جائے۔ اس روایت کے بارے میں بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ حدیث آپؐ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب کسی نے آپ پر جھوٹ باندھا تھا۔

غرض اس مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ والی حدیث سے متعلق جتنی بھی قابلِ ذکر روائتیں ہیں ان میں سے کسی ایک روایت میں بھی کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جس کی بنیاد پر منکرین حدیث کا یہ استدلال درست سمجھا جاسکے کہ یہ جھوٹ کی نسبت والی حدیث ارشاد فرمانے کی ضرورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش ہی اس لیے آئی تھی کہ آپؐ کی طرف آپؐ کے عہد ہی میں جھوٹ کی نسبت ہونے لگی تھی اس کے بالمقابل تمام قابل ذکر روائتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ مذکورہ زیر بحث حدیث یا تو آپؐ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب اپنی احادیث دوسروں تک پہونچانے کا آپؐ نے صحابہ کو حکم دیا یا اس وقت ارشاد فرمائی جب کثرت روایت کی صورت میں احتیاط کا پہلو مدِ نظر رکھنے کی آپ نے تلقین فرمائی۔

کذب علی النبی سے متعلق ایک واقعہ

منکرین حدیث اپنے استدلال کی تائید میں عہدِ رسالت کا جو واقعہ پیش کیا کرتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بھی اصل حقیقت قارئین کے سامنے لے آئی جائے تاکہ اصل صورتِ حال کو سمجھنے میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔ یہ واقعہ امام طحاوی نے مشکل الآثار میں حضرت بریدہؓ سے اور طبرانی نے الاوسط میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کیا ہے اس واقعے کا لب لباب یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں ایک شخص مضافات مدینہ کے ایک قبیلے کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر لڑکی والوں نے انکار کر دیا تھا ہجرت کے بعد ابتدائی زمانے میں ہی وہ شخص ایک حلّہ پہنے ہوئے اس قبیلے میں پہونچا اور جا کر اس نے لڑکی والوں سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ فلاں معاملے میں میں اپنا فیصلہ صادر کروں (یہاں طبرانی کے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں جس گھر میں چاہوں چلا

جاؤں) گھر والوں نے اسے بٹھایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حقیقت حال دریافت کی آپؐ نے فرمایا "دشمن خدا نے جھوٹ بولا" پھر آپؐ نے ایک آدمی کو حکم دیا (طبرانی نے یہاں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے نام لیے ہیں) کہ جاؤ اگر اسے زندہ پاؤ تو قتل کر دو اور اگر مردہ پاؤ تو اس کی لاش جلا ڈالو وہ آدمی وہاں پہونچا تو پتہ چلا کہ مجرم سانپ کے ڈسنے سے مرچکا ہے چنانچہ حکم نبوی کے مطابق اس کی لاش جلا ڈالی گئی وہ آدمی واپس خدمت نبوی میں حاضر ہوا تو آپؐ نے فرمایا "جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنائے"۔

اس واقعے کے بارے میں ہمیں منکرین حدیث سے سب سے پہلے یہ پوچھنا ہے کہ پورے ذخیرۂ حدیث سے تمام صحیح احادیث کو چھوڑ کر ان کی نظر انہی دو روایتوں پر کیوں پڑی جن کی سند بھی ضعیف ہے اور متن بھی منکر ہے کہاں تو منکرین حدیث کا یہ موقف کہ موضوع احادیث کی موجودگی کی بنا پر صحیح احادیث بھی مشکوک ہوگئیں اور قابل حجت نہیں رہیں اور کہاں یہ حال کہ ان روایات کو حجت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جن میں موضوع ہونے کی علامات بہت نمایاں ہیں آخر اس دو رنگی کی کیا توجیہ ہے۔ ایک طرف منکرین حدیث محدثین پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ روایت کی چھان پھٹک ہی میں لگے رہے درایت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور دوسری طرف اپنی مطلب برآری کے لیے ایسی روایت سے دلیل پکڑتے ہیں جس کا متن ایک عامی آدمی بھی دیکھتے ہی کہہ اٹھے گا کہ منکر ہے بھلا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ آپؐ مردوں کو جلانے کا حکم صادر کریں؟

متن کے منکر ہونے کے علاوہ ان دونوں روایتوں کی تو سند بھی ضعیف ہے انکے راویوں میں سے بعض راوی ایسے ہیں جن کی روایت قبول نہیں کی جاتی یہی وجہ ہے کہ امام سخاوی نے اس قصہ کو موضوع اور خود ساختہ کہا ہے[1]۔ نیز مشہور محدث عبداللہ بن عدی نے اس واقعہ کو اپنی کتاب "الکامل فی معرفۃ الضعفاء و المتروکین" میں لیا ہے جو خود دلیل ہے اس واقعے کے راویوں کے ضعیف اور متروک الروایۃ ہونے کی۔

---

[1] السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی

علاوہ ازیں ان دونوں روایتوں کو اگر صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو ان سے زیادہ سے زیادہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ ایک دنیوی کام کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک ایسے جھوٹ کی نسبت کی گئی تھی جو صرف دروغ گو کی ذات تک محدود تھا۔ ان روایتوں سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ دین کے کسی معاملے سے متعلق کوئی حدیث گھڑ کر عام مسلمانوں کے سامنے اسے حدیثِ رسول کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو۔ کہاں ایک خالصتاً دنیوی معاملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جھوٹا حوالہ دے کر کسی شخص کا صرف اپنی ذات کو فائدہ پہونچانے کی کوشش کرنا اور کہاں دینی معاملات میں وضع حدیث کا ارتکاب کر کے پورے دین میں رخنہ اندازی کا موجب بننا ان دونوں باتوں کو ایک دُوسرے پر قیاس کر کے یہ حکم ہرگز نہیں لگایا جا سکتا کہ عہدِ رسالت ہی میں وضع حدیث کا آغاز ہو گیا تھا۔ مزید برآں ان دونوں روایتوں میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ اپنی نوعیت کا ایک ہی واقعہ ہے دُوسرا کوئی واقعہ منکرین حدیث بھی اس ضمن میں پیش نہیں کر سکے صرف اس ایک واقعے کی بنیاد پر یہ کلیہ قائم کر لینا کہاں کا انصاف ہے کہ عہدِ رسالت ہی میں موضوع احادیث گھڑی جانے لگی تھیں۔

منکرین حدیث نے اتنا بھی نہ سوچا کہ دونوں روایتوں میں اس شخص کا نام نہیں بتایا گیا جس نے یہ جھوٹ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جھوٹ بولنے والا کوئی مجہول اور غیر معروف شخص تھا۔ ایک مجہول اور غیر معروف شخص کے ایک جھوٹ کی بنا پر صحابہ کی پوری جماعت کی صداقت کو آخر کس دلیل سے مشکوک ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ عہدِ رسالت میں وضع حدیث کے آغاز کا دعویٰ کرنا صحابۂ کرام کی صداقت کو مشکوک ٹھہرانا ہے جو بلاشبہ آسمان پر خاک ڈالنے کے مترادف ہے اس لیے کہ صحابہ کرام کی عدالت علی الاطلاق سے صرف وہی انکار کر سکتا ہے جو عقل کی نعمت سے محروم ہو یا جس نے انکارِ حق پر کمر باندھ رکھی ہو۔

غرض منکرین حدیث کے پاس اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں کہ وضع حدیث کا آغاز عہدِ رسالت ہی میں ہو گیا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر وضع حدیث کا

آغاز ہوا کب؟ تو اس کی اصل حقیقت بھی سن لیجئے:۔

وضع حدیث کا اصل نقطۂ آغاز

وضع حدیث کی داغ بیل دراصل اس وقت پڑی جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان اختلافات نے سر اٹھایا اور سبائیوں کی سازش کے نتیجے میں ان کے باہمی اختلافات کو حرب و پیکار کی صورت دے دی گئی۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ اہل اسلام چھوٹے چھوٹے فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے۔ اس تفرقہ بازی کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ سیاسی اختلافات کو دینی رنگ دے دیا گیا اور سنت نبوی کو سیاسی اغراض اور داخلی انقسامات کے لیے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ بعض فرقے اپنے افکار و آرا کی تائید میں حدیثیں گھڑنے لگے اولین عنوان جس کو وضع حدیث کی آماجگاہ قرار دیا گیا "فضائل اشخاص و رجال" تھا لوگوں نے اپنے ائمہ اور قائدین کے فضائل و مناقب پر مشتمل حدیثیں وضع کرنا شروع کیں۔ مشہور شیعہ عالم ابن ابی الحدید "شرح نہج البلاغۃ" میں لکھتے ہیں:

" خوب جان لیجئے کہ فضائل و مناقب پر مشتمل احادیث میں اصل جھوٹ شیعہ کی جانب سے آیا ہے" (شرح نہج البلاغۃ جلد ۲ ص ۱۳۴)

معلوم ہوا کہ وضع حدیث کی ابتدا کرنے والے شیعہ تھے۔ ان لوگوں نے جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے فضائل و مناقب کے بارے میں حدیثیں وضع کی تھیں اسی طرح صحابہ خصوصاً صحابۂ کبار اور شیخین جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بے بنیاد معائب و مثالب پر مشتمل حدیثیں بھی وضع کر ڈالی تھیں اس قسم کی موضوعات کے بارے میں ابن ابی الحدید یوں رقم طراز ہے:

شیعہ جن ناپسندہ امور کا ذکر کرنے میں ہمارے اصحاب (شیعہ) کے نزدیک ان کی کوئی اصل و اساس نہیں محدثین نے نہ اس کو روایت کیا ہے اور نہ اس کو پہچانتے ہیں یہ ایک ایسی بات ہے کہ شیعہ اس کی نقل و روایت میں منفرد ہیں۔"
(شرح نہج البلاغۃ جلد ۱ ص ۱۳۵)

شیعہ نے فی الحقیقت اپنے جذبات و احساسات کی تسکین کی خاطر اس کی کوئی پرواہ نہ کی کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کے سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ شیعہ کی اس جسارت کو دراصل اس پس منظر میں دیکھنا چاہیئے کہ یہ لوگ فارسی الاصل تھے بظاہر تو یہ اسلام کے دائرے میں آ گئے تھے مگر اپنے وطنی و آبائی مذاہب کے اثرات کو قلب و ذہن سے نکال باہر کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ یہ لوگ بدستور بُت پرستانہ ذہنیت میں گرفتار رہتے بنا بریں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا ان کے نزدیک کوئی بڑی بات نہ تھی اس سے ان کے دلوں میں پوشیدہ جذبات کو تسکین ملتی تھی۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ لوگ مشہور یہودی عبداللہ بن سبا کی جسیسہ کاریوں کا شکار ہو گئے تھے۔ عبداللہ بن سبا نے اسلام کے شیرازے کو درہم برہم کرنے کے لیے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق تشیّع کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اس کے پیروکاروں میں اکثریت تو ان لوگوں کی تھی جو اس کے مخصوص مشن سے پوری طرح واقف تھے اور وہ خود بھی اسلام کو پھلتے پھولتے دیکھنا پسند نہ کرتے تھے مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو لاعلمی میں اس کے دام فریب میں پھنس گئے تھے۔ سبائیوں کا صرف ایک ہی مقصود تھا اور وہ یہ کہ صحابیت کی قوت کو جس قدر بھی کمزور کیا جا سکے کیا جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عرب کے دس لاکھ مربع میل پر پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی میں جس اقتدار کے حاصل کرنے میں اسلام کامیاب ہوا تھا یا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد چند ہی سالوں میں اسلام نے جو روئے زمین کی سب سے بڑی سیاسی طاقت کی حیثیت اختیار کر لی تھی تو یہ سب کچھ اسی صحابیت کی قوت کے بل بوتے پر ہوا تھا۔ اپنے اس مقصود کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے ان سبائیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازشوں کا جال پھیلانے اور صحابۂ کرام کو باہم لڑانے میں جو کردار ادا کیا وہ تو اپنی جگہ ایک الگ داستان ہے، ہی اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے صحابہ کو بدنام کرنے کی بھی ایک منظم تحریک چلائی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ چند گنے چنے صحابیوں کو چھوڑ کر صحابہ کی پوری جماعت نہ اسلام ہی کی دوست تھی اور نہ پیغمبر اسلام صلی اللہ

علیہ وسلم ہی سے اس جماعت کو اخلاص و عقیدت کا کوئی تعلق تھا لیکن ظاہر ہے یہ بالکل خلاف واقعہ بات ثابت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا یہ تو ایسا ہی تھا جیسے دن کی پوری روشنی میں یہ باور کرانے کی کوشش کی جائے کہ سورج غروب ہو چکا ہے اور رات آگئی ہے اس کے لیے سبائیوں نے ہی ایک تدبیر کارگر دیکھی کہ جھوٹ کا ایسا دھواں اٹھایا جائے اور اس کے ذریعے سے ایسی تاریکی پھیلا دی جائے کہ بینائی رکھتے ہوئے بھی دیکھنے والوں کو دن کی روشنی، رات کی تاریکی کی طرح دکھائی دینے لگے چنانچہ صحابۂ کبار کے بارے میں عموماً اور شیخین حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق خصوصاً مختلف قسم کے معائب و مثالب گھڑ گھڑ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کیے جانے لگے دوسری طرف اپنے آپ کو مسلمان اور اسلام دوست ثابت کرنے کے لیے ان معدودے چند صحابہ کے فضائل و مناقب اپنی طرف سے وضع کر کر کے حدیث نبوی کے طور پر پیش کیے جانے لگے جن کو ان سازشی ذہن رکھنے والے سبائیوں نے پہلے ہی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت صحابہ کی پوری جماعت سے علیحدہ کر لیا تھا۔

حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں اس بے بنیاد الزام کا ذکر کرتے ہوئے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کی منشا کے خلاف مسند خلافت سنبھال لی تھی اور صحابہ کی عمومیت ان دونوں کے ساتھ ہو گئی تھی، اس امر کی بطور خاص تصریح کی ہے کہ یہ بے بنیاد الزام سب سے پہلے عبداللہ بن سبا کی زبان پر آیا تھا حافظ ابن حجر کے الفاظ ہیں:

کان عبدُ اللّٰہِ بن سبا اوّلَ مَن اَظہَرَ ذلکَ (لسان المیزان جلد ۳ صفحہ ۲۹۰)	عبداللہ بن سبا ہی سب سے پہلا آدمی ہے جس نے اس (بے بنیاد خیال) کا اظہار کیا۔

اس کے ساتھ ہی عامر شعبی کے حوالے سے حافظ ابن حجر نے اس بات کی بھی تصریح کی کہ سب سے پہلا آدمی جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ کی نسبت کی وہ بھی یہی عبداللہ بن سبا ہی تھا۔ عامر شعبی کے اس دعوے کو حافظ ابن حجر نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

أول من كذب عبد الله بن سبا (لسان الميزان جلد ۳ صـ ۲۸۹) | سب سے پہلے جس نے جھوٹ بولا (جھوٹی حدیث بنائی) وہ عبد اللہ بن سبا ہی تھا۔

عامر شعبی کے اس قول کو مشہور شیعہ عالم ابن ابی الحدید کے اس قول کے ساتھ ملا کر پڑھیئے جس کا ابھی ہم اُوپر حوالہ دے آئے ہیں اور جس میں انہوں نے کہا ہے کہ فضائل و مناقب پر مشتمل اصل جھوٹ شیعہ کی جانب سے آیا ہے آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ شیعہ ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے عبد اللہ بن سبا کی دسیسہ کاریوں کے زیر اثر نیز اپنے مخصوص پوشیدہ جذبات و احساسات کی تسکین کی خاطر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کی ابتدا کی۔

اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وضع حدیث کی ابتدا خلافت راشدہ کے آخری دو تین سالوں میں ہوئی یعنی تقریباً ۳۷ھ سے ۴۰ھ تک کے درمیانی زمانے میں۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے تقریباً تیس سال بعد اس فتنہ کا ظہور ہُوا۔

وضع حدیث کے سدِ باب میں صحابہ کی احتیاطی تدابیر

اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہی وہ زمانہ ہے جب پہلے پہل احادیث نبوی کے راویوں کے بارے میں چھان بین کی جانے لگی اور اسناد حدیث کے سلسلے کی ابتدا ہوئی۔ اس سے پہلے صحابہ ایک دوسرے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سنتے سناتے اور قطعاً اس تصدیق کی ضرورت محسوس نہ کرتے کہ یہ حدیث سنانے والے نے از خود زبان نبوی سے سنی ہے یا کسی دوسرے صحابی سے سن کر روایت کی ہے مگر جب وضع حدیث کا ظہور و شیوع ہُوا تو ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ اس وقت تک کوئی حدیث قبول نہ کی جائے جب تک اس کے راوی کی ثقاہت و عدالت کا یقین نہ ہو جائے قبل ازیں صحابہ کے باہم اعتماد کا یہ عالم تھا کہ جب کسی دُوسرے صحابی سے کوئی حدیث سنتے تو بلا جھجک اس کو نہ صرف قبول کر لیتے بلکہ آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے اس طرح روایت کرتے جیسے بذات خود انہوں نے وہ حدیث زبان نبوی سے

سُنی ہو۔ ذخیرۂ احادیث میں مراسیل صحابہ کا وجود اس کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا وہ قول بھی اس پر شاہد ہے جس کو امام حاکم نے اپنی مستدرک میں نقل کیا ہے، ایک مرتبہ حضرت انس رضؓ ایک حدیث بیان کر رہے تھے کہ سننے والوں میں سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ نے یہ حدیث خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنی ہے حضرت انس رضؓ نے جواب یوں فرمایا:

ما كلّ ما نحدّثكم به سمعنا ہُ من رسول الله صلى الله عليه وسلم ولكن كان يحدّث بعضنا بعضًا (مستدرک للحاکم)	ہم تم سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کیا کرتے ہیں وہ سب ہم نے خود ہی آپؐ سے نہیں سنیں بلکہ ہم میں سے بعضوں نے بعض سے بھی سنا ہے۔
كُنّا لا نتّهم بعضُنا بعضًا۔ (طبقات ابن سعد جلد، صـ۱۳)	ہم لوگ باہم ایک دوسرے کو (جھوٹ سے) متہم نہیں کیا کرتے تھے۔

غرض جب تک وضعِ حدیث کا آغاز نہ ہوا تھا صحابہ نے کبھی اس بات کی پرواہ نہ کی تھی کہ راوی کے حالات کی چھان بین کی جائے مگر جونہی اس فتنے نے سر اٹھایا صحابہ نے بھی اس بات کا اہتمام کرنا شروع کر دیا کہ کوئی حدیث صرف اس لیے قبول نہ کر لی جائے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے بلکہ قبول کرنے سے پہلے اس بات کا پورا اطمینان کر لیا جائے کہ جو کچھ روایت کیا جا رہا ہے اس کا انتساب آپؐ کی طرف صحیح اور درست طور پر ہوا ہے یا نہیں۔ امام ابن سیرین نے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے:

لم يكونوا يسئلون عن الاسنادِ فلمّا وقعت الفتنة قالوا سمّوا لنا رجالكم فينظر الى اهل السنّة فيؤخذ حديثهم وينظر الى	(پہلے لوگ) اسنادِ حدیث دریافت نہیں کیا کرتے تھے لیکن فتنہ بپا ہو جانے کے بعد لوگ یہ کہنے لگے کہ ہمیں راویوں کے نام بتاؤ پھر غور و غوض کے بعد اہل سنت کی روایت قبول کر لی جاتی اور اہل

بدعت کی حدیث رد کردی جاتی تھی ۔	أهلِ البدع فلا يؤخذ حديثهم (مقدمہ صحیح مسلم باب ۴)

وضع حدیث کا فتنہ ظہور میں آنے کے بعد قبول حدیث میں صحابہ کی احتیاط کا کیا عالم ہو گیا تھا اس کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس کو امام مسلم نے مقدمہ مسلم میں مجاہد سے نقل کیا ہے کہ ایک بار بشیر عدوی حضرت عبداللہ بن عباس کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیثیں بیان کرنے لگے ان کا خیال تھا کہ وہ ان حدیثوں کو خاص توجہ سے سنیں گے مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس نے نہ ان کی باتوں کی طرف کوئی دھیان دیا نہ نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا آخر متعجبانہ کہنے لگے کہ اے ابن عباس میں تو آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سنا رہا ہوں اور آپ توجہ تک نہیں دے رہے یہ کیا معاملہ ہے ۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے جواب میں فرمایا :

ایک وہ وقت تھا کہ جب ہم کسی کو یہ کہتے سنتے کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو فوراً ہماری نظریں بے ساختہ اس کی طرف اٹھ جایا کرتیں اور ہم اپنے کانوں کو اس کی (باتوں کی) طرف لگا دیتے مگر جب لوگ ہر سرکش و غیر سرکش (اونٹ) پر سوار ہونے لگے (یعنی جھوٹ سچ کی تمیز جاتی رہی) تو ہم نے بھی صرف ان حدیثوں کو لینا اختیار کر لیا جن کو ہم پہچانتے ہیں ۔	إنا كنا مرةً إذا سمعنا رجلاً يقول قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم ابتدرتهُ أبصارُنا وأصغينا إليه بآذانِنا فلما ركبَ الناس الصعبة والذلولَ لم نأخذ من الناس إلا ما نعرف (مقدمہ صحیح مسلم باب ۳)

بشیر بن کعب عدوی جیسا کہ معلوم ہے بصرے کے رہنے والے تھے حضرت عبداللہ ابن عباس سے یہ مکالمہ ایسا لگتا ہے کہ اس زمانے میں ہوا ہے جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جانب سے حضرت عبداللہ ابن عباس بصرہ کے حاکم تھے اور یہ وہی زمانہ ہے جب وضع حدیث کا فتنہ جنم لے چکا تھا ۔ قبول حدیث میں صحابہ کرام کی اس احتیاط کا حال بیان کرنے سے ہمارا مقصود یہی واضح کرنا ہے کہ وضع حدیث کے ظہور و شیوع کے ساتھ ہی صحابہ کی طرف سے اس بات کا

اہتمام شروع ہوگیا تھا کہ صحیح وغیر صحیح احادیث آپس میں غلط ملط نہ ہو جائیں۔ "ہر کش وغیر سرکش اُونٹوں پر سواری" یہ عرب کا ایک محاورہ ہے مُراد اس سے حضرت عبداللہ ابن عباس کی یہی تھی کہ روایت حدیث میں جھوٹ اور سچ کی تمیز ہی جاتی رہی تو ہم بھی قبولِ حدیث میں سخت احتیاط برتنے لگے امام مُسلم کی ایک اور روایت میں جس کو انہوں نے طاؤس سے لیا ہے حضرت عبداللہ ابن عباس نے یہی بات زیادہ صریح انداز میں کہی ہے۔ آپ نے فرمایا:

إِنَّا كُنَّا نُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم إِذْ لَمْ يَكُنْ يُكْذَبُ عَلَيْهِ فَلَمَّا رَكِبَ النَّاسُ الصَّعْبَ وَالذَّلُولَ تَرَكْنَا الْحَدِيثَ عَنْهُ (مقدمہ صحیح مسلم باب النھی عن الروایۃ من الضعفا)۔	ہم لوگ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتے تھے جب آپؐ پر کوئی جھوٹ نہیں باندھتا تھا مگر جب لوگ ہر سرکش و غیر سرکش (اُونٹ) پر سوار ہونے لگے (یعنی جب جھوٹ سچ کی تمیز جاتی رہی) تو ہم نے آپؐ کی طرف منسوب کرکے حدیثیں بیان کرنا ہی چھوڑ دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ کی نسبت سے بچنے کے لیے اور وضع حدیث کے فتنے کو بے اثر بنانے کے لیے یہ احتیاط کی انتہائی حد تھی کہ حضرت عبداللہ ابن عباس نے حدیث روایت کرنا ہی ترک کر دیا تھا اور صرف حضرت عبداللہ ابن عباس ہی نہیں معلوم ایسا ہوتا ہے دیگر صحابہ نے بھی یہی طریقہ اپنا لیا تھا کیونکہ حضرت ابن عباس نے بجائے صیغہ واحد کے جمع کا صیغہ ترکنا استعمال فرمایا ہے۔

غرض وضع حدیث کا فتنہ عہد رسالت کے بہت عرصے بعد خلافت راشدہ کے بالکل آخری سالوں میں رونما ہُوا مگر اس کے ظہور کے ساتھ ہی صحابہ پوری طرح مستعد ہو گئے اور اس بات کا پُورا پورا خیال رکھا کہ کسی راستے سے بھی کوئی غلط بات اس طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے کہ اسے صحیح احادیث سے ممتاز نہ کیا جاسکے خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی جن کے فضائل و مناقب پر بکثرت حدیثیں گھڑی جارہی تھیں اس باب میں ہر امکانی کوشش کو بروئے کار لانے میں انتہائی مستعد تھے۔ سبائی جس قسم کی بے سر و پا باتیں خود آپ کی طرف منسوب کرکے پھیلا رہے تھے جب کبھی بھی ان میں سے کوئی بات آپ تک

پہونچتی آپ منبر پر پہونچ کر فوراً اس کی تردید بر سرِ عام فرماتے اور ایسے لوگوں سے علی الاعلان اپنی برارت کا اعلان فرماتے حافظ ابن حجر لسان المیزان میں نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ چند آدمی جن میں عبد اللہ بن سبا بھی شامل تھا کسی مقام پر یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں حضرت علی کے خیالات اچھے نہیں ہیں۔ یہ سنتے ہی حضرت علیؓ ایک خاص کیفیت کے انداز میں عبد اللہ بن سبا کے بارے میں فرمانے لگے:

مالی ولهذا الخبیث الاسود معاذ الله ان اقول لهما الا الحسن الجمیل (لسان المیزان جلد ۳)	میرا اس کالے گندے سے کیا واسطہ اللہ کی پناہ جو میں ان دونوں (ابوبکر و عمر) کے بارے میں بجز اچھی بات کے کچھ اور کہوں۔

ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے خود عبد اللہ بن سبا کو اپنے پاس بلا کر بیٹھے تو بہت کچھ سمجھایا بجھایا کہ وہ اپنی دروغ گوئیوں سے توبہ کرے مگر جب اس پر کوئی اثر نہ دیکھا تو اس کے منہ پر فرمایا کہ قیامت سے پہلے جن تیس دجالوں کے پیدا ہونے کی خبر دی گئی ہے ان میں سے ایک تو بھی ہے[۱]۔"

سبائی جب اپنی دروغ بافیوں سے کسی طرح باز نہ آئے اور ہر طرح کی تادیبی کارروائیوں کے باوجود جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر پھیلانے میں مصروف رہے تو بالآخر حضرت علی نے مجبور ہو کر ان لوگوں کو آگ میں جھونک دینے کا حکم صادر کر دیا اور حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ

قد احرقهم علی فی خلافته (لسان المیزان ص۲۹)۔	(حضرت علی نے) ان لوگوں کو اپنی خلافت میں جلا دیا۔

اس احتیاطی تدبیر کے علاوہ حضرت علی نے وضع حدیث کے فتنے کی سرکوبی کے لیے ایک بڑا کام یہ کیا کہ تقلیل روایت یعنی حدیثیں بہت کم روایت کرنے کا طریقہ جو اب تک

---

[۱] لسان المیزان

آپ نے اپنے پیشرو خلفائے راشدین کے طرز پر اختیار کیا ہوا تھا یک لخت ترک کر دیا اور روایتوں کی اشاعت میں تکثیر کا طریقہ اپنا لیا۔ ظاہر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق معلومات کے اس قیمتی ذخیرے کے مقابلے میں جو حضرت علیؓ کے اپنے چشم دید مشاہدات و مسموعات پر مشتمل تھا اُن بے سروپا باتوں کی بھلا کیا وقعت باقی رہ سکتی تھی جو سبائی مختلف ذرائع سے پھیلاتے پھرتے تھے۔ سبائی موضوعات سے عام لوگوں کی توجہ ہٹانے اور اسے بے وقعت بنانے کی اس تدبیر سے بہتر اور کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی تھی جو حضرت علی نے اختیار کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے متعلق جو معلومات بھی آپ کے پاس تھیں ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت شروع کر دی۔

اس کے علاوہ خود قبول حدیث میں اس قدر احتیاط سے کام لینے لگے کہ جب بھی کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث آپ کے سامنے بیان کرتا تو اس وقت تک اسے قبول نہ کرتے جب تک راوی سے اس پر قسم نہ لے لیتے[1]

قبول حدیث میں حضرت علیؓ کی جانب سے قسم کی اس شرط کے بارے میں اور روایتوں کی اشاعت میں تکثیر کا طریقہ اپنانے سے متعلق تفصیلی بحث ہم نے اسی کتاب کے پہلے حصے میں "حفاظت حدیث اور خلفائے راشدین" کے عنوان کے تحت بیان کی ہے قارئین مراجعت فرمائیں۔

بہر حال ہمیں بتلانا یہ تھا کہ وضع حدیث کا فتنہ تقریباً ۳۵ سنہ ہجری اور ۴۰ سنہ ہجری کے درمیانی عرصے میں رونما ہوا اوّلین واضع حدیث سبائی اور شیعہ تھے مگر وضع حدیث کے آغاز کے ساتھ ساتھ ہی صحیح و غیر صحیح احادیث کے درمیان امتیاز قائم رکھنے کی کوششوں کی ابتدا بھی ہو گئی جو بعد میں چل کر مستقل ایک فن کی شکل اختیار کر گئی۔

امام بخاری کی چھ لاکھ حدیثوں کی اصل حقیقت

اب ہمیں وضع حدیث سے متعلق منکرین حدیث کے اعتراض کے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ

سلسلے میں اُن کی صرف اس آخری بات کا جواب دینا ہے کہ امام بخاری کے زمانے میں چھ لاکھ حدیثیں رائج تھیں جن میں سے امام صاحب نے صرف نو ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔

ہم یہ تو نہیں سمجھتے کہ منکرین حدیث علم حدیث سے اس قدر بے بہرہ ہوں گے کہ اتنا بھی نہ جانتے ہوں کہ حدیثوں کی یہ چھ لاکھ کی تعداد طرق و اسانید کے لحاظ سے تھی یا اپنے متون کے اعتبار سے اور نہ ہی ہم تاریخ حدیث سے انہیں اتنا نابلد خیال کرتے ہیں کہ وہ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہوں کہ جو حدیثیں امام بخاری نے منتخب کی ہیں بس وہی صحیح ہیں اور باقی تمام روایات غیر صحیح ہیں البتہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ منکرین حدیث چونکہ علمی دیانت کا قطعاً کوئی پاس نہیں کرتے اس لیے وہ حقیقت حال سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود عام سادہ لوح ناواقف مسلمانوں کو یہی تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اوّل تو چھ لاکھ جتنی کثیر تعداد میں احادیث کا موجود ہونا محل تعجب دوسرے چھ لاکھ میں سے نو ہزار کے انتخاب کا مطلب یہ ہوا کہ چھ لاکھ احادیث میں سے بس وہ نو ہزار تو امام بخاری کی نظر میں صحیح تھیں جو انہوں نے اپنی صحیح میں لے لیں اور باقی پانچ لاکھ اکیانوے ہزار احادیث کو امام بخاری جعلی اور جھوٹی تصور کرتے تھے اسی لیے انہوں نے ان سب کو اپنی صحیح میں نہیں لیا۔

دراصل یہ دونوں باتیں ہی خلاف واقعہ ہیں نہ اپنے الگ الگ مفہوم اور علیحدہ علیحدہ موضوع کے اعتبار سے احادیث کی تعداد چھ لاکھ ہے اور نہ یہ دعویٰ درست ہے کہ جو حدیثیں امام بخاری نے اپنی صحیح میں لی ہیں ان کی نظر میں بس وہی صحیح تھیں باقی تمام احادیث کو وہ جعلی اور جھوٹی خیال کرتے تھے۔

حقیقت اصل میں یہ ہے کہ محدثین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو متون کے اعتبار سے نہیں بلکہ ان کے طریقوں اور ان کی سندوں کے اعتبار سے گنتے تھے مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل یا آپ سے متعلق کوئی واقعہ اگر ایک سند سے روایت ہوا ہے تو محدثین کے نزدیک وہ ایک حدیث ہے لیکن وہی قول یا فعل یا آپ سے

متعلق وہی واقعہ ایک سند کے بجائے متعدد سندوں سے روایت ہوا ہے تو محدثین اس کو ایک حدیث کے بجائے متعدد احادیث شمار کریں گے دراصل صحابہ سے احادیث اخذ کرنے والوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایک ہی روایت کو جن جن صحابیوں سے ممکن ہو سب سے سنا جائے چونکہ راویوں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ساتھ روایت اپنی قطعیت میں بلند ہوتی جاتی تھی اس لیے ہر راوی اپنی روایتوں میں قوت پیدا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ راویوں کی تلاش میں رہتا تھا شروع شروع میں تو یہ سلسلہ مختصر ہی رہا مگر مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ راویوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی تا آنکہ امام بخاری کے زمانہ تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک قول، ایک ایک فعل اور آپ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ بکثرت بہت سی سندوں سے روایت ہونے لگا اور اس طرح احادیث کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور جیسا کہ اسی کتاب کے پہلے حصے میں ہم کہیں لکھ آئے ہیں کہ متون کے اعتبار سے صحیح احادیث کی تعداد دس ہزار کے لگ بھگ ہے اور اگر صحیح کے ساتھ دیگر تمام قسم کی احادیث بھی جمع کر لی جائیں تب بھی تمام حدیثوں کی تعداد بشمول موضوع احادیث پچاس ہزار سے زیادہ نہیں ہے تو یہ چند ہزار احادیث کی تعداد بکثرت مختلف راویوں سے روایت ہونے کی بنا پر لاکھوں تک پہونچ گئی۔

اس اعتبار سے یہ بات تو بالکل صحیح ہے کہ امام بخاری کے زمانے میں چھ لاکھ حدیثیں رائج تھیں بلکہ چھ لاکھ ہی نہیں اس سے بھی کچھ زیادہ ہی تھیں مگر یہ شمار تعدد طرق کی بنا پر تھا یعنی بکثرت راویوں سے مروی ہونے کی بنا پر تھا احادیث کے مفہوم و مضمون کے اعتبار سے نہ تھا۔ ذرا اندازہ کیجیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد انما الاعمال بالنیات اپنے مضمون کے اعتبار سے تو صرف ایک ہی حدیث ہے مگر چونکہ اس کے راویوں کی تعداد سات سو سے بھی متجاوز ہے اس لیے محدثین اس کو ایک حدیث نہیں بلکہ سات سو حدیثیں شمار کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ حدیثوں کی تعداد کا تعین کرتے وقت اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ امام بخاری کے دور تک حدیث کے لفظ کے اطلاق میں اس قدر

توسیع اور کشادگی آگئی تھی کہ صحابہ کرام کے اقوال و فتاویٰ نیز تابعین و تبع تابعین تک کے ملفوظات کو اصطلاحاً حدیث میں شامل سمجھا جانے لگا تھا احادیث کے شمار کا لاکھوں کے عدد تک پہونچنا کچھ اس بنا پر بھی تھا۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس بات کو سمجھئے کہ احادیث کے انتخاب میں امام بخاری کا طریقہ کیا تھا۔ امام بخاری کا طریقہ یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول کوئی فعل یا آپ سے متعلق کوئی واقعہ جتنی سندوں کے ذریعے ان تک پہونچتا تھا ان میں سے جو جو سند ان کی شرائط صحت پر پوری اترتی تھیں ان تمام سندوں سے امام بخاری اس روایت کو لے لیتے تھے اور جو سندیں ان کے معیار پر پوری نہ اترتیں ان کو چھوڑ دیتے لیکن اس کے ساتھ ہی امام بخاری نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو حدیثیں انہوں نے منتخب کی ہیں بس وہی صحیح ہیں باقی تمام روایات غیر صحیح ہیں بلکہ وہ تو اس کے بالعکس بالتصریح یہ کہتے ہیں کہ میں نے بہت سی صحیح احادیث خوف طوالت کی وجہ سے چھوڑ دی ہیں۔ تہذیب النودی[۱] میں امام بخاری کا یہ قول موجود ہے کہ "میں نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث داخل نہیں کی ہے جو صحیح نہ ہو مگر بہت سی صحیح حدیثیں صرف اس لیے چھوڑ دی ہیں کہ کہیں کتاب طویل نہ ہو جائے" جب مؤلف خود یہ کہہ رہا ہے کہ میری کتاب نے تمام صحیح احادیث کا احاطہ نہیں کیا تو بھلا کسی دوسرے کو یہ کہنے کا حق کیسے پہونچتا ہے کہ مؤلف کی کتاب نے تمام صحیح احادیث کا احاطہ کر لیا ہے باقی جو کچھ ہے وہ غیر صحیح ہے بلکہ امام بخاری نے تو اپنے ایک اور قول میں جس کو محدث حازمی نے اپنی تصنیف "شروط الائمۃ الخمسہ" میں نقل کیا ہے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ جو صحیح حدیثیں میں نے چھوڑ دی ہیں وہ ان صحیح حدیثوں سے تعداد میں زیادہ ہیں جو میں نے اپنی کتاب میں لی ہیں[۲]۔ اب بتلائیے ایک طرف منکرین حدیث کا یہ دعویٰ ہے کہ صحیح بخاری کے علاوہ جتنی احادیث ہیں وہ امام

---

[۱] تہذیب النودی جلد ۱ ص ۷۴

[۲] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۴۹

بخاری کی نظر میں غیر صحیح ہیں دوسری طرف صحیح بخاری کے خود مؤلف کا کہنا ہے کہ میری تالیف میں ساری صحیح احادیث جمع نہیں ہو سکیں جتنی صحیح احادیث میں نے اپنی تالیف میں جمع کی ہیں اس سے زیادہ صحیح احادیث میں نے طوالت کے خوف سے چھوڑ بھی دی ہیں ہر صاحبِ عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کس کی بات ماننے کے قابل ہے اور کس کی رد کر دینے کے قابل۔ صحیح بخاری کے مؤلف امام بخاری کی یا نرم گدوں پر بیٹھ کر حدیث کا انکار کرنے والوں کی ؟

اس حقیقت کا ثبوت کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں تمام صحیح احادیث کو جمع کرنے کا التزام نہیں کیا امام بخاری کے اس قول سے بھی ملتا ہے جس کو محمد ابن حمدویہ نے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد بن اسماعیل بخاری کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد ہیں"۔[ا] اس قول کا مطلب یہ ہوا کہ ایک لاکھ صحیح احادیث میں سے آپ نے صرف نو ہزار کو اپنی صحیح میں لیا ہے باقی اکیانوے ہزار صحیح احادیث ایسی ہیں جن کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس لیے نہیں لیا کہ کہیں کتاب طویل نہ ہو جائے۔

اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے منکرین حدیث ناواقف حال لوگوں کو ایک اور مغالطہ بھی دیا کرتے ہیں وہ اپنے موقف کے حق میں دلائل بیان کرتے ہوئے ایسا انداز اختیار کرتے ہیں جس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ علمِ حدیث میں صحیح کا لفظ سچی حدیث کے معنے میں مستعمل ہے گویا صحیح کے ماسوا جتنی حدیثیں ہیں وہ سب جھوٹی شمار ہوتی ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے' علمِ حدیث کی اصطلاح میں "صحیح" سے مراد وہ حدیث ہے جس کی سند میں صحت کی مخصوص قسم کی شرائط پائی جاتی ہوں اس سے کم تر درجے کی سندوں کے لیے یعنی ان سندوں کے لیے جو ثقہ اور قابلِ اعتماد تو ہوتی ہیں مگر اتنی اعلیٰ درجے کی نہیں ہوتیں محدثین "صحیح" کے لفظ کے بجائے دوسرے مختلف الفاظ مثلاً صحیح لغیرہٖ' حسن لذاتہٖ اور حسن لغیرہٖ وغیرہ استعمال کرتے ہیں اس لیے علمِ حدیث میں جہاں کہیں "حدیث صحیح" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اس سے یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ "حدیث صحیح"

[ا] شروط الائمۃ الخمسہ للحازمی صفحہ ۴۹

کے سوا باقی جتنی حدیثیں ہیں وہ سب جھوٹی ہیں۔

بہر حال اب تک کی گفتگو سے قارئین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ وضع حدیث سے متعلق جتنی بھی باتیں منکرین حدیث کی جانب سے کہی گئی ہیں سب بے بنیاد ہیں۔ ابتدا میں منکرین حدیث کے جن چند اعتراضات کا ہم نے حوالہ دیا تھا ان میں ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلا نمبر وضع حدیث سے متعلق اعتراض ہی کا تھا جس پر اب تک ہم گفتگو کرتے رہے۔ اب ہم ان کے دوسرا اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں۔

۲۔ خلافِ عقل و درایت روایات کی اصل حقیقت

دوسرے نمبر پر جس اعتراض کا ہم نے اوپر ابتداءً ذکر کیا ہے وہ خلافِ عقل و درایت روایات سے متعلق ہے منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ بعض احادیث خلافِ عقل و درایت ہیں اس کے باوجود محدثین کے یہاں انہیں صحت کا درجہ حاصل ہے حالانکہ یہ ناممکن ہے کہ اللہ کا رسول کوئی ایسی بات کہے جو عقل اور درایت کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ چند ایسی احادیث بھی پیش کرتے ہیں جو انہیں خلافِ عقل نظر آتی ہیں۔

اس سلسلے میں منکرین حدیث کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ احادیث نبویہ کو اسی ترازو میں تولتے ہیں جس میں عام غیر نبی انسانوں کے اقوال و اخبار کو تولا جاتا ہے در اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب و مقام ان لوگوں کی نظر میں ہے ہی ایک عام انسان کا اُن کے نزدیک اللہ کے رسول کے کلام میں نہ تو وحی کی کوئی خصوصیت پائی جاتی ہے اور نہ قرآن کے علاوہ کسی اور صورت میں اس پر غیبی امور منکشف ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے رسول میں سوائے اس کے کہ اس پر قرآن کا نزول ہوا ہے کوئی اور ایسی غیر معمولی بات سرے سے پائی ہی نہیں جاتی جو اسے عام بنی نوع انسان سے ممیّز و ممتاز کر دے۔ اس بنیادی غلطی کے نتیجے میں منکرین حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو پرکھنے کے لیے وہی مقیاس و معیار مقرر کرتے ہیں جو عوام الناس کی باتوں کو پرکھنے کے لیے عام طور پر معروف خیال کیا جاتا ہے۔ منکرین حدیث کی ساری غلط

فہمیاں دُور ہو سکتی ہیں اگر وہ اُصولی طور پر اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے فرستادہ اور جوامع الکلم کے حامل تھے، آپ کی روحانی بلندی ملاءِ اعلیٰ کے ساتھ ملی ہوئی تھی جس کی وجہ سے آپؐ کے ہر ہر قول اور ہر ہر فعل سے نور وحکمت اور علم و معرفت کے سوتے پھوٹتے تھے اور آپؐ ان غیبی اسرار سے آگاہ تھے جن سے کوئی دوسرا بشر آگاہ نہیں ہے۔

اس اُصولی حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بھی حدیث کسی بھی صورت میں خلافِ عقل و درایت نظر نہ آئے گی اس لیے کہ عقلاً یہ عین ممکن ہے کہ آپؐ ملاءِ اعلیٰ سے براہِ راست رابطہ رکھنے کی بنا پر کوئی ایسی بات ارشاد فرمائیں جو ایک مخصوص زمانے کے لوگوں کے لیے بالائے فہم و ادراک ہو مگر وہی ارشاد آنے والے اس دَور کے عین مطابق ہو جب انسانی فہم و ادراک نے ترقی کی نئی منازل طے کر لی ہوں۔ اسی طرح عقلاً اس بات کا بھی امکان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کی بنیاد پر کسی ایسے علمی معجزے کی خبر دی ہو جو ابھی ظہور میں نہیں آیا اور اس لیے ہماری محدود عقل اس کو سمجھنے سے قاصر ہو نیز اس میں بھی کوئی عقلی استحالہ درپیش نہیں کہ غیبی اسرار پر مطلع ہونے کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسی حقیقت کی طرف اشارہ فرما دیں جو آج کے معلوم و معروف حقائق سے ہم آہنگ نہ ہو لیکن آگے چل کر اس حقیقت پر سے پردہ اُٹھ جائے اور کھلی آنکھوں سب کچھ مشاہدہ ہو جائے۔

یہ تو ایک اُصولی بات تھی لیکن جہاں تک امر واقعہ کا تعلق ہے کوئی بھی صحیح حدیث خلافِ عقل ہے ہی نہیں اتنی بات تو معترضین بھی مانیں گے کہ خلافِ عقل وہ چیز ہوا کرتی ہے جس سے کوئی محال لازم آئے تو پورے ذخیرۂ حدیث میں پوری تحقیق و جستجو کے بعد بھی کوئی ایک صحیح حدیث بھی خواہ وہ صحت کے نچلے درجے ہی کی کیوں نہ ہو ایسی نہیں ملے گی جس سے کوئی محال لازم آتا ہو البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حدیث کی جانچ پرکھ کے لیے عقل کی سلامتی ایک شرطِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے وہ عقل جو مریض اور بیمار نہ ہو جو نفسانی ظلمتوں اور عاصیانہ نجاستوں سے آلودہ نہ ہو اور وہ عقل جو حق کی متلاشی ہو کسی تعصب کا شکار

نہ ہو حدیث کی جانچ پرکھ کے لیے ایسی ہی عقل کی ضرورت ہے۔ مریض اور بیمار عقل یا وہ عقل جو کسی تعصب کے زیر اثر ہو حدیث کی جانچ پرکھ کی صلاحیتوں سے محروم ہوتی ہے اس لیے کہ وہ مخصوص جذبات و احساسات سے مغلوب ہوتی ہے نتیجتاً اپنے نظریات و افکار کی بنیاد ایسے شکوک و شبہات پر رکھتی ہے جو کوتاہی فکر و نظر اور غفلت پر مبنی ہوتے ہیں ایسی عقل شتر بے مہار کی طرح ہوتی ہے ایسی عقل کو نقد حدیث کی اجازت دے دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے خود اس بات کا سامان مہیا کر دیا کہ سنت صحیحہ کے لیے سرے سے کوئی مضبوط اساس ہی باقی نہ رہے۔

علاوہ ازیں ہر کہ و مہ کی عقل کو نقد حدیث کے لیے حکم ٹھہرانا یوں بھی خود خلاف عقل ہے کون نہیں جانتا کہ مختلف اشخاص کے اعتبار سے عقل کے درجات بھی مختلف و متعدد ہوتے ہیں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز کو ایک شخص درست اور صحیح سمجھتا ہے جبکہ اسی چیز کو دوسرا شخص غلط اور غیر صحیح خیال کرتا ہے عین ممکن ہے کہ ایک چیز ایک شخص کی سمجھ سے بالاتر ہو مگر دوسرے شخص کے لیے وہی چیز اس کے فہم و ادراک کے بہت قریب نظر آتی ہو یہی وجہ ہے کہ تمام امور میں رائے وہی وقیع خیال کی جاتی ہے جو متعلقہ امور کے ماہرین کی جانب سے دی گئی ہو اس لیے کہ وہ ان امور کے مالہٗ اور ماعلیہ سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ نقد حدیث کا بھی بالکل یہی معاملہ ہے اس کے لیے بھی اگرچہ ماہرین حدیث ہی کی رائے کو وقعت حاصل ہے تاہم معترضین اگر ماہرانہ صلاحیتوں سے محروم ہوں تو کم از کم ان سے ہمارا اتنا مطالبہ تو کسی طرح بھی بے جا نہیں کہ وہ اپنے اذہان کو نفسانی ظلمتوں اور نجاستوں سے پاک کر کے نیز اپنی آنکھوں پر سے تعصب کی عینک اتار کر احادیث نبوی میں غور کریں ان شاء اللہ ان کو کوئی ایک حدیث بھی خلافِ عقل و درایت نظر نہ آئے گی۔

نقد حدیث کے لیے عقل کے اصل معیار پر اس اُصولی گفتگو کے بعد اب ہم

نمونے کے طور پر چند ایسی روایات کا جائزہ لیں گے جو عقل کے عین مطابق ہونے کے باوجود منکرین حدیث کو خلاف عقل و درایت نظر آتی ہیں تاکہ یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ معترضین کا ذہن کس انداز سے سوچتا ہے اور اصل حقیقت کیا ہے قارئین انشاءاللہ خود دیکھ لیں گے کہ خلاف عقل احادیث نبوی نہیں بلکہ وہ منفی سوچ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی احادیث کے بارے میں منکرین حدیث نے اپنائی ہوئی ہے۔

سورج کی سجدہ ریزی

مثال کے طور پر پہلی حدیث وہ ہے جس کو امام بخاری نے کتاب بدء الخلق میں باب صفت الشمس والقمر میں حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے اور جس میں سورج کا عرش کے نیچے سجدہ کرنا اور دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگنا مذکور ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

قالَ النّبی صلی اللہ علیہ وسلم لأبي ذرٍ حین غربت الشمس تدری أین تذھب قلتُ اللہُ و رسولہٗ أعلم قال فإنّھا تذھبُ حتّٰی تسجُدَ تحت العرش فتستاذِنَ فیؤذنُ لھا ویوشِكُ أن تسجدَ فلا یُقبلُ منھا وَتستاذِنَ فلا یُؤذن لھا یقال لھا إرجعی من حیث جئتِ فتطلع من مغربھا فذلك قولہٗ تعالٰی والشمس تجری لمستقرٍ لھا ذلك تقدیر العزیز العلیم۔

(بخاری کتاب بدء الخلق باب صفت الشمس والقمر)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج غروب ہوا تو حضرت ابوذر سے فرمایا جانتے ہو سورج کہاں جاتا ہے میں نے کہا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں آپؐ نے فرمایا وہ جاتا ہے اور عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے پھر (طلوع ہونے کی) اجازت مانگتا ہے اور اسے اجازت دے دی جاتی ہے اور عنقریب وہ وقت آئے گا کہ وہ سجدہ کرے گا مگر قبول نہ ہوگا اور اجازت مانگے گا مگر اسے اجازت نہ ملے گی اسے حکم ہوگا کہ پلٹ جا جہاں سے آیا ہے اور پھر وہ مغرب سے طلوع ہوگا اور یہی مطلب ہے اللہ کے اس قول کا کہ آفتاب اپنے مستقر پر چلتا رہتا ہے یہ اندازہ باندھا ہوا ہے زبردست اور علم والے کا۔

اس حدیث میں منکرین حدیث کو جو باتیں خلاف عقل نظر آتی ہیں وہ مختصراً کچھ اسطرح ہیں کہ
(۱) سورج بھلا سجدہ کس طرح کر سکتا ہے سورج کا سجدہ میں گر پڑنا کسی طرح عقل میں آنے والی بات نہیں۔
(۲) اس حدیث میں طلوع و غروب کو سورج کی گردش کا نتیجہ بتلایا گیا ہے حالانکہ آج ایک سکول کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ طلوع و غروب سورج کی گردش کا نہیں زمین کی گردش کا نتیجہ ہے۔
(۳) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا بھی سراسر خلاف عقل ہے۔
اب ہم ایک ایک کر کے ان تینوں شبہات کا جواب دیتے ہیں جہاں تک سورج کے سجدے میں گر پڑنے کا تعلق ہے تو حیرت ہے منکرین حدیث کی بیمار عقل اتنی سی بات نہ سمجھ سکی کہ سورج کا سجدہ وہ سجدہ نہیں ہے جو زمین پر سر ٹیک کر کیا جاتا ہے بلکہ وہ سجدہ ہے جو اظہار عبودیت کے لیے اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہمہ وقت اپنے رب کے سامنے کرتے رہنے پر مجبور ہے قرآن زمین و آسمان کی ہر چیز کو اللہ کے آگے سجدہ ریز قرار دیتا ہے مثلاً قرآن کہتا ہے وللہ یسجد من فی السموات والارض طوعًا وکرھًا وظلالھم بالغدو والآصال (جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں چاروناچار اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور صبح و شام ان کے سائے (بھی اسی کو سجدہ کرتے ہیں) الرعد۔ ۱۵) یا اسی طرح ایک مقام پر قرآن کریم ستاروں اور درختوں کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ اللہ کے سامنے سربسجود ہیں چنانچہ سورۂ رحمٰن میں ہے والنجم والشجر یسجدان (نجم و شجر اسی کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ الرحمٰن۔ ۶) تو اب کیا قرآنی آیات کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ چونکہ فلاں فلاں آیت میں خلاف عقل مضمون بیان ہوا ہے جس کا صدور اللہ سے ممکن نہیں اس لیے اس قسم کی تمام آیات معاذ اللہ موضوع اور ناقابل اعتبار ہیں۔ منکرین حدیث جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں ذرا تبلائیں کہ متذکرہ بالا قسم کی آیات قرآنی میں سجدے سے کونسا سجدہ مراد ہے۔ جو مراد وہ ان آیات کی بیان کریں گے وہی مراد ہماری جانب سے محولہ بالا حدیث نبوی کے بارے میں سمجھ لیجئے ظاہر ہے اس

قسم کی آیات قرآنی میں سجدے سے مراد سجدۂ تسخیری ہے یعنی کلیتہً امر رب کا تابع ہونا۔ بس یہی سجدۂ تسخیری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ تسجد تحت العرش سے بھی مراد ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخاطب کو بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ سورج ہر آن اللہ تعالٰے کے حکم کا تابع ہے اس کا طلوع بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے اور اس کا غروب بھی یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ چونکہ سورج کا مغرب ایک نہیں ہے بلکہ قرآن کی رو سے بہت سے مغرب ہیں جیسے قرآن کہتا ہے برب المشارق والمغارب (مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم۔ المعارج۔ ۴۰) اور سورج ہر آن ایک خطۂ زمین میں غروب اور ہر آن دوسرے خطے میں طلوع ہوتا رہتا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں سجدہ ریز ہو کر طلوع و غروب کی اجازت مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ سورج ہر آن اور ہر لمحہ امر الٰہی کا تابع ہے۔

رہا منکرین حدیث کا دوسرا شبہ کہ اس حدیث میں طلوع و غروب کو سورج کی گردش کا نتیجہ سمجھا گیا ہے جبکہ سائنسی تحقیق بتلاتی ہے کہ طلوع و غروب زمین کی گردش کا نتیجہ ہے تو اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ سائنسی تحقیقات کو جن کا ہمیشہ بدلتے رہنا تجربے سے ثابت ہو چکا ہے قرآنی آیات یا احادیث نبوی کے لیے معیار ٹھہرانا خود خلاف عقل ہے عین ممکن ہے کہ جو سائنس آج سورج کو ساکن اور زمین کو متحرک قرار دیتی ہے کل اس کی تحقیق بدل جائے اور وہ زمین کو ساکن اور سورج کو متحرک قرار دینا شروع کر دے چنانچہ اس رخ پر سائنس نے سوچنا شروع کر بھی دیا ہے تو اول تو یہ معیار ہی غلط ہے۔ دوسری بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ اتنی بات تو منکرین کو بھی تسلیم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طبیعیات یا ہئیت اور کیمیا کے مسائل نبی نوع انسان کو سکھانے کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ عرفان حقیقت بخشنے اور فکر و عمل کی اصلاح کرنے کے لیے تشریف لائے تھے آپؐ نے زمین یا سورج کا ذکر کیا ہے تو یہ بتلانے کے لیے نہیں کیا کہ ان میں سے کون متحرک ہے اور کون ساکن بلکہ یہ سمجھانے کے لیے کیا ہے کہ زمین اور سورج دونوں کا مالک و خالق صرف ایک ذات ہے جس کا نام اللہ ہے

اب اس حقیقت کی تعلیم دینے کے لیے عقل کیا کہتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس علم اشیاء سے مدد لینی چاہیئے تھی جو آپ کے زمانے میں موجود تھا یا اس کو چھوڑ کر ہزار ڈیڑھ ہزار سال بعد کے علم اشیاء کو اس حقیقت کی تعلیم کا ذریعہ بنانا چاہیئے تھا ظاہر ہے عقل کا فیصلہ یہی ہوگا کہ اپنے ہی زمانے کے علم اشیاء سے کام لینا حکمت تبلیغ کے عین مطابق ہے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان حقائق کو ذریعۂ تعلیم بناتے جو صدیوں بعد انسان کے علم میں آنے والے تھے تو آپؐ کی تعلیم آپؐ کے عہد کے لوگوں میں مقبول تو کیا ہوتی سمجھ ہی میں نہ آتی لوگ اصل تعلیم کو چھوڑ کر اس بحث میں پڑ جاتے کہ آخر وہ کونسی دُنیا ہے جس کی ایسی عجیب غریب باتیں آپؐ سنا رہے ہیں۔ ذرا سوچئے تو سہی اگر زیر بحث حدیث کا مضمون اب سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے اس انداز سے بیان کیا جاتا کہ ملنے والا طلوع و غروب کا سبب سورج کے بجائے زمین کی حرکت کو سمجھا تو آج کی دُنیا کی نظر میں تو بے شک وہ ایک علمی معجزہ ہوتا مگر خود آپؐ کے زمانے کے لوگوں کے بارے میں معترضین کا کیا خیال ہے وہ اس علمی معجزے کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے؟ اور پھر اس علمی معجزے کے معمے کی بھول بھلیوں میں پھنس جانے کی بنا پر وہ مضمون ان کے دل و دماغ میں کہاں تک اترتا جو فی الحقیقت سمجھانا مقصود تھا؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کوئی ایک شخص بھی شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے متاثر ہو کر نہ دیتا اور جب آپؐ کے زمانے کے لوگ ہی ایسے علمی معجزوں کی بدولت ایمان لانے سے محروم رہ جائے تو یہ علمی معجزے بعد کی نسلوں تک پہنچتے ہی کیا کہ ان سے داد وصول کرتے۔ غرض حکمتِ تبلیغ اسی طرزِ عمل کی متقاضی تھی جو آپؐ نے اختیار فرمایا کہ اپنے زمانے کے لوگوں کے علم و فہم کے مطابق ان سے کلام کیا اور جن حقائق کو آپؐ لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے ان کی تفہیم کے لیے ان معلومات سے کام نہیں لیا جو صدیوں بعد ظہور میں آئیں۔

رہی سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی بات تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے جو ذات اس سورج کی خالق ہے اس کو تھامے ہوئے ہے اور جو ذات زمین کو ایک منضبط گردش میں رکھے ہوئے ہے وہی ذات اس پر بھی قادر ہے کہ اس سارے نظام کو الٹا

چلا دے اور سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکلتا ہوا نظر آئے سائنسی نقطۂ نظر سے بھی اس امر کا امکان موجود ہے کہ دُنیا کا قانون جذب وکشش یکایک ایک پلٹی کھائے اور تمام سیارے موجودہ رفتار کے مقابلے میں بالکل الٹ رفتار سے چلنا شروع کر دیں طبعیات اور ہیئت کے موجودہ قوانین کو کوئی بھی اٹل نہیں مانتا ان قوانین میں تغیر واقع ہونے یا بالکلیہ اس کے درہم برہم ہو جانے کے امکانات کی موجودگی کا ہر کوئی قائل ہے لہٰذا عین ممکن ہے کہ سُورج کے طلوع و غروب کا موجودہ قانون یکایک بدل جائے اور سُورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو۔

سردی وگرمی اور دوزخ کی دو پھونکیں

دوسری ایسی ہی ایک اور حدیث جو منکرین حدیث کو خلافِ عقل نظر آتی ہے وہ ہے جس کو امام بخاری نے کتاب مواقیت الصلوٰۃ میں حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے اس کا متن ملاحظہ فرمائیے:

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انّہ قال اذا اشتدّ الحرّ فابردوا بالصلوٰۃ فانّ شدۃ الحرّ من فیح جہنم فاشتکت النار الی ربھا فقالت یا ربّ اکل بعضی بعضًا فاذن لھا بنفسین نفس فی الشتاء ونفس فی الصیف وھو اشدّ ما تجدون من الحرّ وھو اشد ما تجدون من الزمھریر

(بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ باب الابراد بالظہر)

حضرت ابوہریرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا جب گرمی کا زور ہو تو نماز ٹھنڈی کر کے (یعنی ٹھنڈے وقت میں) پڑھو کیونکہ گرمی کی شدت جہنّم کی پھونک سے ہے جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی اور کہا اے رب میرے ایک حصّہ نے دُوسرے حصّے کو کھا لیا ہے۔ اللہ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دیدی ایک سانس کی جاڑے میں اور ایک سانس کی گرمی کے موسم میں اور وہ (گرمی کا سانس) اس سخت گرمی جیسا ہے جو تم محسوس کرتے ہو اور وہ (سردی کا سانس) اس سخت سردی جیسا ہوتا ہے جو تم محسوس کرتے ہو۔

منکرین حدیث کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گرمی کی شدت جہنّم کی پھونک کی

وجہ سے ہوتی ہے نیز سردی اور گرمی کے موسم جہنم کی دو پھونکوں کے سبب سے آتے ہیں حالانکہ یہ سراسر غلط ہے موسموں کا تغیر زمین کی مداری گردش اور سورج کے قرب بعد کی بنا پر ہے۔

اس حدیث کے بارے میں بھی بنیادی بات یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود ایک عالمِ طبیعات کی حیثیت سے موسمی تغیرات کی وجوہ بیان فرمانا نہیں ہے بلکہ آپؐ ایک نبی کی حیثیت سے گرمی کی تکلیف محسوس کرنے والوں کو جہنم کا تصور دلانا چاہتے ہیں۔ دوپہر کے وقت صحرائے عرب کی گرمی کا جو حال ہوتا ہوگا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے ایسی گرمی میں ظہر کی نماز کے لیے نکلنا واقعی بڑا شاق گذرتا ہوگا چنانچہ مسند امام احمد میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے منقول بھی ہے کہ لم یکن یصلی صلوۃ اشد علی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منھا (اس (ظہر) کی نماز سے بڑھ کر کوئی نماز اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق نہ تھی) اس پس منظر میں آپؐ دیکھئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اس سے آپؐ کا مقصود دوزخ سے ڈرانا اور ان کاموں سے روکنا تھا جو انسان کو دوزخ کی طرف لے جانے والے ہیں۔ آپؐ کا یہ ارشاد قرآن کریم کے اس ارشاد سے ملتا جلتا ہے جو غزوۂ تبوک کے موقعہ پر ان لوگوں کے لیے جو گرمی سے گھبرا کر جہاد پر نکلنے سے جی چرا رہے تھے فرمایا گیا تھا کہ وقالوا لا تنفروا فی الحر قل نار جھنم اشد حرًّا (انھوں نے کہا کہ اس گرمی میں (جہاد کے لیے) نہ نکلو (اے نبی) ان سے کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ اس گرمی سے زیادہ گرم ہے۔ توبہ - ۸۱) جس طرح قرآن دنیا کی گرمی کا جہنم کی گرمی سے مقابلہ اس لیے کر رہا ہے کہ پس منظر میں وہ لوگ ہیں جو گرمی سے گھبرا کر جہاد پر جانے سے ہچکچا رہے ہیں اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا کی شدید گرمی اور شدید سردی کو دوزخ کی محض دو پھونکوں کے برابر اس لیے بتا رہے ہیں کہ پس منظر میں وہ لوگ موجود ہیں جو جاڑے میں صبح کی اور گرمی میں ظہر کی نماز کے لیے گھروں سے نکلنا شاق سمجھ رہے ہیں۔

فان شدۃ الحر من فیح جھنم کہنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد لازماً یہی نہیں ہے کہ دنیا میں گرمی جہنم کی پھونک کی وجہ سے ہوتی ہے بلکہ اس سے آپؐ کی مراد

یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ جہنّم کی پھونک کی قسم یا جنس سے ہے اس لیے کہ عربی زبان میں لفظ مِنْ بیانِ جنس کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح گرمی اور سردی کے موسموں کے بارے میں آپؐ کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ یہ دونوں موسم جہنم کی دو پھونکوں کے سبب سے آتے ہیں بلکہ آپؐ کا کہنا ہے کہ اللہ نے دوزخ کو دو سانسوں کی اجازت دی ایک سانس سردی کے موسم میں اور ایک سانس گرمی کے موسم میں اور یہ جو تم گرمی سردی محسوس کرتے ہو اس کو دوزخ کے انہی دو سانسوں پر قیاس کر لو۔ غرض جس شخص نے بھی قرآن اور سیرت نبوی میں کچھ بھی غور کیا ہو گا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متذکرہ حدیث سن کر بلا تامّل کہہ اُٹھے گا کہ اس میں آپؐ نے طبعیات کے کسی مسئلہ کو نہیں بلکہ جہنم کی شدت گرمی کو ذہن نشین کرانا چاہا ہے۔

گرگٹ کی پھونکیں

ایک اور حدیث ملاحظہ فرمائیے جس کا مضمون منکرین حدیث کو خلافِ عقل نظر آتا ہے حضرت اُمّ شریک رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ

أَنَّ رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم أَمَرَ بِقَتْلِ الْوَزَغِ وَقَالَ كَانَ يَنْفُخُ عَلَى إِبْرَاهِيمَ عليه السلام

(بخاری کتاب الانبیاء باب قول اللہ تعالیٰ۔ واتخذ اللہ ابراہیم خلیلاً۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گرگٹ کو مارنے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا کہ وہ حضرت ابراہیم پر آگ پھونکتا تھا۔

اس حدیث کے بارے میں منکرین حدیث کو عقلی استحالہ یہ درپیش ہے کہ آخر ایک گرگٹ کی پھونکوں میں آگ بھڑکانے کی طاقت کہاں سے آگئی اور پھر ایک گرگٹ کے بدلے میں گرگٹوں کی ساری نسل کو سزا دینا کہاں کا انصاف ہے؟

منکرین حدیث اس حدیث پر اعتراض کرنے سے پہلے اگر ان احادیث پر بھی نظر ڈال لیتے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وزغ یعنی گرگٹ کو

فُویسق یعنی موذی جانوروں میں سے قرار دیا ہے تو ان کو محولہ بالا حدیث میں کوئی عقلی استحالہ پیش نہ آتا اور بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ۔ دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند جانوروں کو فواسق (موذی) قرار دے کر یہ فرمایا تھا کہ انہیں حرم میں اور حالت احرام میں مار دینے کی بھی اجازت ہے[1] ان میں بچھو باؤلا کتا اور چوہا وغیرہ شامل ہیں ادھر بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے گرگٹ کو بھی[2] موذی قرار دیا تھا اب اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے محولہ بالا حدیث کے مفہوم میں غور کیجئے اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گرگٹ کی پوری نسل کو اس لیے مار ڈالا جائے کہ اس کے ایک فرد نے حضرت ابراہیم پر آگ بھڑکائی تھی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک موذی جانور ہے اور اس کو دوسرے موذی جانوروں کی طرح انسان سے دشمنی ہے چنانچہ اس کی انسان دشمنی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سارے جانوروں میں سے یہی ایک جانور تھا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو اس نے اس آگ کو پھونکنے کی کوشش کی۔

رہی یہ بات کہ گرگٹ کی پھونک میں آگ بھڑکانے کی طاقت کہاں سے آگئی تو حدیث میں یہ کہا ہی کب گیا ہے کہ وہ آگ گرگٹ کی پھونکوں سے بھڑک اٹھی تھی حدیث میں تو صرف گرگٹ کی انسان دشمنی کی مثال دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس کی یہ دشمنی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ یہ حضرت ابراہیم پر آگ بھڑکانے کی کوشش کرتا رہا اگرچہ اس کوشش کا کوئی فائدہ نہ تھا لیکن اس جانور نے اپنی انسان دشمنی کے اظہار میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

بہرحال منکرین حدیث کی طرف سے پیش کی جانی والی اس قسم کی تمام احادیث کا احاطہ کرنا ہمارا مقصود نہیں ہے ہم صرف یہ دکھلانا چاہتے تھے کہ اصل خرابی اس انداز فکر میں ہے جو احادیث نبوی کے بارے میں منکرین حدیث نے اختیار کر رکھا ہے ورنہ کوئی ایک صحیح حدیث بھی ایسی نہیں ہے جو عقل کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو۔

---

[1] بخاری بدء الخلق باب خمس من الدواب فواسق   [2] بخاری بدء الخلق باب خیر مال المسلم غنم

۴- احادیث نبوی اور عُریاں مضامین

منکرین حدیث کا تیسرا اعتراض ان احادیث کے بارے میں ہے جو بقول ان کے عریاں مضامین پر مشتمل ہیں ان کا کہنا ہے کہ بعض احادیث تو ایسے مضامین پر مشتمل ہیں جو اخلاقی لحاظ سے معیوب خیال کیے جاتے ہیں جبکہ بعض احادیث ایسی ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی ازواج مطہرات کے درمیان خالصتاً ازدواجی تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی اکثر و بیشتر خود ازواج مطہرات کی زبانی۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ازواج مطہرات آپؐ کی زندگی کے ایسے معاملات بھی لوگوں کو تبلادیں اور بتلانے میں کوئی شرم محسوس نہ کریں جن کو عام طور پر میاں بیوی کے سوا دوسرا کوئی نہیں جانتا اور نہ کسی دوسرے کو اس پر مطلع کرنا کوئی گوارا کرتا ہے۔

احادیث نبوی پر اس قسم کے تمام اعتراضات دراصل نتیجہ ہیں اس ضمن میں چند بنیادی باتوں کو نظر انداز کر دینے کا۔ اس قسم کے شبہات کو دل میں جگہ دینے سے پہلے اگر درج ذیل چند امور کو ذہن نشین کر لیا جائے تو احادیث کے بارے میں کوئی خلجان باقی نہ رہے اور اچھی طرح یہ بات سمجھ میں آجائے کہ یہ مضامین جو بظاہر عریاں اور معیوب نظر آتے ہیں انسانی زندگی کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے ان کا بیان کیا جانا کس قدر ضروری تھا۔

چند بُنیادی باتیں

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو ذہن نشین کیے جانے کے لائق ہے یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے جو تہذیب و تمدن کے بالکل ابتدائی درجے میں تھی آپؐ کے ذمے صرف یہی کام نہیں تھا کہ ان کے عقائد درست کریں بلکہ آپؐ کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ انہیں انسان بنائیں ان کی زندگی کو سنواریں، انہیں شائستہ اخلاق سکھائیں اور انہیں پاکیزہ معاشرت، مہذب تمدن اور نیک معاملات کی تعلیم دیں۔ یہ مقصد ظاہر ہے محض وعظ و تلقین اور چند زبانی ہدایات کے ذریعے پورا نہیں ہو سکتا تھا اس کے لیے ضرورت تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زندگی کو ان کے سامنے

انسانیت کا ایک مکمل نمونہ بنا کر پیش کریں اور ان کو پورا موقع دیں کہ وہ اس نمونے کا ایک ایک پہلو خوب اچھی طرح دیکھیں اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالیں۔

دُوسری بنیادی بات جو اس سلسلے میں ذہن میں رکھنی ضروری ہے یہ ہے کہ انسان کی داخلی زندگی کے چند گوشے ایسے ہیں کہ انسان کی جسمانی طہارت و نظافت کا بیشتر مدار انہی گوشوں کے درست ہونے پر ہے۔ لیکن اس کے باوجود دُوسری قوموں کے درمیان ان گوشوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں کوئی ہدایات صرف اس لیے نہیں ملتیں کہ ان کے بارے میں شرم کا ایک بے جا احساس ہمیشہ ان کے اذہان میں موجود رہا ہے اسلام کا ہم پر یہ احسان ہے کہ اس نے ان گوشوں کے بارے میں بھی ہمیں ہدایات دیں اور ان کے متعلق قواعد و ضوابط بتا کر ہمیں غلطیوں سے بچایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاص شعبۂ زندگی کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی آپؐ جس قوم میں مبعوث ہوئے تھے اس خاص شعبۂ زندگی میں اُس قوم کے لوگ ابتدائی ضابطوں تک سے ناواقف تھے بالخصوص تعلقات مرد و زن سے منسلک معاملات میں ان لوگوں کی ناشائستگی، ناپاکی اور بے حیائی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ذکر سے بھی گھن آتی ہے اس قوم کے لوگوں کا آپؐ نے نہ صرف تزکیۂ نفوس کیا بلکہ ان کو طہارت جسم و لباس کے طریقے بھی سکھائے ان میں پاکیزگی کا نفیس ذوق پیدا کیا ان کو نجاست اور طہارت کی تمیز عطا کی زندگی بسر کرنے کے گندے گھناؤنے اور ناشائستہ طریقوں کو موقوف کر کے اپنے قول اور عمل سے ان کے مردوں اور ان کی عورتوں کو صفائی، نفاست اور نظافت کے آداب کا خوگر بنایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طہارت، استنجا اور غسل وغیرہ کے مسائل نیز ایسے ہی دوسرے مسائل ان لوگوں کو نہ صرف زبان سے سمجھائے بلکہ خود اپنی خالصتاً نجی زندگی کو ایک حد تک ان کے سامنے بے پردہ کر دیا تاکہ جو کچھ لوگ نہ پوچھیں یا نہ پوچھ سکیں یا جو باتیں آپؐ کو زبان سے بتانے کا موقع نہ ملے وہ لوگوں کو آپؐ کا طرزِ زندگی دیکھنے سے معلوم ہو جائیں۔

اس سلسلے کی تیسری بنیادی بات یہ ہے کہ صحابۂ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو

ایک مثالی انسان سمجھتے تھے اس لیے وہ ہمہ وقت، اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ زندگی کے ہر کام کے بارے میں انہیں یہ معلوم ہوجائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل کیا تھا وہ چیزیں جو محض گمان کی بنیاد پر یا یہود و نصاریٰ کے زیرِ اثر حرام، مکروہ اور ناپسندیدہ خیال کی جاتی تھیں ان کے متعلق صرف یہ سن کر صحابہ کا اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ شریعت میں وہ جائز ہیں، حکمِ جواز کے باوجود ان کے دلوں میں یہ شک باقی رہ جاتا تھا کہ شاید ان میں کوئی کراہت کا عنصر موجود ہو جب تک وہ یہ نہ جان لیتے تھے کہ فلاں فلاں کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل کیا تھا اس وقت تک ان کے دلوں سے کراہت کا خیال نہیں نکلتا تھا یہ بھی ایک اہم وجہ تھی جس کے پیشِ نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خالصتاً خانگی زندگی کو ایک حد تک بے نقاب کرنا ضروری خیال فرمایا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زبردست ایثار

ان تین بنیادی باتوں کو ذہن میں رکھیے اور احادیث نبوی کے مضامین پر عریاں اور غیر اخلاقی ہونے کا الزام لگانے سے پہلے اس حقیقت پر غور کیجیے کہ انہی تین وجوہ کے پیشِ نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کیسا زبردست ایثار تھا کہ آپؐ نے اپنی زندگی کے ہر شعبے کو قوم کی تعلیم کے لیے پبلک بنا دیا اپنی کسی چیز کو بھی پرائیویٹ نہ رکھا حتیٰ کہ ان معاملات کو بھی نہ چھپایا جنہیں دُنیا میں کوئی شخص دوسروں کے سامنے ظاہر کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا آپؐ نے لوگوں کو اذنِ عام دے دیا کہ آؤ ہر حال میں میری زندگی کے ایک ایک پہلو کو دیکھو اور زندگی کے ہر معاملے میں مجھ پر نظر رکھو کہ میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہوں آپؐ نے امت کے ایک ایک فرد کو اس بات کی کھلی اجازت دیدی کہ رفتار میں گفتار میں نشست و برخاست میں سونے اور جاگنے میں عبادات و معاملات میں حتیٰ کہ اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کے ساتھ برتاؤ میں غرض ہر چیز میں ہر وقت اور ہر حال میں ہر کوئی آپؐ کے ایک ایک عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھے، دیکھنے والوں سے سنے اور جاننے والوں سے پوچھے یا خود آپؐ سے دریافت کرے اور اپنی زندگی کو اسی طرز پر ڈھالنے کی کوشش کرے۔ آپؐ نے اپنی ازواجِ مطہرات

کو بھی عام اجازت دے دی کہ خلوت میں آپؐ کا جو طرزِ عمل دیکھیں اس سے عورتوں اور مردوں کو سب کو آگاہ کر دیں تاکہ لوگوں کی صرف ظاہری زندگی ہی نہیں باطنی اور مخفی زندگی بھی تہذیب و شائستگی اور طہارت و نفاست کے زیور سے آراستہ ہو جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بعض پہلوؤں کا علم چونکہ ازواج مطہرات کے علاوہ اور کسی ذریعے سے ممکن نہ تھا اس لیے اللہ تعالےٰ نے بھی اس ذریعۂ تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کے لیے آپؐ کی ازواج مطہرات کو تمام مسلمانوں کے لیے حقیقی ماؤں کی سی حیثیت دے دی تھی اور ان کو افراد امت پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام کر دیا تھا تاکہ مائیں اپنے بیٹوں سے کھل کر بات کریں اور ان کے روحانی باپ کی حرکات و سکنات میں سے ہر ہر چیز کو ان کے سامنے تقلید و پیروی کی خاطر حدود حلال و حرام سے واقفیت کے پیشِ نظر اور پاک و ناپاک میں تمیز کے لیے بیان کرتی رہیں اور اسی طرح بیٹے بھی تاکہ اپنی ماؤں کی خدمت میں حاضر ہو کر بلا جھجک زندگی کے مخفی سے مخفی تر گوشوں کے متعلق رہنمائی حاصل کر سکیں اور جانبین میں ان مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کسی قسم کے ناپاک جذبے کی دخل اندازی کا خطرہ ہی باقی نہ رہے۔

وہ تمام احادیث جو منکرین حدیث کو عریاں مضامین پر مشتمل نظر آتی ہیں وہ سب کی سب وہ احادیث ہیں جن میں جنابت، حیض و نفاس، پاکی و ناپاکی، تعلقات مرد و زن سے منسلک مسائل اور ایسے ہی دیگر امور کی نسبت انسان کے طرزِ عمل کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان احادیث کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور دیگر صحابہ و صحابیات کی زبان سے سن کر منکرین حدیث کا بیمار ذہن اس طرف تو گیا کہ ان احادیث کے مضامین عریاں، خلافِ حیا اور غیر اخلاقی ہیں لیکن یہ نہ سوچا کہ اگر یہ احادیث نہ ہوتیں تو انسانی زندگی کے کیسے کیسے اہم معاملات سے متعلق مسائل سے ہم لاعلم رہ جاتے۔ یہ انہی احادیث کی بدولت تو ہے کہ نہ صرف اہل عرب بلکہ دنیا کے کروڑہا کروڑ مسلمانوں کی نجی مخفی زندگی صفائی، جسم، طہارت لباس اور پاکیزگی اطوار نیز صنفی معاملات میں شائستگی و نظافت کے ایک عام ضابطہ کی پابند ہو گئی۔ ان معاملات

کو اگر محض شخصی ذوق اور انفرادی تمیز پہ چھوڑ دیا جاتا تو ہم میں اکثر افراد کا حال اپنی زندگی کے مخفی شعبوں میں جانوروں سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتا۔ آج کی دُنیا کی بزعم خود متمدن غیر مسلم قوموں کا حال کس کو نہیں معلوم کھانے کے بعد مُنہ کی صفائی سے ناواقف رفع حاجت کے بعد جسم کی طہارت سے نابلد، جنابت و طہارت کے تصور سے بے نیاز اور صنفی جذبات کی تسکین میں گھناؤنے اور گندے طریقوں کے عادی، ان میں اور جانوروں میں کوئی بھی تو فرق نہیں بلکہ قرآن کے الفاظ میں **اولئک کالانعام بل ھم اضل** - یہ احادیث نہ ہوتیں تو بلاشبہ ہمارا بھی یہی حال ہوتا۔

حق یہ ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بہت بڑا ایثار تھا کہ طبعاً انتہا درجے کے شرمیلے اور حیادار ہونے کے باوجود افراد امت کی تعلیم کے لیے حیا کے پردے کو اٹھا دیا اور ہر قسم کے معاملات میں اپنی روحانی اولاد کو جن میں بیٹے اور بیٹیاں سب شامل تھے خود ہدایات دیں، ان کو اجازت دی کہ جو چاہیں پوچھیں اور ان کو اس کا موقع دیا کہ جہاں تک آپؐ کے اندرونی حالات سے وہ واقف ہو سکتے ہوں واقف ہوں خود بھی معلوم کریں اور دوسروں کو بھی بتائیں کہ ایک پاکیزہ مہذب اور شائستہ زندگی کیسی ہوتی ہے فی الحقیقت کیسا زبردست ایثار ہے جس ذات پاک کی حیا کا یہ عالم تھا کہ اس کی شریک زندگی تک کو عمر بھر کبھی اسے برہنہ دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا کہ جس نے کبھی تنہائی میں بھی برہنہ ہونے کو پسند نہ کیا اس نے محض اپنی امت کو صفائی اور شائستگی کی تعلیم دینے کے لیے اپنی بیویوں کو کھُلی اجازت دے دی کہ اس کی نجی زندگی کے مخفی سے مخفی واقعات تک کو لوگوں کے سامنے بیان کر دیں۔

چند مرویات کا جائزہ

متذکرہ بالا امور کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اگرچہ منکرین حدیث کے زیر بحث اعتراض میں کوئی وزن نہیں رہتا تاہم اتمام حجت کے طور پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ احادیث جو اس ضمن میں معترضین کا تختۂ مشق بنی ہیں ان میں سے چند احادیث کا نمونے کے طور پر تجزیہ کر کے یہ دکھا دیا جائے کہ اس قسم کی تمام احادیث دراصل ان مسائل پر مشتمل ہیں جو انسانی

زندگی کے مخفی شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا انسان کے علم میں آنا اس کی اپنی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے از بس ضروری ہے۔

اس سلسلے کی جتنی احادیث منکرین حدیث کی جانب سے اپنے موقف کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں ان کو راویوں کے لحاظ سے دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ احادیث جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے مروی ہیں دوسرے وہ احادیث جو ازواج مطہرات کے علاوہ دیگر صحابہ و صحابیات سے مروی ہیں ہم ان دونوں قسموں میں سے ہر ایک قسم کی چار پانچ احادیث کا نمونے کے طور پر تجزیہ کریں گے صرف یہ دکھانے کے لیے کہ منکرین حدیث کی سوچ کس قدر منفی اثرات کی حامل ہے۔

اوّلاً ہم ازواج مطہرات کی مرویات کا جائزہ لیتے ہیں۔ چنانچہ درج ذیل چند احادیث ملاحظہ فرمائیے:

(۱) عن عائشةَ أنَّ النَّبی صلی اللہ علیہ وسلم قبّلَ بعضَ نسائهٖ ثم خرج إلی الصلوٰة ولم یتوضّأ۔ (ترمذی الطہارۃ باب ترک الوضوء من القبلة)۔	حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی بیوی کا بوسہ لیا پھر نماز کے لیے نکلے اور وضو نہیں کیا۔
(۲) حدثنی ابوبکر بن حفصٍ قال سمعت اباسلمة یقول دخلتُ أنا وأخو عائشةَ علی عائشةَ فسالها أخوها عن غسلِ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فدعت بإناءٍ نحو من صاعٍ فاغتسلت وأفاضت علی رأسها وبیننا وبینها حجابٌ۔ (بخاری - الغسل باب بالصاع ونحوه)	ابوبکر بن حفص نے بیان کیا کہ میں نے ابوسلمہ کو کہتے ہوئے سنا کہ میں اور حضرت عائشہ کے بھائی حضرت عائشہ کے پاس آئے اور ان سے ان کے بھائی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کا حال پوچھا تو انہوں نے تقریباً ایک صاع پانی منگایا پھر انہوں نے غسل کیا اور اپنے سر پر پانی بہایا اس حال میں کہ ہمارے اور ان کے درمیان پردہ حائل تھا۔

(۳) عن أم سلمة قالت جاءت أم سليم الى النبي صلى الله عليه وسلم فقالت يا رسول الله ان الله عز وجل لا يستحيى من الحق فهل على المرأة من غسل إذا احتلمت فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم نعم إذا رأت الماء فقالت أم سلمة يا رسول الله و تحتلم المرأة فقال تربت يداك فبم يشبهها ولدها۔
(الطہارۃ باب وجوب الغسل على المرأة)

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ ام سلیمؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ اللہ تعالےٰ حق بات سے نہیں شرماتا کیا عورت پر غسل واجب ہے جب اسے احتلام ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں جبکہ وہ پانی (منی) دیکھے حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے آپؐ نے فرمایا تیرے ہاتھوں کو مٹی لگے احتلام نہیں ہوتا تو پھر بچہ عورت کے مشابہ کیونکر ہوتا ہے۔

(۴) عن عائشة قالت كنت اغتسل أنا والنبي صلى الله عليه وسلم من إناء واحد كلانا جنب وكان يأمرني فأتزر فيباشرني وأنا حائض وكان يخرج رأسه إلي وهو معتكف فأغسله وأنا حائض
(بخاری کتاب الحیض باب مباشرة الحائض)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے نہاتے تھے اور ہم دونوں جنبی ہوتے تھے اور آپؐ مجھے حیض کی حالت میں ازار باندھنے کا حکم دیتے تھے پھر مجھ سے اختلاط کرتے تھے اور آپؐ اعتکاف کی حالت میں اپنا سر (مسجد سے باہر) میری طرف نکال دیتے تھے اور میں بحالت حیض اسے دھوتی تھی۔

(۵) عن عائشۃ قالت کنت اشرب و انا حائض ثم اناولہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیضع فاہ علی موضع فی فیشرب واتعرق العرق وانا حائض ثم اناولہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیضع فاہ علی موضع فی (مسلم کتاب الطہارۃ باب جواز غسل الحائض راس زوجہا)۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ میں (برتن سے) پانی پیتی تھی اور پھر اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بڑھا دیتی آپؐ اسی جگہ منہ رکھتے جہاں میں نے رکھ کر پیا تھا حالانکہ میں حیض سے ہوتی تھی اور اسی طرح میں حیض کی حالت میں ہڈی پر سے گوشت کھاتی تھی اور پھر اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیتی تھی اور آپؐ اس جگہ منہ رکھتے جہاں میں نے رکھا تھا۔

یہ پانچوں احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ بیان ہوا ہے جو یا تو انسانی زندگی کے مخفی شعبوں سے تعلق رکھتا ہے یا اس کا تعلق جسمانی طہارت و نفاست سے ہے۔ یہ مسائل معترضین کے لیے کوئی اہمیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں مگر جن لوگوں کو اپنی زندگی احکام خداوندی کے مطابق گذارنی ہے ان کو تو بہرحال یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ زندگی کے ان مخفی گوشوں کو رضائے الٰہی کے مطابق کیسے درست رکھا جا سکتا ہے۔ انسانی زندگی کے بعض مخفی گوشوں کا ذکر سن کر منکرین حدیث کا ذہن ان مخصوص گوشوں کی کیفیت و ماہیت کی طرف تو چلا گیا اور اسی لیے ان کے الفاظ میں سے انہیں عریانی جھانکتی نظر آنے لگی مگر ان کا ذہن اس طرف متوجہ نہ ہو سکا کہ اگر یہ ذکر نہ ہوتا تو انسانی زندگی کے یہ مخفی گوشے اصلاح سے محروم رہ جاتے۔ ان کی زبان پر یہ اعتراض تو فوراً آ گیا کہ ایسی خالصتاً نجی نوعیت کی باتوں پر ازواج مطہرات کی یوں بے حجابانہ گفتگو توقع کے خلاف ہے مگر ان کے دماغ میں اتنی بات نہ آسکی کہ یہ گفتگو ماؤں اور بیٹوں کے درمیان ہے لہذا اس کا تعلق ایسے مسائل سے ہے جن کا علم بیٹوں کو اپنی ماؤں کے ذریعے کے علاوہ اور کسی ذریعے سے ہو ہی

نہیں سکتا تھا۔

چلئے جانے دیجئے منکرین حدیث کو ان کے حال پر چھوڑ دیئے آئیے ہم فرداً فرداً ان پانچوں احادیث کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان میں کیسے کیسے اہم مسائل کا حل بیان ہوا ہے۔

بوسہ ناقض وضو نہیں

پہلی حدیث حضرت عائشہ سے مروی ہے اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عمل کی خبر دی ہے اور بتلایا ہے کہ آپؐ نے اپنی کسی زوجہ مطہرہ کا بحالت وضو بوسہ لیا اور اس کے بعد بغیر وضو کیے نماز پڑھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کی اطلاع دینے سے حضرت عائشہ رضہ کا مقصود یہ بتلانا ہے کہ بوسہ بجائے خود وضو توڑنے والی چیز نہیں ہے۔ دراصل بعض لوگ محض بوسہ لے لینے کو ناقض وضو سمجھنے لگے تھے ان کا خیال تھا کہ اس سے اگر وضو ٹوٹتا نہیں ہے تو کم از کم طہارت میں فرق ضرور آ جاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضہ کو ان کا شک دور کرنے کے لیے متذکرہ بالا عمل نبوی کی خبر دینا پڑی تاکہ ثابت ہو جائے کہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بوسہ لینے کے بعد بغیر وضو کیے نماز پڑھی ہے اس لیے بوسہ ناقض وضو نہیں ہے۔

غسل کے لیے کتنا پانی کافی ہے

دوسری حدیث بھی حضرت عائشہ رضہ ہی سے متعلق ہے اس میں ذکر ہے کہ غسل کے متعلق استفسار پر حضرت عائشہ نے پانی منگوا کر اور پردہ لٹکا کر حضرت ابوسلمہ رضہ اور اپنے بھائی کی موجودگی میں غسل فرمایا۔ اس حدیث کے بارے میں سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس حدیث کے راوی حضرت ابوسلمہ رضہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی بھانجے تھے جنہیں حضرت ام کلثوم بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا نے دودھ پلایا تھا اس لحاظ سے اس حدیث میں مذکورہ دونوں شخص جن کے سامنے حضرت عائشہ رضہ نے پردہ لٹکا کر غسل فرمایا آپ کے محرم ہی تھے ان میں سے غیر محرم

کوئی نہ تھا۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ منکرین حدیث حقیقت حال سے ناواقف لوگوں کے سامنے اس حدیث پر تبصرہ کچھ ایسے انداز سے کرتے ہیں جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو سلمہؓ کوئی غیر شخص تھے اس کے علاوہ پھر ایک زیادتی یہ کرتے ہیں کہ روایت میں تو صرف "حجاب" یعنی پردے کا ذکر ہے مگر ان لوگوں کے تبصرے سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ گویا پردہ باریک تھا چنانچہ کہتے ہیں کہ اگر پردہ باریک نہ ہوتا تو حضرت عائشہؓ نہاتی ہوئی نظر نہ آسکتیں اور اس طرح غسل کے عمل کا جو مظاہرہ کرنا مقصود تھا وہ پورا نہ ہوتا حالانکہ اگر انہیں اس مسئلے کا علم ہوتا جو اس وقت درپیش تھا اور جس کی تحقیق کے لیے یہ دونوں اصحاب اپنی خالہ اور بہن کے پاس گئے تھے تو انہیں یہ سوچنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کہ پردہ باریک ہونا چاہیئے تھا۔

دراصل صحابہ کے درمیان بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ غسل کے لیے کتنا پانی کافی ہو سکتا ہے۔ بعض صحابہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ روایت پہنچی تھی کہ آپ ایک صاع بھر پانی سے غسل کر لیتے تھے جبکہ اتنے پانی کو لوگ غسل کے لیے ناکافی سمجھتے تھے غلط فہمی کی بنیاد فی الحقیقت یہ تھی کہ وہ غسل جنابت اور غسل بغرض صفائی بدن کا فرق نہیں سمجھ رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے مستفسرین کو مسئلے کی نوعیت سمجھانے کے لیے اپنے اور ان کے درمیان ایک پردہ ڈالا جس سے صرف ان کا سر اور چہرہ ان دونوں حضرات کو نظر آتا تھا پھر ایک صاع بھر پانی منگوا کر اپنے اوپر بہایا۔ اس طریقہ سے حضرت عائشہؓ مستفسرین کو دو باتیں سمجھانا چاہتی تھیں ایک یہ کہ غسل جنابت کے لیے صرف جسم پر پانی بہانا کافی ہے دوسرے یہ کہ اس مقصد کے لیے صاع بھر پانی کفایت کرتا ہے۔

عورتوں سے مخصوص ایک شرعی حکم

تیسری حدیث حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے یہ حدیث عورتوں کو ایک اہم شرعی حکم سے واقفیت مہیا کرتی ہے مسئلہ جس سے ایک عرب خاتون کو سابقہ پیش آگیا تھا یہ تھا کہ اگر ایک عورت اسی طرح کا خواب دیکھے جیسا عام طور پر بالغ مرد

دیکھا کرتے ہیں تو وہ کیا کرے اسے پاک ہونے کے لیے مردوں کی طرح غسل کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ چونکہ یہ صورت عورتوں کو بہت کم پیش آتی ہے اس لیے عورتیں اس کے شرعی حکم سے ناواقف تھیں۔ چنانچہ وہ خاتون مسئلہ پوچھنے آئیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ بتا کر کہ عورت کو بھی مرد ہی کی طرح غسل کرنا چاہیئے نہ صرف ان کو بلکہ تمام عورتوں کو ایک ضروری تعلیم دے دی اب بتلایا جائے کہ اس میں کونسی بات اخلاقی لحاظ سے معیوب تھی کیا ان عرب خاتون کا مسئلہ پوچھنا کوئی عیب کی بات تھی؟ کیا انہیں مسئلہ پوچھنے کے بجائے شرم کا لحاظ کرتے ہوئے جو کچھ ان کی اپنی سمجھ میں آتا وہی کر لینا چاہیئے تھا۔ ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ معترضین کو اس میں کونسی بات غیر اخلاقی نظر آتی ہے۔

جنابت اور حیض کے بارے میں قدیم تعصبات کا ازالہ

چوتھی اور پانچویں احادیث میں جو مضمون حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی بیان ہوا ہے اس کی اصل حقیقت سمجھنے کے لیے اس پس منظر کا جاننا ضروری ہے جو ان احادیث کو روایت کرتے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پیش نظر تھا۔

دراصل جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کے ناپاک ہونے کا تصور شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کی طرح قدیم شریعتوں میں بھی تھا لیکن قدیم شریعتوں میں یہودی احبار اور عیسائی راہبوں کی مبالغہ آرائیوں نے اس تصور کو حد اعتدال سے اس قدر بڑھا دیا تھا کہ وہ جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کے وجود ہی کو ناپاک خیال کرنے لگے تھے۔ ان کے زیر اثر اہل حجاز و مدینہ میں بھی یہ تصور حد مبالغہ کو پہنچ گیا تھا خصوصاً حائضہ عورت کے ساتھ تو رہنا سہنا بھی گناہ خیال کیا جانے لگا تھا چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب عورت کو حیض آتا تھا تو یہودی اس کے ساتھ کھانا پینا اور اس کے ساتھ رہنا سہنا چھوڑ دیتے تھے[1] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الطہارۃ باب الحیض الفصل الاول

لائے تو آپؐ نے بتایا کہ اس حالت میں صرف فعل مباشرت ناجائز ہے اس کے علاوہ میل جول رہن سہن کھانا پینا غرض ہر قسم کی معاشرت حائضہ عورت کے ساتھ اسی طرح رہتی ہے جیسی اس کے پاک ہونے کی حالت میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگرچہ اس سلسلے میں بنیادی غلط فہمی رفع ہو گئی تھی تاہم قدیم تعصبات کے زیر اثر ایک مدت تک لوگ یہ سمجھتے رہے کہ جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کا وجود کچھ نہ کچھ تو گندا رہتا ہی ہے اس لیے اس حالت میں اس کا ہاتھ جس چیز کو لگ جائے وہ بھی کم از کم مکروہ تو ضرور ہو جاتی ہو گی۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں زیر بحث دونوں حدیث اور اسی قسم کی دوسری احادیث روایت ہوئی ہیں۔ متذکرہ بالا مبالغہ آمیز تصورات کو اعتدال پر لانے کے لیے ازواج مطہرات کو یہ بتانا پڑا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اس حالت میں کوئی اجتناب نہیں فرماتے تھے آپؐ کے نزدیک حائضہ یا جنبی عورت کے ہاتھ لگانے سے جب پانی جیسی سیال اور تر چیز گندی نہیں ہوتی تھی تو کسی برتن یا کپڑے وغیرہ کے گندے ہو جانے کا تو سوال ہی کیا۔ بلکہ پانچویں حدیث میں تو یہ جتلایا گیا کہ حائضہ عورت کا ہاتھ تو ہاتھ رہے منہ بھی لگ جائے تو کوئی چیز گندی نہیں ہوتی۔ نیز اس قسم کی احادیث میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ حائضہ بیوی کے ساتھ اس کا شوہر صرف مباشرت کا مخصوص فعل نہیں کر سکتا باقی ہر قسم کا اختلاط جائز ہے۔ اب ذرا سوچئے اگر ازواج مطہرات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان افعال پر ہمیں مطلع نہ کیا ہوتا تو قدیم تعصبات کے زیر اثر ہمیں اپنی خانگی زندگی میں کیسی کیسی مشکلات سے سابقہ پیش آتا۔

ازواج مطہرات کی مرویات کے بعد اب ہم چند ایسی احادیث کا جائزہ لیتے ہیں جو دوسرے راویوں سے روایت ہوئی ہیں۔ مثلاً

(۱) قال سمعتُ جابرَ بنَ عبد اللّٰہ یقول کنّا نستمتعُ	(راوی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن عبداللہؓ کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایک

بالقبضة من التمر والدقيق
الأيام على عهد رسول الله
صلى الله عليه وسلم وأبي
بكر حتى نهى عنه عمر
(مسلم كتاب النكاح باب نكاح المتعة)

مٹھی چھوہارے یا ایک مٹھی آٹے کے عوض چند روز کے لیے متعہ کر لیا کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت عمر نے ہمیں منع کیا۔

(۲) قال أذن لنا رسول الله صلى
الله عليه وسلم بالمتعة فانطلقت
أنا ورجل إلى امرأة من
بني عامر كأنها بكرة عيطاء
فعرضنا عليها أنفسنا فقالت
ما تعطني فقلت ردائي وقال
صاحبي ردائي وكان رداء صاحبي
أجود من ردائي وكنت أشب
منه فإذا نظرت إلى رداء
صاحبي أعجبها وإذا نظرت
إليّ أعجبتها ثم قالت أنت
ورداءك يكفيني فمكثت
معها ثلاثا ثم إن رسول
الله صلى الله عليه وسلم قال
من كان عنده شيء من
هذه النساء التي يتمتع فليخل
سبيلها۔
(مسلم كتاب النكاح باب نكاح المتعة)

(حضرت سُبرۃ الجُہنی) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں متعہ کرنے کی اجازت دی تو میں اور ایک اور شخص بنی عامر کی ایک عورت کے پاس گئے عورت نوجوان اور دراز گردن تھی سو ہم نے اپنے آپکو اس پر پیش کیا وہ بولی کیا دوگے میں نے کہا میری چادر حاضر ہے میرا ساتھی بولا میری بھی چادر حاضر ہے اور میرے ساتھی کی چادر میری چادر سے اچھی تھی مگر میں اس سے جوان زیادہ تھا عورت جب میرے ساتھی کی چادر دیکھتی تو وہ اسے پسند آتی اور جب مجھے دیکھتی تو میں اسے پسند آتا پھر وہ بولی کہ تو اور تیری چادر مجھے کافی ہے پھر میں اسکے پاس تین دن رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا کہ اگر کسی کے پاس یہ میعادی نکاح والی عورتیں ہوں تو وہ انہیں آزاد کر دے۔

(۳) اَخبرَنی عطاءٌ قال سمعتُ جابرَ بنَ عبد الله رضی الله عنهما فی ناسٍ معِیَ قال اَهللنَا اصحابُ محمد صلی الله علیہ وسلم بالحجّ خالصًا وحدہٗ قال عطاءٌ قال جابرٌ فقدم النبیّ صلی الله علیه وسلم صُبحَ رابعةٍ مضتْ من ذی الحجة فاَمرنا اَن نحِلّ قال عطاءٌ قال اَحلّوا واَصیبوا النساءَ قال عطاءٌ ولم یعزم علیهم ولکن اَحلّهن لهم فقلنا لمّا لم یکن بیننا وبین عرفة اِلّا خمسٌ اَمرنا ان نُفضِی اِلی نسائِنا فناَتی عرفة تقطرُ مذاکیرنا المنی.. الحدیث)

(مُسلم کتاب الحج باب بیان وجوہِ الاَحرام)

عطاء روایت کرتے ہیں کہ میں نے چند اشخاص کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ سے سُنا فرمایا ہم سب اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف حج کا احرام باندھا عطا بیان کرتے ہیں کہ حضرت جابر نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چوتھی ذی الحجہ کی صبح کو آئے اور ہمیں حکم دیا کہ احرام کھول ڈالیں عطا کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا احرام کھول ڈالو اور (اپنی) بیویوں کے پاس جاؤ عطا بیان کرتے ہیں کہ یہ حکم ان پر وجوب کے طور پر نہ تھا بلکہ جواز کی حدود میں تھا پس ہم کہہ رہے تھے کہ صرف پانچ دن تو عرفات پہونچنے میں رہ گئے ہیں اور آپؐ نے ہمیں اپنی بیویوں کے پاس جانے کے لیے کہہ دیا (گویا) ہم عرفات اس طرح پہونچیں کہ ہمارے اعضائے رئیسہ سے تقاطر منی ہو رہا ہو..... الی آخر الحدیث۔

حقیقتِ حال کی وضاحت کے لیے یہ تین احادیث ہی کافی ہیں۔ پہلی دو حدیثیں متعہ کے ذکر پر مشتمل ہیں جبکہ تیسری حدیث حج کے بعض احکام سے متعلق ہے۔ جو کوئی بھی تعصب سے بالاتر ہو کر ان احادیث کے مضامین میں غور کرے گا اس کا ذہن "نستمتع یا یتمتع" یا "اَصیبوا النساءَ" جیسے الفاظ سے جماع کے مخصوص عمل کی کیفیت کی طرف منتقل ہونے کے بجائے ان مسائل کے جواز و عدم جواز پر غور کرنے میں مصروف ہو جائے گا جو ان الفاظ کے ذکر کا اصل مقصد ہیں مگر کیا کیا جائے منکرین حدیث کی عقلِ سقیم کا کہ وہ اس قسم کی احادیث میں اصل مقصود تلاش کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہے۔

متعہ کے مختلف پہلو

پہلی دو حدیثوں پر اعتراض کرنے سے پہلے اگر منکرین حدیث یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ متعہ کی حقیقت کیا ہے اور اس کے بارے میں صحابہ کے سامنے کونسی بات تحقیق طلب تھی جس کی وضاحت کے لیے صحابہ کو یہ روایات نقل کرنا پڑیں تو شاید ان کا ذہن عریانیت کی طرف منتقل نہ ہوتا اور وہ حقیقت حال کو پا لیتے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اسلام سے قبل زمانۂ جاہلیت میں نکاح کے جو طریقے رائج تھے۔ ان میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ کسی عورت کو کچھ معاوضہ دے کر ایک خاص مدت کے لیے اس سے نکاح کر لیا جاتا تھا ایسے نکاح کو "نکاح متعہ" کہا جاتا تھا۔ جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ یہ تھا کہ جب تک اللہ تعالٰی کی طرف سے کسی چیز کی نہی کا حکم نہیں مل جاتا تھا اس چیز کے بارے میں پہلے سے رائج شدہ طریقے کو آپؐ منسوخ نہ فرماتے تھے بلکہ یا تو اس پر سکوت فرماتے یا بوقتِ ضرورت اس کی اجازت بھی دے دیتے تھے چنانچہ اپنی اسی عادت کے مطابق متعہ کے بارے میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً اس کے رواج پر سکوت فرمایا مگر بعد میں کسی جنگ یا سفر کے موقعے پر اگر لوگوں نے شدت سے اس کی ضرورت ظاہر کی تو اس کی اجازت بھی دے دی کیونکہ اس وقت تک اس کی نہی کا حکم نازل نہ ہوا تھا پھر جب حکم نہی نازل ہو گیا تو آپؐ نے اس کو قطعاً ممنوع قرار دے دیا لیکن متعہ کی ممانعت کا یہ حکم تمام لوگوں تک نہ پہونچ سکا جس کی بنا پر بعد میں بھی کچھ لوگ ناواقفیت کی بنا پر متعہ کرتے رہے آخر کار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اس حکم کی عام اشاعت کی اور پوری قوت کے ساتھ اس رواج کو بند کیا جب تک یہ رواج پوری طرح بند نہ ہو گیا صحابہ کے سامنے متعدد سوالات تحقیق طلب رہے مثلاً یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی متعہ کی اجازت صراحتاً بھی دی تھی یا محض سکوت کے طریقے پر ہی آپؐ عمل پیرا رہے؟ اور اگر اجازت دی تھی تو کس کس موقعے پر؟ نیز یہ کہ آپؐ نے اسے بعد میں ممنوع قرار دیا ہے یا نہیں؟ اگر دیا ہے تو اس کی عام ممانعت آپؐ نے کب فرمائی؟ اور کن الفاظ میں اس کام سے روکا؟

بر اور اسی طرح کے متعدد سوالات تھے جن کی تحقیق مقصود تھی چنانچہ صحابہ میں سے جس جس کے پاس اس مسئلے سے متعلق کوئی علم تھا اس نے دوسروں کے سامنے بیان کیا یہی وجہ ہے کہ یہ محولہ بالا دو حدیثیں ہی نہیں اور بھی متعدد احادیث اسی قسم کے مضامین کی حامل مختلف کتب حدیث میں آپ کو ملیں گی جن سے اس متعہ کے مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اب انہی زیر بحث دونوں حدیثوں کو لے لیجئے پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے عہد تک متعہ کے جواز کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں لوگوں کے ذہنوں میں موجود تھیں تا آنکہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ فرمایا اور متعہ کے عدم جواز سے متعلق حکم نبوی کو عام رواج دیا۔

اسی طرح دوسری حدیث سے متعہ کے ایک اور پہلو پر روشنی پڑتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ بعض مواقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کی صریح اجازت بھی دی تھی تاہم بعد میں اس کی قطعی ممانعت بھی فرما دی تھی ۔ یہی حال اس قسم کے مضامین پر مشتمل دیگر تمام احادیث کا ہے کہ ان سے اس مسئلے سے متعلق کسی نہ کسی پہلو کی وضاحت ہوتی ہے ۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر صحابہ یہ احادیث روایت نہ کرتے تو متعہ کے بارے میں متذکرہ بالا تحقیق طلب مسائل کیسے حل ہوتے نیز بعد میں آنے والے فقہا اور اسلامی قانون کی تدوین کرنے والے آخر کس بنیاد پر متعہ کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ کرتے ۔

حج و عمرہ سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ

تیسری حدیث حضرت جابر کی روایت کردہ ان متعدد احادیث میں سے ایک ہے جن میں انھوں نے احرام سے تعلق رکھنے والے چند فوائد کا تذکرہ کیا ہے۔ اس حدیث میں جو واقعہ بیان ہوا ہے اس کا پس منظر دراصل یہ تھا کہ گذشتہ رسوم مالوفہ کی بنا پر بعض لوگوں کے دلوں میں یہ غلط خیال بیٹھا ہوا تھا کہ ایام حج میں عمرہ نہیں ادا کیا جا سکتا اس غلط خیال کو دور کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ۴ ذی الحجہ کو طواف وسعی سے فارغ ہو کر لوگوں کو حکم دیا کہ جو لوگ اپنے

ساتھ قربانی کا جانور نہیں لائے وہ احرام کھول دیں چونکہ آپؐ ایام جاہلیت کے اثرات کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے اس لیے ساتھ ہی آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ احرام کھول کر تم اپنی بیویوں کے پاس جاؤ اس سے مقصود صرف اتنا تھا کہ احرام کی تمام پابندیوں کا رفع ہو جانا متحقق ہو جائے اور لوگوں کے ذہن میں کوئی شک باقی نہ رہے مگر اس کے باوجود بھی بعض لوگ احرام کھولتے ہوئے جھجکے اور آپس میں تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے کہ کیا ہم اس حالت میں عرفہ کی طرف روانہ ہوں گے کہ ہم پر احرام کی کوئی پابندی نہ ہو حتیٰ کہ ہمیں اپنی بیویوں سے متمتع ہونے کی بھی کھلی چھٹی ہو اسی استعجاب کو انہوں نے تقطو مذاکیرنا المنی کے الفاظ سے تعبیر کیا بعض لوگوں کے اسی مذبذب پر نبی کریم صلی علیہ وسلم نے وہ فقرہ ارشاد فرمایا تھا جو اسی روایت میں آگے چل کر آتا ہے کہ "میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں اگر میرے ساتھ قربانی کے جانور نہ ہوتے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی احرام کھول دیتا۔

یہ واقعہ بعد میں حضرت جابرؓ کو اس لیے سنانا پڑا کہ بعد میں بھی بعض لوگوں کو یہ شک باقی رہ گیا تھا کہ جو شخص احرام باندھ کر حج سے پہلے مکہ پہونچا ہو وہ آیا طواف وسعی کرنے کے بعد حلال ہو سکتا ہے یا نہیں اور آیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ حج کا زمانہ آنے پر حرم ہی سے احرام کا آغاز کرے اس شک کو دور کرنے کے لیے حضرت جابرؓ نے یہ حدیث سنائی تھی۔

اب تک کی گفتگو سے قارئین کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ تمام احادیث جن کا ہم نے ابھی تفصیل سے جائزہ لیا ہے وہ سب کی سب انسانی زندگی کے بعض انتہائی اہم مسائل سے متعلق ضروری علم مہیا کرتی ہیں اگر کوئی اس علم سے آنکھیں بند کر کے ان احادیث کو صرف اپنے اعتراضات کا تختۂ مشق بناتا ہے تو اپنی عقل کے سقیم و بیمار ہونے کا خود ثبوت مہیا کرتا ہے احادیث کے مرتبہ و مقام میں کوئی فرق نہیں آتا یہ چند احادیث ہم نے نمونے کے طور پر پیش کر دی ہیں انہی پر ان تمام احادیث کو قیاس کر لیا جائے جو ان احادیث کے علاوہ منکرین حدیث کی جانب سے اس ضمن میں پیش کی

جاتی ہیں۔

۴۔ خلافِ علم و تجربہ روایات

اب اس کے بعد ہم منکرین حدیث کے چوتھے اعتراض کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

ان کا ایک اعتراض یہ ہے کہ صحیح احادیث کے ذخیرے میں بعض روایات ایسے دعاوی پر مشتمل ہیں جو تجربے کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اور ظاہر ہے نبی کے دعاوی کبھی غلط نہیں ہوتے بنابریں یہی سمجھا جائے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان تمام دعاوی کی نسبت غلط ہے۔

اس اعتراض کے پیچھے بھی منکرین حدیث کی وہی منفی سوچ کام کر رہی ہے جب تک وہ اس حقیقت کو اصولی طور پر تسلیم نہیں کر لیتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے فرستادہ ہونے کی بنا پر ان غیبی اسرار سے آگاہ تھے جن سے کوئی دوسرا بشر آگاہ نہیں ہے اور جب تک وہ یہ نہیں مان لیتے کہ ملاء اعلیٰ سے ہمہ وقت رابطہ حاصل ہونے کی بنا پر آپؐ کا ہر ہر قول اور ہر ہر فعل نور و حکمت اور علم و معرفت سے معمور ہوتا تھا اس وقت تک ان کو قدم قدم پر اسی طرح ٹھوکریں لگتی رہیں گی۔

اوّل تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی صحیح حدیث ایسی ہے ہی نہیں جو علم و تجربے کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو تاہم بالفرض اگر کوئی ایسی حدیث ہو بھی جو اب تک کے معروف علم اور آج تک کے معلوم تجربے کے خلاف ہو تو کیا یہ ممکن نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایسی بات کی خبر دی ہو جو موجودہ زمانے میں رائج علوم و معارف سے تو ہم آہنگ نہ ہو لیکن آئندہ زمانوں میں انسانی دسترس کی حدود میں آنے والے علم و آگہی کے ذرائع اس کی تصدیق کرتے ہوں۔ عقلاً یہ عین ممکن ہے کہ آپؐ نے فلسفۂ حیات انسانی سے متعلق کوئی ایسی بات ارشاد فرمائی ہو جو آج کے دور میں لوگوں کی سمجھ سے باہر ہو مگر وہی فلسفیانہ ارشاد اس دور کے عین مطابق ہو جب فلسفہ اپنے نقطۂ کمال پر پہونچ جائے گا۔ غرض اگر کسی زمانے میں لوگوں پر کسی ارشاد رسول کی حکمت و مصلحت واضح نہ ہو سکے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ وہ حدیث ہی موضوع ہے۔

سوسال بعد دُنیا کا خاتمہ

بہر حال منکرین حدیث اگر اپنی سوچ کا رُخ درست کر لیں تو خود اس بات کا اقرار کرتے نظر آئیں گے کہ کوئی ایک بھی صحیح حدیث ایسی نہیں جو انسانی علم و تجربے کے خلاف ہو۔ ان کی جانب سے جتنی بھی روایات اس سلسلے میں پیش کی جاتی ہیں اگر ذرا بھی بہ نظر غور ان کا جائزہ لیا جائے تو کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں رہتی جس پر خلاف علم و تجربہ ہونے کا اعتراض صادق آسکے۔ مثال کے طور پر ان کی طرف سے پیش کی جانے والی اسی روایت کو لے لیجئے جس میں ذکر ہے کہ سو سال کے بعد زمین پر کوئی جاندار زندہ نہیں رہے گا۔ یہ روایت دراصل اس حدیث کا ایک جزو ہے جس کو امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کتاب العلم میں نقل کیا ہے۔ پوری حدیث اس طرح ہے:

قال صلیٰ بنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم العشاء فی آخر حیاتہ فلما سلّم قام فقال أرأیتم لیلتکم ھذا فإن رأس مائۃ سنۃ منھا لا یبقیٰ ممن ھو علیٰ ظھر الارض أحد۔	(حضرت عبداللہ بن عمر نے) بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اخیر عمر میں ہم کو عشاء کی نماز پڑھائی جب سلام پھیرا تو کھڑے ہوئے اور فرمایا کیا تم نے اس رات کو دیکھا (اسے یاد رکھنا) اب سو برس کے بعد جتنے لوگ اس وقت زمین پر ہیں ان میں سے کوئی (زندہ) نہیں رہے گا۔

(بخاری۔ العلم باب السمر فی العلم)۔

منکرین حدیث نے اس حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ دُنیا سو سال کے بعد ختم ہو جائے گی اور پھر اسی بنیاد پر اسے موضوع ٹھہرایا ہے کہ یہ تاریخی حقائق اور حس و مشاہدے کے خلاف ہے۔

اس حدیث پر تبصرہ کرنے سے پہلے ہمیں منکرین حدیث سے یہ پوچھنا ہے کہ امام بخاری نے اس روایت کو کتاب الصلوٰۃ میں بھی لیا ہے کیا وجہ ہے اس کو اختیار کرنے کے بجائے منکرین حدیث کی نظر انتخاب اسی کتاب العلم والی روایت پر کیوں پڑی کیا یہ حقیقت نہیں کہ کتاب الصلوٰۃ والی روایت انہوں نے صرف اس لیے نہیں لی کہ اس میں

ان کے اعتراض کا جواب موجود تھا۔ اُس روایت میں چونکہ "الیوم" کا لفظ اس ارشاد نبوی کا صحیح مفہوم متعین کر دیتا تھا جس کے بعد متذکرہ بالا اعتراض کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی تھی اس لیے منکرین حدیث کا فائدہ اسی میں تھا کہ اس روایت سے صرف نظر کر لیا جائے۔

دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت جبکہ میں یہ الفاظ کہہ رہا ہوں دُنیا میں جتنے لوگ ہیں سو سال کے اندر اندر سب مر جائیں گے یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ سو سال کے بعد دُنیا ہی ختم ہو جائے گی۔ اگرچہ کتاب العلم والی روایت میں بھی "لیلتکم ھذا" کے الفاظ اسی مفہوم پر دلالت کرتے ہیں تاہم کتاب الصلوٰۃ والی روایت تو اس مفہوم کی تعیین میں بالکل ہی صریح ہے۔ اس حدیث کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

فقال أرأیتم لیلتکم ھذہ فإن رأس مائۃ سنۃ منہا لا یبقیٰ ممن ھو الیوم علی ظھر الارض احد۔ (بخاری۔ الصلوٰۃ باب ذکر العشاء والعتمۃ)	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم نے اس رات کو دیکھا اب سے سو برس کے بعد جتنے لوگ آج پشت زمین پر ہیں ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا۔

اس ارشاد سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اس بات پر متنبہ کرنا تھا کہ تمہاری عمریں پہلی امتوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں لہٰذا عبادت کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیئے۔ نیز اس کے ساتھ ہی ان الفاظ میں معجزانہ طور پر ایک پیشن گوئی بھی موجود تھی کہ پوری ایک صدی گذرنے پر موجودہ لوگوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا چنانچہ یہ پیشن گوئی پوری بھی ہوئی صحابہ میں سے جس کی موت سب کے بعد واقع ہوئی وہ حضرت ابوطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے ۱۱۰ ھ ہجری میں وفات پائی جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ۱۰ ھ ہجری کا واقعہ ہے اس طرح اس ارشاد کے دن سے لیکر آخری صحابی حضرت ابوطفیل کی وفات تک پورے سو سال بنتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ یہ کیسے پتہ لگا کہ آپؐ نے یہ سنہ ۱۰ ہجری میں ارشاد فرمایا تھا تو اوّل تو کتاب العلم والی روایت میں "فی اٰخر حیاتہٖ" کے الفاظ خود اس پر دال ہیں دُوسرے وہ حدیث جو امام مسلم نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے اس میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے ایک مہینہ پہلے کا واقعہ ہے اور یہ معلوم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ماہ ربیع الاوّل سنہ ۱۱ ہجری میں ہُوا ہے۔

منکرین حدیث کی علمی دیانت ملاحظہ ہو انہوں نے اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی وضاحت کو بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ دراصل خود صحابہ کے زمانے میں بھی بعض لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا صحیح مطلب سمجھنے میں دھوکہ لگ گیا تھا ان کے ذہن میں صرف صدی کا مفہوم باقی رہ گیا اُنہوں نے آپؐ کے الفاظ "آج جو زمین کی پشت پر زندہ ہے" کی طرف توجہ نہ دی اور اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ ساری دُنیا ہی سو سال بعد ختم ہو جائے گی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک موقعہ پر ایسے لوگوں کو سمجھایا اور متذکرہ الفاظ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپؐ کے اس ارشاد کا اصل مقصود واضح کیا۔ حضرت ابن عمرؓ کی یہ وضاحت امام مسلم نے کتاب فضائل الصحابہ میں نقل کی ہے۔ اس وضاحت کے الفاظ یہ ہیں:

فوھل الناس فی مقالۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم تلک فیما یتحدثون من ھٰذہ الاحادیث عن مائۃ سنۃٍ وانما قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یبقیٰ ممن ھو الیوم علیٰ ظھر الارض احدٌ یرید بذلک اَن ینخرم ذٰلک القرن (مسلم کتاب فضائل الصحابہ بیان معنی قولہ علی راس مائۃ)۔	لوگوں کو سو سال والی احادیث کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب سمجھنے میں غلطی لگ گئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ کہا تھا کہ جو انسان زمین کی پشت پر آج کے دن موجود ہیں ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا اور مُراد یہ تھی کہ اس صدی کے آخر تک (یہ موجودہ نسل) ختم ہو جائے گی۔

سلہ مسلم کتاب فضائل الصحابہ باب بیان معنی قولہ علی رأس مائۃ

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس وضاحت سے آنکھیں بند کر لینا اور یہ رٹے جانا کہ زیر بحث حدیث تاریخی حقائق کے خلاف ہے منکرین حدیث کی علمی بددیانتی تو ہے ہی خوفِ خدا سے ان لوگوں کے عاری ہونے کی دلیل بھی ہے۔

غرض کتنی عجیب بات ہے جو حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عظیم معجزے پر مشتمل تھی منکرین حدیث کا تختۂ مشق بن کر موضوع اور تاریخی حقائق کے خلاف قرار پائی۔

ع بریں عقل و دانش بباید گریست۔

عجوہ کھجور کی تاثیر

اسی طرح ایک اور حدیث جو منکرین حدیث کا تختۂ مشق بنی ہے وہ ہے جس کو امام بخاری نے کتاب الطب میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اس کو بھی دیکھ لیجئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من اصطبح کلّ یوم تمرات عجوۃ لم یضرّہٗ سمّ ولا سحر ذالک الیوم الی اللیل وقال غیرہٗ سبع تمرات۔ (بخاری ۔ الطب باب الدواء بالعجوۃ)	جس نے ہر روز علی الصبح عجوہ نامی کھجوریں کھائیں اس پر اس رات تک نہ زہر اور نہ جادو کا اثر انداز نہ ہوگا ایک دوسری روایت میں سات کھجوروں (کے الفاظ) ہیں۔

منکرین حدیث کو عجوہ نامی کھجور کی اس تاثیر سے انکار ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ طب جدید نے اس مخصوص کھجور میں کوئی ایسی تاثیر یا خاصیت نہیں پائی جو زہر یا جادو کے ملاج میں مفید ہوتی ہو اس لیے معلوم ہوتا ہے یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

عجوہ نامی کھجور کے بارے میں طبِ جدید کیا رائے رکھتا ہے کیا نہیں اس سے تو ہم بعد میں بحث کریں گے پہلے ہمیں یہ بتایا جائے کہ کیا طبِ جدید نے دنیا کے تمام ماکولات مشروبات نباتات اور میوہ جات کی خاصیات کا احاطہ کر لیا ہے یا دوسری صورت میں طبِ جدید نے کہیں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے عجوہ کی تمام تاثیرات اور تمام خاصیات معلوم کر لی ہیں اگر ایسا کوئی دعویٰ طب کی دنیا میں موجود نہیں تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عجوہ میں فلاں تاثیر

سرے سے موجود ہی نہیں ہے اگر عجوہ میں ابھی تک جادو اور زہر کے لیے مفید خواص کا سراغ نہیں لگایا جا سکا تو کیا یہ ممکن نہیں کہ مستقبل میں جب اس کھجور پر باقاعدہ طبی تحقیق کی جائے تو بہت سے ایسے نئے خواص کا پتہ چلے جو مفید زہر یا مفید سحر ہوں۔ علاوہ ازیں تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجئے کہ طب جدید نے عجوہ نامی کھجور پر پوری طبی تحقیق کے بعد یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ اس میں متذکرہ تاثیرات میں سے کوئی تاثیر موجود نہیں ہے تو اس کے بعد بھی یہ امکان پھر بھی باقی رہے گا کہ آئندہ طب کا علم مزید ترقی کرے اور تحلیل و تجزیہ کا کوئی ایسا نیا طریقہ دریافت ہو جائے جس کی مدد سے عجوہ کی کچھ مزید تاثیرات و خاصیات کا انکشاف ہو کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ طب کا علم اپنی آخری حد کو پہونچ گیا ہے اور اب اس پر مزید کسی اضافے کا کوئی امکان نہیں۔

یہ تو تھی ایک اصولی بات رہا عجوہ کے بارے میں طب جدید کی رائے کا معاملہ تو یہ کہنا سرے سے ہے ہی غلط کہ طب جدید نے اس مخصوص کھجور میں کوئی ایسی تاثیر یا خاصیت نہیں پائی جو زہر یا جادو کے علاج میں مفید ہوتی ہو اس لیے کہ طب جدید میں یہ امر ایک طے شدہ حقیقت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ عجوہ غذا بخش اور ملین معدہ ہوتی ہے یہ کھجور جسم میں حرارت کے ساتھ ساتھ فرحت اور نشاط پیدا کرتی ہے نتیجتاً اس کو اگر نہار منہ کھانا معمول بنا لیا جائے تو جس مادے سے معدہ میں کیڑے بنتے ہیں وہ کمزور پڑ جاتا ہے اور کیڑے مر جاتے ہیں اور اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ اندرونی امراض کے پیدا ہونے کی بڑی وجہ انتڑیوں میں بدبو اور کیڑوں کا پیدا ہو جانا ہی ہے جب یہ معاملہ بڑھ جاتا ہے تو جسم میں زہر پیدا ہو جاتا ہے جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوتا ہے بنا بریں حدیث میں جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ عجوہ زہریلے اثرات کو ختم کر دیتی ہے معلوم ہوا کہ بالکل درست ہے۔

اسی طرح عجوہ سے جادو کے اثرات کا زائل ہو جانا بھی کوئی ایسی بات نہیں جو بعید از عقل و قیاس ہو۔ اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں کہ جادو ایک نفسیاتی مرض ہے طب جدید نے بھی اس کو تسلیم کر لیا ہے کہ تخیلات و توہمات بعض امراض میں بڑا اہم پارٹ

ادا کرتے ہیں تو نفسیاتی مرض ہونے کی بنا پر ظاہر ہے جادو کا علاج بھی نفسیاتی ہی ہونا چاہیئے۔

اب ذرا تجزیہ کیجئے جب ایک سحر زدہ شخص عجوہ کے ان پہلوؤں پر غور کرے گا کہ یہ جسم انسانی کو حرارت بخشتی ہے فرحت و نشاط بہم پہونچاتی ہے بدن کو تقویت دیتی ہے کیڑوں کو مارتی اور فضلات کے تعفن کو دور کرتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب وہ اس حقیقت میں غور کرے گا کہ عجوہ کھجور کو اللہ کے رسول نے جس کی بات ہمیشہ قطعی اور حتمی ہوتی ہے جادو کے مرض کے لیے مفید بتایا ہے تو نفسیاتی طور پر اس کے اندر قوتِ مدافعت بڑھیگی جو جادو کے ازالے میں مؤثر ہوگی۔

کھمب کی خاصیت

طب ہی کی بنیاد پر منکرین حدیث نے اس حدیث کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جس میں ذکر ہے کہ کھمب (جس کو سانپ کی چھتری بھی کہا جاتا ہے اور جو برسات کے زمانے میں عموماً کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر از خود اُگ آتی ہے) کا پانی آنکھ کے لیے باعثِ شفا ہے۔ اس حدیث کا متن یہ ہے:

الکمأۃ من المنّ وماءھا شفاء للعین۔	کھمب (یا سانپ کی چھتری) ترنجبین (کی قسم) سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لیے باعثِ شفا ہے۔

(بخاری کتاب الطب باب المنّ شفاء للعین)۔

اس حدیث پر بھی منکرین حدیث کو یہی اعتراض ہے کہ یہ طبی تحقیق کے خلاف ہے اس لیے صحیح نہیں ہے۔

اس حدیث کے بارے میں بھی اوّل تو اصولی بات وہی ہے کہ آج اگر انسان کی تحقیق میں کھمب کی یہ تاثیر نہیں آئی جو حولہ بالا حدیث میں بیان ہوئی ہے تو اس کا امکان ختم تو نہیں ہوا کہ کل انسانی تحقیق میں اس تاثیر کا وجود ثابت ہو جائے دوسرے ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ منکرین حدیث ایک طرف تو اخبارِ آحاد کے پورے کے پورے ذخیرے کو صرف اس بنیاد پر بیکار اور ناقابل اعتماد ٹھہراتے ہیں کہ ان سے علم ظنی حاصل ہوتا ہے جو کہ فی الحقیقت یقین ہی کی ایک قسم ہے دوسری طرف محض اندازوں اور تخمینوں پر اس قدر اعتماد کرتے ہیں کہ ان کو احادیث نبوی کے صحیح و غیر صحیح ہونے کا معیار

قرار دیتے ہیں۔ کسی چیز کی کوئی خاصیت جو اطبا بیان کرتے ہیں وہ سب ان کے اندازے اور تخمینے ہی تو ہوتے ہیں۔ ان اندازوں اور تخمینوں کی بنیاد پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جو وحی و برہان پر مبنی ہونے کی وجہ سے یقیناً "قطعی اور حتمی ہیں مشکوک اور غلط قرار دینا کہاں کی دانش مندی ہے۔ آج اگر ایک حدیث اس لیے قابل قبول نہیں کہ وہ طب کی تحقیق کے خلاف ہے تو کل اگر طب کی تحقیق اس کے حق میں ہو گئی تو یقیناً وہ قابلِ قبول بن جائے گی اس کا مطلب یہ ہوا کہ طبیب کی بات تو قابلِ قبول ہے جو ایک عام انسان سے زیادہ کچھ نہیں مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات قابل قبول نہیں جو معترضین کے نزدیک بھی اللہ کے رسول ہیں ایں چہ بوالعجبی است

علاوہ ازیں یہ کہنا ہی غلط ہے کہ کھمب میں وہ تاثیر نہیں پائی جاتی جو حدیث میں بیان ہوئی ہے اس لیے کہ ابوسہل مسیحی اور بوعلی سینا جیسے مسلّم و مشہور اطبا کی تحقیق تو یہ ہے کہ کھمب کا پانی بصارت کو تیز کرتا ہے نیز اگر اس کو سرمہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس سے ظلمت بصر دور ہوتی ہے اور دکھتی آنکھ ٹھیک ہو جاتی ہے۔

حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں ان دونوں اطبا کی اس تحقیق کو زیر بحث حدیث کی صداقت پر گفتگو کرتے ہوئے دلیل کے طور پر بیان کیا ہے۔ انہوں نے مشہور طبیب غافقی کا بھی حوالہ دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس طبیب کی مفردات میں لکھا ہے کہ اگر کھمب کے پانی کو مشہور دوا اثمد کے پانی میں گوندھ کر سرمہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس سے آنکھ کی پلکوں کو تقویت پہونچتی ہے اور قوت بصارت میں اضافہ ہوتا ہے۔[1]

کیا یہ تمام مشاہیر اطبار منکرین حدیث کے نزدیک ناقابلِ اعتماد ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو براہِ کرم ہمیں بتایا جائے وہ کونسے اطبار ہیں جن کو منکرین حدیث کے یہاں اعتماد کا درجہ حاصل ہے پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے کہ کیا ان کے معتمد اطبار نے روئے زمین پر پیدا ہونے والی ہر کھمب کا تجربہ و تجزیہ کر لیا ہے اور

---

[1] زاد المعاد جلد ۳ صفحہ ۱۸۱

اس کی سب رہنموں پر تحقیق مکمل کرلی ہے خصوصاً اسی طرز و انداز کی کھمب پر جو عہد رسالت میں سرزمین حجاز میں پائی جاتی تھی کیا انہوں نے کوئی تجربہ کیا؟ اور سب سے بڑھ کر اور بنیادی بات یہ کہ کیا ان اطباء کی رائے میں طب اپنے نقطۂ کمال کو پہونچ گیا ہے کہ اب جو چیز بھی اس کی تحقیق میں نہیں آئی یا اس کے خلاف ثابت ہوئی وہ مردود قرار دے دی جائے۔

بات کچھ بھی نہیں منکرین حدیث کے پیش نظر صرف اعتراض کرنا ہے اسی مقصد کو ذہن میں رکھ کر وہ کتب حدیث کو کنگھالنا شروع کرتے ہیں اور جہاں جہاں کوئی بات انہیں اپنے مطلب کی نظر آتی ہے بلا تحقیق و تنقیح اور بغیر کچھ سوچے سمجھے اس کی بنیاد پر احادیث نبوی پر اعتراضات وارد کرتے چلے جاتے ہیں خواہ بعد ان میں سے کوئی بھی اعتراض ثابت نہ ہوسکے وقتی طور پر ناواقف حال لوگوں کو دھوکہ دینے میں تو وہ کچھ نہ کچھ کامیاب ہو ہی جاتے ہیں اور یہی ان کا مطمح نظر ہے۔

۵۔ باہم متعارض روایات

اب آئیے منکرین حدیث کے اس اعتراض کی طرف جو اوپر ہم نے پانچویں نمبر پر درج کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اکثر صحیح احادیث باہم متعارض ہیں اور یہ قاعدۂ مسلّمہ ہے کہ متعارض اشیاء ساقط الاعتبار ہوتی ہیں لہٰذا احادیث بھی باہم متعارض ہونے کی بنا پر ساقط الاعتبار قرار پائیں۔

یہ اعتراض بھی دراصل معترضین کی کم علمی کا غمّاز ہے۔ منکرین حدیث کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ کتب حدیث کا متقابل مطالعہ انہیں حاصل نہیں وہ احادیث کے بارے میں جو فیصلہ کرتے ہیں اپنے محدود مطالعے کی بنیاد پر کرتے ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ یہ کبھی نہ کہتے کہ اکثر احادیث باہم متعارض ہیں۔ جن لوگوں کی احادیث کے پورے ذخیرے پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ احادیث کے درمیان اتفاق بہت زیادہ اور اختلاف بہت کم ہے مثلاً احادیث صفات و فضائل میں کوئی تعارض نہیں احادیث اخلاق و رقاق میں بھی کہیں تعارض نظر نہیں آتا اسی طرح احادیث معجزات تعارض سے

پاک ہیں نیز احوال جنت و جہنم کے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں بھی ننانوے فی صد احادیث ایسی ہیں جن میں کوئی تعارض نہیں پایا جاتا۔ لے دے کے وہ احادیث رہ جاتی ہیں جو یا تو بعض واقعات پر مشتمل ہیں اور یا پھر ان کا تعلق احکام سے ہے۔

جہاں تک احادیثِ واقعات کا تعلق ہے تو ان میں اگرچہ ایک بہت ہی قلیل تعداد ایسی حدیثوں کی ضرور ملتی ہے جو باہم متعارض تو نہیں البتہ باہم مختلف دکھائی دیتی ہیں لیکن ان کا باہمی تعارض و اختلاف بھی صرف ظاہر نظر میں ہی محسوس ہوتا ہے غور و فکر کے بعد اور احادیث نبوی کے تقابلی مطالعے کے بعد اکثر و بیشتر وہ رفع ہو جاتا ہے دراصل ہوتا یہ ہے کہ یا تو مختلف راویوں نے ایک ہی بات یا واقعے کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہوتا ہے جو بظاہر باہم متعارض و مختلف نظر آنے لگتا ہے حالانکہ معانی کے لحاظ سے ان کے درمیان کوئی تعارض و اختلاف نہیں ہوتا یا پھر مختلف راویوں نے ایک ہی واقعے یا تقریر کے مختلف اجزا بیان کیے ہوتے ہیں ناواقف سمجھتا ہے ان کے بیانوں میں اختلاف ہے جبکہ احادیث کے ذخیرے سے واقف اس واقعے کے تمام اجزا کو یکجا کر کے ان کے باہمی تطابق کو پا لیتا ہے۔

..یہی حال احادیثِ احکام کا ہے جو احادیث باہم متعارض نظر آتی ہیں وہ اس قدر کم ہیں کہ غیر متعارض احادیث کی نسبت وہ شاید ایک فی صد بھی نہیں۔ ان میں سے بھی اکثر کا حال یہ ہے کہ ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے اور تحقیق و جستجو کی جائے تو تعارض رفع ہو جاتا ہے ان احادیث کے ساتھ بھی صورتِ حال یہ ہے کہ یا تو یہ ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے عمل فرمایا ہوتا ہے اور جس راوی نے جو طریقہ مشاہدہ کیا اسے روایت کر دیا یا پھر یہ ہوتا ہے کہ احادیث میں باہم تقدم و تاخر زمانی موجود ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو علوم حدیث پر عبور حاصل ہے وہ اس تقدم و تاخر زمانی کو معلوم کر لیتے ہیں اور اس کی بنیاد پر پہلی حدیث کو منسوخ اور بعد والی حدیث کو ناسخ قرار دیتے ہیں۔

احادیثِ احکام کا مطالعہ کرتے وقت یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ بہت

سے اعمال و افعال کی تشریع دفعتاً نہیں ہوئی بلکہ بتدریج ہوئی ہے مثلاً نماز ابتدا میں دو رکعت فرض ہوئی بعد میں رکعات کی تعداد چار ہو گئی یا مثلاً ابتداء اسلام میں صرف دو ہی وقت صبح اور عصر کی نماز فرض تھی بعد میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں تو احکام پر مشتمل احادیث کے معاملے میں اس تدریج کے عمل کا لحاظ رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ اس تدریج کے عمل سے پیدا ہونے والے اختلاف کو تعارض یا تناقض کا درجہ دینا غلط ہو گا۔

غرض ایسی احادیث جن کا باہمی تعارض و اختلاف رفع کرنا مشکل ہو تعداد میں اتنی قلیل ہیں کہ ان کو غیر متعارض و غیر مختلف احادیث سے وہ نسبت بھی نہیں جو ایک کے عدد کو ہزار کے عدد سے ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قدر اقل قلیل احادیث متعارضہ کی بنیاد پر پورے ذخیرۂ حدیث کو غیر معتبر قرار دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ احادیث نبویہ کسی ایک ناقابل تقسیم کل کا نام تو ہے نہیں کہ اس کا ایک جزء ساقط ہوا تو کل کے کل کا ساقط ہونا لازم آگیا، ہر حدیث اپنے اپنے مقام پر اپنی ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے اور ہر ایک اپنی جداگانہ سند کے ساتھ روایت ہوئی ہے بنابریں دو چار روایات کیا دو چار سو روایات بھی ساقط ہو جائیں تو بقیہ ہزاروں روایات کا سقوط لازم نہیں آسکتا۔ اوّل تو ایسی روایات کے بارے میں جن کا باہمی تعارض و اختلاف رفع کرنا مشکل ہو درست اور صحیح طریقۂ عمل یہ ہے کہ راجح اور احوط پر عمل کیا جائے لیکن اگر ترک ہی کرنا منظور ہے تو ظاہر ہے صرف انہی روایات کو ترک کیا جائے گا جو باہم متعارض ہوں گی ان کی وجہ سے غیر متعارض روایات کو ترک کرنے والا پاگل اور احمق ہی کہلائے گا۔

۶۔ روایت بالمعنیٰ

اس کے بعد نمبر ہے منکرین حدیث کے اس اعتراض کا کہ اکثر احادیث کی روایت بالمعنیٰ ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر ارشادات کے مفہوم و مضامین کو راوی نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے چنانچہ ان کے خیال میں جب آپ ؐ کے الفاظ ہی محفوظ نہیں تو مفہوم و

مضامین کے بارے میں کیسے یہ یقین کر لیا جائے کہ وہ بہ تمام وکمال ہم تک پہونچ گئے ہیں۔

اس اعتراض کا اندازہ یہ بتلا رہا ہے جیسے معترضین کے نزدیک احادیث نبوی کا جس قدر ذخیرہ ہے وہ سب کا سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر مشتمل ہے حالانکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ حدیث فقط اقوال نبوی ہی کا نام نہیں بلکہ آپؐ کے افعال اور آپؐ کے سامنے پیش آنے والے حالات و واقعات کو بھی حدیث ہی کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات منکرین حدیث بھی بخوبی جانتے ہیں لیکن حقائق کو چھپا کر اپنے مطلب کی بات نکالنا ان کی عادت ہو گئی ہے۔ بہر حال اتنی بات واضح ہے کہ متذکرہ بالا اعتراض صرف ان احادیث تک محدود ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر مشتمل ہیں اس لیے کہ صرف اقوال ہی کے بارے میں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ان کی روایت بالمعنیٰ کیوں ہے باللفظ کیوں نہیں جہاں تک آپؐ کے افعال اور آپؐ کے سامنے پیش آنے والے حالات اور واقعات کا تعلق ہے تو ظاہر ہے ان کے باللفظ روایت ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کسی کے منہ سے نکلنے والے کلمات تو باللفظ نقل کیے جا سکتے ہیں لیکن کسی کی ذات سے صادر ہونے والے افعال یا کسی کی ذات سے تعلق رکھنے والے احوال الفاظ یا کلمات تو نہیں ہیں کہ انہیں باللفظ نقل کیا جا سکے ان کو تو نقل کرنے والا ہر راوی اپنے ہی الفاظ میں نقل کرے گا اگرچہ بنیادی مفہوم ہر ایک کا یکساں رہے گا۔

اب روایت بالمعنیٰ کا اعتراض چونکہ اقوال نبوی تک ہی محدود رہ گیا ہے اس لیے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ منکرین حدیث کو وہ تمام احادیث تسلیم کر لینی چاہئیں جن کا تعلق افعال و احوال نبوی سے ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ ذخیرۂ احادیث کا اکثر حصہ افعال و احوال نبوی پر ہی مشتمل ہے اقوال نبوی پر مشتمل حصہ اس کے مقابلہ میں بہت قلیل ہے اس طرح حدیث کا ایک بہت ہی قلیل حصہ ایسا ہے جو اب محل نظر رہ گیا ہے۔ اس قلیل حصے میں سے بھی بہت سے اقوال نبوی ایسے ہوں گے جو افعال و احوال نبوی سے

مطابقت رکھتے ہوں گے ان کو تسلیم کر لینے میں بھی منکرین حدیث کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے اس لیے کہ تسلیم شدہ حصے سے ان کا مطابقت رکھنا ثبوت ہے اس بات کا کہ روایت بالمعنیٰ کے طریقے سے جو نقصان انہیں پہونچنے کا احتمال تھا وہ اس سے محفوظ رہے ہیں۔ اس کے بعد جو بہت ہی قلیل حصہ اقوال نبوی کا بچے گا اس میں سے ان احادیث کو بھی علیحدہ کر لیجیئے جو اوراد واذکار اور ادعیۂ مسنونہ پر مشتمل ہیں ایسی احادیث کے بارے میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ سب کی سب روایت باللفظ ہیں اس لیے کہ امت مسلمہ کے درمیان ایسی احادیث نسل در نسل ایک ہی جیسے الفاظ کے ساتھ نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ اسی طرح اذان، تشہد، اقامت اور احادیث اخلاق نیز احادیث قدسیہ اور احادیث جوامع الکلم یہ سب کی سب احادیث بھی تقریباً باللفظ روایت ہوئی ہیں اس قسم کی تمام احادیث پر بھی منکرین حدیث کا اعتراض صادق نہیں آتا اس لیے ان کو بھی قبول کر لینے میں انہیں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد اقوال نبوی کا بقیہ حصہ رہ ہی کتنا جاتا ہے جس پر روایت بالمعنیٰ کا اعتراض وارد ہوتا ہو۔

بہرحال منکرین حدیث کے نزدیک اگر حفاظت حدیث میں شبہ روایت بالمعنیٰ ہی کی بنا پر تھا تو یہ شبہ صرف اس اتنے ہی حصہ تک محدود رہنا چاہیئے جتنا حصہ بروایت بالمعنیٰ کے طریقے سے غیر محفوظ ثابت ہے اور وہ ہم ابھی بتلا چکے ہیں کہ انتہائی قلیل ہے مگر قارئین کو یہ سن کر شاید تعجب ہوگا کہ اس اقل قلیل حصہ حدیث کے مشتبہ و مشکوک ہونے کی بنیاد پر منکرین حدیث پورے کے پورے ذخیرۂ حدیث کو مشتبہ و مشکوک قرار دیتے ہیں حتیٰ کہ وہ حصہ بھی جو روایت باللفظ کے طریقے سے ثابت ہے۔ کتنی عجیب بات ہے ہم اب تک تو یہ سنتے آئے تھے کہ اکثر کی بنیاد پر کل کا حکم ثابت ہوتا ہے منکرین حدیث نے اس کلیہ کو اپنے مخصوص مقاصد کے پیش نظر الٹ دیا۔ ہے ان کے یہاں اب اقل قلیل کی بنیاد پر کل کا حکم ثابت ہونے لگا ہے۔ ہم تو جب جانیں جب منکرین حدیث اپنے دنیا وی کاروبار بھی اسی کلیے کے مطابق انجام دینے لگیں اور آج ہی سے سب سے پہلا کام یہ کریں کہ

کھانا کھانا بالکل چھوڑ دیں کیونکہ کھانا کھانے سے کبھی کبھی بدہضمی بھی ہو جاتی ہے اور قلیل کی بنیاد پر کل کے حکم کا اثبات ایک اصول کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ روایت بالمعنیٰ کے طریقے پر منقول یہ اتنا قلیل حصہ حدیث بھی فی الحقیقت مشتبہ نہیں رہتا اس لیے کہ محدثین کے یہاں روایت بالمعنیٰ وہی مقبول ہے جس کا راوی الفاظ کے مدلول و مفہوم اور معانی و مقاصد کو خوب سمجھتا ہو اور یہ بھی خوب جانتا ہو کہ اگر اس لفظ کے بجائے دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تو مفہوم میں کتنا تغیر ہو جائے گا جو راوی ان صلاحیتوں سے بہرہ ور نہیں اس کی روایت بالمعنیٰ محدثین کے نزدیک بالاتفاق مقبول نہیں۔

روایت بالمعنیٰ کے سلسلے میں یہ حقیقت بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ احادیث نبوی کے اولین راوی صحابۂ کرام اعلیٰ درجے کے قوی الحافظہ ہونے کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس بھی تھے نیز آپ کی مراد میں کسی تغیّر و تبدل اور آپؐ کے کلام میں ادنیٰ تحریف کو اپنے لیے شقاوت ابدی خیال کرتے تھے ایسے راویوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے مقصود کو اگر اپنے الفاظ میں بیان کیا بھی ہے تو کیسے یہ تصور کر لیا جائے کہ ان سے کوتاہی ہو گئی ہو گی اور مقصود و مُراد نبوی میں تغیر و تبدل آ گیا ہو گا۔

روایت بالمعنیٰ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ روایت باللفظ کے مقابلے میں روایت بالمعنیٰ وثاقت اور طمانیت کے لحاظ سے کم درجہ رکھتی ہے اور اس سے کسی کو انکار بھی نہیں فقہائے اسلام بالاتفاق اس کے قائل ہیں۔

۷۔ حضرت ابوہریرہؓ اور صحابہ کی تنقید

اب تک ہم منکرین حدیث کے چھ اعتراضات کا جواب دے چکے ہیں۔ اُوپر ساتویں نمبر پر جس اعتراض کا ہم نے حوالہ دیا ہے اس کا تعلق حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ذات سے ہے۔ منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کو خود صحابہ کے درمیان قابلِ اعتماد تصور نہیں کیا جاتا تھا چنانچہ بعض صحابہ نے

ان پر تنقید کی ہے اور ان کی صداقت بیانی پر شک و شبہ کا اظہار کیا ہے پھر اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ احادیث نبوی کا ایک کثیر حصہ چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے مروی ہے اس لیے وہ سارا کا سارا ناقابل اعتماد ہے۔

اس اعتراض کی اصل حقیقت پر کلام کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کی وضاحت کر دی جائے کہ صحابہ کے درمیان جو بھی علمی نزاع و اختلاف ہمیں مختلف کتابوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے اس کی حقیقت تبادلۂ افکار و نظریات سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ دراصل بات یہ ہے کہ فہم و ادراک اور قوت استنباط کے اعتبار سے سب صحابہ یکساں نہ تھے بعض اوقات ایسا ہوتا کہ خاص حالات کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی سے کوئی معاملہ کرتے اور وہ اسے عام حکم سمجھ کر لوگوں کے سامنے بیان کر دیتا اس سے صحابہ کے مابین علمی بحث کا آغاز ہو جاتا اور تردید و تائید کا سلسلہ شروع ہو جاتا تاآنکہ حق واضح ہو جاتا اور حق واضح ہوتے ہی یکایک وہ علمی بحث اپنے انجام کو پہنچ جاتی اور ہر فریق حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا۔ حق واضح ہونے سے پہلے جس قدر بھی تردیدات ایک دوسرے کے لیے روا رکھی جاتیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کی صداقت بیانی کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں بلکہ ہوتا یہ تھا کہ مثلاً ایک صحابی کوئی حدیث روایت کرتا اور دوسرا صحابی اس روایت کو منسوخ یا مخصوص یا مقید تصور کرتا یا ایک صحابی روایت کرتا اور دوسرا سمجھتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کسی خاص شخص سے متعلق ہے اور مخصوص حالات کے نتیجے میں صادر ہوا ہے۔ یا مثلاً ایک صحابی کسی حدیث کو ایک طریقے سے بیان کرتا اور دوسرا اسے اس سے مختلف انداز میں نقل کرتا۔ اس قسم کی تمام صورتوں میں حق واضح ہونے تک ایک صحابی دوسرے صحابی کے بارے میں مختلف خیالات کا اظہار کرتا مثلاً یہ کہ اسے وہم ہوا ہے یا یہ کہ وہ بھول گیا ہے یا اس سے کوئی فروگذاشت ہوئی ہے۔ اب اس قسم کے یا اسی سے ملتے جلتے جس قدر بھی اقوال و آثار منقول ہیں نا واقف حال یا تعصب سے مغلوب حضرات ان کے بارے میں جو چاہیں رائے زنی کرتے رہیں ان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ صحابہ فہم حدیث کی خاطر ایک دوسرے سے تبادلۂ افکار کرتے

تھے تاکہ حق کھل کر سامنے آ جائے۔

بس اسی پر حضرت ابوہریرہؓ اور دیگر صحابہ کے معاملے کو قیاس کر لیجئے۔ حضرت ابوہریرہؓ اور دیگر صحابہ کے مابین جو علمی تنازعات کا ذکر ہمیں مختلف کتب میں ملتا ہے اس کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ وہ محض ایک علمی تبادلۂ افکار تھا جو فہم و ادراکِ حدیث کی خاطر صحابہ اور حضرت ابوہریرہؓ کے درمیان وقتاً فوقتاً برپا ہوا اس کو حضرت ابوہریرہؓ کی تردید و تکذیب پر محمول کرنا سراسر کم علمی اور جہالت ہے۔

اس سلسلے میں سب سے بڑی سوچنے کی بات یہ ہے کہ صحابہ اگر حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہوتے تو وہ ان کو اس بات کی اجازت کیونکر دے سکتے تھے کہ وہ کھلم کھلا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث روایت کرنے کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ذرا خیال تو کیجئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسا جری اور بے باک حق پرست کیا کسی ایسے شخص کو جس کی مرویات صحابہ کے درمیان شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھی جا رہی ہوں روایت حدیث کی اجازت دے سکتا تھا یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جیسی فقیہہ و عالم ام المومنین کیا اس صورتِ حال کو خاموشی سے برداشت کر سکتی تھیں کہ ایک آدمی جو احادیث نبوی کے بارے میں قابلِ اعتماد متصور نہیں ہوتا دن رات کثیر احادیث روایت کرتا رہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کے زمانے میں بہت سے صحابہ بقیدِ حیات تھے اور صحابہ کی دینی غیرت سے کون واقف نہیں حدیث میں غلطی کرنے والے کے بارے میں وہ چشم پوشی سے کام لیں اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا ان سب کے سامنے اگر حضرت ابوہریرہؓ روایت حدیث کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور اس انداز سے رکھے ہوئے ہیں کہ صحابہ میں سب سے زیادہ روایت کرنے والے شمار کیے جاتے ہیں تو یہ بیّن ثبوت ہے اس بات کا کہ صحابہ کے درمیان حضرت ابوہریرہؓ کو روایت حدیث میں معتمد خیال کیا جاتا تھا۔

حضرت ابوہریرہؓ صحابہ کی نظر میں

علاوہ ازیں صحابہ کے درمیان اگر حضرت ابوہریرہؓ کو اعتماد کا درجہ حاصل نہ تھا جیسا کہ منکرین حدیث کا دعویٰ ہے تو صحابہ کے ان اقوال و آثار کے بارے میں وہ کیا

کہیں گے جو حضرت ابو ہریرہؓ کی مدح وستائش میں وارد ہوئے ہیں مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک موقعہ پر حضرت ابو ہریرہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

یا اَبا هریرۃ اَنْت کنتَ اَلزمَنا لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم واَحفظَنا لحدیثہ۔ (ترمذی - المناقب)۔	اے ابو ہریرہ آپ ہم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہنے والے اور ہم سے زیادہ احادیث کو یاد رکھنے والے ہو۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت طلحہ بن عبیداللہ کے سامنے حضرت ابو ہریرہ کی کثرت روایت پر تعجب کا اظہار کیا تو حضرت طلحہ بن عبیداللہ نے فرمایا:

اَما اَن یکون سِمع من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مالم نسمع عنہ' (ترمذی - المناقب)۔	اس میں شک نہیں کہ (ابو ہریرہ نے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کچھ سنا ہے جو ہم نے نہیں سُنا۔

اسی قسم کا ایک قول حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کسی نے ان کو حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت بیان کرتے سُنا تو تعجب سے پوچھا کہ آپ تو خود صحابی ہیں اس کے باوجود حضرت ابو ہریرہؓ کی روایتیں نقل کرتے ہیں آپ نے جواب میں فرمایا:

اَن اَبا هریرۃ قد سِمعَ مالم نسمع و اِنی ان اَحدث عنہ اَحبّ اِلیَّ من اَن اُحدِّث عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یعنی مالم اسمعہ منہ۔ (البدایۃ والنہایۃ ج ۸)	ابو ہریرہ نے وہ کچھ سنا ہے جو ہم نے نہیں سنا اور مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ میں ابو ہریرہ سے روایت کروں بہ نسبت اس کے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (بلا واسطہ) روایت کروں یعنی وہ کچھ جو میں نے آپؐ سے خود نہیں سُنا۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کسی نے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو آپؓ نے فرمایا

وعلیك اباهریرۃ یعنی تمہیں چاہیئے کہ تم یہ سوال ابوہریرہ سے کرو پھر ان کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی اس دُعا کا ذکر کیا جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین کہا تھا اور جو کبھی فراموش نہ ہونے والے علم سے متعلق تھی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں یہ سارا واقعہ نقل کیا ہے۔ اسی واقعے میں یہ بھی ذکر ہے کہ جب حضرت ابوہریرۃ کی تقلید کرتے ہوئے بعض دیگر صحابہ نے بھی ایسی ہی دعا درخواست کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَسَبَقَكم بها الغلام الدوسی	دوسی لڑکا تم پر سبقت لے گیا۔

(تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صـ ۲۶۶)

غرض حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مدح وستائش میں صحابۂ کرام کے یہ تمام اقوال اس بات کا ثبوت ہیں کہ صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے جس کا منکرین حدیث کو دعوٰے ہے۔ اور یہ تو ہم نے صرف چند اقوال نقل کیے ہیں ورنہ اسی قسم کے مضامین کے حامل اور بھی بہت سے اقوال اس ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں کہ حضرت ابوہریرۃ صحابۂ کرام کے نزدیک نہ صرف قابلِ اعتماد بلکہ دوسروں سے زیادہ قابلِ اعتماد، دوسروں سے زیادہ احادیث نبوی کو یاد رکھنے والے اور دوسروں سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہ کر کسب علوم و برکات میں سبقت لے جانے والے خیال کیے جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "ابوہریرۃ کو ہم سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ورفاقت کا شرف حاصل تھا اور وہ ہم سے بڑے حافظ حدیث تھے"[1] اسی طرح حضرت ابی بن کعبؓ حضرت ابوہریرہ کے بارے میں فرمایا کرتے کہ "ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی باتیں بھی پوچھنے کی جرأت کر لیتے جو ہم نہیں کر سکتے تھے"[2]۔

---

[1] السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی [2] ایضاً

منکرین حدیث کا استدلال

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنے کے لیے منکرین حدیث خود حضرت ابوہریرہ رضؓ ہی کے ایک قول سے دلیل پکڑتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضؓ کے اس قول پر تفصیلی گفتگو کی جائے تاکہ اصل حقیقت سامنے آجائے۔ حضرت ابوہریرہ کا یہ قول وہ ہے جس کو امام مسلم نے حضرت اعرج سے روایت کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں:

سمعتُ أبا هريرةَ يقول إنكم تزعمون أنَّ أبا هريرةَ يكثر الحديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم والله الموعد كنتُ رجلاً مسكيناً أخدمُ رسول الله صلى الله عليه وسلم على ملإ بطني وكان المهاجرون يشغلُهم الصفقُ بالاسواق وكانت الانصارُ يشغلهم القيام على اموالهم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم من يبسُط ثوبَه فلن ينسى شيئًا سمعه منّي فبسطتُ ثوبي حتّى قضى حديثه ثم ضممتُه اليّ فما نسيتُ شيئًا سمعته منه۔ (مسلم۔ فضائل الصحابہ)

میں نے ابوہریرہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ تم سمجھتے ہو کہ ابوہریرہ رضؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت احادیث بیان کرتا ہے بخدا میں تو ایک مسکین شخص تھا اور صرف اپنا پیٹ بھر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرنے کے سوا میرا کوئی کام نہ تھا اور مہاجرین کو بازار کے کاروبار سے فرصت نہ تھی جبکہ انصار اپنے اموال کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اپنا کپڑا بچھادے وہ مجھ سے جو بات سنے گا وہ بھولے گا نہیں سو میں نے اپنا کپڑا بچھادیا یہاں تک کہ آپؐ حدیث بیان کر چکے پھر میں نے اس کپڑے کو اپنے سینے سے لگالیا چنانچہ (پھر) میں نے جو بات بھی آپؐ سے سنی کبھی نہیں بھولا۔

منکرین حدیث اس حدیث سے دلیل پکڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کا

خود اپنا اعتراف موجود ہے کہ صحابہ کثرت مرویات کی بنا پر ان کی روایت کردہ احادیث کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان پر تنقید کیا کرتے تھے۔

بدگمانی نہیں اظہار تعجب

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس حدیث میں کونسی بات ایسی ہے جس سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہو کہ حضرت ابوہریرہ کی مرویات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ متذکرہ بالا حدیث میں حضرت ابوہریرہ کی کثرت روایت پر اظہار تعجب ضرور کیا گیا ہے مگر اظہار تعجب سے شک و شبہ کا اظہار کیسے لازم آیا۔ بعض اوقات ایک شخص جس کی صداقت بیانی پر پورا اعتماد ہوتا ہے کوئی عجیب واقعہ بیان کرتا ہے یا اس کی ذات سے کسی عجیب عمل کا صدور ہوتا ہے اور آپ اس پر حیرت و تعجب کا اظہار کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ آپ اس کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں یا اس کو جھٹلا رہے ہیں۔ بخلاف اس کے اظہار حیرت سے آپ کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ امر واقعہ کی اصل حقیقت بیان کر کے آپ کے تعجب کا ازالہ کرے۔ بالکل یہی معاملہ حضرت ابوہریرہ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت ابوہریرہ متاخر الاسلام ہونے کے باوجود دیگر صحابہ کے مقابلے میں زیادہ حدیثیں روایت کیا کرتے تھے صحابہ کے درمیان سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ وہ سمندر کی سی روانی کے ساتھ جب حدیثوں پر حدیثیں بیان کیے چلے جاتے تو اس سے بعض ان تابعین کے دلوں میں جو حضرت ابوہریرہ کے ذاتی حالات سے واقف نہ تھے یا بعض ان صحابہ کے ذہنوں میں جو مدینہ سے دور بود و باش رکھتے تھے اس تعجب کا پیدا ہونا فطری امر تھا کہ آخر آپ دوسرے صحابہ کے مقابلے میں اس قدر احادیث کے محفوظ کرنے والے کیسے بن گئے یہی تعجب ایک سوال بن کر کبھی کبھی ان کی زبانوں پر بھی آجاتا مگر جب حضرت ابوہریرہ حقیقت حال واضح فرماتے تو سب کے دل مطمئن ہو جاتے۔

حضرت ابوہریرہ کو دوسرے صحابہ کے مقابلے میں اس قدر کثیر احادیث کیسے محفوظ ہو گئی تھیں اس کی وجہ حضرت ابوہریرہؓ نے اسی متذکرہ بالا حدیث میں خود بیان کر دی ہیں اسی کی وجہ دو تھیں ایک یہ کہ حضرت ابوہریرہ ہمہ وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں حاضر رہتے تھے دوسرے یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے جو کچھ ایک مرتبہ آپ یاد کر لیتے کبھی نہ بھولتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سنہ ۷ ہجری میں ایمان لائے اور پہلے دن سے لے کر آپ کے وصال تک ایک دن کے لیے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانے سے جدا نہ ہوئے ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے جہاں بھی آپ تشریف لے جاتے ابو ہریرہ ساتھ ہوتے، کئی کئی دن کھانے کو نہ ملتا مگر ابو ہریرہ کو یہ گوارا نہ ہوتا کہ حفظِ حدیث کا مشغلہ چھوڑ کر دنیا کے کسی کاروبار میں لگ جائیں ان کے مقابلے میں دوسرے صحابہ کو خدمت نبوی میں حاضری کے ساتھ ساتھ دنیوی مشاغل کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا تھا جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ نے خود بتایا مہاجرین بے چارے بازاروں میں کاروبار تجارت میں مصروف رہتے اور انصار کو اپنے باغات اور اپنے اموال کی دیکھ بھال کی طرف توجہ دینی پڑتی۔ اس طرح حضرت ابو ہریرہؓ نے چار سال کے عرصے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کچھ حاصل کر لیا جو دوسرے نہ کر سکے۔ پھر اس پر مزید یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احادیث کے حفظ میں ان کا شغف دیکھ کر معجزانہ انداز میں ان کی قوتِ حافظہ کی تقویت کا ایسا سامان کر دیا کہ جو یاد کیا کبھی ذہن سے محو نہ ہوا۔ چادر کا قصہ اوپر کی حدیث میں بھی بیان ہوا ہے دیگر کئی روایات میں بھی آیا ہے، جن میں سے بعض میں ذکر ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے خود ضعف حافظہ کی شکایت کی تھی جس پر اس چادر والے طریقے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فیضیاب فرمایا۔

غرض خدمت نبوی میں ہمہ وقت حاضری اور دعائے نبوی کی برکت سے غیر معمولی قوت حافظہ ان دونوں باتوں نے مل کر حضرت ابو ہریرہ کو حفظ حدیث اور کثرت روایت کے معاملے میں دوسرے لوگوں سے ممتاز بنا دیا۔

کثرت روایت کا ایک اور سبب

حضرت ابو ہریرہ کی کثرت روایت کا ایک اور سبب یہ بھی تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلافت راشدہ کے عصر و عہد میں جب صحابہ کی کثیر تعداد اِدھر اُدھر مختلف بلاد و امصار میں پھیل گئی تو حضرت ابو ہریرہ نے محسوس کیا کہ احادیث کا جو ذخیرہ ان کے

پاس امانت ہے اسے ہر حال میں امت مسلمہ کے جتنے افراد تک وہ پہونچا سکیں پہونچا دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آخری گھڑی آ کھڑی ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا ہوا یہ کثیر علم ان کے سینے میں مخفی ان کے ساتھ ہی چلا جائے اور کتمانِ علم کا الزام ان کے سر رہ جائے چنانچہ بعض مواقع پر اپنے اس فکر و احساس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے اگر قرآن کی یہ آیت نہ ہوتی تو میں کبھی کوئی حدیث بیان نہ کرتا[1] پھر سورۂ بقرہ کی وہ آیت تلاوت فرماتے جس میں کتمانِ علم پر اللہ کی لعنت کا ذکر ہے۔

غرض جن لوگوں کو حضرت ابوہریرہ کے شغف حدیث کا حال معلوم نہ ہوتا تھا وہ ان کی کثرت روایت کو دیکھ کر تعجب میں پڑ جاتے تھے اور اپنی حیرت و استعجاب کو دور کرنے کے لیے حضرت ابوہریرہؓ سے مختلف سوالات کرنے لگتے تھے اسی حیرت و استعجاب کو دور کرنے کے لیے حضرت ابوہریرہؓ اس حقیقت کا اظہار فرماتے جس کا ذکر زیر بحث حدیث یا اسی قسم کی دوسری احادیث میں ہمیں ملتا ہے۔

ایک اور حقیقت زیر بحث حدیث سے ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی کثرت روایت پر حیرت و استعجاب کا اظہار بھی مشاہیر صحابہ میں سے کسی کی جانب سے نہ تھا بلکہ اس کا اظہار کرنے والے وہ لوگ تھے جو نہ تو چیدہ و برگزیدہ صحابہ کی صف میں شامل تھے اور نہ ان کو اسلام میں سبقت کرنے اور عرصہ مدید تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے قریب ترین صحابیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی کثرت روایت پر حیرت و تعجب کا اظہار کرنے والوں میں سے کوئی صحابی تھا ہی نہیں۔ حضرت ابوہریرہ کے الفاظ پر غور کیجئے وہ معترضین کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں "اور مہاجرین کو بازار کے کاروبار سے فرصت نہ تھی جبکہ انصار اپنے اموال کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے" معلوم ہوا حضرت ابوہریرہ کے مخاطبین میں مہاجرین و

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۴ قسم ۲

انصار میں سے کوئی شامل نہ تھا اگر کوئی شامل ہوتا تو حضرت ابوہریرہؓ کا خطاب ان الفاظ میں ہوتا "تم لوگ تجارت و زراعت کے کاموں میں مصروف رہتے تھے" یہ غائب کے صیغے سے مہاجرین و انصار کا ذکر دلیل ہے اس بات کی کہ حضرت ابوہریرہؓ کی کثرت روایت پر تعجب کا اظہار کرنے والے مہاجرین و انصار کے علاوہ کچھ لوگ تھے۔

ہمارے اس خیال کی تائید میں وہ روایت اور بھی زیادہ صریح ہے جس کو امام مسلم نے ہی حضرت سعید ابن مسیّب سے روایت کیا ہے۔ اس روایت میں معترضین کا قول ان الفاظ میں نقل ہوا ہے:

ویقولون ما بال المهاجرين و الانصار لا يتحدثون مثل احاديثه۔ (مسلم فضائل الصحابہ)	لوگ کہتے ہیں کہ مہاجرین و انصار کو کیا ہوا وہ ابوہریرہ کی طرح حدیثیں بیان نہیں کرتے۔

غور کرنے کی بات ہے اگر اعتراض کرنے والے مہاجرین و انصار میں سے کوئی ہوتے تو ان کا قول لازماً ان الفاظ میں نقل ہوتا ما بالنا لا نتحدث مثل احادیثہ (ہمیں کیا ہوا ہم ابوہریرہ کی طرح حدیثیں روایت نہیں کرتے) اسی طرح جواب میں حضرت ابوہریرہ یہ نہ کہتے کہ "میرے انصاری بھائی اپنی زمینوں کی دیکھ بھال میں لگے رہتے اور میرے مہاجر بھائی بازار کے معاملات میں مصروف ہوتے" بلکہ سیدھے سادے طریقے سے کہتے کہ تم زمینوں کی دیکھ بھال میں یا تم بازار کے معاملات میں مصروف رہتے تھے۔

غرض اس قسم کی جتنی روایات بھی مسلم یا بخاری میں ہیں ان کے الفاظ اسی حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کی کثرت روایت پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرنے والے صحابہ کے علاوہ کوئی ایسے لوگ تھے جو حضرت ابوہریرہؓ کے شغف حدیث اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے خصوصی تعلق سے کما حقہٗ واقف نہ تھے۔ ہم نے حضرت ابوہریرہ کے سیر و سوانح کو خوب خوب کنگھالا کتب آثار و حدیث میں بڑی تلاش و جستجو سے کام لیا کہ کسی ایک ہی ایسے صحابی کا نام مل جائے جس نے

حضرت ابوہریرہ رضؓ کو کثرت روایت کی بنا پر مطعون کیا ہو لیکن کوئی ایک روایت بھی ہمیں ایسی نہیں مل سکی۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ پر تنقید کرنے والوں میں مشاہیر صحابہ میں سے اگر کوئی ہوتا تو تاریخ کے اوراق میں یہ بات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتی جس طرح صحابہ کی دوسری ردّو قدح کا ذکر ہمیں کتب تاریخ میں ملتا ہے اس کا ذکر بھی ضرور ملتا۔

ہم منکرین حدیث کے ممنون ہوں گے اگر وہ کوئی ایک ہی ایسی صحیح تاریخی شہادت پیش کر دیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کسی معروف صحابی نے حضرت ابوہریرہ کو آپکی کثرت روایت پر مطعون کیا ہو یا کسی صحابی نے حضرت ابوہریرہ رضؓ کی طرف کذب بیانی کی نسبت کی ہو اور ان کو حدیثیں روایت کرنے یا دوسروں کو ان کی مرویات سننے سے روکا ہو۔ ہمیں یقین ہے وہ کوئی ایسی شہادت پیش نہیں کر سکیں گے۔

اس ضمن میں کوئی تاریخی ثبوت تو خیر منکرین حدیث قیامت تک پیش نہیں کر سکیں گے البتہ اُنہوں نے اپنی عادت کے مطابق حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ایک روایت کے بعض الفاظ کو توڑنے مروڑنے کی کوشش کی ہے اور اس سے اپنے مطلب کی بات نکالنی چاہی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ امام مسلم نے اسے کتاب المساقات والمزارعۃ میں روایت کیا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ أنّ رسولَ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم أمَرَ بقتلِ الکلابِ إلّا کلبَ صیدٍ أو کلبَ غنمٍ أو ماشیۃٍ فقال لابن عمر رضی اللہ عنہما أنّ أبا ھریرۃ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ یقول أو کلبَ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتّوں کے مار ڈالنے کا حکم فرمایا مگر شکار کا کتّا یا بکریوں کا کتّا اور جانوروں کی حفاظت کا کتّا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ حضرت ابوہریرہ تو

زرع فقال ابن عمر رضی اللہ تعالٰی عنہما إنّ لأبی ھریرۃ زرعًا۔
(مسلم کتاب المساقات والمزارعۃ باب الامر بقتل الکلاب)۔

کھیت کا کتا بھی (مستثنیٰ) کہتے ہیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضرت ابوہریرہ کے پاس کھیت بھی ہے۔

اس حدیث کے الفاظ "إنّ لأبی ھریرۃ زرعًا" کے مفہوم کو منکرین حدیث اس معنے میں لیتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی جانب سے یہ ایک لطیف طنز ہے حضرت ابوہریرہ پر یعنی دراصل حضرت ابن عمر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابوہریرۃ کے پاس کھیتی بھی ہے اس لیے یہ کھیتی کے کتے کا استثنا انہوں نے معاذ اللہ اپنی طرف سے بڑھا لیا ہے۔

اگرچہ اکثر شارحین حدیث نے حضرت عبداللہ ابن عمر کے اس قول پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ان الفاظ سے حضرت ابن عمر کا مقصود کیا تھا ہم اس پر بھی ابھی گفتگو کریں گے مگر اس سے پہلے ہم منکرین حدیث سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ کھیتی کا کتا کے الفاظ روایت کرنے میں کیا حضرت ابوہریرہ منفرد ہیں اگر وہ منفرد ہوں اور دیگر کسی صحابی سے یہ الفاظ مروی نہ ہوں تو پھر تو منکرین حدیث کا یہ قول کسی درجے میں قابل غور ہو سکتا ہے کہ اس سے حضرت ابن عمر کی مراد حضرت ابوہریرۃ کو کذب بیانی سے متہم کرنا تھا لیکن اگر صورتِ حال اس سے مختلف ہوا اور یہ الفاظ دوسرے صحابہ نے بھی روایت کیے ہوں تو پھر منکرین حدیث کا یہ قول کسی درجے میں بھی قابل قبول نہ ہوگا۔ اب سنئے وہ روایت جس میں کھیتی کے لیے کتا پالنے کی اجازت کا ذکر ہے کس کس صحابی سے مروی و منقول ہے امام بخاری نے اسے حضرت سفیان بن ابی زہیرؓ[1] سے روایت کیا ہے مسلم میں یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمر حضرت شعبہ اور حضرت سفیان بن ابی زہیرؓ[2] سے

---

[1] ماجاء فی الحرث والمزارعۃ [2] کتاب المساقاۃ والمزارعۃ

روایت ہوئی ہے ترمذی کتاب الصید میں حضرت ابوہریرہ کی روایت کے ساتھ ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کی روایات میں بھی کھیتی کے لیے کتا پالنے کی یہ اجازت صریحاً مذکور ہے۔ اب بتلائیے جب اس روایت میں حضرت ابوہریرہ منفرد نہیں بلکہ دیگر متعدد صحابہ نے بھی اسے روایت کیا ہے تو پھر کیسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ حضرت ابوہریرہ کے پاس کھیتی بھی تھی اس لیے انہوں نے اپنی طرف سے حدیث کے الفاظ میں کھیتی کے کتے کی اجازت کا اضافہ کر لیا تھا اور حضرت ابوہریرہؓ کے اسی فعل پر طنز کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن عمر نے یہ کہا تھا کہ "ابوہریرہ کے پاس کھیتی بھی ہے"۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پھر آخر ان الفاظ سے حضرت ابن عمر کا مقصود کیا تھا۔ شارحین حدیث نے اس سلسلہ میں جو وضاحت کی ہے ہمیں افسوس ہے کہ منکرین حدیث نے اس کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی بلکہ ہم اگر یہ کہیں تو بالکل درست ہوگا کہ عامۃ الناس کو دھوکہ میں رکھنے کے لیے انہوں نے جان بوجھ کر اس وضاحت کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ حافظ بن حجر نے فتح الباری میں حضرت ابن عمر کے ان الفاظ پر تبصرہ کرتے ہوئے پہلے یہ بیان کیا ہے کہ ان الفاظ سے مقصود حضرت ابوہریرہ کی تصدیق ہے پھر لکھا ہے کہ رواۃ حدیث میں سے سفیان بن ابی زہیر اور عبداللہ بن مغفلؓ نے حضرت ابوہریرہ کی تائید کی ہے۔ اسی طرح امام نووی شارح صحیح مسلم ان الفاظ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے حضرت عبداللہ ابن عمر کا مقصود نہ ابوہریرہ کی روایت کی تحقیر ہے اور نہ اس کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار۔ بخلاف اس کے ان کا مقصد یہ جتلانا ہے کہ چونکہ حضرت ابوہریرہ زمین اور کھیتوں کے مالک بھی تھے اس لیے انہوں نے اس کھیتی کے کتے کی اجازت کے الفاظ حدیث یاد رکھنے کا زیادہ اہتمام کیا اس لیے کہ یہ قاعدہ ہے جو شخص جس کام سے زیادہ شغف رکھتا ہے اس کام کے متعلق احکام دوسروں سے بڑھ کر یاد رکھتا ہے اور اس کے لیے وہ بلیغ اہتمام کرتا ہے جو دوسرے نہیں کرتے۔

شارحین حدیث کی اس تعبیر کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر ہی کی ایک روایت ایسی بھی ہے جس میں اُنہوں نے خود کھیتی کے کتے کی اجازت نقل کی ہے اس روایت کو امام مسلم نے کتاب المساقات والمزارعۃ میں بروایت ابوالحکم بیان کیا ہے۔ اگر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کھیتی کے کتے کی اجازت کو حدیث ابوہریرہ میں اضافہ آمیز فرماتے تو خود اس اجازت کو کیوں روایت کرتے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اُنہوں نے جب حضرت ابوہریرہ سے یہ الفاظ سنے تو یا تو ان پر اعتماد کامل کی بنا پر یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تحقیق کر لینے کے بعد خود بھی وہ الفاظ روایت کرنے لگے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو خود کسی وقت یہ یاد آیا ہو کہ میں نے آپؐ سے یہ الفاظ سنے تھے اور پھر ان کو بیان کرنا شروع کر دیا ہو بہرحال وجہ کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ حضرت ابن عمر نے یہ الفاظ خود بھی روایت کیے ہیں اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ انہیں ابوہریرہ کے ان الفاظ کی روایت پر قطعاً کوئی شک نہ تھا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ منکرین حدیث کا یہ اعتراض بھی قطعاً بے بنیاد ہے کہ حضرت ابوہریرہ کو صحابہ کے درمیان اعتماد کا درجہ حاصل نہ تھا۔

۸۔ امام ابوحنیفہ پر حدیث سے بے نیازی کا الزام

اب منکرین حدیث کا صرف آخری اعتراض باقی رہ گیا ہے اس اعتراض کا لب لباب یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں کو اس قابل سمجھا ہے کہ ان پر اعتماد کیا جائے یہی وجہ ہے کہ جتنے بھی احکام و مسائل فقہی کا انہوں نے استنباط کیا ہے ان کے لیے صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں کو بنیاد بنایا ہے ورنہ ان کے مستنبط تمام مسائل کا مدار قرآن پر ہے۔ اُنہوں نے عقلی حقائق کی روشنی میں قیاس کی بنیاد پر قانون کے اُصول اور نظریات مرتب کیے ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ کا یہ طرز عمل جہاں اس بات کا ثبوت ہے کہ حدیث کا تمام تر ذخیرہ سوائے معدودے چند حدیثوں کے ناقابل اعتماد ہے وہاں اس طرز عمل میں ہمارے لیے یہ دلیل بھی ہے کہ قرآن کی تعبیر حدیث کی مدد کے بغیر موجود الوقت حالات کی روشنی میں

کی جا سکتی ہے۔

امام ابوحنیفہ کا سرمایۂ حدیث

یہ اعتراض ہی دراصل ایک غلط مفروضے پر مبنی ہے یہ بات کہ امام ابوحنیفہ نے استنباط مسائل میں صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں پر اعتماد کیا ہے ایک مفروضے سے زیادہ کچھ نہیں۔ امام ابوحنیفہ نے اگرچہ دیگر محدثین کی طرح حدیث نبوی کی تدریس کے لیے کوئی حلقۂ درس قائم نہیں کیا اور نہ ہی امام مالک کی طرح حدیث کی کوئی کتاب مرتب کی تاہم آپ کے تلامذہ نے آپؒ کی روایت کردہ احادیث کو کتب و مسانید میں جمع کیا ہے ان کتب و مسانید کی تعداد سترہ کے قریب ہے۔ ان میں سے امام ابوحنیفہ کے سب سے بڑے شاگرد امام ابویوسف کی مرتب کردہ کتاب الآثار تو آج بھی شائع شدہ حالت میں مل جاتی ہے اس اکیلی کتاب میں ہی ایک ہزار سے زیادہ احادیث امام ابوحنیفہ کی روایت کردہ موجود ہیں اس کے علاوہ روایات ابی حنیفہ پر مشتمل کتب میں سے مشہور ترین کتب حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب الآثار المرفوعہ از امام محمد بن حسن

(۲) الآثار المرفوعہ والموقوفۃ از امام محمد بن حسن

(۳) مسند امام حسن بن زیاد اللؤلوی

(۴) مسند حماد بن امام ابی حنیفہ

ان کے علاوہ "مسند ابی حنیفہ" کے نام سے اور بھی متعدد علماء نے کئی کتابیں مرتب کیں ان علماء میں امام ذہبی، امام بخاری، حارثی، ابن المظفر، محمد بن جعفر، ابونعیم اصبہانی، قاضی ابوبکر انصاری، ابن ابی العوام اور ابن خسرو بلخی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مسانید کو بعد میں قاضی القضاۃ ابوالمؤید محمد بن محمود خوارزمی المتوفی ۶۶۵ھ ہجری نے ایک ضخیم کتاب میں یکجا کر دیا اور اسے "جامع مسانید الامام الاعظم" کے نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب فقہی ابواب پر مرتب ہوئی ہے اور مکررات کو اس میں حذف کر دیا گیا ہے۔ اسے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ مذکرہ مسانید کے علاوہ خطیب بغدادی، دارقطنی، ابن شاہین اور ابن عقدہ جیسے نامور علماء نے حدیث کی مرتب کردہ

مختلف "مسانید ابی حنیفہ" کا ذکر بھی کتابوں میں ملتا ہے۔ خطیب بغدادی نے جب دمشق کا سفر اختیار کیا تو دار قطنی اور ابن شاہین کی مرتب کردہ "مسانید ابی حنیفہ" ان کے ہمراہ تھیں علاوہ ازیں ان کی اپنی تالیف "مسند ابی حنیفہ" بھی ان کے پاس موجود تھی[1]۔ اسی طرح ابن عقدہ کی مسند کے بارے میں علامہ بدر الدین عینی نے اپنی تاریخ کبیر میں ذکر کیا ہے کہ اس میں ایک ہزار سے زیادہ روایات موجود تھیں۔ امام ابو حنیفہ کے ایک اور شاگرد رشید امام زفر نے بھی ایک کتاب "کتاب الآثار" کے نام سے مرتب کی تھی اس میں بکثرت روایات امام ابو حنیفہ کی تھیں۔ اس کا ذکر حاکم نے اپنی کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" میں کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثیں قابل اعتماد تھیں تو پھر یہ ہزاروں کی تعداد میں وہ کونسی احادیث روایت کرتے رہے۔ ان احادیث کو وہ صحیح اور قابل اعتماد سمجھتے ہی تھے تو روایت کرتے تھے۔ علم حدیث میں امام ابو حنیفہ کے شیوخ کی تعداد جن سے انہوں نے روایات لی ہیں چار ہزار تک پہنچتی ہے امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں آپ کو "ثقہ اور حافظ حدیث" کے لقب سے یاد کیا ہے آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ سب کچھ ثبوت ہے اس بات کا کہ منکرین حدیث نے جس دعوے پر اپنے اعتراض کی بنیاد رکھی ہے وہ ایک خلاف واقعہ افسانے اور غلط مفروضے سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

منکرین حدیث جو بات کہتے ہیں اس کا کسی معتبر کتاب میں ہمیں کوئی ذکر نہیں ملتا صرف ابن خلدون نے اس کو ذکر کیا ہے لیکن ایک تو اس کی کوئی سند نہیں بتائی دوسرے اس کی عبارت مبہم و مجمل ہے اس عبارت سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کی مرویات کی تعداد ہی اتنی ہے حالانکہ ان مسانید کی موجودگی میں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کوئی عقل سے عاری ہی ہوگا جو اس بات کو درست جانے گا۔

---

[1] السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی

استنباط کا مبنیٰ احادیث

اب رہی یہ بات کہ اگر بکثرت احادیث امام ابو حنیفہ کے نزدیک صحیح تھیں تو انہوں نے مسائل و احکام فقہی کے استنباط کے لیے صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں پر کیوں اکتفا کیا تو یہ بات بھی پہلی بات کی طرح قطعاً غلط، خلاف واقعہ اور مبنی بر کذب ہے کوئی شخص فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں سے اگر صرف امام طحاوی کی شرح معانی الآثار، ابو بکر جصاص کی احکام القرآن اور امام سرخسی کی المبسوط ہی دیکھ لے تو اسے کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہو کہ امام ابو حنیفہ نے حدیث سے بے نیاز ہو کر صرف قیاس اور قرآن پر اپنے مسائل فقہی کے استنباط کی بنیاد رکھی تھی۔ شارح قاموس سید مرتضیٰ زبیدی نے ایک کتاب "الدرر المنیفۃ فی ادلۃ ابی حنیفۃ" کے نام سے مرتب کی ہے اسی ایک کتاب کو دیکھ لیا جائے تو منکرین حدیث کا جھوٹ پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سب موافق و مخالف اس پر متفق ہیں کہ امام ابو حنیفہ ایک مجتہد امام تھے مجتہد کی لازمی شرائط میں سے کون نہیں جانتا کہ ایک یہ شرط بھی ہے کہ وہ احادیث احکام پر حاوی ہو اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ایسی احادیث ہزاروں کی تعداد میں ہیں بعض حنابلہ کا قول بھی اگر لیا جائے تو احادیث احکام کی تعداد کئی سو سے تو متجاوز ہے ہی پھر یہ کیسے مان لیا جائے کہ ایک ایسا شخص مسند اجتہاد پر فائز ہو جاتا اور امت مسلمہ اس کو مجتہد تسلیم کر لیتی جو صرف سترہ یا اٹھارہ احادیث کو مدار احکام بنائے ہوئے تھا۔ کیا یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ ایک ایسا شخص جس کا سرمایۂ حدیث صرف سترہ یا اٹھارہ روایات ہوں مسلمانوں کے ایک ایسے عظیم امام کا درجہ حاصل کر لے جس کا فقہی مسلک تمام دیگر فقہی مذاہب و مسالک سے وسیع تر شمار کیا جائے اور کائنات ارضی کے لاکھوں مسلمان جس کے حلقہ بگوش ہوں۔ یہی نہیں بلکہ آنے والے زمانوں میں جس کے اجتہاد و فقہ پر ائمۂ دین اعتماد کرتے اور اسے نقل و روایت کرتے چلے آئے ہوں۔

امام ابو حنیفہ سے جو مسائل مروی ہیں ان کی کم از کم تعداد تراسی ہزار بتائی جاتی ہے بعض روایات کے مطابق ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے اس حقیقت کو ذہن میں رکھیے اور ذرا اس بات پر غور کیجیے کہ محدث ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب "مصنف" میں

ایک باب باندھا ہے جس میں وہ مسائل گنائے ہیں جن میں امام ابو حنیفہ نے بقول ان کے احادیث صحیحہ کی خلاف ورزی کی ہے ان کی کل تعداد ایک سو پچیس ہے اگرچہ احادیث صحیحہ کی خلاف ورزی کے اس قول میں علمائے فقہ کو کلام ہے اور انھوں نے تفصیل سے اس کی اصل حقیقت بھی واضح کی ہے تاہم تھوڑی دیر کے لیے اس قول کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ ایک سو پچیس کے علاوہ باقی تمام مسائل یعنی تقریباً بیاسی ہزار سے زائد مسائل جو امام ابو حنیفہ سے منقول ہیں وہ سب کے سب احادیث صحیحہ کے موافق ہیں قطع نظر اس کے کہ ان کے بارے میں کوئی حدیث صریحاً مروی ہو یا نہ ہو۔ اگر ان سب مسائل کی بنیاد دینے والی احادیث کو تلاش کیا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ امام ابو حنیفہ کے یہاں سینکڑوں بلکہ ہزاروں احادیث کا وجود ثابت ہو جائیگا۔

امام صاحب کا مسلک

غرض یہ خیال بھی قطعاً غلط ہے کہ امام ابو حنیفہ نے حدیث سے بے نیاز ہو کر صرف قیاس اور قرآن پر اپنے مسائل فقہی کی بنیاد رکھی۔ حدیث سے استناد کے معاملے میں امام ابو حنیفہ کا جو مسلک تھا اسے خود انہی کے الفاظ میں سنئے:

"جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو وہ سر آنکھوں پر میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں ہم آپ کی مخالفت نہیں کر سکتے جو بات صحابہ سے منقول ہو ہم اس میں سے اپنا پسندیدہ قول چن لیتے ہیں اور جو بات صحابہ کے علاوہ دوسروں سے منقول ہو تو ہم بھی آدمی ہیں اور وہ بھی آدمی ہیں"۔ (میزان شعرانی جلد ۱ صـ ۶۱)

اسی سے ملتا جلتا مگر ذرا تفصیل کے ساتھ امام ابو حنیفہ کا ایک اور قول خطیب نے تاریخ بغداد میں نقل کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں:

"مجھے جب کوئی حکم خدا کی کتاب میں مل جاتا ہے تو میں اسی کو تھام لیتا ہوں اور جب اس میں نہیں ملتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے ان صحیح آثار کو لیتا ہوں جو ثقہ لوگوں کے ہاں ثقہ لوگوں کے واسطے سے معروف ہیں پھر جب نہ کتاب اللہ میں حکم ملتا ہے نہ سنت رسول اللہ میں تو میں اصحاب رسول کے قول (اجماع صحابہ) کی

پیروی کرتا ہوں اور ان کے اختلاف کی صورت میں جس صحابی کا قول چاہتا ہوں قبول کرتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں مگر ان سب کے اقوال سے باہر جا کر کسی کا قول نہیں لیتا۔ رہے دوسرے لوگ تو جس طرح اجتہاد کا حق انہیں ہے مجھے بھی ہے۔"

(تاریخ بغداد جلد ۱۳ صـ ۳۶۸)

ایک مرتبہ خلیفہ منصور نے بعض لوگوں کے اکسانے پر امام ابو حنیفہ کو لکھا کہ میں نے سنا ہے آپ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ جواب میں امام صاحب نے لکھا:

"امیر المومنین آپ تک جو بات پہونچی ہے وہ صحیح نہیں ہے میں سب سے پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر پھر ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم اجمعین کے فیصلوں پر پھر باقی صحابہ کے فیصلوں پر البتہ جب صحابہ میں اختلاف ہو تو پھر قیاس کرتا ہوں۔" (میزان شعرانی جلد ۱ صـ ۶۲)

یہ اور اسی طرح کے دیگر متعدد اقوال ہیں جن میں امام صاحب کے اپنے الفاظ میں وہ مسلک ہمارے سامنے آتا ہے جو حدیث سے استناد کے معاملے میں امام ابو حنیفہ نے اختیار کیا ہوا تھا کسی کے کلام کی کوئی تعبیر وہی درست اور صحیح سمجھی جاتی ہے جو متکلم نے خود بتلائی ہو ان اقوال کی موجودگی میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ امام ابو حنیفہ حدیث سے بے نیاز ہو کر مسائل فقہی کا محض قیاس کی بنیاد پر استنباط کیا کرتے تھے وہ امام صاحب پر افترا پردازی کرتا ہے۔ ایک مرتبہ جب امام ابو حنیفہ کے سامنے کسی کا لگایا ہوا یہ الزام نقل کیا گیا کہ آپ قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں تو اس پر آپ نے فرمایا:

جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہم قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں وہ بخدا جھوٹ کہتا ہے اور افترا پردازی سے کام لیتا ہے نص کی موجودگی میں قیاس کی ضرورت ہی کیا ہے۔

(میزان شعرانی جلد ۱ صـ ۶۱)

حقیقت یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ حدیث کے مقابلے میں قیاس کو ہرگز ترجیح نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے یہاں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ انہوں نے ضعیف احادیث تک کو قیاس کے مقابلے میں قابل ترجیح سمجھا ہے مثال کے طور پر حالت سفر میں نبیذ کے ساتھ وضو کرنے کی

اجازت پر مشتمل حدیث کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن امام صاحب نے اس حدیث کو قیاس پر ترجیح دی ہے اسی طرح جب چور دس درہم سے کم چرائے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا حالانکہ اس کے بارے میں وارد شدہ حدیث محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ امام ابن قیم اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں:

"اصحاب ابی حنیفہ کا اس امر پر اجماع منعقد ہوچکا ہے کہ امام صاحب کے نزدیک ضعیف حدیث قیاس ورائے سے افضل ہے۔" (اعلام الموقعین)

غرض اب تک کی گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ منکرین حدیث کی نہ یہ بات صحیح ہے کہ امام ابوحنیفہ نے مسائل فقہی کے استنباط کے لیے صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں پر اعتماد کیا ہے اور نہ ان کی یہ بات ہی درست ہے کہ امام صاحب حدیث سے بے نیاز ہوکر محض قیاس اور قرآن پر اپنے مسائل کا مدار رکھتے تھے اس طرح امام ابوحنیفہ کے بارے میں انکا سارا اعتراض ہی بے بنیاد ہے۔

اس کے ساتھ ہی الحمد للہ منکرین حدیث کے ان تمام اعتراضات کا جواب مکمل ہو جاتا ہے جن کا زیر نظر عنوان کی ابتدا کرتے وقت ہم نے حوالہ دیا تھا اور اسی کے ساتھ ہی الحمد للہ یہ کتاب اپنے اختتام کو پہونچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تحریر کو مصنّف ناشرین اور قارئین سب کے لیے ہدایت کا ذریعہ اور ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

محمد محسن

۳ مارچ ۱۹۷۹ سنہ عیسوی

۴ ربیع الثانی ۱۳۹۹ سنہ ہجری

مصادر و مآخذ

القرآن الکریم
تفسیر قرطبی
تفسیر طبری مطبوعہ مصر
تفسیر معارف القرآن مفتی محمد شفیع طبع کراچی
الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی
مطبوعہ سہیل اکیڈمی پاکستان
احکام القرآن ابوبکر جصّاص
الاحکام فی اصول الاحکام لابن حزم
طبع قاہرہ ۱۳۴۵ھ
صحیح بخاری
صحیح مسلم
جامع ترمذی
سنن ابوداؤد
سنن نسائی
سنن ابن ماجہ
سنن دارمی
مؤطا امام مالک
مسند امام احمد بن حنبل
مشکوٰۃ المصابیح للخطیب
مستدرک حاکم مطبوعہ حیدرآباد دکن
کنز العمال شیخ علی متقی برہان پوری
مطبوعہ حیدرآباد دکن
الادب المفرد للبخاری مطبوعہ قاہرہ مصر
معالم السنن للخطابی مطبوعہ حلب
صحیح ابن حبان
مشکل الآثار امام طحاوی مطبوعہ حیدرآباد دکن
صحیفۂ ہمام ابن منبہ مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ
طبع حیدرآباد دکن
مجمع الزوائد للہیثمی مطبوعہ قاہرہ
کتاب العلل امام ترمذی
فتح الباری ابن حجر عسقلانی مطبوعہ مصر
عمدۃ القاری علامہ عینی مطبوعہ قاہرہ مصر
شرح مسلم امام نووی طبع قاہرہ
مسوّی شرح مؤطا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
مطبوعہ مکہ مکرمہ
تذکرۃ الموضوعات محمد بن طاہر المقدسی
طبع مصر ۱۳۲۳ھ
معرفۃ علوم الحدیث للحاکم طبع قاہرہ
الموافقات امام شاطبی طبع تونس ۱۳۰۲ھ
تلقیح ابن جوزی

صید الخاطر ابن جوزی

تہذیب النووی

شروط الائمۃ الخمسہ للحازمی طبع قاہرہ

المیزان للشعرانی طبع قاہرہ

المحدث الفاصل رامہرمزی

زاد المعاد ابن قیم مطبوعہ مصر

تاویل مختلف الحدیث ابن قتیبہ طبع قاہرہ

الرسالۃ للامام الشافعی طبع اول ۱۳۵۸ھ

فتح المغیث امام سخاوی طبع قاہرہ ۱۳۵۵ھ

تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر عسقلانی طبع حیدرآباد دکن ۱۳۲۵ھ

اعلام الموقعین ابن قیم طبع ۱۳۷۳ھ

توجیہ النظر شیخ طاہر الجزائری طبع مصر ۱۳۲۸ھ

تقیید العلم خطیب بغدادی طبع دمشق ۱۹۴۹ء

جامع بیان العلم ابن عبدالبر مطبعہ منیریہ مصر

السنۃ قبل التدوین محمد عجاج الخطیب طبع مصر

الرسالۃ المستطرفہ للکتانی کارخانہ کتب کراچی

قواعد التحدیث شیخ ابوالحسن حنبلی طبع دمشق ۱۳۵۲ھ

علوم الحدیث و مصطلحہ ڈاکٹر صبحی صالح طبع دمشق ۱۳۷۹ھ

السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی

حجیت حدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی طبع لاہور

ترجمان السنہ مولانا بدر عالم طبع کراچی

تدوین حدیث مولانا مناظر احسن گیلانی طبع کراچی

ترجمان القرآن منصب رسالت نمبر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی طبع لاہور

تفہیمات مولانا ابوالاعلیٰ مودودی طبع لاہور

تاریخ الحدیث مولانا عبدالصمد صارم طبع لاہور

شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید طبع مصر

ازالۃ الخفا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی طبع کراچی

تذکرۃ الحفاظ للذہبی مطبوعہ دمشق

تدریب الراوی للسیوطی مکتبہ قاہرہ مصر ۱۳۷۹ھ

اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ابن اثیر جزری طبع قاہرہ ۱۲۸۶ھ

الاصابہ فی تمییز الصحابہ حافظ ابن حجر مطبوعہ مصر

طبقات ابن سعد مطبوعہ بیروت

لسان المیزان حافظ ابن حجر مطبوعہ حیدرآباد دکن

البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر مطبعۃ السعادۃ قاہرہ ۱۳۵۱ھ

وفیات الاعیان ابن خلکان مطبعۃ المیمنیۃ مصر

سیرت ابن ہشام مطبوعہ مصر

کشف الظنون حاجی خلیفہ طبع مصر ۱۲۷۴ھ

انساب الاشراف علامہ بلاذری

الکامل فی التاریخ ابن اثیر جزری مطبوعہ مصر

جوامع السیر ابن حزم

تاریخ الکبیر امام بخاری مطبوعہ حیدرآباد دکن

معجم صغیر، اوسط، کبیر طبرانی — تاریخ طبری مطبوعہ مصر

تاریخ بغداد خطیب بغدادی مطبوعہ مصر ۱۳۴۹ھ

تاریخ دمشق حافظ ابن عساکر